گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

کراچی

سچی کہانیاں

October

2014

اس شمارے میں:

☆ قمبر شہداد کوٹ سے ایک نوعمر لڑکی کی پامالی کی داستان

☆ لندن، وہاڑی سے ایک چلتر عورت کے منصوبہ ساز ذہن کا شاخسانہ

☆ شہر کراچی کے ایک نوجوان کی سیاسی بساط پر مہرہ بننے کی داستان الم

☆ تین مرد، تین کہانیاں، سچ بیانیاں اور شعلہ ساماں تحریریں

☆ "مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

برصغیر کے نامور قلم کار

ایم اے راحت کا نیا

سنسنی خیز سلسلہ

"ہم شکل"

ماہنامہ
سچی کہانیاں
کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



منیجر مارکیٹنگ
زین العابدین

منیجر ایڈمن اینڈ سرکولیشن
محمد اقبال زمان

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام
مدیر : کاشی چوہان/دانیال شمسی

MEMBER	
APNS	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
CPNE	رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتا: 110 'آدم آرکیڈ
شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ✵ جلد: 31 ۔ شمارہ: 10 ✵ اکتوبر: 2014ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

فون: 34930470 - 021-34939823 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 720 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر / قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ



زندگی کا احساس......

جامع مسجد حنفیہ، لاہور...... جب اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتے ہی مسجد کی دوسری منزل کی چھت نمازیوں پر گر پڑی...... وہ لوگ جو اپنے تمام کام ترک کر کے اللہ کے حضور حاضری لگانے آئے تھے، اللہ کے حضور حاضر ہو گئے۔ ایک بار پھر پیچھے رہ جانے والے ساری عمر کے لیے روتے بلکتے رہ گئے۔ 24 نمازی انسانی غفلت کے باعث اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہمیں کب سمجھ آئے گی؟ ہم کب جذباتیت اور دروغ گوئی کا راستہ ترک کر کے زندگی کو حقیقت کی آنکھ سے دیکھیں گے؟ حکومتی ادارے ناکام ہیں، اس لیے عوام بدحال ہیں۔ اگر مسجد کی تعمیر میں استعمال کیے جانے والے میٹریل کا معائنہ کیا گیا ہوتا، تعمیر انجینئرز کے مشورے سے ہوتی تو یہ سب نہ ہوتا۔ 24 جانیں یعنی 24 خاندان......

شاید لکھنے اور دیکھنے میں یہ نمبر بہت بڑا نہ محسوس ہو مگر سوچنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قیامت صغریٰ سے کم نہیں، اُن خاندانوں کے لیے جن کے پیارے ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔ مسجد کی غیر قانونی تعمیر کی طرف شاید اس لیے توجہ نہیں دی گئی کہ فسادات کا اندیشہ ہو گا۔ ہم تو وہ بدنصیب لوگ ہیں جو مذہب اور زبان کے نام پر بڑے سے بڑا گناہ کرنے کو تیار ہیں۔ یہ جانتے ہی نہیں کہ یہ دونوں معاملات زندہ انسانوں کے لیے ہیں، موت کے بعد تو بس بے جان لاش اور کفن حقیقت ہے......

کاش ہمیں زندگی کا احساس، زندگی ہی میں ہو جائے۔

منزہ سہام

کچھ اپنی باتیں

ہمارے ایک دوست ہیں، خیر سے شاعر جمع پروفیسر ہیں۔ گفتگو کمال کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنے شاعرانہ انداز میں ایسی ایسی سائنسی باتیں کر جاتے ہیں کہ میں کئی دن تک مبہوت سا رہ جاتا ہوں۔ ابھی پچھلے دنوں روشنی کی رفتار اور اس کا ماضی، حال، مستقبل سے تعلق موضوعِ گفتگو تھا۔ ساتھ ساتھ ویو لینتھ، الٹرا وائلٹ ریز وغیرہ بھی گفتگو کی لپیٹ میں رہے، ہمارے دوست اپنی بات کیے جا رہے تھے اور میرا ذہن حضرت میر تقی میر کے اس شعر پر اٹکا ہوا تھا:

یہ توہم کا کارخانہ ہے ☆☆ یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

میرے دوست اپنی سائنسی توجیہات پیش کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ ان کی تمام گفتگو ابھی تک میؔر کے اس شعر کی تشریح نہیں کر سکی۔ وہ کہنے لگے جو سامنے آسمان پر سب سے زیادہ چمکتا دمکتا ستارہ نظر آتا ہے۔ یہ اس وقت اپنی کم سے کم چھ سو سال پرانی شکل میں نظر آرہا ہے، یعنی ہم حال میں ہیں اور چھ سو سال پرانا ماضی ہمارے ہمرکاب ہے۔ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار کلومیٹر فی سیکنڈ ہے، اگر ہم روشنی کی رفتار سے زیادہ رفتار میں اس ستارے کی جانب سفر کریں تو ستارے کو اس کے ماضی میں جا پکڑیں گے، یعنی روشنی سے زیادہ تیز رفتار میں سفر کر کے ماضی میں پہنچا جاسکتا ہے۔ کہنے لگے یہ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں حقیقت میں یہ سب کچھ ویسا نہیں ہے جیسا ہمیں نظر آتا ہے۔ جو پھول ہمیں سرخ رنگ کا نظر آتا ہے وہ کتے کو سبز رنگ کا نظر آتا ہے۔ ہمیں دکھائی دینے والی ہر چیز کائنات کی ویو لینتھ پر انحصار کرتی ہے۔ اس دنیا میں جو کچھ ہم چُھو سکتے ہیں، جو کچھ ہم دیکھ سکتے، جو کچھ ہم سن سکتے، جو کچھ محسوس کر سکتے ہیں وہ غالباً تین ہزار سے ساڑھے سات ہزار ویو لینتھ پر مقیم چیزیں ہیں۔ ساڑھے سات ہزار سے اوپر کروڑوں، اربوں، کھربوں ویو لینتھ ہیں اور تین ہزار سے نیچے بھی اربوں کھربوں ویو لینتھ ہیں۔ ہماری دنیا صرف اسی تین ہزار ویو لینتھ پر ہے۔ یہ مواصلاتی لہریں ہیں، جن پر ہمارے موبائل فون اور ٹی وی چینل وغیرہ چلتے ہیں۔ یہ ہماری ویو لینتھ سے قریب قریب باہر ہیں اسی لیے ان لہروں کو ہم نہ چھو سکتے ہیں، نہ محسوس کر سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں۔ یعنی جس جگہ ہمیں سمندر دکھائی دیتا ہے، جانے وہاں سات ہزار ویو لینتھ سے اوپر کیا شے موجود ہو، بہت ممکن ہے وہاں خشک صحرا ہو۔ بہت ممکن ہے جس گھر میں ہم رہتے ہوں، اس گھر میں ہماری زمین جیسی سیکڑوں دنیائیں آباد ہوں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ گلاب کے پھول کا حقیقی رنگ کیا ہے، ہماری آنکھ کے عدسے جن رنگوں کی ترتیب پر مالک کائنات نے بنائے ہیں، ہم فقط وہی رنگ دیکھ سکتے ہیں اور ان ہی رنگوں کو دیکھنے والے لینسز بنا سکتے ہیں۔ یہ تو ہمارے دوست کا کہنا تھا، مگر میرے اس دوست کے پاس آج کے جدید علوم کی مدد موجود ہے، انٹرنیٹ موجود ہے جس پر پوری دنیا کا تحقیقی کام دیکھا جاسکتا ہے، آج دنیا کے سائنسدان برسہا برس کی تحقیق کے بعد یہ بتا رہے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ سوائے دھوکے کے اور کچھ نہیں۔ میں مرشد و مربی میر تقی میر کے بارے میں سوچتا ہوں کہ ان کے پاس کون سا علم تھا، ان کے پاس کون سی تحقیق تھی جس کی بنا پر انھوں نے بڑی نزاکت سے کہہ دیا کہ یہ دنیا وہم ہے، انسان کی حس جس چیز پر اعتبار کرتی ہے بس وہی چیز اُس کی دنیا ہے۔ واہ حضرت میر تقی میر واہ۔ اس ساری تحقیق اور باتوں کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرنے کے بعد میں سچی کہانیاں اور دوشیزہ ڈائجسٹ کو دیکھ رہا ہوں اور مسلسل سوچ رہا ہوں کہ یہ ان جان عزیز پرچوں کی وقعت کیا ہے، میرے پاس گھر میں دو شیلف بھرے ہوئے جن میں صرف دوشیزہ اور سچی کہانیاں براجمان ہیں، سوچتا ہوں اس شیلف کو اگر سات ہزار ویو لینتھ سے بڑھ کر دیکھا جائے تو یہاں کیا موجود ہوگا؟۔ میں نے بہت سوچا بہت غور کیا۔ بے شمار مرتبہ سوال کیے اور ہر مرتبہ مجھے اپنے سوال کا ایک ہی جواب ملا۔ ہاں ایک ہی جواب ملا۔ فقط ایک جواب...... کہ اس شیلف کو کسی بھی ویو لینتھ پر دیکھا جائے گا تو یہاں اگر یہ ڈائجسٹ نظر نہیں آئیں گے تو بس پھر صرف اور صرف سہام مرزا نظر آئیں گے۔

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو!

اس وقت ملکِ خداداد نازک صورتِ حال سے گزر رہا ہے۔ ہر نیا آنے والا دن اندیشوں میں گھرا ہوتا ہے۔ سچ پوچھیے تو کراچی میں بیٹھ کر اپنے شہرِ اقتدار میں موجود بہن بھائیوں! بچوں کے لیے دل بے قرار رہتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل کو آہیں ہمارا رستہ روک کے کھڑی ہوں کہ ہمارا کیا قصور تھا۔

ساتھیو! آپ سب سے بھی اپیل ہے کہ 'سب اچھا ہو' کی دعا کیجیے۔ اس ماہ محفل کا آغاز کرتے ہیں ایم حسن نظامی، قبولہ شریف کے خط سے لکھتے ہیں اگست کا پرچہ اپنی پوری رعنائیوں سے جلوہ گر ہوا، آپ نے رنگ برنگے گلوں کو سچی کہانیاں کے گلدان میں سجایا۔ جن کی مہک و خوشبو سے سبھی پڑھنے والوں کے چہرے شادمان و سرشار ہو گئے۔ صفدر علی حیدری، ارشد علی ارشد، مجید احمد جائی، عبدالعزیز جی آ، عاشق حسین ساجد اور بہت سی لکھاری خواتین بہنوں کے علاوہ ہمارے سینئر استاد ریاض حسین شاہ بھی اس محفل میں شامل ہیں۔ آپ اور ادارے کے سبھی کارکنان ہر ماہ پرچے پر بے حد محنت کرتے ہیں اور اس کا نکھار ہر ماہ خوب سے خوب تر ہوتا ہے۔ اس کی دلکشی ہر پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی چلی جاتی ہے اور بھی پرچے کی ڈیمانڈ میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ سچی کہانیاں کو نومبر 2002 سے پڑھنا شروع کیا تو پھر مستقل طور پر یہ زیرِ مطالعہ رہا۔ اس کے سبھی سلسلے معیاری اور جاذب نظر ملے۔ تبھی اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، سبھی چہرے اپنے اپنے اور دیکھے بھالے محسوس ہوئے تو دل کچھ لکھنے کو بے چین ہو گیا اور میں کاشی چوہان صاحب کے خلوص و پیار اور محبت سے اس پر دل و جان سے فدا ہو گیا، مجھے اپنے پرچے میں ''ویلکم'' کرنے اور اس قدر پذیرائی دینے پر بے حد شکریہ۔

☆ پیارے بھائی! آپ بھی اس چمن کے گل ہیں، آپ کی طرف سے اب محبت کا بڑھا ہاتھ پیچھے نہ ہٹے۔

✉ سہراب گوٹھ، کراچی سے اُمِ عادل لکھتی ہیں، امید ہے آپ اور آپ کی ٹیم بخیریت و عافیت مصروفِ عمل ہوں گے۔ محترم آپ نے ماشاءاللہ کئی ماہ سے رسالے کی ذمے داریاں سنبھالی ہوئی ہیں، ماضی قریب میں میں احوال میں پابندی کے ساتھ شامل ہوتی تھی اس کا ثبوت سرگودھا کے بھائی ممتاز احمد کی کئی مرتبہ احوال اور رسالے میں واپس لوٹ آنے کی پکار ہے، جس کے لیے میں بھائی ممتاز کی تہہ دل سے مشکور و ممنون ہوں، آپ سے مخاطب ہونے کا شرف پہلی مرتبہ حاصل ہو رہا ہے۔ یقیناً آپ اتنی طویل غیر حاضری کی وجہ پوچھیں گے، تو محترم دو تین وجوہ تحریر کیے دیتی ہوں۔ اکیڈمک مصروفیات، خرابیٔ صحت، وقت کی کمی۔ لیکن اب ارادہ کیا ہے کہ کسی طرح بھی اپنے رسالے کے لیے وقت ضرور نکالنے کی کوشش کروں گی اور اسی کوشش کی وجہ سے آپ سے مخاطب ہوں امید ہے آپ خوش آمدید کہیں گے، کاشی بھیا تعریف تو سب کو بھلی لگتی ہے مگر خوبی تو یہ ہے کہ تنقید بھی تنقید کرنے والے کی سوچ کو پڑھ کر سمجھی اور برداشت کی جائے مطلب یہ ہے کہ رسالے کا معیار اب وہ نہیں محسوس ہو رہا (یہ میری ذاتی فیلنگ ہے۔ میرا خیال ہے اس

مرتبہ اتنا ہی کافی ہے، منزہ صاحبہ، ممتاز بھیا، عبدالعزیز بھیا اور باقی تمام احوالیوں کو درجہ بدرجہ سلام ہاں کراچی میں ہوتے ہوئے ہمیں رسالہ 10 کے بعد ملتا ہے۔ وجہ؟ میرا یہ خط اکتوبر کے احوال میں ضرور لگائیں، اللہ نگہبان

☆ پیاری بہن اُمّ عادل! آپ کی تنقید سرآنکھوں پر آپ کو تازہ پرچہ کیسا لگا۔ اس ماہ کا پرچہ پڑھ کر ضرور رائے دیجیے گا۔

✉ ڈاکٹر غزل خان آفریدی نامعلوم مقام سے رقم طراز ہیں، آپ کا ماہنامہ سچی کہانیاں میں عرصہ دراز سے پڑھ رہی ہوں اور آج میں پہلی مرتبہ اس خوب صورت ماہنامے میں خط لکھنے کی جسارت لرزتے ہاتھوں سے کر رہی ہوں، مجھے آپ کی بھولی صورت دل کو بہت لبھاتی ہے، بس آپ کے انداز کی اسی اپنائیت نے مجھ کم ظرف کو یہ ہمت دی ہے کہ میں آپ کو اپنی ایک غزل ارسال کر رہی ہوں اگر قابل اشاعت ہوئی تو میں جانتی ہوں آپ ضرور چھاپیں گی۔ ویسے بھی نئے لکھنے والوں کی آپ نے ہمیشہ رہنمائی وحوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ بس آنٹی جانی اپنی سرپرستی میں اس غزل کی غزل کو شائع کر کے احسان مندی کا موقع عنایت کیجیے۔

☆ اچھی غزل! بہت کامیابیاں سمیٹو۔ شاعری میں تمہیں بہت محنت کرنا ہے، امید ہے ہمت نہیں ہاروگی۔



✉ اوکاڑہ سے ہمارے ہردلعزیز، صحافی، لکھاری دوست جاوید راہی کی احوال میں اولین آمد ہے عرض گزار ہیں۔ جناب کاشی چوہان جی اور محترمہ منزہ سہام مرزا صاحبہ دام اقبال ہو۔ شاد آباد رہیں، عرض گزار ہوں جب ماہنامہ افسانہ کراچی سے شروع ہوا۔ خورشید اعجاز مدیر تھے اس کے اور احمد ندیم قاسمی، بہزاد لکھنوی، ۔۔؟۔۔ امام، بانو قدسیہ، نزوعلی فرتاش، مقبول جہانگیر، رضیہ بٹ، مینا ناز، شریف کیانی، ذکی باصر، امجد رؤف خان، ضیاء شاہد، اظہر جاوید، رئیس امروہی، محبوب جاوید، ضیا ساجد، ایم اے زاہد، طارق اسماعیل ساگر جیسے بہت سے ادب دوست لوگ اس فورم پر اکٹھے تھے۔ شاید 1970ء سے پہلے کی بات ہے۔ میرا ایک افسانہ، چند چمکتے سکّوں کے لیے، مبلغ دس ہزار کے انعام میں شامل کرلیا گیا۔ اس تقریب جو میٹروپول ہوٹل میں منعقد ہوئی تھی میں میری ملاقات محترم سہام مرزا (مرحوم ومغفور) سے ہوئی۔ بہت عزت اور پیار دینے والے انسان تھے، میں اوکاڑہ سے کراچی شفٹ ہوگیا، ان کی مہربانی سے روزنامہ اعلان کراچی جو جاوید اختر مرحوم نکالتے تھے کا نیوز ایڈیٹر مقرر رہا۔ پرچہ جب تک چلا خوب سے خوب تر ہوتا گیا۔ مجھے ایک آدھ بار جناب سہام مرزا نے اپنے پاس کام کرنے کی پیش کش کی مگر اخبار کے چکر میں ایسا الجھا کہ اب تک آدھی صدی ہو چلی ہے محوسفر ہوں۔ ہر روز صبح سورج اُگنے کے ساتھ اپنی بھاگ دوڑ کا آغاز کرتا ہوں اور جب سورج شہر کے آخری کونے میں کہیں غروب ہونے جارہا ہوتا ہے تو میں دوسری صبح کے انتظار میں گھر کی طرف چل پڑتا ہوں اور بے خبر ہو کر سوجاتا ہوں مگر دوسری صبح اخبار کی تلخ مہک جو سیاہی سے اُٹھ رہی ہوتی ہے میرے سوئے ہوئے احساس کو جھنجوڑ کر جاگنے پر مجبور کر دیتی ہے میں پھر سے دن کا آغاز کرتے زرد رنگ فضاؤں میں تحلیل ہونے لگتا ہوں۔ ادب اور ادیب کا رشتہ صدیوں سے آکاش بیل جیسا ہے۔ یہ بیل اپنی غذا زمین سے حاصل کرنے کے بجائے درختوں کی ٹہنیوں سے چمٹ کر اپنے جسم کو زندہ رکھتی ہے اور ادب اپنے تخلیق کار کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں جکڑتے جاوداں شاہکار تخلیق کروانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کاشی چوہان کی تیز رفتار پہاڑی جھرنے کے ٹھنڈے پانی کی مانند یا بڑے سمندر میں گھرے ہوئے سرسبز جزیرے کی مثال لگتا ہے جب یہ لفظوں کو قطار در قطار سرو کے درختوں کی طرح ترتیب سے ادب دھرتی کے سینے پر بوتا ہے تو پھر ''سچی کہانیاں'' قارئین کی روح کو شاد آباد کرتی ہیں ایسے محسوس ہونے لگتی ہیں جیسے ایک بیج کے بدلے دھرتی ماں اُسے سیکڑوں شاخوں اور پتوں میں بانٹ دیتی ہے۔ میں نے ماہنامہ افسانہ کراچی سے آغاز کیا تو محترم سہام مرزا مرحوم کی وساطت میرے سر پر سائبان کی مثال ثابت ہوئی۔ جنگ، نوائے وقت، مشرق، امروز، خبریں جیسے اخبارات سمیت ملک کے اور بھارت کے بڑے روزنامہ ہندسماچار میں آج تک لکھتا آرہا ہوں۔ روزنامہ خبریں میں فیچر رائٹر کی پوسٹ پر ہوں ''جیل کہانی'' ہر سنڈے میگزین میں شامل ہوتی ہے۔ ان ساری باتوں کو ایک طرف رکھتے

یہاں ذکر کروں گا ''ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی کا جسے 31 سال ہو چکے ہیں اپنے قارئین کا پیار سمیٹتے ہوئے پاکستان اور دیگر ممالک میں اس ڈائجسٹ کا معیار اور اس میں شامل تحریریں قارئین کو ادبی تسکین فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں شامل نئے لکھنے والوں کی کاوشوں کو نوک پلک سنوارنے کے بعد جو مقام ملتا ہے اس ادبی یونیورسٹی کی ڈین محترمہ منزہ سہام مرزا اور کاشی چوہان آپ دونوں کے لیے اسے قارئین ایوارڈ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس لحاظ سے ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی کو جو انفرادیت حاصل ہے اس میں اپنے قارئین سے آشنائی اور اردگرد سے بے نیاز کردینے کا فن کاشی چوہان آپ اور محترمہ منزہ سہام کو تو ورثہ میں ملا ہے قابل تحسین ہونے کے ساتھ ساتھ معتبر بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو مزید روشن رکھیں آمین۔ مرحوم سہام مرزا صاحب کا قرض چکانے کی کوشش کروں گا اگر آپ کی جانب سے حوصلہ افزائی ہوئی تو۔ آپ سب کے لیے دل سے دعا گو۔

☆ جاوید بھائی! احوال میں آپ کی آمد مثلِ بہار ہے، آپ کی اولین آمد کو مکمل لگانا ہماری محبت ہے۔ سلامت رہیے۔

✉ **مقصود احمد بلوچ میاں چنوں** سے شاملِ احوال ہیں، لکھتے ہیں اگست کا شمارہ اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے پراسرار نمبر ٹائٹل دیکھ کر میرے بچے ساری رات ڈرتے رہے۔ اتنا خوف ناک ٹائٹل تھا اس کے بعد منزہ سہام کا عید مبارک پڑھا۔ کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں پڑھیں جو کہ پہلے کی طرح بہت ہی زبردست تھیں، اس کے بعد اپنے من پسند ٹاپک احوال کی طرف چھلانگ لگادی۔ احوال میں تو میرے بہت سارے جاننے والے ساتھی بھی موجود تھے جن کے احوال پڑھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ ان دوستوں میں سب سے پہلے قبولہ شریف سے ایم حسن نظامی، لالہ موسیٰ سے ایم اشفاق بٹ، چکوال سے عبدالعزیز جی آجو کہ بہت ہی غصّے کے عالم میں تھے اور سچی کہانیاں کی ایوارڈ تقریب کے بارے میں غصہ کررہے تھے۔ کاشی بھائی آپ سے میری ایک ریکوسٹ ہے آپ عبدالعزیز جی آ بھائی کو ایک ایوارڈ بازار سے خرید کردے دو، چلو کم از کم اُن کا غصہ تو کم ہوجائے گا۔ (ہاہاہاہا) ویسے میں مذاق کررہا تھا جی آ بھائی کا غصہ کم کرنے کے لیے۔ جھنگ سے سدرہ انور علی، پیاری بہن آپ کی اسٹوری (میں کون ہوں) میں نے پڑھی تھی۔ میرے خیال میں اس شمارے کی سب سے بیسٹ اسٹوری تھی، بہن جی آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں آپ (حاجی انور علی لانگ) کی بیٹی تو نہیں ہیں پلیز ضرور بتانا، باقی آپ کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ ملتان سے مجید احمد جائی صاحب آپ کی اسٹوری بھی بہت زبردست تھی۔ کراچی سے عادل حسین آپ کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ چیچہ وطنی سے ہمارے بھائی عبدالغفار عابد بھائی جان کیسے ہو، آپ کی اسٹوری سب جائزہ ہے وری ویلڈن۔ کراچی سے میرے پیارے بھائی اشفاق شاہین، ڈاکٹر طارق محمود آ کاش میرے اتنے سارے دوست سچی کہانیاں میں ہیں لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میرے کسی بھی دوست نے مجھے سچی کہانیاں میں خوش آمدید نہیں کہا۔ میں ان تمام دوستوں سے بہت زیادہ ناراض ہوں اور کاشی بھائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں انہوں نے مجھے سچی کہانیاں میں خوش آمدید بھی کہا اور میرا احوال بھی شائع کیا۔ کاشی بھائی میری طرف سے آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے، اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں اللہ نگہبان۔

☆ پیارے مقصود! احوال میں مزہ نہیں آیا۔ یار کچھ مزے دار احوال قارئین ڈیمانڈ کررہے ہیں۔

✉ سرگودھا سے مون شاہ نے بڑے عرصے بعد ہمیں یاد کیا ہے، لکھتی ہیں اچھے بھائی کاشی چوہان السلام علیکم۔ امید ہے بخیر ہوں گے، اتنا زبردست پُراسرار نمبر دینے کے لیے بے حد شکریہ، عید مبارک سے لے کر فیض عشق تک سبھی کچھ پسند آیا، لیکن اس مرتبہ سب سے بہترین تحاریر ریاض حسین کی سفید آنکھیں محمد سلیم اختر کی خان زادہ، ملک صفدر عباس اعوان کی نادیدہ روح تھیں۔ سفید آنکھیں پڑھ کر تو ہم اپنی آنکھوں کا جائزہ لینے پر مجبور ہوگئے بہرحال آپ کی تحریر شامل نہ تھی۔ کمی محسوس ہوئی۔ احوال میں نئے لوگوں کی آمد خوش آئند بات ہے۔ لیکن پرانے ساتھیوں کو بھی آواز دیجیے نجانے ارم زہرہ، عارف شیخ روحیلہ وغیرہ کہاں کھو گئے؟ انکل عبدالعزیز آپ اپنا استعفیٰ واپس لیجیے، ہمیں نامنظور ہے۔ ممتاز احمد بھیا آپ کو عمرے کی سعادت حاصل ہوئی مبارک قبول کریں۔ کاشی بھائی ہم کوپن کاٹ کر رسالے کی

بس دعا چاہیے

پیارے ساتھیو! ہماری اور آپ کی ہر دل عزیز، رُخسانہ سہام مرزا اِن دنوں شدید علیل ہیں۔ قارئین سے اپیل ہے کہ ان کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔ اُمید ہے آپ کی دعائیں انہیں پھر سے زندگی کی جانب لوٹانے میں کامیاب ہوجائیں گی۔ جب تک وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوجاتیں پرل پبلی کیشنز یا اُس کے تحت شائع ہونے والے دوشیزہ ڈائجسٹ اور سچی کہانیاں سے اُن کا کوئی تعلق نہیں۔

خوب صورتی ختم کرنے کے حق میں نہیں، لہٰذا ہمارا خط یوں ہی قبول کریں، نیز میری تحریر''آئینہ خانے میں'' کو خدارا قریبی اشاعت میں جگہ دے دیجیے، اب تو آنکھیں پتھرا گئیں انتظار کرتے کرتے یہ نہ ہو کہ ریاض حسین صاحب کو ''پتھرائی آنکھیں'' عنوان پر کوئی تحریر لکھنا پڑ جائے۔ اللہ پاک سچی کہانیاں سے میرا تعلق یونہی قائم رکھے۔ (آمین)

☆ بہت اچھی بہن مون! خدا تم کو سلامت رکھے۔ جلد تمہاری تحریر اس شمارے کے صفحات کا حصہ بنے گی۔

✉ لاہور سے ہماری بہت شفیق اور محترم گڈی آپا نے احوال میں حاضری دی ہے۔ لکھتی ہیں محترم جناب ایڈیٹر کاشی چوہان صاحب السلام علیکم، امید ہے اللہ کی مہربانی سے بخیریت تمام ہوں گے۔ وہی عرض لیے حاضر ہوں۔ تقریباً جبرا صبر آزما انتظار کے بعد قلم اٹھا رہی ہوں ہاں البتہ فون پر تو کئی بار یاد دہانی کرواتی رہی۔ چلیں ایک بار پھر سہی ایڈیٹر ناصر صاحب کے اُصرار پر بامقصد تحریریں بھیجتی رہی جسے پڑھنے کے بعد وہ سراہتے بھی رہے۔ آپ کے دور میں تو...... صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا رسالہ اعزازی آج تک جاری نہیں ہوا، انعامی کہانیوں میں شامل ہونے کے لیے سچی کہانیاں کی ہی ہوکر رہ گئی۔ کئی بار عرض کیا کہ دوشیزہ کے لیے کوئی تحریر بھیج دیں حالاں کہ ایسی ہی ہزاروں کہانیاں افسانہ نگاری میں مختلف رسالوں میں چھپیں اور ایوارڈ بھی حاصل کیا۔ جب پوچھو تین ماہ بعد کی تاریخ دے دیتے ہیں۔ حالاں کہ میری کہانیاں ''خاص کہانی'' کے معیار پر بھی پوری اُترتی ہیں اور پہلے بھی چھپ چکی ہیں۔ امید ہے جواب ضرور ملے گا، آپ کی سچی کہانیاں کی پسندیدگی میں ہمارا بھی خاصہ ہاتھ ہے، جسے آپ مانتے بھی ہیں اور کوئی نئی تازی بات نہیں۔ ہمارے لکھنے کی رفتار بھی Slow آپ نے کردی ہے، ایک اور ناول لکھ رہی ہوں خدا کرے جلدی مکمل ہوجائے۔ ملکی حالات کی بدحالی پر بہت پریشان ہوں۔ خدا کے آگے التجا ہے کہ وہ ہمارے ملک کو سلامت رکھے اور ترقی کے راستے پر گامزن کرے، آمین۔ تمام قارئین اور معاونین کو گڈی آپا کا سلام اور دعائیں قبول ہوں۔

☆ پیاری آپا! آپ کا گلہ کرنا بالکل بنتا ہے، مگر ہم تو اپنی مجبوری بھی حوالۂ قلم نہیں کرسکتے۔ انشاء اللہ جلد آپ کی تحریر سب کی بصارتوں کا رزق بننے والی ہے۔



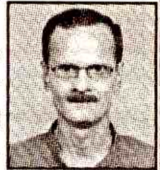
✉ ساحل ابڑو، ڈیرہ اللہ یار سے رقم طراز ہیں، جناب کاشی چوہان السلام علیکم ماہ ستمبر کا تازہ شمارہ سچی کہانیاں 30 مورخہ کو (ہاکر) ہاتھوں میں تھما کر چلا گیا، مگر ایک بے چینی سی کیفیت کا عالم چھوڑ گیا، جس کی وجہ تھی سچی کہانیاں کافی دیر سے آنا۔ تو یہاں بندہ کیا کرسکتا ہے۔ کیا کوئی ایک دن میں سچی کہانیاں کو مکمل پڑھ کر تبصرہ لکھ سکتا ہے؟ کبھی بھی نہیں اور اوپر سے کاشی کے گلے شکوے کہ ساحل تبصرہ 8 تاریخ تک آنا چاہیے۔ خیر یہ تو کاشی کی ادبی محبت ہے۔ جو ہر رائٹر کے ساتھ چلی آرہی ہے۔ تو کاشی میں یہاں چند باتیں ضرور شیئر کروں گا کہ سچی کہانیاں رہنما بھی ہے، رہبر بھی، یہ سچی کہانیاں ہمارے اچھے برے وقت کی ساتھی بھی ہیں اور رفیق بھی۔ باجی منزہ سہام جس کی دن رات کی محنت لگن سے یہ باغیچہ سرسبز ہے، ورنہ کئی عورتوں کی ڈائجسٹوں میں دیکھا جائے تو وہاں مرد رائٹر کا داخلہ ممنوع ہے۔ مگر دوشیزہ واحد ڈائجسٹ

ہے جہاں اچھے اچھے رائٹر دھڑا دھڑ لکھ رہے ہیں اور میں اس شخصیت کو بھی خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں جس کی محبت سے آج ہم سب رائٹر حضرات ایک پلیٹ فارم پر جمع ہیں، وہ عزت ماب نہ ہوتے تو شاید یہ گلشن کبھی بھی نہ کھلتا۔ یہ رائٹرز کی جڑیں کبھی نہ مضبوط ہوتی اور ان جڑوں کی شاخوں میں سے ایک ہیں کاشی چوہان، کاشی چوہان بہت ہی مختصر عرصہ میں دوشیزہ میں چھا گئے اور تمام روٹھے ہوئے رائٹرز کو یکجا کر کے سچی کہانیاں میں لکھنے کی دعوت دی، اسے کہتے ہیں محنت جو سچی کہانیاں۔ دوشیزہ کی پوری ٹیم دن رات کی محنت میں مگن ہیں اور اس کا پھل منزہ سہام خود اپنی آنکھوں سے دیکھتی آ رہی ہیں۔ اور ہاں کاشی آپ نے چند ماہ پہلے سچی کہانیاں کی سیل بڑھانے کے لیے لکھا تھا۔ تو برادر پہلے ڈیرہ اللہ یار میں صرف 5 کاپیاں آتی تھیں۔ اب اللہ کے فضل و کرم سے آپ کی محبت سے ایجنسی والا جیکب آباد جمالی ایجنسی والے سے 30 کاپیاں منگواتا ہے، میری کوشش جاری ہے کہ دوشیزہ کو بھی فعال بناؤں، انشاءاللہ۔ کاشی آپ کی بزم ادب میں ایک بار پھر چھوٹی سی کہانی (تشنہ لب) ارسال کر رہا ہوں۔

☆ بہت پیارے بھائی ساحل! آپ کی محبت ہماری سر آنکھوں پر، آپ کا خط آپ کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔



✉ پیر نوید شاہ ہاشمی نے ہمیں یاد کیا ہے ٹنڈو جام سے۔ عرض کرتے ہیں اپنے نئے محبوب ''سچی کہانیاں'' کا شمارہ اگست ذرا تاخیر کے ساتھ یعنی کہ 7 اگست کو ملا۔ احوال میں میرے تبصرے کو بچونگڑا بنایا لیکن عزت و احترام کے ساتھ شاملِ بزم کرنے پر مشکور ہوں۔ جمیل میتلو، سدرہ انور علی، منشی محمد عزیز، مجید احمد جائی، ممتاز احمد، صفدر علی حیدری کے احوال پیار، محبت، خلوص اور معیار کے لحاظ سے ہائی لائٹ رہے۔ ریحانہ نعیم نے قارئین کو اچھی جھاڑ پلائی جواباً انہیں عرض ہے کہ یہ سب محبت کا نشہ ہے کہ محبت میں محبوب کے عیوب دکھائی نہیں دیتے، قارئین سچی کہانیاں اگر تنقید نہیں کرتے تو ان کے ساتھ یہی معاملہ ہے اب اگر محبت کرنا جرم ہے تو قارئین خطاوار ہیں۔ عبدالعزیز جی آ، ماشاءاللہ جس قدر ''جی آ'' الجھاتا ہے اس قدر ہی موصوف کے احوال نے الجھایا۔ نہ جانے کس بات پر وہ طاہر القادری کی طرح جلے بھنے بیٹھے تھے، بات سمجھ سے بالاتر ہے لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ سینئرز کا ایسا طرزِ عمل مناسب نہیں، زندگی بہت ہی مختصر ہے، اسے ان لٹیروں میں ضائع کرنا کہاں کی دانش مندی ہے، یہی بات ہم نے پچھلے دنوں اپنے حیدر آبادی دوست ادیب سمیع چمن کو بھی کہی تھی۔ سدرہ انور علی کی نئی تصویر بلاشبہ خوب ہے، ہم بھی یہی کہیں گے بقول آپ کے چشم بد دور! مسز نوید ہاشمی کی خدمت میں عرض ہے کہ اب ہم بھی پرچے میں آ چکے ہیں، ناموں کی مماثلت سے مغالطہ ممکن ہے لہٰذا اپنے نام میں ذرا ترمیم کر دیں تو مناسب رہے گا، ممتاز احمد نے بجا فرمایا کہ کوپن کا طریقہ مناسب نہیں۔ علم کو پابند سلاسل مت کریں جو قارئین معاشی مسائل کے باعث پرچہ ادھر اُدھر سے مانگ کے پڑھتے ہیں ذرا ان کے متعلق بھی سوچیے! آپ قارئین کے تبصروں سے انعامی کہانیوں کا انتخاب کر سکتے ہیں باقی مرضی ہے جی آپ کی۔ اس پراسرار نمبر میں پسندیدگی کے لحاظ سے نادیدہ روح اول، عشق ہوش رُبا دوئم اور سفید آنکھیں سوئم رہیں۔ لاجواب معیاری کہانیاں تھیں۔ فیض عشق کی قسط نمبر 2، خان زادہ، پراسرار حویلی، انار کا درخت اور پہلے سوچ لیتے بھی اس شمارے کی متاثر کن کہانیاں کہہ سکتے ہیں جبکہ راج زنکی، آسیب اور ناجاں وغیرہ بھی ٹھیک رہیں۔ ایم اے راحت ہمارے بھی فیورٹ ادیب ہیں انہیں پڑھ پڑھ کے ہم بڑے ہوئے ہیں ان کی نئی سلسلہ وار کہانی ''ہم شکل'' کا شدت سے انتظار ہے۔ سخن آباد میں اس بار شازیہ گل، مور شاہد حسین، عمران فائق، بشریٰ سعید، حافظ مون شاہ کے کلام نے ٹوٹے دل کو رُلا کے رکھ دیا بلکہ ہلا کے رکھ دیا۔



☆ بھائی نوید شاہ! تفصیلی احوال کا شکریہ۔ آپ کی کہانی فی الحال زیرِ غور ہے۔

✉ فرید عالم، کریم آباد کراچی سے شاملِ احوال ہیں، لکھتے ہیں سچی کہانیاں کے چمکتے دمکتے ستاروں آپ سب کو گرما گرم تازہ تازہ میرا سلام۔ دھوم مچی ہے سچی کہانیاں کی اور یہ سب خلوص

سانحۂ ارتحال

روزنامہ ''ڈان'' کے روح رواں حمید ہارون کی والدہ پروین سعید ہارون گزشتہ ماہ رضائے الٰہی سے انتقال فرما گئیں، ادارہ پرل پبلی کیشنز ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ ان کے حق میں دعائے خیر کریں اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند فرمائے۔

محبت، محنت انکساری اور شفقت بھرے دلوں پر راج کرنے والے کاشی اور دانیال بمع اسٹاف کے جذبوں کا کمال ہے ان ساتھیوں کی کاوشوں سے آج ہم سچی کہانیاں کی پہچان بن گئے۔ اچھی اور سچی کہانیاں وہی اچھی ہوتی ہیں جو دل پر نقش ہو جائیں اور یہ پہچان ہمارے ساتھی ہیں۔ کہانیوں میں سلیم اختر، بشریٰ سعید احمد، عظیم الدین انصاری، نزہت جبین ضیاء، عارف رمضان، مقصود احمد بلوچ، شاہدہ شکیل، فاطمہ بتول، نصرت سرفراز، عبدالغفار عابد، ارشد علی ارشد، فوزیہ جاوید، شعبان کھوسہ اور سلیم فاروقی صاحب کی آتشِ جنوں بہت زبردست ہے۔ نور محمد، عذرا فردوس، ادیب سمیع چمن، ریحانہ نسیم، دستگیر شہزاد، امجد جاوید کی کہانیوں سے دل شاد ہوا۔ احوال میں، اسامہ ندیم، حاذق ندیم آپ بہت اچھے تبصرے لکھ رہے ہیں شاباش، آپ کے تبصروں میں جن لوگوں نے ہمارا نام سجایا ان کو سلام مبارک ہو اور باقی ساتھیو نے احوال میں ہمیں ایسے غائب کیا جیسے بریانی سے چکن؟ تمام نئے اور پرانے ساتھیو آپ کی شان سچی کہانیاں ہے ناچو گاؤ دھوم مچادو کاشی بھیا آپ چوپال جیسا نیا سلسلہ شروع کردیں تو مہربانی ہوگی۔

☆ اچھے بھائی! آپ کی آمد ہمارا سیروں خون بڑھا دیتی ہے۔ سب کچھ پہلا جیسا کب رہتا ہے؟

✉ اشفاق شاہین کراچی سے احوال میں شامل ہیں، لکھتے ہیں کاشی بھائی السلام علیکم! خوب صورت سرورق سے مزین ستمبر کا شمارہ ہمیں 29 تاریخ کو ملا۔ شکر ہے کہ یہ ٹائٹل پر اسرار نہیں تھا اور ایک درخواست بھی ہے کہ بھلے نمبر پر اسرار نمبر ہو، خدارا سرورق کو بھیانک اور خوف ناک نہ بنائیں۔ منزہ سہام کا ''دھرنا ہوگا'' ہماری سیاست کا نیا اور افسوس ناک باب ہے۔ کاشی کی ''کچھ اپنی باتیں'' ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھیں، کاش کہ ہم کچھ سبق حاصل کریں۔ پھر پہنچے اپنی پسندیدہ محفل احوال میں۔ سدرہ انور پہلے ہی صفحہ پر نمایاں تھیں، پریشان نہ ہوں سدرہ، آپ کے انکل ادھر ہی ہیں! تحسین جونیجو حوصلہ مت ہارو، تبصرہ کرو، نہیں کٹے گا۔ کتنا کاٹیں گے اگر کاٹیں تو ہم آپ کے ساتھ ہوں گے دھرنا دینے کو۔ مبارک شمسی جی آیا نوں، آتے رہیے گا۔ یوسف لغاری بھی نیو کمر ہیں تہہ دل سے خوش آمدید، نصرت سرفراز صاحبہ تفصیلی خط کے ساتھ موجود تھیں۔ مریم بخاری اللہ آپ کو ہمت و حوصلہ عطا فرمائے اور مرحومین کو جنت میں جگہ دے۔ مسز نوید ہاشمی، عبدالغفار عابد، حنا بشریٰ، ظفر ابڑو، مور شاہد، غلام رسول، ملک عاشق ساجد، ممتاز احمد، عظمیٰ شکور، مجید جائی، عزیز مئے نمایاں خطوط کے ساتھ محفل کی رونق ٹھہرے۔ رانا شاہد بیٹے کی مبارکباد، کنول عمران سالگرہ مبارک، حاذق ندیم موسٹ ویلکم، غلام حسین آپ کے دوست کے لیے دعائے مغفرت۔ آتے ہیں تبصرے کی طرف ''دور کے ڈھول'' سلیم اختر نے کیا خوب لکھا۔ ''دُکھ دہلیز کے'' نے ہمیں بھی دُکھی کردیا۔ گلابی دوپٹہ بہترین سچ بیانی لکھی بشریٰ نے، گڈ۔ زندگی کا معیار اور فیصلے دل کے بھی اچھی سچ بیانیاں تھیں۔ ''انوکھا رشتہ'' ہمارے لیے ایک سبق ہے۔ مقصود بلوچ نے ''کشف'' کو خوب صورت الفاظ سے مزین کیا۔ بہت خوب۔ گلدستہ اور عادت کی بھینٹ میں سبق آموز سچ بیانیاں تھیں۔ ''ناکردہ گناہ'' میں نصرت سرفراز نے ہمیں بھی ملول کردیا، بہت اچھا لکھا۔ محبت کی کسک، عبدالغفار عابد بہت خوب دوست پردیسی کہانیوں میں سب سے خوب صورت فوزیہ جاوید کی ''کیوں یہ کھیل کھیلا'' رہی۔ تین مرد تین

کہانیاں تینوں ہی ٹھیک رہیں۔ روشنی کے مینار، جیجل میتلو کی نئی قبراچھی تھی۔ ''قسمت کی دستک'' امجد جاوید فیض عشق میں خوب جارہے ہیں، سخن آباد میں تمثیلہ لطیف، شائستہ جمال اور اقصیٰ نگین نے بہت خوب صورت شاعری کی اور ماہ ستمبر کے شمارے کی سب سے خاص بات معراج عالم کی ''ننگا لگاؤ مسلمانو'' ٹھہری۔ ایک نیا ہی اور جدید انداز اپنا کے نئی نسل کے نوجوانوں کو گمراہ کیا جارہا ہے اور یہ ہی ہماری پستی کی نشانیاں ہیں۔ بہت لکھ لیا، ایک شعر کے ساتھ اجازت چاہتے ہیں۔ سب کے لیے نیک دعائیں۔

اب اس کے بعد کوئی رابطہ نہیں رکھنا یہ بات طے ہوئی، لیکن سوال درد کا ہے

☆ اشفاق بھائی! آپ کو باقاعدہ کہلوانے کی ضرورت کب سے پیش آ گئی۔ کبھی کبھی بے قاعدہ لوگ بھی عزیز از جان ہوتے ہیں۔



✉ سدرہ انور علی، جھنگ صدر سے شامل احوال ہیں، لکھتی ہیں محترم کاشی چوہان بھیا و دیگر اسٹاف، اینڈ گرلز اینڈ لیڈیز اینڈ جینٹل مین۔ اولڈز اینڈ ینگ مین السلام وعلیکم! میری طرف سے دوشیزہ رائٹر ایوارڈ بہت مبارک ہو۔ سچی کہانیاں ستمبر کا شمارہ کچھ لیٹ ملا۔ ٹائٹل اچھا نہیں لگا مگر نیچے ناگن کا ٹائٹل اچھا لگا۔ منزہ آنٹی کا اداریہ، دھرنا ہوگا پسند آیا۔ احوال میں تمام خطوط پسند آئے لیکن تحسین جونیجو، اشفاق شاہین، ممتاز احمد بھیا، محمد عزیز بھیا کے خطوط بہت زیادہ اچھے لگے۔ سید مبارک علی شمسی، یوسف لغاری، نازیہ جہانگیر کو احوال میں خوش آمدید۔ ملکہ احوال تحسین جونیجو آئی ایم سوری۔ میں نے بہت توقع وابستہ کر لی تھی آپ سے میں نے سوچا تھا کبھی کبھی خلوص خون سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ مگر میں غلط تھی، زرینہ آپی کو سلام کہیے گا۔ فیصل ندیم السلام وعلیکم ہماری عید اچھی گزری، فیصل جی مجھے ایسی شہرت نہیں چاہیے جس میں وہ کچھ کرنا پڑتا ہے جو انسان کو اپنی ہی نظروں میں گرا دیتا ہے۔ مریم شاہ بخاری میں جانتی ہوں کہ آپ بہت کربناک، اذیت ناک مراحل سے گزر کر آئی ہیں میرے پاس ایسے الفاظ نہیں جس سے آپ کے دکھوں کا مداوا کرسکوں، ڈیئر فریدہ فری وعلیکم السلام خوش رہو۔ اشفاق شاہین، کنول عمران، عظمیٰ شکور، حنا بشریٰ یہ سب تو آپ کی تحسین نظر ہے۔ ورنہ میں کیا؟ محمد اسماعیل بروہی سلام بھیا میں ہمیشہ آپ کا نام لکھوں گی آپ مستقل آیئے تو سہی۔ شائستہ جمال، مسز نوید ہاشمی، ثمینہ ناز آپی، حنا بشریٰ محمد عزیز بھیا، رانا بھیا، شفقت حسین، غلام رسول گل سلام۔ کیسے ہیں آپ سب؟ منشی محمد عزیز بھیا آپ بھی نا بس چلیں یہ عرف صرف آپ کے لیے ہے۔ دور کے ڈھول انکل سلیم اختر کی تحریر وہ کہتے ہیں نہ کہ باہر کی روشنیاں دیکھ کر اندر کے اندھیرے پر دل نہیں جلانا چاہیے۔ دہلیز کے دکھ پسند آئی۔ بشریٰ سعید احمد کی گلابی دوپٹہ، عظیم الدین کی زندگی کا معیار، فیصلے دل کے نزہت جبیں ضیاء کی، فاطمہ بتول کی عادت کی بھینٹ، نصرت سرفراز کی ناکردہ گناہ بہت پسند آئیں۔ ارشد علی ارشد کی مکھنی اچھی جارہی ہے اور ناگن تو بہت لاجواب ہے۔ مگر آتش جنوں کا اینڈ اس قدر جلدی؟ کچھ سمجھ نہیں آئی فوزیہ جاوید کی کیوں یہ کھیل کھیلا اور تینوں مرد کہانیاں پسند آئیں۔ ایس امتیاز کی نئی قبر بھی ٹھیک تھی۔ سخن آباد میں ثمینہ ناز، کشمالہ تاثیر، شائستہ جمال، ایم جے قریشی اور عزیز انکل کی شاعری پسند آئی۔ یہ شعر سب کے لیے

محبت کرنے والوں کے ساتھ اگر طاہر القادری ہوتے غضب کا دھرنا دیتے' ہم تجھے پانے کے لیے

اب تک کے لیے اتنا ہی ملتے ہیں اگلے ماہ تب تک کے لیے اللہ نگہبان

☆ پیاری سدرہ! تمہاری محبت سب کے لیے ہے تو ہم سب بھی تم سے بہت پیار کرتے ہیں، اللہ عمر دراز کرے۔

✉ محمد اسماعیل بروہی، نواب شاہ سے لکھتے ہیں۔ کاشی بھیا سدا خوش رہو۔ ستمبر کا شمارہ ہاتھ میں ہے، اس بار ماڈل بہترین اسٹائل کے ساتھ جلوہ گر تھیں، منزہ آپا کا اداریہ پڑھ کر اب کیا لکھوں۔ کاشی کی باتیں دکھی کر گئیں۔ اوہو احوال

کی محفل سج رہی ہے، سدرہ انور علی آپ کا خط پسند آیا۔ جناب سچی کہانیاں ہمیں پسند ہیں اور تعریف تو ہم کریں گے، تحسین جونیجو اور مجید جائی سے میری کٹی، محمد یوسف لغاری کو ویلکم کہتے ہیں۔ سوئیٹ اور ڈیئر مور شاہد حسین کیسے ہو۔ گلاب جیسے امجد علی سدا خوش رہو۔ غلام رسول گل آپ کے خط میں صرف میرا نام نہ تھا۔ کیوں؟ کنول عمران، بیٹی اور آپ کو سالگرہ مبارک ہو، اب کہانیوں کی طرف آتے ہیں...... دور کے ڈھول سہانے اچھی کہانی تھی، پڑھ کر مزا آیا دُکھ دہلیز کے، جاوید راہی نے عمدہ کہانی لکھی۔ گلابی دوپٹا، زندہ کا معیار اور فیصلے دل کے بھی اچھی تھیں۔ رائٹرز نے خوب محنت سے لکھا۔ کشف، گلدستہ اور عادت کی بھینٹ بھی پسند آئیں، نصرت سرفراز نے ناکردہ گناہ کے نام سے کہانی پڑھنے کو دی پسند آئی۔ جیجل میتلو کی روشنی کے مینار اچھی کاوش تھی۔ چاروں سلسلے وار کہانیاں بھی بہترین جا رہی ہیں۔ کاشی بھائی اک کہانی بھیج رہا ہوں، بہت محنت سے لکھی ہے، پلیز شامل کیجیے بڑے چاہ اور امید سے بھیج رہا ہوں، پلیز مان رکھیے گا۔ جلد شامل کیجیے گا، آخر میں انکل عزیز جی آپ سے اک بار پھر درخواست کہ پلیز آ جاؤ۔ چلتے چلتے عمران فائق، اشفاق شاہین، مریم شاہ، عظمیٰ شکور، شفقت حسین، رضوان قیوم، حنا بشریٰ اور سید محمود حسن کو سلام۔

☆ پیارے اسماعیل! سلامت رہو! تبصرہ بہتر ہے کہانی پڑھ کر جلد مطلع کریں گے۔

✉ نسیم سحر، گلشن اقبال کراچی سے احوال میں رقم طراز ہیں، کاشی بھائی السلام علیکم۔ بقرعید کے حوالے سے کہانی پیش خدمت ہے، اگر آپ نے ستمبر کا شمارہ عید کے حوالے سے نکال دیا تو اکتوبر کا شمارہ بھی بقرعید کا نکال دیں پلیز پلیز پلیز، مجھے امید ہے کہ آپ کو پسند آئے گی، نام سمجھ میں نہیں آیا، آپ ہی اچھا سا رکھ دیجیے گا۔ بہت ساری ذمہ داریوں میں سے میں نے بھی ایک ڈال دی (نام تجویز کرنے کی) امید ہے برا نہیں مانیں گے۔

☆ پیاری بہن نسیم سحر! بہت شکریہ کہ ایک مختصر نامہ آیا تو سہی! کہانی کے لیے کوشش، وعدہ نہیں۔

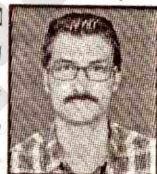


✉ احوال میں یہ آمد ہے ایم اشفاق بٹ کی لالہ موسیٰ سے۔ لکھتے ہیں ستمبر کا شمارہ 30 اگست کو ملا سرورق پر بہت گوری چٹی مٹیار بڑے دلفریب انداز میں دیکھ رہی تھی۔ بالوں کا اسٹائل بھی زبردست تھا۔ اور یار اب تو اس ناگن عورت کی جان چھوڑ دیں۔ اتنی خوبصورت لڑکی کی تصویر کے ساتھ ناگن عورت کی تصویر اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ منزہ سہام کا دھرنا ہوگا۔ پتا نہیں ہمارے ملک کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔ آزادی، انقلاب، استعفیٰ، پتا نہیں کس کی جیت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ہمارے ملک پاکستان کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔ کاشی بھائی کچھ اپنی باتیں میں بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ احوال میں سب سے پہلی شرکت نبیلہ شاہین کھاریاں کی تھی اس کے بعد سدرہ انور علی بڑے لمبے چوڑے احوال کے ساتھ نظر آئیں سدرہ جی ایک بات بتائیں آپ اتنی جلدی پورا پرچہ پڑھ کر اس پر احوال کس طرح لکھ لیتی ہیں کوئی آسان سا نسخہ مجھے بھی بتا دیں۔ بہت ہی اچھا تبصرہ ہوتا ہے آپ کا۔ احوال میں جن دوستوں نے مجھ ناچیز کو یاد کیا وہ ہیں، عمران فائق، اشفاق شاہین، عبدالغفار عابد، ظفر علی ابڑو، مور شاہد حسین، غلام رسول گل، ثمینہ عبدالقیوم، مجید احمد جائی، ان سب کا بہت شکریہ ملک عاشق حسین ساجد اور فریدہ فری آپ تو ہمیں بالکل ہی بھول گئے ہیں۔ سچ بیانیوں میں محمد سلیم اختر کی دور کے ڈھول شاندار رہی۔ گریٹ ہیں آپ! اس کے بعد جاوید راہی کی دکھ دہلیز کے، بشریٰ سعید کی گلابی دوپٹا سسپنس سے بھرپور کہانی تھی۔ عظیم الدین انصاری کی زندگی کا معیار، نزہت جبیں ضیا کی فیصلے دل کے، دوشیزہ رائٹر کی ایوارڈ تقریب 2014ء کی جھلکیاں دیکھیں ایوارڈ وصول کرنے والوں کی یادگار تصویریں دیکھی سب کو بہت بہت مبارکباد قبول ہو۔ عارف رمضان کی انوکھا رشتہ بھی بہت اچھی تھی۔ میرے فیورٹ رائٹر مقصود احمد بلوچ کی سچ بیانی کشف لوگ واقعی اپنی سچی محبت میں جان تک دے دیتے ہیں۔ اس کے بعد شاہدہ شکیل کی گل دستہ، فاطمہ بتول کی عادت کی بھینٹ، نصرت سرفراز کی ناکردہ گناہ بھی زبردست رہیں۔ عبدالغفار عابد کی محبت کی کسک، ملک عاشق حسین ساجد کی گونگی ماں اچھی تحریر تھی۔ فوزیہ جاوید کی کیوں یہ کھیل کھیلا نے بھی خوب تاثر چھوڑا۔ پردیس سے تیسری کہانی

شعبان کھوسہ کی کانٹوں کی زمین بھی اچھی لگی۔ تین مرد تین کہانیوں میں نور محمد کی تمہاری یاد میں، عذرا فردوس کی انسانیت کی ہار اور تیسری مرد کہانی ادیب سمیع چمن کی قلمی دوستی، ان سب کے نام اہم پیغام ہے جو قلمی دوستی کو سب کچھ ماننا شروع کر دیتے ہیں پلیز قلمی دوستوں کو خط یا موبائل تک ہی رکھیں۔ جس طرح ادیب بھائی نے قلمی دوستی میں اختر عباس کے بارے میں بتایا بالکل اسی طرح ایک دفعہ میرے ساتھ بھی ہوا تھا کراچی سے خرم وقار سید آیا اور مجھ سے پیسے فراڈ کر کے لے گیا جو کہ ابھی تک نہیں ملے۔ شعلہ ساماں تحریروں میں پہلا شعلہ جیجل میتلو کا روشنی کے مینار، ایس امتیاز کا دوسرا شعلہ نئی قبر حیران کن تحریر تھی۔ ریحانہ نسیم کی قسمت کی دستک، خزانے سے بھری بھرپور دستک تھی۔ دستگیر شہزاد کی تحریر ماں کی قبر زبردست تھی۔

مسئلہ یہ ہے میں خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے بہت مفید عمل بتا رہے تھے بابا جی۔ سخن آباد میں ہر دفعہ میری غزل ردی کی ٹوکری کھا جاتی ہے بھوکی کہیں کی۔ باقی عادل حسین، تمثیلہ لطیف، شائستہ جمال، ثمینہ ناز، فرح علی، سدرہ انور علی، کشمالہ احمد، کنول ناز، شائستہ نور، اقصیٰ نگین، ان کی غزلیں اچھی تھیں۔ باقی اب اجازت دیں سب کو میرا سلام قبول ہو۔

☆ بہت عزیز اشفاق بٹ! انشاء اللہ اگلے ماہ آپ کا تبصرہ عروج پر ہوگا اور اگلے ماہ سخن آباد میں بھی آپ کی نظم اول نمبر پر لگے گی۔



✉ ہمارے لکھاری اور شاعر دوست عادل حسین کراچی سے رقم طراز ہیں۔ ستمبر کا سچی کہانیاں اپنی روایتی آب و تاب سے جلوہ گر ہوا۔ میری غزل کی اشاعت پر شکریہ، آپ کا اداریہ سچ کا عکاس، اور کاشی بھائی آپ کی باتیں تو ہوتی ہی ہر دل کی باتیں ہیں۔ احوال میں شامل ہوئے تو دل کو بہت سکون ملا۔ سب ساتھیوں کو ڈھیروں سلام اور دعائیں۔ آتشِ جنون کا اختتام خوب رہا۔ سلیم فاروقی صاحب کو مبارک۔ مکھنی اور ناگن بھی خوبصورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ دُور کے ڈھول محمد سلیم اختر صاحب کی خوبصورت سچ بیانی تھی۔ جاوید راہی صاحب کی دکھ دہلیز کے بھی' بشریٰ سعید احمد کی گلابی دوپٹا' محبت کی کسک جیسی اچھی کہانیاں سچی بیانیوں میں مزہ دے گئیں اور کانٹوں کی زمین شمالی علاقاجات کی بھیانک حقیقتوں کو واضح کرتی ہوئی ایک تحریر۔ اللہ اُن لوگوں کو عقلِ سلیم عطا فرمائے جبکہ تمہاری یاد میں، انسانیت کی ہار عذرا فردوس صاحبہ کی ایک خوبصورت تحریر، پیٹ کی آگ انسان کو کہاں تک لے جاتی ہے۔ آج کی دہشت گردی کی بڑی وجہ بے روزگاری بھی ہے۔ اللہ حکمرانوں کو ہدایت دے ادیب سمیع چمن صاحب کی قلمی دوستی بھی خوب تھی۔ روشنی کے مینار جیجل میتلو جی کی خوبصورت تحریر جو کشمیری مجاہدین کی بہادری کا اعتراف تھی۔ ایس امتیاز احمد صاحب کی کہانی نئی قبر اک عجیب قسم کی کہانی تھی۔ قسمت کی دستک ریحانہ نسیم جی کی' ماں کی قبر' فیضِ عشق ابھی باقی ہے۔ یہاں تک خوب ہے۔ مسئلہ یہ ہے سے لوگ بہت فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔ سخن آباد اس بار پہلے سے مزید بہتر تھا۔ عبدالعزیز جی آ، تمثیلہ لطیف، فرح علی، کنول ناز، عائشہ نور عاشا اور نصرت سرفراز صاحبہ کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ خط اس بار طویل ہو گیا ہے۔ اب اجازت دیجیے۔

☆ عادل! مجبوری تھی، قینچی بہت چل گئی۔ تبصرہ شاندار رہا۔



✉ عبدالعزیز جی آ چکوال سے عرض گزار ہیں۔ اچھے کاشی آداب میرے عزیز ساتھیو اور پیارے پیارے بچو! ستمبر کے شمارے میں جس طرح آپ لوگوں نے میرا استعفیٰ ریجیکٹ کر کے اپنے دلی جذبات و احساسات کا خوبصورت اظہار کیا ہے۔ بہت مشکور و ممنون ہوں۔ احوال میں شامل تمام خطوط دل کی آنکھ سے پڑھے ہر جملے اور ہر سطر میں سے آپ لوگوں کی محبت، پیار اور خلوص جھلک رہا تھا۔ جیسے جیسے خطوط پڑھتا گیا۔ یوں لگا محبتوں کا قرض بڑھتا چلا گیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ لوگ میرے قلم کی آہ و بکا سے اتنا پیار کرتے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ ان محبتوں کے قرض کو

فرض سمجھ کر کچھ عرصہ کے لیے قلم کی مزدوری جاری رکھوں۔ آخر میں اپنے اُن کرم فرماؤں کا بہت شکریہ جنہوں نے میری غزل پسند کی۔ اپنے ایک شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

خلافِ شرع کوئی کام کرومت ☆ حق بات کہنے سے ڈرومت

ہوسکے تو خوشیوں کے پھول بانٹو ☆ اپنا دامن کانٹوں سے بھرومت

☆ جی آ بھائی! تحریر کب آ رہی ہے۔ پورا سال اس طرح کرومت۔



✉ کراچی سے ہماری بہت عمدہ لکھاری اور قاری مسز نوید ہاشمی لکھتی ہیں۔ دوستوں اور ساتھیو، السلام وعلیکم! ستمبر کے پرچے میں گیارہ سچ بیانیاں تھیں۔ دور کے ڈھول، دکھ دہلیز کے، گلابی دوپٹا، زندگی کا معیار، انوکھا رشتہ، گل دستہ، دل کو چھوگئیں۔ انوکھا رشتہ، کشف، گل دستہ، ناکردہ گناہ، محبت کی کسک، کیوں یہ کھیل کھیلا، کانٹوں کی زمین بہت شاہکار تحریریں تھیں۔ اب آتے ہیں تین مرد تین کہانیاں کی طرف تمہاری یاد میں، انسانیت کی ہار، فلمی دوستی بھی کمال تحریریں لگیں۔ تین شعلہ ساماں تحریریں بھی شاندار رہیں۔ روشنی کے مینار، نئی قبر، قسمت کی دستک بے حد اچھی لگیں۔ ڈیئر ریحانہ نعیم پیار کرنے کا انداز سب کا الگ الگ ہوتا ہے میرا الگ، آپ کا الگ، سب کا الگ، پیار کو پیار ہی سمجھنا چاہیے اچھا سوچو اچھا بولو۔ اچھا کہو تو سب اچھا ہی ہوگا۔ کوئی بات بُری لگے تو معافی چاہتی ہوں۔ ماں کی قبر دستگیر شہزاد کی تحریر بھی اچھی تھی۔ سخن آباد میں عادل حسین، تمثیلہ لطیف، کشمالہ احمد، ایم قریشی، کنول ناز، عنبرین نعیم کی شاعری پسند آئی۔ منزہ سہام کی تحریر ہم سب کے دل کی آواز تھی۔ کاشی چوہان کی تحریر واقعی کتنے گتے مرگئے جو انسان سے اچھے تھے۔ میرے پیارے دوستوں ساتھیو میری کہانی انار کا درخت پسند کرنے پر میں شکر گزار ہوں۔ سدرہ انور علی آپ خود پیاری سی ہیں اور پیارے کو ہر چیز پیاری نظر آتی ہے۔ محمد اسماعیل بروہی، عبدالغفار عابد، ظفر علی، عبدالغفار ثاقب، حنا بشریٰ، مور شاہد حسین، غلام رسول گل، امجد علی، محمد رضوان قیوم، ممتاز احمد جاذق ندیم، کنول عمران خان، فیصل ندیم بھٹی، عظمیٰ شکور، منشی محمد عزیز میمن، اسامہ ندیم نے حوصلہ افزائی کی شکریہ۔ کنول عمران خان آپ کی تنقید بھی مجھے پسند آئی اگر تنقید نہیں ہوگی تو ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ ہماری تحریر میں کیا کمی ہے شکریہ۔ غلام حسین بیٹا آپ کے غم میں ہم سب شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ مجید احمد جائی آپ بات کو دبانے کے بجائے بات بڑھاتے نظر آئے۔ (سدرہ انور علی اور ریحانہ نعیم کی بات کررہی ہیں) اُمید ہے میرا بھائی میری بات کا بُرا نہیں منائے گا۔ یہاں سب اپنے ہیں احوال ہمارا گھر ہے گھر میں شانتی سب کو اچھی لگتی ہے۔

☆ آپ کا تبصرہ اچھا لگا۔ اب آپ کا قلم بہتر سے بہترین کی جانب مائل ہے۔

✉ احوال میں یہ آمد ہے ملکہ احوال تحسین جونیجو کی خیر پور ناتھن شاہ بورڑی شریف سے۔ لکھتی ہیں اداریہ ہمیشہ ایک خوبصورت پیغام دے جاتا ہے۔ کچھ باتیں اپنی کاشی بھائی کی من کو بھلی لگتی ہیں۔ پیاری یاریں، سبق آموز...... بھیا ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ آپ اور قارئین نے مجھے ملکہ احوال کے لقب سے نوازا، جو کہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں، مگر گزشتہ دو تین ماہ سے آپ نے لکھنا مسترد کردیا کیوں؟ اسی حوالے سے گزشتہ ماہ ایک خاتون ریحانہ نعیم صاحبہ نے اپنے خیالات ونظریات پیش کیے، تو میں بھی کچھ عرض کرنا چاہوں گی کہ صرف خاموش قاری، یا تنقید کرنا کوئی بڑی بات نہیں جی اصل بات خلوص، جان پہچان اور جذبات ہیں۔ ہمیں جھوٹی شان اور تصویر شائع کرواکے شو کرنے سے کوئی سروکار نہیں۔ محترمہ جی صرف کہانی پر رائے دینے کے لیے احوال نہیں بنایا گیا، احوال کا مقصد ایک دوسرے کا احوال سننا سنانا بھی ہے۔ آپ کو یہ سب پسند نہیں پتا تو نا بات کریں۔ یہ ہمارا اپنا پرچہ ہے اور ثبوت ہماری کئی برس کی وابستگی ہے۔ ہم خوب واقف ہیں کہ کیا کرنا ہے کیا نہیں اور کیسے کرنا ہے، الحمدللہ عقل سے فارغ نہیں ہیں۔ خوش رہیے اپنی خوشی میں، اسماعیل بروہی بھائی وعلیکم السلام، خوش رہیے۔ اشفاق شاہین بھائی، انشاء اللہ عزوجل دعاؤں کا ساتھ سلامت رہے گا۔

خوش رہیے۔ مور شاہد حسین بھائی، دادی اماں کی داستان طویل ہے، پھر کبھی سہی یہاں ویسی ہی جنگ ہو رہی ہے، ملکہ، شہزادہ، شہزادی وغیرہ اب آپ بھی...... ظفر علی ابڑو صاحب، غلام رسول گل، شفقت حسین خوش رہیے۔ کہانی صرف ایک ہی پڑھ پائی ہوں کہ شمارہ اب کی بار لیٹ ملا۔ (کانٹوں کی زمین) شعبان کھوسہ بھائی کی۔ یہ زمین ہمارے معاشرے کا کڑوا سچ ہے، بلاشبہ حقیقی کردار پر ایک بھرپور سبق آموز، غم زدہ تحریر رہی کہ تنقید کی کوئی گنجائش باقی نہیں، ویلڈن بھائی۔ سخن آباد میں عمدہ کلام پیش کرنے والوں کے نام غزل، عزیز جی آ انکل، شائستہ جہاں، ثمینہ ناز، ساحل ابڑو، سدرہ انور، کشمالہ احمد اور عمران فائق خوبصورت کلام لے کر آئے۔ باقی شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ اللہ حافظ۔

☆ لیجیے ملکۂ عالیہ! اب خوش ہو جائیں۔ یہ احوال واقعی آپ سب کا ہے۔



✉ ہماری قاری اور لکھاری دوست عظمیٰ شکور، سرگودھا سے شاملِ احوال ہیں۔ لکھتی ہیں ستمبر کی ہولے ہولے چلتی ہواؤں نے ''سچی کہانیاں'' دامن میں لا پھینکا۔ دل خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ سرورق پر زندگی کے تمام رنگوں سے مزین ماڈل خوب لگی۔ اشتہارات کی بھرمار کے بعد منزہ سہام کو پریشان دیکھا پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے، کچھ اپنی باتیں پڑھنا شروع کیا تو آنکھیں بہہ گئیں ارے بھئی آنسوؤں سے نہیں لکھائی اتنی باریک تھی کہ آنکھیں سہہ نہ پائیں۔ (عظمیٰ جی! ہم ''نظر'' کا **Test** بھی تو لیتے ہیں) آنکھیں پونچھیں اور احوال کی طرف بڑھے۔ واہ جی واہ اپنوں کی محفل سجی تھی۔ ہر کوئی بڑھ کر اپنی محبت کا اظہار کر رہا تھا سچی کہانیوں سے۔ بہت سے خطوط میں ہمارا ذکر خیر بھی تھا خود پر پیار آ گیا۔ میرا خیال ہے اب ہمیں کہانیوں کے دیس میں چلنا چاہیے جہاں بہت سی کہانیاں محوِ انتظار ہیں کہ انہیں بغور پڑھ لیا جائے۔ ملک عاشق حسین صاحب کی 'گونگی ماں' نور محمد کی لکھی تحریر تمہاری یاد میں' محبت کی کسک عبدالغفار عابد صاحب کی گل دستہ شاہدہ شکیل کے قلم سے ماں کی قبر دستگیر شہزاد کی کشف مقصود احمد بلوچ بے حد پسند آئیں۔ سب ساتھیوں کو سلام و دعا اور سردی کے شروع دن مبارک۔

☆ عظمیٰ شکور صاحبہ! تبصرہ مختصر مگر شاندار رہا۔



✉ جہانیاں سے ملک صفدر عباس اعوان عرض کرتے ہیں پیارے کاشی بھائی السلام علیکم! ہیلو ایوری بڈی، ہاؤ آر یو فرینڈز، آئی ہوپ یو ول بی فائن، جی جناب، زندگی کے مسائل سے اجازت لے کر اور مصروفیات کو شکست دے کر ایک بار پھر آن دھمکے ہیں۔ بہت خوب صورت ہوتے ہیں وہ لمحے جب میں سچی کہانیوں سے ملنے کی فرصت پالیتا ہوں اور آنکھیں اس کا دیدار کرتی ہیں۔ پھر سچی کہانیوں سے میری چاہت کوئی ڈھکی چھپی تو نہیں۔ مگر اس نے اس بار پھر بے وفائی کی اور کافی لیٹ طلوع ہوا۔ بھئی آخر کیوں جناب! سچی کہانیاں ملا تو سارا غصہ ایسے بھاگا جیسے عراق سے امریکہ...... سرورق جاذبِ نظر تھا۔ نازک اور جاذب نظر نقوش کی مالک دوشیزہ مجھے تو کسی ایسے دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر لگی جس کا حصول ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ حسینہ بے وفا کی تیر برساتی آنکھوں سے اپنے دل کو بچاتے ہوئے اشتہارات کی ندی میں چھلانگ لگا دی۔ بمشکل ڈوبنے سے خود کو بچا کر ندی عبور کی اور اداریہ کے کنارے جا پہنچے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا تو کوئی میڈم منزہ سے سیکھے۔ کچھ اپنی باتیں میں کاشی بھائی آپ سے ملاقات ہوئی۔ آپ تو ہر ماہ بڑے قیمتی موتی صفحہ قرطاس پر بکھیر رہے ہو۔ لو جی شہر احوال میں جلدی سے جا پہنچے تانکا جھانکی شروع کی۔ جب سے مجھے شہر احوال کے پرائمری اسکول میں داخلہ ملا ہے۔ تو کبھی نہ کبھی حاضری لگوا ہی لیتا ہوں۔ کہیں نام ہی خارج نہ ہو جائے ناں۔ ایک بات کہ شہر احوال کا رقبہ اب بڑھا دینا چاہیے کیونکہ اب زیادہ لوگ جو آ رہے ہیں شہر احوال میں اپنے احوالیوں کے چاند چہرے ستارہ آنکھیں دیکھ رہا ہوں۔ پرانے ہیرو ہیروئن تو اکثر غائب ہیں۔ اگرچہ نئے چہرے آ گئے ہیں۔ مگر پرانوں میں اگر محترمہ تحسین جونیجو صاحبہ کا ذکر نہ کیا جائے تو زیادتی ہوگی ان کی مستقل مزاجی کو دیکھ کر بعض

اوقات بڑا رشک آتا ہے۔ کاشی بھائی آپ یقین کریں۔ میں چھوٹا تھا۔ پڑھنے لکھنے سے ناآشنا تھا۔ تو میرے بڑے والے تایا ابو مجھے سچی کہانیاں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ احوال کے خطوط بھی پڑھتے تھے۔ تو وہ سب سے پہلے اِن تحسین جونیجو صاحبہ کے خطوط پڑھ کر سناتے تھے۔ (ارے......) اس سے آپ ان کے تجربے کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ سچی کہانیاں کی ایک اور پرانی ساتھی نانی فائزہ شہزاد کے بارے میں اتنا ہی کہوں گا کہ فائزہ شہزاد میری پیاری نانی مجھے بنالو اپنا سگا نواسہ، میں ننھا منھا، پیارا شونا سا بچہ ہوں۔ سچی مچی......! نیند کی وجہ سے قلم بار بار پھسل رہا ہے۔ رات کا پہر ہے۔ خط بھی دوسری بار لکھ رہا ہوں۔ اب آپ سے کوئی بات چھپاتا تو ہوں نہیں میں۔ وہ دراصل پہلا خط نیند کے جھونکوں میں بمشکل مکمل کیا۔ نظر پڑی تو خط کو صفحے کی بجائے میز پر لکھا ہوا پایا۔ قلم کی بے دھیانی کو مورِدِ الزام ٹھہرا کر بادل نخواستہ دوسرا خط لکھ رہا ہوں۔ چلو چھڈو جی...... ابھی تک صرف سلسلے وار کہانیوں کا ہی صفایا کر سکا ہوں۔ دوسری کہانیاں نظروں سے دوری اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے معذرت، آخر میں مزے دار بریانی اور لذیذ مرغ بروسٹ کھاتے ہوئے اجازت۔ کیونکہ خط لکھنے کے چکر میں کھانا اور نیند دونوں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

☆ ملک صفدر عباس اعوان! تحسین خود تمہیں جواب دیں گی۔ باقی یار خوش گمانی اور خوش خرامی میں فرق تو سمجھو۔ آئندہ خط نیند میں نہیں لکھنا۔



✉ یہ آمد ہے محفل میں ہمارے کمانڈو شعبان کھوسہ کی کوئٹہ سے۔ لکھتے ہیں، بندہ ناچیز کی طرف سے سچی کہانیاں کی پوری ٹیم کو اسلام وعلیکم! امید کرتا ہوں سب خیر خیریت سے ہوں گے۔ باجی منزہ سہام جب ہم چھوٹے ہوتے تھے تو اپنی بات منوانے کے لیے کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے گھر کی چیزیں توڑ دیتے تھے۔ یہ سیاسی لوگ مجھے بچے لگتے ہیں جو اپنی بات منوانے کے لیے اپنے ہی گھر کی چیزیں توڑ رہے ہیں۔ کچھ اپنی باتیں کاشی بھائی آپ نے صحیح فرمایا ہم انسان تو ہیں پر ہم میں انسانیت نہیں رہی۔ سدرہ انور علی، تحسین جونیجو کے تبصرے پسند آئے۔ محمد یوسف بھائی سچی کہانیاں میں آپ کو دل سے خوش آمدید کہتے ہیں۔ غلام حسین، مریم شاہ بخاری اپنوں کی جدائی پر اللہ تعالیٰ آپ کو صبر کی توفیق دے دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ مرنے والوں کو جنت الفردوس میں جگہ دے (آمین) مور شاہد حسین آپ تو پہلے سے شہزادے ہو۔ شہزادے کو شہزادہ بننے کی کیا ضرورت۔ کنول بہنا آپ کو اور آپ کی صاحب زادی کو میری طرف سے سالگرہ مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ دونوں کو لمبی عمر اور ڈھیر ساری خوشیاں دے (آمین) اشفاق شاہین، عبدالغفار عابد، ملک عاشق حسین، ایم اشفاق بٹ، ممتاز احمد، مجید احمد جائی، آپ سب کو میری طرف سے محبت بھرا سلام۔ ظفر علی ابڑو، حنا بشریٰ، غلام رسول گل، امجد علی، شفقت حسین، فیصل ندیم، رانا محمد شاہد، منشی محمد عزیز مئے آپ سب کا باقاعدگی سے محفل میں آنا سچی کہانیاں سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اسامہ ندیم، حاذق ندیم، آپ دونوں مجھے ہم شکل لگ رہے ہو کہیں آپ دونوں جڑواں بھائی تو نہیں ہو۔ محمد سلیم اختر صاحب آپ کی ہر کہانی اپنی مثال آپ ہے۔ ہمارے لیے آپ استاد کا درجہ رکھتے ہیں خاص کر میں آپ کا فین ہوں۔ میری کہانی 'کانٹوں کی زمین' کو پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ سب کی رائے میرے لیے بہت قیمتی ہوتی ہے تاکہ میں اپنے قلم کو مزید نکھار سکوں۔ اسی کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔ زندگی نے ساتھ دیا تو پھر ملیں گے۔

☆ پیارے شعبان! تبصرے دیکھ کر فوراً ایک خیال ذہن میں آیا۔ نیند تو کانٹوں کے بستر پر بھی آجاتی ہے۔ اتنی ٹف ڈیوٹی اور پھر بھی سچی کہانیاں سے اتنی محبت...... جیو یار!

✉ نیئر رضاوی ہمیشہ کی طرح لیٹ اور مختصر ترین تحریر کے ساتھ شاملِ احوال ہیں۔ لکھتے ہیں امید کرتا ہوں آپ سب لوگ خیریت سے ہوں گے اور دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ سب کو حفظ و امان میں رکھے (آمین) پُراسرار نمبر نہایت بہترین رہا ہر تحریر اپنا جواب آپ تھی۔ ٹائٹل بھی خاصا دلچسپ تھا۔ ستمبر کا شمارہ آچکا ہے اس کے باوجود قارئین پُراسرار نمبر

مانگ رہے ہیں جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پُر اسرار نمبر کتنا کامیاب رہا۔ اس سے پہلے بھیجی گئی تحریر کا شدید انتظار کیا لیکن افسوس کہ شائع نہیں ہوسکی۔ ایک اور تحریر ارسال کر رہا ہوں اُمید کرتا ہوں سچی کہانیاں کی زینت ضرور بن جائے گی۔

☆ پیارے بھائی نیرؔ! اس بار بھی آپ لیٹ ہوگئے۔ انشاء اللہ آپ کی شاعری اگلے ماہ سچی کہانیاں کی زینت بنے گی۔

✉ کراچی سے یہ آمد ہے مومنہ بتول کی۔ لکھتی ہیں پیارے کاشی السلام وعلیکم! بعد خیریت عرض یہ ہے کہ ستمبر کا شمارہ لیا اور ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا، وجہ اس کی تحریریں ہیں آپ کا احوال نامہ تسلسل سے پڑھا بھائی بہنوں سے ملاقات رہی۔ اپنی ایک غزل ارسال کر رہی ہوں اُمید صبح کی مانند کہ شاید آپ کے معیار پر پوری اتر سکے۔ جلد ہی اپنی نئی تحریر روانہ کروں گی۔ کوپن کا سلسلہ، کچھ مشکل ضرور لگا ہے مگر خیر خدا آپ کو اور اہل خاندان سچی کہانیوں کو نظر بد سے بچائے اُمید ہے کہ جواب سے نوازیں گے۔

☆ مومنہ جی! اگلے ماہ ضرور آپ کی شاعری سخن آباد کا حصہ بنے گی۔

✉ چک **58** شمالی سرگودھا سے ہمارے اچھے بھائی فیصل ندیم بھٹی عرض کرتے ہیں السلام و علیکم! سب سے پہلے منزہ سہام صاحبہ کا اداریہ دھرنا ہوگا پڑھ کر دل بہت رنجیدہ ہوا۔ کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں پڑھ کر حقیقت میں یہ احساس ہوا کہ ہم انسانوں سے تو کتے ہی اچھے ہیں۔ احوال میں پہلے ہی صفحے پر سدرہ انور علی صاحبہ سے ملاقات ہوئی سدرہ جی اس بار تو خط بہت ہی تفصیل سے لکھا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو خوش رکھے آمین۔ عظمٰی شکور صاحبہ کا خط پسند آیا۔ مور شاہد بھائی آپ ناراض بھی ہوجاتے ہیں؟ سُنایئے کیسے ہیں؟ غلام رسول مسز نوید ہاشمی، مجید جائی کو سلام اور دعا۔ حاذق ندیم شمارے میں شامل ہونے پر آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ عبدالعزیز جی آ، ویلکم بیک آپ آگئے۔ باقی تمام رائٹرز کو سلام اور دعائیں فریدہ فری صاحبہ آپ کی شاعری کی کتاب سرگودھا سے مل جائے گی۔ پہلی سچی کہانی دور کے ڈھول سلیم اختر کی بہت ہی سبق آموز ہے۔ دکھ کے دہلیز کے جاوید راہی کی کہانی قابل تعریف ہے۔ گلابی دوپٹا، زندگی کا معیار، فیصلے دل کے، انوکھا رشتہ، کشف گل دستہ عادت کی بھینٹ ناکردہ گناہوں کی بھینٹ محبت کی کسک عبرت خیز کہانیاں ہے۔ کاش آج کے نوجوان اس سے عبرت حاصل کریں؟ مٹھی سلسلہ اچھا جا رہا ہے۔ گونگی ماں، کیوں یہ کھیل کھیلا، کانٹوں کی زمین، انسانیت کی ہار بھی بہت خوب رہیں۔ اجازت چاہتا ہوں۔ کاشی بھیا اب تو میری کہانی کا نمبر لگا ہی دیں نا۔

☆ فیصل! خوش ہوجاؤ۔ اس بار تمہارا نمبر آ گیا۔ تمہاری تحریر شامل ہے اس ماہ۔

✉ ڈی آئی خان سے ایم جے قریشی عرض کرتے ہیں، دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد دوبارہ سچی کہانیاں کی چاند ستاروں کی محفل میں پھر سے حاضر ہوا ہوں۔ غیر حاضری کی وجہ کچھ گھریلو مصروفیات اور کچھ پریشانیاں تھیں۔ یکم ستمبر ہلکی ہلکی سرد ہوا اور بوندا باندی میں شام کے **8** بجے میں اپنی بیوی مہوش جواد کے ساتھ جدہ نیوز ایجنسی پر اپنا پسندیدہ رسالہ ماہنامہ سچی کہانیاں لینے گیا تو نیوز ایجنسی پر سچی کہانیاں سب سے منفرد، سب سے جدا ہنستا مسکراتا ہزاروں رنگ بکھیرتا اپنی آمد کی نوید دے رہا تھا۔ دھرنا ہوگا منزہ سہام کی تحریر بہت دفعہ پڑھی۔ کاشی چوہان کی اپنی باتیں پڑھیں۔ احوال میں سدرہ انور علی جھنگ، محمد یوسف لیہ، نصرت سرفراز اسلام آباد، مریم شاہ بخاری سرگودھا، اشفاق شاہین کراچی، شفقت حسین، ممتاز حسین، کنول عمران خان کراچی، عظمٰی شکور سرگودھا اور منشی محمد عزیز کا تفصیلی تبصرہ بہت پسند آیا۔ ارے ہاں بھائی! بھول گیا سوری۔ ٹائٹل بہت پسند آیا۔ حسینہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ کہانیوں میں دکھ دہلیز کے جاوید راہی، فیصلے

دل کے نزہت جبیں، کشف مقصود بلوچ، گل دستہ شاہدہ شکیل، عادت کی بھینٹ فاطمہ بتول، ناکردہ گناہ نصرت سرفراز، مکھنی ارشد علی ارشد، گونگی ماں، عاشق حسین، کیوں یہ کھیل کھیلا فوزیہ جاوید، انسانیت کی ہار عذرا فردوس، روشنی کے مینار جیجل میتلو، قسمت کی دستک ریحانہ نسیم، ماں کی قبر دستگیر شہزاد اور ناگن اعجاز احمد کی کہانیاں بہت پسند آئیں۔ باقی سب کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ سخن آباد میں میری غزل شائع کرنے پر بہت بہت شکریہ۔ سخن آباد میں تمثیلہ لطیف، شائستہ جمال، ثمینہ ناز، ساحل ابڑو، سدرہ انور علی، کشمالہ احمد تشنہ، نصرت سرفراز اور عمران فائق کی غزلیں بہت ہی بہت ہی پسند آئیں۔ کافی لمبا تبصرہ لکھ دیا ہے کہیں ایسا نہ ہو ردی کی ٹوکری میں چلا جائے۔ میں اور میرے فرینڈز مہوش جواد، جواد حسن، شعبان کی طرف سے اسٹاف سچی کہانیاں، ماہنامہ سچی کہانیاں اور پاکستان کے لیے دعا گو ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

☆ بھائی ایم جے! تبصرہ جامع تھا اور آپ کی تحریر بھی بہت خوشخط ہے۔

✉ مریم شاہ بخاری نے ہمیں سرگودھا سے یاد کیا ہے۔ لکھتی ہیں نامنظور نامنظور نامنظور...... نا...... ارے آپ پریشان نہ ہوں بھیا۔ سچی کہانیاں نہیں بلکہ انکل عبدالعزیز جی آ کا استعفیٰ نامنظور ہے۔ اب چلتے ہیں سچی کہانیاں کی جگمگاتی تحریروں کی جانب۔ ہر تحریر اپنی مثال آپ تھی چند ایک کو چھوڑ کر۔ دور کے ڈھول سلیم اختر، انوکھا رشتہ عارف رمضان، گونگی ماں ملک عاشق حسین ساجد، (گونگی ماں پڑھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آ گئے) کانٹوں کی زمین شعبان کھوسہ، قلمی دوستی ادیب سمیع، روشنی کے مینار جیجل میتلو، ماں کی قبر دستگیر شہزاد، بہترین کہانیاں رہیں۔ ناکردہ گناہ نصرت سرفراز اور دکھ دہلیز کے جاوید راہی کی اچھی کہانیاں تھیں۔ مجھے جو اسٹوری سب سے خوبصورت اور بیسٹ لگی وہ ایس امتیاز کی تحریر نئی قبر ہے۔ زبردست زبردست...... سب سے منفرد اور انوکھی۔ ممتاز بھیا عمرہ کرنے پر مبارکباد۔ سخن آباد میں تمام شعرا کا کلام اچھا تھا۔ پسند آیا، سلسلے وار ناولز بھی زبردست جا رہے ہیں۔ آتشِ جنوں اپنے اختتام کو پہنچا۔ احوال میں تمام ساتھیوں کے محبت نامے زبردست تھے۔ اسامہ ندیم اور حاذق ندیم ننھے منے چوزو واہ جی واہ...... جیتے رہو اور خوش رہو۔ (چھوٹے سے ہو ناں اس لیے چوزہ بولا، برا نہیں منانا) نئے لکھنے والوں اور والیوں کو خوش آمدید۔ لیجیے بھیا تبصرہ ہوا مکمل، اب دیجیے اجازت۔

☆ اچھی مریم! سلامت رہو، جلد تمہاری تحریر شمارے کا حصہ بننے والی ہے۔



✉ مجید احمد جائی ملتان سے احوال میں تشریف فرما ہیں۔ لکھتے ہیں، ماہ ستمبر 2014 تازہ شمارہ لیٹ موصول ہوا۔ ہنستی مسکراتی حسینہ عیدالاضحیٰ کے آنے کی نوید دے رہی تھی۔ پاکستانی قوم تو روز اول سے قربانیاں دیتی ہے اب نجانے کتنی بار قربان ہوگی۔ میری طرف سے سب ہی قارئین' لکھاریوں اور سچی کہانیاں کے اسٹاف کو دل کی گہرائیوں سے عیدالاضحیٰ مبارک ہو۔ بارشوں نے نظام زندگی مفلوج کر رکھا ہے اور ملکی حالات آئے روز خراب ہوتے جا رہے ہیں اللہ تعالیٰ پاکستان قوم اور وطن کی حفاظت فرمائے آمین ثم آمین۔ کچھ اپنی باتیں، ہر دل عزیز پیارے کیوٹ سوہنے میٹھے محبت بانٹتے کاشی چوہان ہمیشہ کی طرح بہت کچھ کہہ گئے۔ احوال میں بھی کے تبصرے جاندار تھے میری طرف سے سدرہ انور جو ہمیشہ جاندار تبصرہ کرتی ہیں عادل حسین، ثمینہ بٹ، پیاری جیجل میتلو، غلام رسول گل، پیارے دوست ساحل ابڑو، نفیسہ فضل، فیض رسول، ظفر ابڑو، ریحان آفاق، نسرین اختر، سوہنے میٹھے مور شاہد حسین' پکے سچے ہر دل عزیز بزرگ لکھاری عبدالعزیز جی آ (سر جی کیسے مزاج ہیں) صفدر علی حیدری کہیں گم ہوگئے ہیں؟ عامر زمان عامر، ڈاکٹر آکاش محمود، مبارک علی شمسی اینڈ ملک عاشق حسین ساجد کے تبصرے بھی جاندار تھے خوشخبری پا کر دل ناچنے لگا ارے بھائی ہمارا تبصرہ بھی شامل اشاعت ہے۔ ہمیں بھی یاد رکھا کاشی بھائی نے بہت شکریہ جی، کہانیوں میں ملک عاشق حسین ساجد کی کہانی پا کر دل خوش ہوا۔ آتش جنوں، مکھنی، خوبصورت دلچسپ مراحل میں داخل ہو چکی ہیں۔ کہانیوں پر تبصرے پر

معذرت کیونکہ ابھی پڑھی نہیں، پڑھ کر احوال بھیجتے تو لیٹ ہوجاتے۔ حاضری بھی ضروری ہے۔ اگلی بار انشاء اللہ۔ قارئین، تمام اسٹاف کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے عیدالاضحیٰ مبارک باد دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھنا، فی امان اللہ۔

☆ پیارے مجید احمد جائی! تمہارا اپنے خوبصورت ہاتھ سے لکھا تبصرہ پا کر ہمارا دل مسرور ہوجاتا ہے۔



✉ امجد علی چیزل آباد سے لکھتے ہیں۔ مدیرِ اعلیٰ آنٹی منزہ سہام، مدیر کاشی چوہان بھائی اور دانیال شمسی صاحب صحت وسلامتی کی دعائیں۔ آپ سمیت تمام اسٹاف رائٹرز اور قارئین حضرات کے نام، امید ہے سب امن وامان سے ہوں گے۔ ستمبر کا چمکتا دمکتا تازہ شمارہ ملا۔ سروق اچھا تھا، منزہ سہام کا اداریہ دھرنا ہوگا۔ منفرد موضوع پر لکھا گیا۔ کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں بے مثال تحریر تھی۔ محفل احوال خوب جمی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے اپنے پسندیدہ سلسلے سلیم فاروقی آتش جنوں، منتھی، ارشد علی ارشد، ناگن اعجاز احمد نواب اور فیض عشق امجد جاوید پڑھے بے حد پسند آئے۔ باقی تمام کہانیاں بھی موضوع کے لحاظ سے اچھوتی تھیں۔ سخن آباد میں بھی سب کی شاعری ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ مسئلہ یہ ہے خلق خدا کی بھلائی کے لیے اچھا سلسلہ ہے یہ تو رسالے کی جان سمجھو آخر میں ایک درخواست ہے کہ ہمارے ہاں سچی کہانیاں لیٹ ملتا ہے پلیز اس پر خاص توجہ فرمائیں۔

☆ پیارے امجد! کوشش ہے آپ کو پرچہ اپنے بک اسٹال پر جلد فراہم کردیا جائے۔



✉ ہمارے بہت پیارے مور شاہد حسین قمبر شہداد کوٹ سے رقم طراز ہیں پیارے بھیا کاشی چوہان سدا خوش رہو۔ ستمبر کا شمارہ بہت ہی خوشگوار موسم میں موصول ہوا۔ سرورق پر بچی محترمہ سے ہیلو ہائے کے بعد ہمیشہ کی طرح آنٹی منزہ سہام کا اداریہ اور آپ کی کچھ اپنی باتیں دل کی آنکھ سے پڑھی جو روح میں اترتی گئی۔ پھر کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر احوال میں قدم رکھا جہاں سید مبارک علی شاہ محمد یوسف لغاری، نازیہ جہانگیر، حاذق ندیم بھی محفل کی رونق ہے۔ بھلی کرے آیا۔ محفل کی خوبصورتی اپنے عروج پر تھی مگر چند خطوط پڑھتے ہوئے مجھے رونا آرہا تھا ہم قلم وکاغذ کا خوب حق ادا کررہے ہیں۔ محفل میں ایک دوسرے کے خلاف باتیں کی جارہی تھیں۔ وہ حضرات ادب وآداب اور کسی کی دل آزاری کا احساس بھی بھول چکے ہیں۔ ہمارے رابطوں کا ایک ہی ذریعہ احوال تو ہے اس میں بھی کڑوی کسیلی باتیں ہورہی ہیں۔ پلیز خدا کے واسطے اپنے ذہن کو بدل دو محبت اور صرف محبت اپناؤ۔ اسماعیل بروہی بھیا یہ محبت اور دوستی سدا قائم رکھیے گا تھینکس۔ عمران فائق خدا آپ کو کامیاب کرے۔ کنول عمران خان **12** ستمبر اور آپ کی صاحبزادی **07** ستمبر سالگرہ مبارک ہو۔ فیصل ندیم بھیا، عظمیٰ شکور، ثمینہ عبدالقیوم، ایم اشفاق بٹ، رانا محمد شاہد، محمد عزیز مئے، غلام رسول گل، مجید احمد جائی، ظفر علی ابڑو، امجد علی بھیا آپ سب کیسے ہیں۔ ادی زرینہ جونیجو، ظفر رند، شاہد فراز، صفدر علی حیدری، ملک صفدر عباس اعوان آپ جھلک دکھا کے کہاں غائب ہوجاتے ہیں۔ سیدہ مون شاہ بخاری اور غلام حسین جیکب آبادی نے رلا دیا خدا صبر دے آمین۔ سیدہ کومل شاہ اور آفتاب علی کو خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ کاشی چوہان بھیا آپ نے بڑا پیارا جواب دیا کہ شہزادہ احوال بننا ہے تو ادی سدرہ سے رابطہ کریں۔ تو میرے بھائی سمجھو ہم شہزادہ احوال بن گئے۔ مجھے پوری امید ہے کہ سدرہ انور علی شہزادۂ احوال کے لقب سے ضرور نوازیں گی۔ اور ہاں وہ ہے نا اپنی ادی تحسین جونیجو وہ بھی ہاہا۔ سدرہ انور علی گڑیا رانی اور ملکہ احوال ادی ادی تحسین جونیجو سمیت تمام احوالی مجھے بہت عزیز ہیں۔ گڑیا رانی کی اکثر باتیں محبت سے بھرپور ہوتی ہیں جبکہ ملکہ احوال کی بھی مطمئن بیٹھی مگر دوٹوک باتوں میں بے پناہ محبت چھپی ہوتی ہے۔ کئی لوگ اسے خوشامد یا کچھ اور سمجھیں گے مگر ایسا کچھ نہیں ہے، ہم سارے احوالی آپ سب بہن بھائیوں کی طرح ہیں۔ خاص الخاص سلسلہ سخن آباد میں تمام غزلیں اور نظمیں دل کو چھوگئی سب میں اچھوتا پن تھا۔ میرے پیارے قارئین میری بڑی بہن کی طبیعت کافی ناساز ہے ان کو سانس لینے میں تکلیف رہتی ہے۔ چند دن بعد ان کے دل کا آپریشن ہے اور ابو بھی

پراسرار کہانی نمبر 3

Email : pearlpublications@hotmail.com

پراسرار نمبر 1 اور پراسرار نمبر 2 کے بعد پراسرار نمبر 3

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کر دیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔

جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کر دیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرا لیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ دسمبر کا شمارہ، پراسرار نمبر 3 ہوگا۔

نوٹ: پراسرار نمبر کے لیے کہانیاں بھیجنے کی آخری تاریخ 5 اکتوبر ہے۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرما لیں۔

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا ر کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: --

مکمل پتا: --

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا ر بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: -------------------- تعداد صفحات: --------------------

نام: --

مکمل پتا: --

فون رسیل نمبر: --

نومبر 2014ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا ر کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: -------------------- مصنف: --------------------

دوم، عنوان: -------------------- مصنف: --------------------

سوم، عنوان: -------------------- مصنف: --------------------

نام: -------------------- شہر: --------------------

شوگر کے مرض میں مبتلا ہیں۔ پلیز ان کی مکمل صحت یابی کے لیے دعا کریں۔

☆ پیارے مور! آپ کی بہن کی صحت کے لیے ہم خدا سے دعا گو ہیں اور ہمارے قارئین۔



✉ شفقت حسین حب چوکی سے لکھتے ہیں جناب ایڈیٹر صاحب آف ماہنامہ سچی کہانیاں پھر وہی بات کہوں گا کہ پرچہ لیٹ ملا 3 تاریخ کو اسی شام جب آپ کو فون کیا آپ سے بات کر کے بے حد اچھا لگا آخر میں آپ نے کہا کہ 5 تاریخ تک خط سچی کہانیاں کے دفتر بھیج دیں۔ وقت کی کمی اور مصروفیات کی وجہ سے تھوڑا ہی مطالعہ کیا ہے۔ سب سے پہلے احوال کی جانب لمبی چھلانگ لگائی۔ تصویر کے ساتھ اپنا خط دیکھا پڑھا خوشی ہوئی بے حد شکریہ، پھر بڑی حسرت سے باقی احوالیوں کے خط پڑھے مگر کسی ظالم نے بھولے سے یاد تک نہیں کیا اور ہر ماہ خاص یاد رکھنے والے مور شاہد حسین نے بھی نجانے کیوں بھلا دیا۔ مور بھیا اب میں آپ کی شہزادہ بننے کی کوئی سفارش نہیں کروں گا۔ ہاہاہاہا...... مون شاہ بخاری اور غلام حسین نے دکھی کر دیا ہم ان کے دکھ وغم میں برابر کے شریک ہیں۔ اب اجازت دیں

☆ شفقت تبصرہ اچھا لگا۔ یار کچھ شاعری وغیرہ بھی تو بھیجو۔ سنا ہے تم شاعری بھی کر رہے ہو آج کل۔



✉ ظفر علی ملیر کراچی سے عرض کرتے ہیں محترم کاشی چوہان بھائی السلام وعلیکم! سچی کہانیاں روز بروز خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے آپ کی محنت ورق ورق سے جھلک رہی ہے۔ صفحہ صفحہ آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ستمبر کا شمارہ دل کو بہت بھایا۔ ایسا معیاری پرچہ مہیا کرنے پر بے حد شکریہ۔ محفل احوال تو سچی کہانیاں کی جان ہے جہاں ہم دور دور بیٹھے بھی ایک دوسرے سے دکھ سکھ شیئر کرتے ہیں۔ ویسے آپ بھی محفل بڑی پیاری سجاتے ہیں۔ آپ کے خلوص ومحبت سے بھرپور جواب پڑھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ سچی کہانیاں جیسے معیاری اور منفرد پرچے میں اپنا خط دیکھ کر دل خوشی سے سرشار ہو گیا۔ جن دوستوں نے یاد کیا ان کا شکریہ، خصوصاً مور شاہد حسین جنہوں نے ہر قدم ہر لمحہ حوصلہ افزائی سے نوازا۔ خدا ان کی تمام جائز حاجات پوری کرے آمین۔ مور شاہد بھیا میں آپ کا فین ہوں آپ اپنی کہانی کب پڑھنے کو دے رہے ہیں؟ امجد علی بھیا، غلام رسول گل، شفقت حسین، غلام حسین کو بہت بہت سلام۔

☆ ظفر علی...... آپ کی محبت کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں۔



✉ غلام رسول گل جیکب آباد سے احوال میں شامل ہیں۔ لکھتے ہیں عزیز بھائی کاشی چوہان سلام وآداب آپ سمیت سچی کہانیاں کے پورے اسٹاف لکھاری اور قارئین حضرات کے لیے زندگی، صحت سلامتی خوشی وکامیابی امن کی دعائیں۔ تازہ شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ حسب عادت پرچہ ملتے ہی احوال کی جانب لمبی چھلانگ لگائی ارے یار واہ، ہم بھی شامل احوال ہیں۔ ہر ماہ تصویر کے ساتھ خط شائع کرنے پر عین نوازش۔ مور شاہد حسین انشاء اللہ اپنی محبت واپنائیت تا قیامت رہے گی۔ ڈاکٹر ایس وفا آپ بھی ہمارے لیے بہت ہی خاص ہیں جناب۔ سب سے پہلے فیصلے دل کے، روشنی کے مینار، اور کیوں یہ کھیل کھیلا پڑھی۔ بے حد پسند آئی۔ سلیم اختر کی دور کے ڈھول خاص تھی۔ شاہدہ شکیل، گل دستہ، مقصود بلوچ کشف، عبدالغفار عابد کی محبت کی کسک بھی اچھی تھیں۔ مکھنی ارشد علی ارشد، ناگن اعجاز احمد نواب، آتش جنوں، سلیم فاروقی زبردست میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ ویلڈن۔ کاشی بھائی اب تو کوئی شکایت نہیں ہے نا کہ تبصرہ نہیں کیا۔



☆ اچھے غلام رسول! آپ کی محبت ہماری طاقت ہے۔ خوش رہو۔

✉ جیکب آباد سے غلام حسین بھی شاملِ احوال ہیں۔ لکھتے ہیں، محترم کاشی بھائی السلام وعلیکم! آپ کی خدمت میں سلام دعائیں اور نیک تمنائیں ستمبر کا شمارہ میرے سامنے میز پر

ہے۔ ٹائٹل اچھا ہے دھرنا ہوگا اور کچھ اپنی باتیں ان کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔ محفل احوال میں **41** افراد نے بھرپور شرکت کی۔ اور **12** ایس ایم ایس کے ذریعے شامل ہوئے **24** نمبر سیٹ میری تھی۔ بے حد شکریہ، بڑے بھائی غلام رسول گل اور مور شاہد حسین بھیا کی خدمت میں آداب وسلام، آپ دونوں سدا خوش رہیں آمین۔ باقی تمام احوالیوں کو بندہ ناچیز غلام حسین کی جانب سے ڈھیروں ڈھیر پیار محبت اور سلام۔ کہانیوں میں سب سے پہلے محترم سلیم فاروقی کی تحریر آتش جنوں پڑھی اور ارشد علی ارشد کی تحریر ملکھنی میرے پسندیدہ سلسلے وار ناول ہیں باقی چند کہانیاں پڑھی ہیں۔ جن میں قلمی دوستی، ماں کی قبر، فیض عشق، گل دستہ، کانٹوں کی زمین، اچھی تھیں امید ہے باقی کہانیاں بھی سبق آموز ہوں گی۔ اب اجازت دیں۔

☆ اچھے بھائی! تبصرہ بڑا پیارا لکھا آپ نے۔ اگلے ماہ بھی آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔



✉ ہمارے بہت محترم بھائی ممتاز احمد سرگودھا سے لکھتے ہیں اسلام وعلیکم! دعا ہے اللہ کریم آپ کو صحت اور تندرستی جیسی عظیم دولت سے ہمیشہ مالا مال رکھے۔ آمین۔ احوال میں سب دوستوں کو پُرخلوص سلام، کیسے ہیں آپ سب لوگ؟ ستمبر کا شمارہ تین دن کی تاخیر سے ملا۔ اشتہارات کی ورق گردانی کے بعد کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں پڑھ کر پنجابی کے عارفانہ کلام کے یہ مصرعے یاد آگئے۔

راتیں جاگیں شیخ سداویں تے ☆ راتیں جاگن کتے تیتھوں اُتے
مالک داور نہ چھڈدے بھاویں ☆ سو سو مارے جوتے کتے تیتھوں اُتے

احوال میں پہنچ کر سب اپنوں سے ملاقات ہوئی جو خوب رہی۔ بھائی محمد یوسف لغاری لیہ سے پہلی بار احوال میں شامل ہوئے۔ خوش آمدید، ویلکم، کنول عمران خان بالکل آپ مٹھائی کی حق دار ہیں۔ سرگودھا سے کراچی مٹھائی بھیج دیتا ہوں۔ آپ تک پہنچتے پہنچتے باسی ہوگئی تو میرا کوئی قصور نہ ہوگا۔ آپ کی مبارکباد کا بہت شکریہ، ثمینہ عبدالقیوم پیاری بہنا خیر مبارک بہت شکریہ۔ عظمیٰ شکور کیسی ہیں آپ؟ عظمیٰ جی آپ کا کہا سرآنکھوں پر تو لیجیے فوراً ہی ایک کہانی ارسال کر دی ہے۔ ویسے اب آپ بھی کوئی کہانی لکھ دیں شدت سے انتظار ہے آپ کے قلم کے جوہر دیکھنے کا۔ بھائی مجید احمد جائی کا تبصرہ خوب رہا۔ جائی بھائی آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ بھائی فیصل ندیم بھٹی جناب کیسے ہیں آپ؟ آپ کی کہانی کب پڑھنے کو ملے گی؟ مریم شاہ بخاری آپ کو بہت سارے صدمے جھیلنے پڑے دعا ہے اللہ کریم مرحومین کی مغفرت فرمائے اور آپ کو صبر عطا فرمائے آمین۔ اسامہ ندیم پیارے چھوٹے اور ننھے منے بھائی اور دوست کیسے ہو؟ تمہارا لکھنے کا انداز بتاتا ہے کہ مستقبل کے ہونہار اور بہت کمال کے لکھاری ہو، بہن شائستہ جمال کو عمرے کی سعادت مبارک ہو۔ منشی محمد عزیز مئے بھیا کیسے ہو؟ کہانیوں میں دور کے ڈھول اچھی کہانی تھی۔ گلابی دوپٹا بہت ہی لاجواب کہانی تھی۔ فیصلے دل کے ایک اصلاحی اور پُراثر کہانی تھی۔ انوکھا رشتہ، عادت کی بھینٹ، ناکردہ گناہ اچھی کہانیاں تھیں۔ گل دستہ ایک مختصر مگر سبق آموز کہانی تھی۔ کشف اور محبت کی کسک بالکل بھی پسند نہیں آئیں۔ انسانیت کی ہار، شاندار کہانی تھی۔ روشنی کے مینار بہت عمدہ کہانی تھی۔ دل میں گھر کر گئی۔ قسمت کی دستک ایک زبردست کہانی تھی۔ کیوں یہ کھیل کھیلا عورت کے مکروفریب کی منہ بولتی تصویر تھی۔ کانٹوں کی زمین ایک خوبصورت اور عمدہ درس دینے والی کہانی تھی۔ اولاد کو خاص طور پر بیٹیوں کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ تمہاری یاد میں ایک اچھی کاوش تھی۔ لیجیے اس سے پہلے کاشی چوہان کی قینچی میدان عمل میں آ کر چلنا شروع ہو جائے تو اس نوبت کے آنے سے پہلے خط کو سمیٹتا ہوں انشاءاللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے ساتھ دیا تو۔

☆ بہت عزیز ممتاز بھائی! تبصرہ ہمیشہ کی طرح روح کی سیرابی کا باعث بنا۔

✉ محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے پہلی بار احوال میں شامل ہیں لکھتے ہیں، چند دن ہوئے شہر جانے کا اتفاق ہوا وہاں

بک اسٹال پر ماہ اگست عید مبارک نمبر دیکھ کے میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ ایسا رنگین اور خوبصورت سچی کہانیاں کا پرچہ نکالنے پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کریں۔ سرورق اچھا تھا، اندر جھانکا تو ہر تحریر کامیابی سے ہمکنار تھی۔ میں اِس کا ایک پرانا قاری ہوں۔ ہر لحاظ سے یہ ایک معیاری اور کامیاب رسالہ ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مقررہ تاریخ پر ہمیں پرچے کا بڑی شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ اس کے سارے سلسلے انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہیں۔ آپ کو پہلی بار خط تحریر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں اگر آپ نے تعاون کیا تو آئندہ بھی خط تحریر کیا کروں گا، سخن آباد کے تحت چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں کسی قریبی شمارے میں جگہ دے دیں بشرطیکہ آپ کا ہمارے ساتھ تعاون ہو امید ہے کہ آپ میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ آپ ہم سے کافی دور ہونے کے باعث میرے دل کی دھڑکنوں میں بسے ہوئے ہیں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ آپ کی زندگی میں سدا رنگ برنگے پھول مہکتے رہیں۔ خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں اپنے قیمتی وقت سے چند لمحے نکال کر یہ تحریر آپ کی نظر کر رہا ہوں زندگی نے وفا کی تو پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں۔

☆ پیارے اسلم جاوید! خوش آمدید انشاءاللہ اگلے ماہ آپ کی شاعری پرچے کا حصہ ہوگی۔ اُمید ہے اب یہ ساتھ دیر پا رہے گا اور انشاءاللہ ہر ماہ اپنے قیمتی وقت سے چند لمحے ہمارے لیے ضرور نکالیں گے۔

✉ عبدالغفار ثاقب ایبٹ آباد سے تحریر کرتے ہیں السلام وعلیکم! میری اور سے سچی کہانیاں کے سبھی اسٹاف اور سبھی سچی کہانیوں کو پڑھنے، اور لکھنے والوں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے سلام قبول! آج صبح سے ہی ہوائیں چل رہی تھیں۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور مجھے بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ دل تمنا کر رہا تھا کہ کالج سے واپسی پر بادل نا برسیں، موسم اچھا رہے، تو بھیگے بغیر اپنے من پسند رسالے کو لے آئیں۔ لیکن عین چھٹی کے وقت بارش شروع ہوگئی۔ وہ من پسند چیز ہی کیا جو بنا ستائے۔ تھکائے مل جائے۔ تیز بارش میں بھیگتے ہوئے گرتے پڑتے جب بک اسٹال پہنچے تو ٹائٹل گرل، ہماری ہمت کو داد دیتی ہوئی ہمارا سواگت کرتی نظر آئی۔ جلدی سے سرسری طور پر کہانیوں کو دیکھنے کے بعد احوال میں چھلانگ لگائی تو اپنا ٹوٹا، پھوٹا ادھورا خط شامل احوال دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ اور گیارہ سو واٹ کا جھٹکا لگا۔ کئی جگہوں سے تو لفظوں کو بھی توڑ پھوڑ کے شامل احوال کیا گیا۔ میں سوچتا ہی رہ گیا اتنے پیار سے اپنے من پسند رسالے میں خط لکھا تو ایسا شائع ہوا۔ اگر کچھ اور لکھوں تو وہ نجانے کیسا شائع ہو اور لگتا ہے میری تجاویز، آراء کو بیدردی سے حوالۂ ڈسٹ بن کر دیا گیا۔

☆ پیارے غفار ثاقب! پرچے پر غیر ضروری تنقید سے بہتر ہوتا اگر تم ہمیں فوری طور پر کوئی تحریر ارسال کر دیتے۔ اس ماہ بھی تم نے کیا لکھا؟ اس بار ہم تمہارا پورا خط لگا رہے ہیں۔ فیصلہ قارئین کریں گے۔



✉ علی حسنین تابش کی، چشتیاں سے احوال میں پہلی آمد ہے، لکھتے ہیں سب سے پہلے مدیر اعلیٰ محترمہ منزہ سہام صاحبہ، مدیر کاشی چوہان صاحب، تمام اسٹاف اور قارئین کو میرا عقیدت بھرا اسلام قبول ہو۔ جناب ملک عاشق حسین ساجد صاحب کا بہت شکریہ کہ انہوں نے مجھے سچی کہانیاں ڈائجسٹ پڑھنے اور اس میں لکھنے کا مشورہ دیا۔ میں ملک صاحب آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جب بھائی کاشی چوہان صاحب سے رابطہ ہوا تو میں نے انہیں بتایا کہ ہمارے شہر میں سچی کہانیاں نہیں آتا۔ انہوں نے اس مسئلے کا حل بھی نکال دیا۔ انہوں نے مجھے سالانہ خریدار بننے کا مشورہ دیا جو کہ مجھے پسند آیا۔ میں سچی کہانیاں ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بن گیا۔ یہ کسی ڈائجسٹ میں میرا پہلا خط ہے۔ **30** اگست کو مجھے جب ڈاکیا انکل 'ستمبر کا سچی کہانیاں' دینے آئے تو اک انجانی سی خوشی ہوئی۔ ٹائٹل بہت پسند آیا۔ جب اندر جھانکا تو منزہ سہام کا دھرنا ہوگا پڑھا۔ سچ ہی لکھا ہے کہ ہمیں اپنی سوچ بدلنا ہوگی۔ بہت اچھا لگا پڑھ کر۔ پھر کاشی

بھائی کی کچھ اپنی باتیں پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ بھائی جان آپ بہت اچھا لکھتے ہو۔ ویری نائس، کہانیاں سب اچھی تھیں۔ لیکن مجھے زیادہ فیض عشق امجد جاوید صاحب کی اور روشنی کے مینار جیجل میتلو کی بہت پسند آئیں۔ میں تو ان کہانیوں میں کھو ہی گیا۔ جی چاہتا تھا پڑھتا ہی جاؤں اور احوال میں محترمہ سدرہ جی کا خط اور باقی سب نے بھی اچھا لکھا ہے سب ہی پسند آئے۔ میرا سب سے پسندیدہ سلسلہ سخن آباد بن گیا۔ کیونکہ میں خود اک شاعر ہوں تو اس لیے مجھے سچی کہانیاں کا یہ سلسلہ بہت پسند آیا۔ سب شاعر اچھا لکھتے ہیں سب کی غزلیات پسند آئیں۔ ملک صاحب آپ نے مجھے اس ڈائجسٹ کا مشورہ دے کر بہت اچھا کیا ہے۔ یہ ایک اچھا اور معیاری ڈائجسٹ ہے جو ہر طرح سے مکمل ہے۔ میں ایک بار پھر سے ملک عاشق حسین ساجد صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں بھائی کاشی صاحب آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔ آپ ایک اچھے اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی میں بھی 'سچی کہانیاں' ڈائجسٹ میں ایک کہانی کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ امید ہے کاشی بھائی میری حاضری کو قبول کریں گے۔ سب رائٹرز بہت اچھا لکھتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک سچی کہانیاں ڈائجسٹ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین اور اللہ پاک بھائی کاشی چوہان صاحب اور منزہ سہام صاحبہ کو لمبی عمر اور تندرستی عطا فرمائے آمین تاکہ وہ یونہی سچی کہانیاں ڈائجسٹ کی حسین محفل سجائے رہیں۔ اب کے لیے اتنا ہی زندگی نے ساتھ دیا تو پھر سے شامل احوال ہوں گے تب تک کے لیے اللہ نگہبان۔

☆ تابش! یقین کرو تمہارے تبصرے نے ہمیں بہت خوشی دی۔ ہمارے دروازے اپنے ہر پیار کرنے والے کے لیے کھلے ہیں۔



✉ اسلام آباد سے ہماری بہت پیاری لکھاری، شاعرہ ساتھی نصرت سرفراز دھرنوں سے بچتے بچاتے آخر احوال تک پہنچ ہی گئیں۔ لکھتی ہیں، ستمبر کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ خوبصورت سرورق کے ساتھ ایک خوبصورت رسالہ واقعی دل گداز تحریریں زندگی میں بکھری تصویریں ورق ورق بکھری ہوئی ہیں۔ منزہ سہام مرزا کے قلم سے بکھرے الفاظ دھرنا ہوگا واقعی پاکستانی سیاست کس راستے پر گامزن ہے؟ یہ دھرنے اور انقلابی دنیا کو پاکستان کا کون سا چہرہ دکھا رہے ہیں۔ کچھ اپنی باتیں کاشی چوہان کے قلم سے نہ جانے اُس معصوم بچے کی باقی زندگی کس طرح گزرے گی۔ اُس معصوم کی آہیں درندہ صفت انسان کی نیندیں ضرور خراب کریں گی۔ احوال میں کئی مہینوں بعد اپنا خط شامل دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ویسے تو ہر قاری کی اپنی پسند ہوتی ہے مگر مجھے محمد سلیم اختر کی دور کے ڈھول سہانے بہت پسند آئی جیجل میتلو کی روشنی کے مینار بھی بہت خوب رہی۔ عظیم الدین انصاری کی زندگی کا معیار موبائل فون کے حوالے سے، محبت کی کسک عبدالغفار عابد، فاطمہ بتول کی عادت کی بھینٹ خاموشی بھی حد سے گزر جائے تو سزا بن جاتی ہے ماں کی قبر دستگیر شہزاد پڑھ کر محسوس ہوا واقعی زندگی میں ایسے کردار بھی پائے جاتے ہیں نئی قبر ایس امتیاز احمد بہت ہی عجیب وغریب ذہنی کیفیت کی داستان تھی اسے تو پُراسرار نمبر میں شامل ہونا چاہیے تھا ناگن اور ملھنی ہر ماہ اگلے ماہ کا انتظار کرواتی ہیں فیض عشق امجد جاوید اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے سخن آباد کے تمام الاٹی پلاٹ کے جائز حقدار تھے ایک سے بڑھ کر ایک لیکن شاعر عبدالعزیز جی آ چکوال سے چھا گئے۔ واقعی جگ میں ڈھونڈ نہ پایا تجھ سی کوئی مثال کو ہم آپ پرفٹ کر سکتے ہیں۔ کاشی بھائی ایک عرض یہ کرنا تھی کہ آپ نے سخن آباد میں ہمیں پلاٹ الاٹ تو کر دیا مگر اس میں مشرقی اور مغربی پاکستان والی دوری تھی ایک مصرعہ مغربی پاکستان میں تو دوسرا مشرقی پاکستان میں تھا۔ ایک شعر کے دو مصرعوں میں اتنی دوری؟ بہر حال پلاٹ الاٹ کرنے کا بے حد شکریہ اس بار دوری کو کم کرنے کی کوشش کیجیے گا خط جلد از جلد ارسال کرنے کی وجہ سے خوشخطی بے حد خراب ہے۔ سخن آباد کی مستقل رہائشی بننے کی خواہش مند ہوں شامل اشاعت کر کے شکریہ کا موقع دیں اور ہاں میری کہانی ناکردہ گناہ کی اشاعت کا بہت شکریہ دلہن وہی جو آپ کو مل گئی یا نہیں بتایئے گا۔

☆ نصرت جی! آپ کا تبصرہ ہمارا مان ہے۔ اُمید ہے مان نہیں ٹوٹے گا۔ دلہن تو ہمیں بہت پہلے ہی مل گئی تھی۔

✉ شائستہ جمال شاہ فیصل کالونی کراچی سے شریک احوال ہیں، لکھتی ہیں تمام پڑھنے اور لکھنے والوں کو سلام! اس دعا کے ساتھ کہ آپ لوگ جہاں کہیں رہیں خوش رہیں۔ کاشی چوہان کی تحریر کچھ اپنی باتیں بہت ہی دل کو لگیں۔ واقعی آج کل جو کچھ ہو رہا ہے کیا ہم انسان کہلانے کے لائق ہیں؟ سدرہ انور نے تحسین جونیجو کو ملکۂ احوال کا لقب کیا دیا کہ سب دعویدار آ گئے کسی کو سلطان تو کسی کو شہزادۂ احوال بننا ہے۔ اب یہ تو بات ہے محبت اور خلوص کی...... ویسے کسی نے سوچا کہ اتنی پیاری پیاری باتیں کرنے والی سدرہ کو بھی 'رانی احوال' ہونا چاہیے؟ کیوں قارئین...... مور شاہد حسین شاہد بہت شکریہ، کنول عمران آپ کو اور آپ کی بیٹی کو سال گرہ مبارک، عظمٰی شکور، حنا بشریٰ، فریدہ فری، مجید احمد کا تبصرہ قابلِ تعریف ہے، سچ بیانیوں میں محمد سلیم اختر کی 'دور کے ڈھول' جاوید راہی کی 'دکھ دہلیز کے' عارف رمضان کی 'انوکھا رشتہ' اچھی تحریریں تھیں۔ مقصود احمد بلوچ کی تحریر 'کشف' پڑھ کر تھوڑا سوچ رہی تھی کہ کیا آج کل ایسی محبت بھی ہوتی ہے؟ سلسلے وار کہانیوں میں ارشد علی ارشد کی 'ملھنی'، زبردست جا رہی ہے، 'ناگن' اعجاز احمد نواب کی بہت اچھے موڑ پر ہے۔ شعبان کھوسہ کی 'کانٹوں کی زمین' خوبصورت تخلیق تھی۔ تحریر میں ماحول کی عکس بندی بہت عمدہ تھی۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ سخن آباد میں تمام شعراء کا کلام پسند آیا۔ اب اجازت اپنا خیال رکھیے گا اللہ نگہبان۔

☆ پیاری شائستہ! مختصر تبصرہ بڑا جاندار رہا۔ اگلے ماہ آپ کی شاعری بھی سچی کہانیاں کا حصہ ہوگی۔

✉ ہیڈ بیکائنی، مظفر گڑھ سے یہ آمد ہے ہمارے ساتھی ملک عاشق حسین ساجد کی، ملک صاحب اپنی محبت کا اظہار 'احوال' میں کچھ یوں کر رہے ہیں۔ ستمبر کا شمارہ سچی کہانیاں دیدہ زیب سرورق کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ محترمہ منزہ سہام کا اداریہ دھرنا ہوگا اور آپ کا تحریر کردہ کچھ اپنی باتیں پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ویلڈن! احوال میں بھی تبصرے لاجواب تھے۔ مگر سدرہ انور علی، محمد یوسف لغاری، نصرت سرفراز، مریم شاہ بخاری، ممتاز احمد، کنول عمران، عظمٰی شکور، منشی محمد عزیز مئے نے کمال لکھے۔ جنہوں نے بڑی باریک بینی اور دُور اندیشی کے ساتھ بے لاگ تبصرے کے طور پر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ مجید احمد جائی، اشفاق بٹ، سید مبارک علی شمسی اور عبدالغفار عابد بھی اچھے اور معیاری خطوط کے ساتھ موجود تھے۔ صفدر علی حیدری و دیگر احباب جو کافی عرصہ سے نجانے کہاں غائب ہیں ان کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ سخن آباد بہت کمال کا جا رہا ہے مگر اس میں صفحات کی کمی ہمیشہ سے محسوس ہوئی۔ پلیز ہو سکے تو اس کی تعداد میں ایک صفحے کا اضافہ تو لازمی کریں تاکہ مزید شعراء کرام کا کلام شائع ہو سکے۔ کہانیوں کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار تو کر ہی دیا ہے مگر پھر بھی بہت معیاری کاوشیں ہیں۔ مجھ ناچیز کو جگہ دے کر تو میرا دل موہ لیا ہے۔ اس کے لیے تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

☆ دل تو بھائی آپ نے تبصرہ بھیج کر موہ لیا، صفدر علی حیدری غائب ہیں؟ صفدر علی خود اس بات کا جواب دیں گے۔

✉ ہمارے بہت پیارے ساتھی صفدر علی حیدری کی اوچ شریف سے آمد ہے۔ لکھتے ہیں، اب کی بار بھی ''سچی کہانیاں'' حسبِ معمول تاخیر سے ملا۔ عدیم الفرصتی کے سبب لگتا یہی تھا کہ اس بار خط نہیں لکھ پاؤں گا۔ اور اپنا خط نہ پا کر جو کوفت ہوئی اس نے اس ارادے کو مزید پختہ کر دیا تھا۔ لیکن برادرم سلیم اختر اور عاشق حسین ساجد کی تحریروں نے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ ان کی تحریروں کے علاوہ اداریہ اور احوال ہی پڑھ پایا ہوں۔ مور شاہد بھائی نے پیار بھرا شکوہ کیا کہ ان کا نام میرے خط میں کیوں نہیں آتا؟ تو سوچا اس بار دوستوں کو یاد کر لیا جائے۔ بات فقط اتنی ہے کہ احوال میں، میں نے ہمیشہ تحریروں پر تبصرہ کرنا مناسب سمجھا ہے۔ کیونکہ جو لوگ اتنی محنت سے اپنی تخلیقات بھیجتے ہیں ان پر تبصرہ نہ کرنا میرے نزدیک بہت بڑی زیادتی ہے۔ تحسین جونیجو کو میری تحریر پسند آئی...... بے حد شکریہ۔ عبدالغفار عابد کا بھی متشکر ہوں کہ انہوں نے اپنی پسند سے آگاہ کیا۔ حنا بشریٰ صاحبہ کو میری کہانی کا اینڈ اچھا لگا، سپاس گزار ہوں۔ ظفر علی کو تبصرہ پسند آیا جزاک اللہ۔ مور شاہد بھائی آپ کا خط خصوصی دلچسپی سے پڑھتا اور محظوظ ہوتا ہوں۔ آپ نے یاد کیا بہت اچھا

لگا، سلامت رہیں۔ امید ہے اب آپ کا شکوہ دور ہو گیا ہوگا۔ اپنے عزیز ترین دوست سید مبارک شمسی کو "سچی کہانیاں" میں تشریف آوری پر دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتا ہوں، جی آیاں نوں۔ یوسف لغاری میرے فیس بک فرینڈ ہیں۔ بڑے زندہ دل انسان ہیں۔ ان کو احوال میں دیکھ کر سچ میں دل کی کلی کھل اٹھی۔ پلیز اب آتے رہیے گا۔ نصرت سرفراز صاحبہ معروف کالم نگار ہیں۔ اکثر نیوز سائیٹس پر ان کے کالم دکھائی دیتے ہیں۔ ان سے درخواست ہے کہ اپنی حاضری کو با قاعدہ بنائیں۔ اشفاق شاہین کے لیے کہوں گا "بڑی دیر کر دی مہرباں آتے آتے"۔ ان کا دل پذیر تبصرہ دل کا بہت بھلا لگا۔ ان کی طرف سے پذیرائی پر دلی مسرت ہوئی۔ اسامہ ندیم کو میری کہانی اچھی لگی، بہت مہربانی۔ منشی محمد عزیز مئے کا بھی بے حد شکریہ کہ انہیں میری تحریر پسند آئی۔ مجید جائی بھائی کافی دنوں بعد دکھائی دیے۔ میری لیے بڑی خوش کن خبر ہے کہ ان کو میرا خط اور تحریر پسند آئی۔ جائی جی یہ میری دوسری طویل کہانی ہے۔ عظمیٰ شکور نے بڑی حوصلہ افزائی فرمائی، دل سے ممنون ہوں۔ کنول عمران خان کی تنقید کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ حازق ندیم کا شکر گزار ہوں کہ انہیں "عشق ہوش ربا" پسند آئی۔ لگتا ہے آنجناب اسامہ ندیم کے بھائی ہیں۔ ممتاز بھائی جیسے پیارے لکھاری کو میری کہانی پسند آئی، یہ بات میرے لیے اعزاز سے کم نہیں۔ امجد علی کا بھی شکر گزار ہوں۔ غلام رسول گل نے مجھے چوہدری بنا دیا، چلیں جیسے ان کی خوشی۔ برادرم سلیم اختر ایک خوبصورت تحریر کے ساتھ آئے۔ بڑی جاندار کہانی تھی۔ بہت بہت مبارک باد۔ لیکن افسوس وہ احوال میں دکھائی نہیں دیتے۔ یہ شکوہ تو ان سے ہے اور رہے گا۔ برادرم عاشق حسین ساجد ایک یادگار تحریر کے ساتھ آئے۔ لکھاری ساتھیوں سے معذرت کہ میں دیگر تحریریں تا حال پڑھ نہیں پایا۔ امید ہے کہ وہ بھی عمدہ تحریریں ہوں گی، جبھی تو شمارے کا حصہ بنی ہیں۔
اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچالے، اجازت چاہتا ہوں، اللہ نگہبان

☆ پیارے صفدر...... تبصرہ؟ خیر یار زندہ صحبت باقی، اپنا خیال رکھنا۔



✉ چیچہ وطنی سے عبدالغفار عابد، بہت محبت سے احوال میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں، سچی کہانیاں کے تمام قارئین ولکھاری اور اسٹاف کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ آپ سبھی ہمیشہ کی طرح ہنستے مسکراتے اور خوش و خرم ہوں گے۔ اپنے تبصرے کا آغاز محفلِ احوال سے ہی کرتا ہوں۔ میں نے سسٹر سدرہ کا خوبصورت خطاب بھی سن لیا اور عبدالعزیز جی آ کے سابقہ خطاب سے بھی محظوظ ہو چکا ہوں۔ میں دونوں کو مبارکباد دیتا ہوں خوبصورت خطاب پر۔ دونوں کے گلے شکوے سر آنکھوں پر، دونوں کی شکایت درست آپ ساتھیوں کی اجازت سے اپنی بات کا آغاز کرتا ہوں۔ آپ کو کسی ایک سے گلہ ہوگا کیا یہ محفل کسی ایک کی ہے؟ نہیں یہ احوال ہم سب کا ہے۔ اگر ہم نے آپس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا لیا تو اس محفل کا حسن پھیکا پڑ جائے گا۔ اس محفل کو چار چاند لگانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہر کسی کو درجہ بہ درجہ اہمیت دیں۔ یہاں ہم سب نے محبتیں تقسیم کرنی ہیں، یہ سوچے بغیر کہ دوسروں کا رویہ ہمارے ساتھ کیسا ہے۔ اگر ہم دوسروں کو بن مانگے خوشیوں کی مہک سے نوازیں گے تو یقینی امر ہے کہ ہمیں بھی خوشیاں ہی خوشیاں ملیں گی۔ اگر ہم انسانیت کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں تو آپس کی معمولی سے معمولی اور بڑی سے بڑی غلطیوں کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ یہی انسانیت کی معراج ہے۔ انسانیت کے حسن کو قائم رکھنے کے لیے ہی تو غصے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ عزیز جی آ شیخ اور کپتان والی ضد چھوڑیں۔ کامیاب مذاکرات کی امید لے کر احوال کی مذاکراتی ٹیم آپ کے کنٹینر میں آ رہی ہے، واک آؤٹ ختم کریں، اگلے ماہ آپ کی حاضری اس محفل میں ہونی چاہیے۔ سسٹر سدرہ آپ بہت اچھی ہیں۔ آپ کا لکھنے کا انداز بہت خوبصورت ہے۔ کیا آپ قارئین سمیت میرا سر فخر سے بلند دیکھنا چاہتی ہیں؟ اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے تو پھر اپنے قلم کو محبتوں کا پرچار کرنے کے لیے وقف کر دیں۔
کبھی غم کی آندھی جنہیں چھو نہ پائے ☆ وفاؤں کے ہم وہ نشیمن بنا دیں
محترم سلیم اختر 'محبت کی کسک' پسند کرنے کا شکریہ، آپ کے مشورے میرے لیے اعزاز کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہی

مشوروں پر عمل کر کے اچھا رائٹر بننے کی کوشش کروں گا۔ نصرت سرفراز حوصلہ افزائی کا شکریہ، میں تمام ساتھیو کا مشکور و ممنون ہوں جو میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ محترمہ باجی ام عادل بخاری اور سیدہ نورالعین زاہرہ اس محفل میں آپ کی کمی محسوس ہورہی ہے۔ دل تو کرتا ہے کہ کہانیوں پر تفصیلی تبصرہ کروں مگر کاشی بہت گھور گھور کے دیکھ رہا ہے، لہٰذا میں اپنا خطاب ختم کر کے آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔

☆ بہت پیارے غفار عابد! ہمیں لگا یہ تبصرہ آپ نے کنٹینر میں بیٹھ کر لکھا ہے اسی لیے خطاب کا رنگ نمایاں ہے۔ اس خطاب کو کہیں کہیں سے اڑانا پڑ گیا۔ اُمید ہے مائنڈ نہیں کرو گے۔



✉ جتوئی سے محمد جاوید پہلی بار احوال میں شریک ہیں لکھتے ہیں، کاشی بھائی ستمبر کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا منزہ جی کا اداریہ گہری فکر کی دعوت دے گیا۔ کچھ اپنی باتیں میں آپ نے یادگار باتیں کیں۔ سمیع اللہ خان سے انٹرویو دوشیزہ میں ہم پڑھ چکے بہت زبردست رہا۔ ماہ ستمبر میں دور کے ڈھول، دکھ دہلیز کے، گلابی دوپٹا، کانٹوں کی زمین، گل دستہ، روشنی کے مینار، یادگار تحریریں تھیں۔ انشاء اللہ ماہ پھر حاضر ہوں گا۔ میرا یہ چھوٹا سا خط ضرور شائع کیجیے گا۔

☆ پیارے جاوید خوش آمدید، اگلے ماہ تمہاری آمد کا انتظار رہے گا۔

ایس ایم ایس کے ذریعے احوال کا حصّہ بننے والے قارئین

اریب احمد۔ کراچی، عائشہ عمر۔ حیدر آباد، صبا دانش۔ چکوال، شمائلہ نوید۔ ٹنڈو الہ یار، کومل فرحان۔ گجرات، شاہین بی بی۔ خیر پختونخوا، حمیرا ظفر۔ رحیم یار خان، صفورہ احمد۔ سکھر، عالیان۔ کوئٹہ، شہزادی بانو۔ میلسی، عامر علی۔ فیوچر کالونی' کراچی، انیل قربان پٹھان۔ جامشورو، ماہین شاہ۔ چیچہ وطنی، برہان الدین۔ بھوربن، صاحبہ نور۔ سرگودھا، علی احمد۔ کوٹری، عقل زادہ۔ اپر دیر، ہمایوں شاہنواز خان۔ حب، سراج شیر خان۔ کراچی، شاعر عتیق۔ کراچی

ساتھیو! لیجیے اس ماہ کا احوال تو اپنے اختتام کو پہنچا اب آپ پڑھیے اور لکھیے گا کہ اس ماہ کا پرچہ آپ کو کیسا لگا؟ ان شاء اللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پھر سے ملاقات ہوگی۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

آپ سب کی دعاؤں کا طالب

کاشی چوہان

کھلی کچہری — آپ کے بے حد اصرار پر دھماکہ خیز خبر

سچی کہانیوں کے متوالو!

☆ کیا آپ کی بھیجی گئی کہانیاں شامل اشاعت نہیں ہوتی؟ ☆ کیا آپ کو ماہنامہ سچی کہانیاں دیر سے موصول ہونے کی شکایت ہے؟ ☆ کیا سچی کہانیاں آپ کے شہر میں دستیاب نہیں؟

اور اس طرح کے کئی سوالات اور درپیش مسائل پر بات کرنے کے لیے سرکولیشن منیجر آپ کے شہر میں بہت جلد موجود ہوں گے

رابطہ کریں فون کال یا بذریعہ ایس ایم ایس: 0300-2313256-0333-2269932

نوٹ: تمام ساتھی فیس بک پر سچی کہانیاں میں شامل ہو جائیں، تا کہ رابطہ مضبوط رہے۔

MONTHLYSACHCHEEKAHANIYAN@GMAIL.COM





گیس نِل

گیس نل لیجیے، تندرست محسوس کیجیے

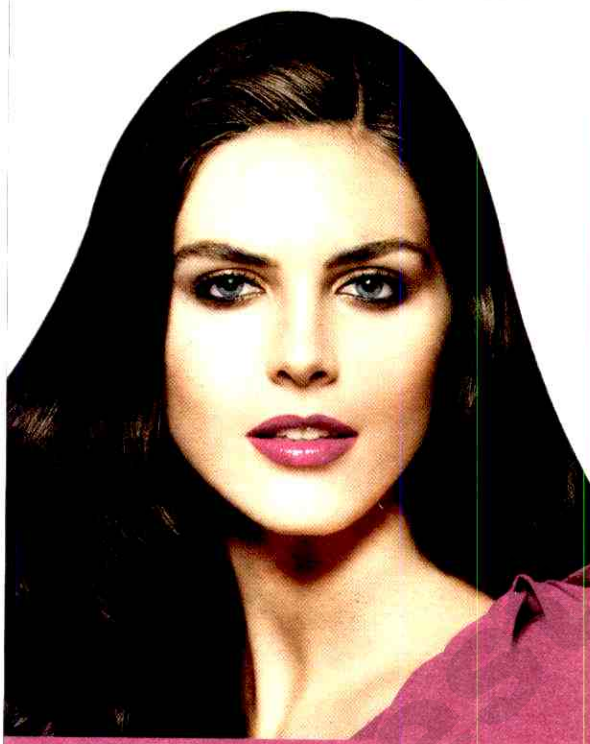
بدہضمی کے باعث معدے کا بھاری پن طبیعت میں اکتاہٹ پیدا کر دیتا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ آپ پر منوں بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ گیس نل کے چٹ پٹے ذائقے سے محظوظ ہوں اور اس بھاری پن سے نجات حاصل کریں۔







Marhaba Laboratories UAN: 111-152-152 www.marhaba.com.pk





MATTE
LIPSTICK
Medora



Medora
SEMI MATTE LIPSTICK



Medora
GLITTER LIPSTICK
Medora
NAIL POLISH
MEDORA OF LONDON



Glossy
Lipstick
Medora
Medora
NAIL POLISH

اس ماہ کی سچ بیانیاں

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے موصولہ، وہ سچ بیانیاں
جن کو پڑھ کر، اپنی مٹی کی خوش بُو، آس پاس محسوس ہوتی ہے

پہلی سچ بیانی

اب مرا انتظار کر



ایم اشفاق بٹ

لالہ موسیٰ سے ایک ایسی دوشیزہ کی بپتا جسے مذہب اور سگے رشتے تج کر بھی کوئی صلہ نہ ملا

میرا نام نیلم ہے میں نے ایک عیسائی گھرانے میں جنم لیا۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ ہمارے گھر کا ماحول آزاد خیال تھا۔ میرے ابو بہت مذہبی آدمی تھے۔ ہم سب گھر والے اتوار کو چرچ جایا کرتے تھے کیوں کہ ابو کا حکم ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ہمیں کوئی رعایت نہیں ملتی تھی۔ میری امی بہت سادہ اور گھریلو خاتون تھیں۔ ہماری رہائش ضلع گجرات کے ایک چھوٹے قصبے میں تھی......

میں نے قصبے کے ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ میں مزید پڑھنا چاہتی تھی، مگر ابو نے اجازت نہ دی۔ کیوں کہ کالج شہر میں تھا اور فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ میں نے مزید پڑھنے کی خواہش دِل میں ہی دفن کر دی اور گھر کے کام کاج میں دِل چسپی لینے لگی۔ مجھے میٹرک کیے ہوئے ایک سال گزرا تھا کہ ہمارے قصبے کے اسکول میں پی ٹی سی کی کلاسز شروع ہوئیں۔ میں نے بھی ابو کی اجازت سے داخلہ لے لیا۔ پی ٹی سی کا کورس میں نے بہت اچھے نمبروں میں پاس کر لیا اور ڈرتے ڈرتے ابو سے گزارش کی کہ مجھے کسی قریبی اسکول میں جاب دلوا دیں۔

مجھے نوکری کرنے کی کوئی مجبوری نہیں تھی کیوں کہ ابو کی قصبے کے بڑے بازار میں کپڑے کی دکان تھی۔ اس کے علاوہ ہماری زمین بھی تھی۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ میرا شوق دیکھ کر ابو نے کسی کی سفارش تلاش کی اور مجھے ایک پرائمری اسکول میں نوکری مل گئی۔

جس اسکول میں مجھے نوکری ملی وہ جگہ ہمارے قصبے سے کافی دور تھی اور وہاں ٹرین پر جانا پڑتا تھا، یہ سفر تقریباً آدھے گھنٹے کا ہوتا تھا۔ میں اسکول کے زمانے سے ہی برقع اوڑھتی رہی تھی۔ اب بھی میں برقعے میں ہی اسکول جایا کرتی تھی جو کہ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی تھا۔ لہٰذا میں سہ پہر تک واپس آ جاتی۔

میرا رنگ سانولا ہونے کے باوجود پُرکشش تھا اور یوں بھی جوانی میں تو عام سی لڑکی بھی حسین نظر آتی ہے۔

اویس میری خالہ کا بیٹا تھا وہ لوگ لاہور میں رہتے تھے چھٹیوں میں ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے۔ اویس انجینئرنگ یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ جب سے میں نے جوانی میں قدم رکھا تھا میں نے محسوس کیا تھا کہ اویس کی آنکھیں مجھے کوئی پیغام دیتی ہیں۔ اس کے دیکھنے اور باتیں کرنے کا انداز ہی بدل گیا تھا۔ مگر اس نے کبھی کھل کر اظہار نہیں کیا تھا۔ جہاں تک میری بات ہے مجھے اس میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔

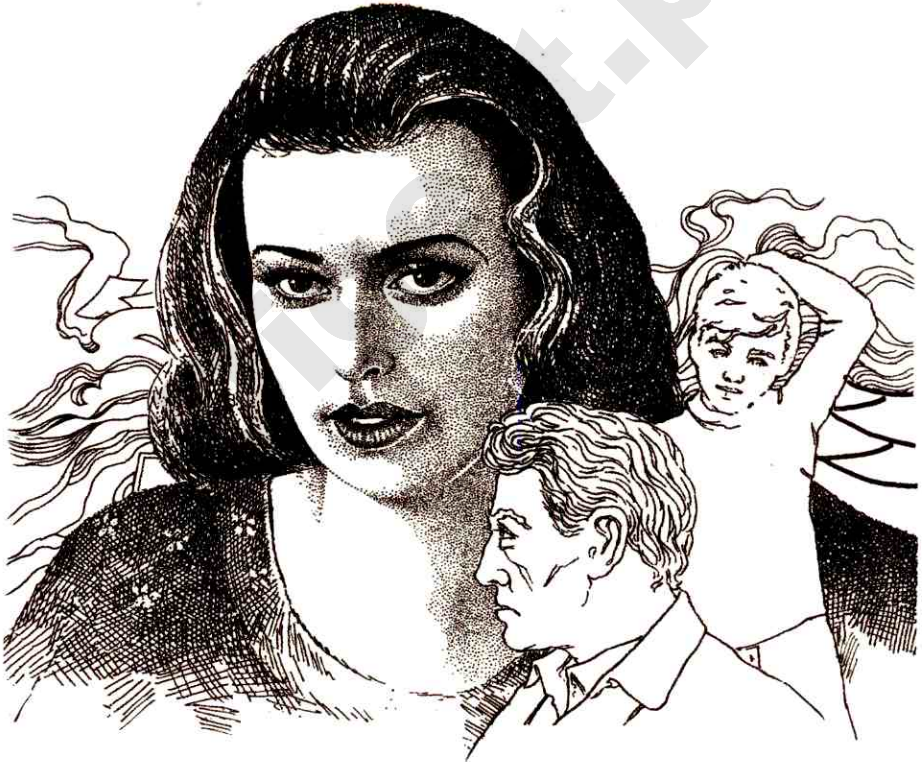
مجھے ملازمت کرتے چھ ماہ گزر چکے تھے۔ میں بہت

مطمئن تھی کہ اچانک میری زندگی میں ہلچل مچ گئی۔ میں جس ٹرین سے جاتی تھی وہ لوکل ٹرین تھی، ٹرین میں کھانے پینے کی چیزیں بیچنے کے لیے بہت سے لوگ آتے تھے۔ میں نے کبھی کسی کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ ویسے بھی یہ چہرہ نقاب میں ہوتا تھا۔ میں ایسے طریقے سے نقاب کرتی تھی کہ صرف میری آنکھیں نظر آتی تھیں۔ میں ٹرین میں بیٹھ کر کوئی نہ کوئی کتاب یا رسالہ پڑھنے لگتی اس طرح اِدھر، اُدھر دیکھنے سے بچ جاتی۔ ویسے بھی ٹرین میں بہت لوگ ایسے بھی ہوتے تھے جن کا تعلق قصبے سے اور ہمارے واقف کاروں سے ہوتا تھا۔ ابو سے ویسے بھی مجھے بہت خوف آتا تھا مگر ہزار بچنے کے باوجود عشق نے میرے دل پر دستک دے ہی دی۔

☆......☆

اس دن ٹرین میں بہت رش تھا۔ میں کھڑکی کے پاس والی الگ سیٹ پر بیٹھ کر ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی۔ ڈبے میں چیزیں بیچنے والوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں سب سے بے نیاز ڈائجسٹ کھولے، نیچے سر کیے بیٹھی تھی کہ اچانک آواز آئی۔

''مس جی! آپ پھل لیں گی۔'' میں نے چونک کر سر اوپر کیا۔ میرے قریب ہی ایک لڑکا کھڑا پھل بیچ رہا تھا۔ اس سے پہلے تو میں نے اسے وہاں نہیں دیکھا تھا کیوں کہ اتنے دنوں سے آتے جاتے سارے شکل آشنا تو ہو ہی جاتے ہیں۔ وہ شاید نیا آیا تھا، شکل اور حلیے سے وہ پھل فروش نہیں لگتا تھا، دوسری چیزیں بیچنے والوں میں وہ سب سے نمایاں لگ رہا تھا۔ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس وہ کسی کالج کا اسٹوڈنٹ لگ رہا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ کیوں کہ ابھی تک وہ میری طرف ہی متوجہ تھا۔ اچھا جی کہہ کر وہ دوسروں کو پھل دینے لگا۔



میں غیر ارادی طور پر اسے دیکھتی رہی۔ گاڑی میرے مطلوبہ اسٹیشن پر رُکی تو میں نیچے اُتر آئی۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے میں نے یونہی پلٹ کر دیکھا تو وہ لڑکا پلیٹ فارم پر کھڑا میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ میں تیزی سے آگے چل پڑی۔ اسکول میں اور گھر آ کر بھی میں اس کے بارے میں سوچتی رہی۔

پھر روزانہ وہ مجھے نظر آنے لگا ہر روز وہ دلکش مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے مجھ سے ضرور یہ سوال پوچھتا۔

''مس جی! پھل لیں گی؟'' اور ہمیشہ میرا جواب نفی میں ہوتا۔ آہستہ آہستہ وہ میرے دل ودماغ پر چھانے لگا۔

ایک دن کوئی اسے نام لے کر پکار رہا تھا اور یوں مجھے اس کا نام بھی معلوم ہوگیا۔ اس کا نام فاروق تھا۔ یوں ہی دو تین ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ میں نے محسوس کرلیا کہ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق آ جاتی ہے۔ حالاں کہ میرا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس دوران کرسمس کی چھٹیاں شروع ہوگئیں۔ میری سہیلیوں اور رشتے داروں کی طرف سے بھی کارڈ ملے اور پہلی بار مجھے اویس کی طرف سے مجھے کارڈ ملا۔ کارڈ کھولتے ہی میں حیران ہوگئی، بے حد خوب صورت چمکتا ہوا کارڈ تھا میں چند لمحوں کے لیے گم صم رہ گئی۔ پھر فاروق کا سراپا پوری آب وتاب کے ساتھ میری نگاہوں میں آ گیا۔ میں نے کارڈ بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔

☆......☆

فاروق سے روزانہ سامنا ہوتا اور میں دل کی شدید خواہش کے باوجود اس سے ایک لفظ نہ کہہ پاتی اور مجھے لگتا جیسے وہ بھی کچھ کہتے کہتے رک جاتا ہو۔ پھر ایک دن شاید اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اس دن میں پلیٹ فارم سے باہر نکلی تو مجھے لگا جیسے کوئی میرے پیچھے آ رہا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو فاروق تھا ایک دم دل کی دھڑکنوں میں شور مچ گیا۔ وہ میرے قریب آ کر بولا۔

''مس جی آپ سے ایک بات کرنی ہے۔''

''کیا بات ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''کسی غیر عورت کو مخاطب کرنا اچھی بات نہیں۔''

''آپ غیر تو نہیں ہیں۔'' وہ جذبوں سے بھرپور لہجے میں بولا۔

''دیکھو مجھے تنگ مت کرو۔ جاؤ یہاں سے۔'' میں نے اسے ڈانٹا۔

''مس جی! کیا آپ واقعی چاہتی ہیں کہ میں چلا جاؤں۔'' اس کے سوال پر میں خاموش رہ گئی۔ وہ پھر بولا۔ ''دیکھیں جی۔ میں ان پڑھ بندہ ہوں۔ بڑی بڑی کتابیں نہیں پڑھ سکتا، مگر یہ یقین سے کہتا ہوں کہ آپ کے دل میں میرا خیال رہتا ہے اور یہی حال میرا ہے۔'' اس نے سادگی سے اپنے دل کی بات کہہ دی، تو میں دنگ رہ گئی۔

''تم جانتے ہو میں کون ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''جانتا ہوں کہ آپ عیسائی ہیں مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ پیار کسی بھی مذہب کو نہیں مانتا۔ وہ صرف محبوب کو دیکھتا ہے، میں آپ کو حاصل کر کے رہوں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔ مگر مجھے ایک یقین دلا دیجیے کہ میرے جذبے یک طرفہ تو نہیں ہیں۔ مس جی...... میں آپ کے قابل تو نہیں ہوں، اَن پڑھ جاہل آدمی ہوں۔ گاڑی میں پھل بیچتا ہوں، پھر بھی وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو بہت خوش رکھوں گا۔''

فاروق کی باتیں سن کر میں خاموش رہ گئی۔ میری خاموشی میری رضامندی تھی۔ وہ خوب صورت سا شخص مجھ جیسی عام شکل وصورت کی لڑکی سے پیار کا اظہار کر رہا تھا۔ یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ جس آگ میں اتنے دنوں سے جل رہی تھی، اس کی تپش اس کے دامن تک پہنچ گئی تھی۔ میں تو پہلے ہی اس کے خیالوں میں جی رہی تھی۔ میری خاموشی کو میرا اقرار سمجھ کر اس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ پھر میں قدم بہ قدم محبت کے سفر پر آگے بڑھتی چلی گئی۔

☆......☆

ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی اس کے دوست کا گھر تھا، اس گھر کے ڈرائنگ روم میں ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اس کا دوست ہماری محبت کا رازدان تھا۔ ہم ہفتے میں ایک بار ملتے تھے۔ مستقبل کی ڈھیروں باتیں کرتے، محبتوں کی کہانیاں دہراتے۔ ایک بات جس نے میرے دل میں فاروق کی محبت کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ تنہائی میں ملنے کے باوجود فاروق نے مجھے چھونے کی یا تنہائی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور تو اور وہ تو مجھے کبھی تم بھی نہیں کہتا تھا۔ ایک بار میں نے اس سے

کہا کہ مجھے تم کہا کرو۔ تو کہنے لگا مس جی! جس دن آپ کو اپنا بنا کر اپنے گھر لے جاؤں گا۔ آپ کا نام بھی لوں گا۔ اور بے تکلفی سے بھی پکاروں گا۔ اس کی ایسی باتیں ہی تو مجھے دیوانہ بنا دیتی تھیں۔

میرا چہرہ کھلا کھلا رہنے لگا تھا۔ میری کولیگز کہتی تھیں کہ نیلم کے چہرے پر نکھار آ گیا ہے۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ یہ محبت کا خمار تھا جو میرے چہرے سے چھلکتا تھا۔

محبت تو خوشبو ہوتی ہے چھپائے نہیں چھپتی۔

عید آئی تو میں نے فاروق کے لیے خوب صورت سا کارڈ اور ایک سوٹ خریدا، محبوب کے لیے تو اپنا آپ بھی بیچ دینے کو دل چاہتا ہے اور جب میں نے اسے عید سے ایک روز پہلے اس کا گفٹ دیا تو وہ حیران رہ گیا۔

''نہیں مس جی۔ تحفہ مرد دیتے ہیں میں آپ سے کوئی چیز نہیں لوں گا۔''

''دیکھو فاروق! میں نے بہت شوق سے یہ سوٹ خریدا ہے۔ میری خواہش ہے کہ عید کی چھٹیوں کے بعد جب ہم ملیں تو تم نے یہ سوٹ پہنا ہو۔''

''ٹھیک ہے تو پھر میں بھی آپ کے لیے بھی سوٹ لاؤں گا۔'' وہ ضدی لہجے میں بولا۔

''اچھا بابا ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا تو وہ خوش ہو گیا۔

☆......☆

ایک دن اچانک اویس ہمارے گھر چلا آیا۔ امی ابو اور بچے اس کی آمد سے بہت خوش ہوئے کیوں کہ اس بار وہ کافی مہینوں کے بعد آیا تھا۔ شام کو میں باورچی خانے میں کھانا بنا رہی تھی کہ اویس وہاں آ گیا۔ کچھ دیر تو وہ میری جاب کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ پھر کہنے لگا ''نیلم امی تمہیں میرے لیے مانگنے آنا چاہتی ہیں۔ میں تمہاری رضامندی جاننے آیا ہوں۔ مجھے تمہارا جواب چاہیے۔'' اس کی بات نے مجھے ایک لمحے کے لیے خاموش کرا دیا۔ جب اس نے اصرار کیا تو میں نے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز باتوں ہی باتوں میں، میں نے اس کہا۔

''دیکھو اویس تم بہت اچھے ہو تم میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے یقیناً کوئی بھی لڑکی تمہاری رفاقت پر ناز کرے گی، مگر میں نے کبھی تمہارے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا۔ شاید تمہیں میری بات ناگوار گزرے مگر کبھی تمہیں احساس ہو جائے گا کہ زبردستی کے بندھن پائیدار نہیں ہوتے۔ پلیز تم خالہ جان کو خود ہی منع کر دینا۔''

میری بات سن کر اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ مجھے دُکھ بھی ہوا، مگر میں اپنے دل کا کیا کرتی۔ جو صرف اور صرف فاروق کے نام سے دھڑکتا تھا۔ میری بات سن کر وہ دوسرے دن واپس چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے مجھ سے ملنا تو کیا کلام تک نہیں کیا۔ میں جانتی تھی کہ اس کے دل کو ٹھیس پہنچی ہے۔ شاید ہم انسانوں کا المیہ یہی ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں وہ ہمیں ملتا نہیں۔

میں اور فاروق آنے والے وقت سے بے خبر محبت کی راہ پر آنکھیں بند کیے، گامزن تھے کہ ایک دن ایسا حادثہ پیش آیا کہ میری زندگی کا رُخ یکسر بدل گیا۔

☆......☆

اس دن دس بجے کا وقت تھا۔ میں اور فاروق اس کے دوست کے گھر میں تھے۔ ہم کافی دنوں کے بعد ملے تھے۔ فاروق کے شدید اصرار پر میں اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ ہم باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کبھی بھی برقع نہیں اُتارا تھا چہرے کا نقاب نیچے کر لیتی تھی فاروق کی محبت سے لبریز آنکھیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ میں دھڑکنوں کو سمیٹنے میں ناکام ہو رہی تھی کہ اچانک باہر والا دروازہ دھڑ ادھڑ بجنے لگا۔ فاروق نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو دو پولیس والے اندر گھس آ گئے۔

''اوئے یہاں بدمعاشی ہو رہی ہے، پولیس والے نے آتے ہی فاروق کو گریبان سے پکڑ لیا۔

''نہیں جی! ہم تو ضروری بات، یہ میری منگیتر ہیں جی۔'' فاروق کی زبان سے لڑکھڑا کر لفظ نکلے۔

''اوئے منگیتر کے بچے، گھر میں ملنے کا وقت نہیں ملتا۔ اوئے ہم نے بڑے دنوں سے تم پر نظر رکھی ہوئی تھی، کھلے عام فحاشی پھیلا رہے ہو۔ کوئی حیا نہیں ہے۔'' پولیس والے کی زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی چل رہے تھے۔ میں تو سن ہو کر رہ گئی جیسے بدن سے سارا لہو نچڑ گیا ہو۔

''چلو بی بی تم بھی تھانے۔ عشق کرنے کا بڑا چسکا ہے تم عورتوں کو۔'' اس نے بدتمیزی سے میرا ہاتھ پکڑا۔ پھر ہم دونوں کو پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔ باہر بہت سے

لوگوں نے ہماری رُسوائی کا تماشا دیکھا۔ تھانے میں مجھے تو ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔

مگر فاروق کو ایک کونے میں کھڑا کر دیا گیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے نظریں نہیں ملا پا رہے تھے۔ پھر قدرت کو شاید ہم پر ترس آ گیا۔ فاروق کے والد صاحب تھانے سے ہمیں ضمانت پر رہا کروا کر لے آئے۔ باہر آ کر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگے۔

''بیٹی تم گھر جاؤ باقی کے معاملات بعد میں دیکھیں گے۔'' میں ٹرین میں بیٹھ گئی۔ شام ہونے والی تھی، مجھے یہ فکر تھی کہ امی ابو بہت پریشان ہو رہے ہوں گے۔

آج تک مجھے اتنی دیر کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ کسی طرح کا بہانا بنالوں گی۔ مگر میری رُسوائی کی داستان مجھ سے پہلے میرے گھر تک پہنچ گئی تھی۔ جونہی میں نے دروازے سے اندر قدم رکھا ابو کی آواز آئی۔

''انہی قدموں سے واپس لوٹ جاؤ۔ اس گھر میں اب تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم ہمارے لیے مرگئی ہو۔'' میں روتی ہوئی امی کی طرف بڑھی مگر ماں نے بھی مجھے دھتکار دیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ شام گہری ہونے لگی تھی۔ میرے والدین نے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ میں روتی رہی آوازیں دیتی رہی اور معافیاں مانگتی رہی مگر کسی نے میری صدا نہ سنی۔

مانا کہ میری غلطی بہت بڑی تھی۔ میں نے والدین کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔ مگر جب میرے اپنے ہی مجھے معاف کرنے کو تیار نہیں تھے جنہوں نے مجھے پیدا کیا تھا۔ تو میں غیروں سے کیا امید کرتی۔ ساری رات میں اپنے گھر کے دروازے پر پڑی رہی جونہی صبح کا اُجالا بکھرنے والا تھا تو میں اُٹھی اور ایک الوداعی نظر گھر پر ڈال کر وہاں سے چلی آئی۔

اسٹیشن پر پہنچی تو ابھی گاڑی نہیں آئی تھی۔ میں کل سے بھوکی پیاسی تھی۔ ویٹنگ روم میں بیٹھ کر گاڑی کا انتظار کرنے لگی۔ گاڑی آئی تو میں گاڑی میں سوار ہوئی تو سامنے فاروق نظر آیا۔ میری حالت دیکھ کر شاید وہ سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر دوست کے گھر گیا۔ اس کے دوست کی بیوی بھی موجود تھی۔ میں نے اسے اپنے ماں باپ کے رویے کے بارے میں بتایا، وہ باہر نکل گیا تھوڑی دیر کے بعد اپنے والد غلام مصطفیٰ صاحب کو ساتھ لے کر آیا اور وہ مجھ سے کہنے لگے۔

''فاروق نے مجھے سارے حالات سے آگاہ کر دیا ہے۔ تم میری بیٹی کی طرح ہو۔ اب بتاؤ کیا چاہتی ہو۔ میں تمہیں ان حالات میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔''

میں نے صرف ایک لمحہ سوچا اور فیصلہ کر لیا۔

''میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔'' میرا لہجہ اتنا فیصلہ کن تھا کہ غلام مصطفیٰ صاحب چند لمحے میرے چہرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ پھر بولے۔

''بیٹی تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ اب کسی قسم کی فکر نہ کرنا۔''

پھر شام سے پہلے پہلے میں اسلام قبول کر چکی تھی اور میرا نکاح فاروق کے ساتھ ہو چکا تھا۔ فاروق ہوٹل سے کھانا لایا۔ ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ تو میرے سسر غلام مصطفیٰ صاحب ہم کو ساتھ لے کر گھر آ گئے۔ میرے دل کی عجیب سی کیفیت تھی۔ خوشی فاروق کو پا لینے کی تھی اور دُکھ والدین کو چھوڑنے کا۔ گھر میں میری ساس نے بڑی ناگواری سے میرا استقبال کیا۔

فاروق مجھے ایک کمرے میں بٹھا کر چلا گیا۔ باہر پتا نہیں کیا کیا باتیں ہوئیں کہ اتنے میں میری ساس ایک سوٹ ہاتھ میں پکڑے آئی اور بولیں۔

''یہ لو دلہن۔ کپڑے پہن لو۔'' ان کے یہ الفاظ مجھے نیا حوصلہ بخش گئے۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے، بال سنوارے، وہ کمرہ بہت سادہ اور سستی اشیاء سے سجا ہوا تھا۔ ظاہر ہے ایک پھل فروش کی آمدنی کتنی ہو سکتی ہے۔ ایک الماری میں مجھے میک اپ کا سامان نظر آیا، پتا نہیں کس کا تھا بہر حال میں نے ہلکا ہلکا میک اپ بھی کر لیا۔ فاروق کمرے میں آیا۔ آج پہلی بار میں بغیر برقعے کے اس کے سامنے تھی۔ وہ مسکرایا تو میری نظریں جھک گئیں۔

بہت کچھ گنوا کر میں نے اپنی محبت پالی تھی اور میں اسے خسارے کا سودا نہیں سمجھتی تھی۔ فاروق کی رفاقت اتنی خوب صورت اور بھرپور تھی کہ میں ساری تلخیاں بھول گئی۔ رات دن اتنے حسین ہو گئے کہ مجھے یوں لگتا جیسے میں نے نیا جنم لیا ہو۔ مسلمان ہونے کے بعد عجیب سا

اطمینان اور سکون میرے دل میں اُتر آیا تھا۔ میں اپنے سسر جنہیں میں ابا جی کہنے لگی تھی۔ ان سے قرآن پاک پڑھنا اور نماز سیکھنا شروع کردی تھی۔ میری ساس اگرچہ میرے ساتھ اچھی تھیں۔ مگر ایک بات میں نے نوٹ کرلی تھی کہ وہ میرے ہاتھ سے کچھ کھاتی پیتی نہیں تھیں اور مجھے باورچی خانے کا کام بھی نہیں کرنے دیتی تھیں۔ بڑے پیار سے مجھے باورچی خانے سے باہر نکال دیتیں۔ مگر اس بات کا مجھے کوئی گلہ نہیں تھا شاید وہ سمجھتی تھیں کہ میں نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا۔

میں فاروق کی رفاقت میں خوش تھی۔ محبوب کا قرب سارے دُکھ درد مٹا دیتا ہے۔ میں نے اسکول سے پندرہ دن کی چھٹی لی ہوئی تھی۔ فاروق مجھے لاہور سیر کے لیے لے گیا۔ ہم نے اپنا ہنی مون خوب انجوائے کیا۔ گھر لوٹے تو میری چھٹی ختم ہو چکی تھی۔

رات کو سب کھانے کے لیے بیٹھے تھے کہ ساس بولیں۔

''فاروق اب نرگس کو بھی گھر لے آؤ ڈیڑھ ماہ ہو گیا ہے اسے میکے گئے ہوئے۔'' فاروق گڑبڑا گیا۔

''نرگس کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں اس نے بتایا نہیں نرگس اس کی بیوی ہے اور ایک چھ ماہ کا بیٹا بھی ہے اس کا۔''

ایک بم تھا جو میرے حواس پر گرا۔ میں اُٹھ کر کمرے میں آ گئی۔ فاروق میرے پیچھے کمرے میں آ گیا۔ میں رونے لگی۔ فاروق کہنے لگا۔ ''میں نے تمہیں اسی لیے نہیں بتایا تھا کہ تم ناراض نہ ہو جاؤ اور میری محبت ٹھکرا نہ دو۔ نرگس میری ماں کی پسند ہے اور تم میری چاہت ہو۔ میرا پیار ہو۔ پلیز رونا بند کرو۔ میں واقعی تمہارا مجرم ہوں۔ جو جی چاہے سزا دے لو۔''

میں خاموشی سے روتی رہی وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔

''نیلم میں صرف تمہارا ہوں۔ تم میری زندگی ہو ایک بار معاف کردو، میں قسم کھاتا ہوں کہ تمہارا مقام نرگس سے زیادہ ہوگا۔ میں اسے چھوڑ سکتا ہوں مگر میرا بیٹا میری کمزوری ہے۔'' میں سوچنے لگی کہ مرد کیسے کیسے جواز تلاش کرلیتا ہے۔ اب نرگس گھر واپس آ رہی تھی تو میں بھلا کیا کرسکتی تھی۔ واپسی کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔

''اچھا اب مسکرادو۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر بولا تو میں پھیکی

خواہش

حضرت ابوتراب بخشیؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جنگل میں مجھے انڈا روٹی کھانے کی خواہش ہوئی اور میں راستہ بھول کر ایسی جگہ پہنچا جہاں کچھ اہل قافلہ شور مچا رہے تھے اور مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''اسی نے ہمارا سامان چرایا ہے۔''

یہ کہہ کر چھریوں سے مجھ پر حملہ آور ہو گئے۔ ایک بوڑھے نے مجھے شناخت کر کے کہا۔ ''یہ چوری نہیں کرسکتے۔ یہ تو بہت بڑے بزرگ ہیں۔'' یہ سن کر سب معافی مانگنے لگے۔ اس پر میں نے کہا۔

''مجھے کوئی شکوہ نہیں اس لیے کہ آج میرے نفس کو خوب ذلت کا سامنا ہوا۔''

پھر اس بوڑھے نے گھر جا کر میرے سامنے انڈہ روٹی پیش کیا۔ جب مجھے کھانے میں ہچکچاہٹ ہوئی تو ندائے غیب آئی۔

''تجھے خواہش کی سزا مل گئی ہے اب کھانا کھالے۔''

مرسلہ: ام حبیبہ۔ چک شہزاد، اسلام آباد

سی ہنسی ہنس دی۔

''شکر ہے خدا کا، میری سزا معاف ہوئی۔'' وہ میرا ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر بولا تو میں دیکھتی رہ گئی۔

☆......☆

دوسرے دن میں اسکول سے لوٹی تو ایک لڑکی بیٹھی تھی میں سمجھ گئی کہ یہی نرگس ہے۔ اس کی گود میں بچہ تھا۔ وہ سرخ و سفید رنگ کی بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ شادی شدہ لگتی نہیں تھی۔ میں حیران رہ گئی کہ اتنی خوب صورت بیوی کے ہوتے ہوئے فاروق نے مجھ سے شادی کیوں کی۔ مگر شاید انسانی ذہن کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

نرگس مجھے بہت اچھے طریقے سے ملی۔ اپنا بیٹا میری گود میں ڈال کر بولی۔ ''اب یہ تمہارا بیٹا ہے۔'' میں اس کے خلوص اور محبت سے بہت متاثر ہوئی۔ اپنے کمرے میں گئی تو میرا سامان وہاں نہیں تھا۔ فاروق اندر آیا اور کہنے لگا یہ کمرہ اصل میں نرگس کا ہے۔ ہم دوسرے کمرے میں رہ لیں گے۔'' اور دوسرا کمرہ وہ اسٹور تھا جہاں گھر کا فالتو سامان رکھا تھا۔ فاروق نے میرے ساتھ مل کر پرانا سامان باہر نکالا اور جو تھوڑا بہت سامان تھا، بیڈ پر اب نرگس کا حق

تھا مجھے ایک پرانی سی چارپائی دی گئی۔ اس دن تو میں نے گزارہ کرلیا دوسرے دن میں فاروق کے ساتھ بازار جا کر دو چارپائیاں اور بغیر کسی اور ضرورت کا دوسرا سامان خرید لائی۔ اتنا خرچا ہوجانے پر فاروق کا موڈ خراب ہوگیا۔ مگر میں کیا کرتی اب زندگی کا ایک اور رخ میرے سامنے تھا۔

نرگس بظاہر زبان سے بہت اچھی تھی مگر آہستہ آہستہ گھر کا سارا کام میرے سپرد ہوگیا۔ میں اسکول جانے سے پہلے بھی کام کرتی اور واپس آ کر جبکہ میرا تھکن سے بُرا حال ہوتا۔ ڈھیروں کام میرے منتظر ہوتے۔ فاروق ایک رات میرے کمرے میں سوتا اور ایک رات نرگس کے کمرے میں۔ یہ انصاف اس نے خود ہی طے کرلیا تھا، لیکن اس بات کا خیال اسے نہیں آتا تھا کہ میں نوکری بھی کرتی ہوں اور گھر کا سارا کام بھی۔

نرگس ایک جاہل اور ان پڑھ لڑکی تھی مگر میں دیکھتی تھی کہ وہ شام ہوتے ہی جب فاروق کے آنے کا ٹائم ہوتا نہا دھوکر ہلکا سا میک اپ کرلیتی۔ بچے کو بھی خوب سنوارتی۔

وہ گوری چٹی تھی۔ خوب صورت تھی۔ خوب صورت نظر آتی جبکہ میں تو پہلے ہی سانولی تھی پھر اسکول میں پڑھانا اور گھر آ کر تھکاوٹ کی وجہ سے کام بھی کرنا اس سے میرا رنگ اور بھی کالا ہوگیا۔ میک اپ کا مجھے ہوش نہیں تھا۔

پھر میں امید سے ہوگئی، فاروق اور میری ساس سسر اب تھوڑا بہت خیال کرنے لگے تھے۔ میں خوش تھی کہ ایک بار پھر فاروق کے انداز میں وہی وارفتگی لوٹ آئی تھی۔ مگر یہ وقتی ثابت ہوا میں نے جڑواں بیٹیوں کو جنم دیا۔

میرا دو بیٹیاں ایک ساتھ پیدا کرنا تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔ فاروق مزید لاپروا ہوگیا۔ اسے صرف میری تنخواہ سے دلچسپی تھی۔ ہر ماہ وہ ساری رقم لے لیتا اور پھر خود خرچ کرنے کے لیے دیتا۔ میں یہ بھی برداشت کرتی رہی مگر بچوں کی ضروریات بہت تھیں۔ مجھے بار بار فاروق کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا۔ فاروق خود جو کماتا تھا اس میں سے مجھے آج تک کچھ نہیں ملا تھا۔ میں اپنی محبت سے مجبور تھی، ہر زیادتی برداشت کرتی رہی۔ گھر پر مکمل کنٹرول نرگس کا تھا۔

ایک ان پڑھ لڑکی مجھے بڑی خوب صورتی سے مات دے رہی تھی۔ پھر ایک سال نرگس نے پھر ایک بیٹا پیدا کردیا تو سب اس کے ناز اُٹھاتے نہ تھکتے۔ میں حیران ہوکر دیکھتی کہ یہ وہی فاروق ہے جو میرے لیے کبھی ایک سوٹ تک نہ لایا تھا اب نرگس اور بچے کے لیے ڈھیروں چیزیں لے کر آتا اور میری بیٹیاں ویسے ہی رہتیں۔ صرف میرے سسر تھے جو میرا تھوڑا بہت ساتھ دیتے تھے۔ میری بیٹیوں سے بہت لاڈ پیار کرتے تھے۔

فاروق اب مکمل طور پر مجھ سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ محبت کا تاج محل اتنی جلدی گر جائے گا میرے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ میرا دل تو آج بھی فاروق کے لیے دھڑکتا تھا اس کے لیے میں نے سب کچھ چھوڑا تھا، مگر وہ ستم گر تو یوں لگتا تھا جیسے اسے میرا وجود نظر ہی نہیں آتا تھا۔ میری شادی کو پانچ سال کا عرصہ گزر گیا۔ میں بے حسی کی چادر اوڑھے ہوئے دن کاٹ رہی تھی۔ فاروق کبھی کام پر جاتا کبھی نہ جاتا۔ میری تنخواہ اچھی خاصی تھی اس سے گھر کا خرچہ چلتا تھا۔ مجھے لگی بندھی رقم ملتی تھی مگر اب بچیاں بڑی ہورہی تھیں۔ خرچے بہت بڑھ گئے تھے، مگر میں پھر بھی خاموش تھی کہ محبت کرنا آسان ہے نبھانا مشکل۔ فاروق نے بالکل ہی مجھے بھلا دیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا کہ فاروق کوئی اجنبی ہے۔

میں نہیں چاہتی تھی کہ لوگ کہیں کہ ماں باپ گھر بار اور مذہب کو چھوڑنے کے باوجود دونوں کی نہیں بنتی۔ میں نے خدا سے لو لگالی۔ پانچ وقت کی نماز ادا کرنے لگی۔ کبھی کبھار فاروق میری طرف لوٹتا تو میری بے حسی زیادہ دیر میری طرف متوجہ نہ رہنے دیتی۔ اس کی بے وفائی نے میرے دل پر بہت گھاؤ لگائے تھے۔ اب تو صرف زبردستی کا نباہ تھا۔ شاید میں اس بے حسی میں زندگی گزار دیتی کہ ایک واقعہ مجھے اندر تک ہلا گیا۔

☆......☆

چھٹی کا دن تھا میں کپڑے دھو رہی تھی۔ سردیوں کے دن تھے دونوں بچیاں اور نرگس کا بیٹا کھیل رہے تھے۔ فاروق بھی گھر میں موجود تھا کھیلتے کھیلتے بچوں میں شاید لڑائی ہوگئی۔ نرگس کا بیٹا رونے لگا میں نے پلٹ کر دیکھا تو بچیاں سہمی کھڑی تھیں۔

''کیا ہوا ہے؟'' فاروق قریب آ کر بولا۔
''اُس نے مارا ہے۔'' بچے نے میری بیٹی کی طرف اشارہ کیا۔ فاروق نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بچی کے منہ پر اتنے زور سے تھپڑ مارا کہ وہ دیوار سے جا ٹکرائی۔ اس کے سر سے خون ابلنے لگا۔ بجائے اس کے کہ وہ آگے بڑھ کر دیکھتا ایک اور تھپڑ دے مارا۔ بچی زمین پر گری اور شاید بے ہوش ہوگئی، میں تڑپ کر اُٹھی اور بچی کو بانہوں میں لے لیا۔ نرگس کی طرف دیکھا تو اس کی فاتحانہ مسکراہٹ نے میرے اندر آگ لگادی۔
میری ساس اور نرگس تماشا دیکھ رہی تھیں۔ دادی کی بے حسی پہ میرا دل مَسل گیا۔ فاروق پریشان سا کھڑا تھا۔ میں نے جلدی سے چادر اوڑھی اور بچی کو ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر نے پٹی وغیرہ کر کے دوائی دے دی۔ میں گھر لوٹی تو سب صحن میں ہی بیٹھے تھے۔
''کیا حال ہے اب اس کا۔''
میری ساس نے رسماً پوچھا۔
''بچ گئی ہے۔'' میں نے فاروق کی طرف دیکھ کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ وہ خاموشی سے بیٹھا تھا۔
اس رات میں نے کھانا نہیں بنایا تھا۔ بچی کے ساتھ لیٹی رہی۔ میرے دل و دماغ میں جیسے آندھیاں چل رہی تھیں۔ فاروق پر اتنا شدید غصّہ آ رہا تھا کہ کس قدر بے حس ہوگیا ہے۔ اپنی اولاد پر اتنا ظلم۔ صرف اس لیے کہ وہ بیٹیاں ہیں۔ رات کو میرے سسر میرے لیے کھانا لے کر آئے میں نے انکار کردیا کہنے لگے۔ ''بیٹی تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہورہی ہے مگر میں مجبور ہوں۔ میں اب بوڑھا اور بیمار ہوگیا ہوں تو میری اولاد اور بیوی میری بات نہیں سنتے۔''
''مگر میں اب مزید زیادتی برداشت نہیں کروں گی۔'' میں نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ وہ خاموشی سے کھانا اُٹھا کر چلے گئے۔ رات کو بچی بخار میں جھلسنے لگی۔
میں ساری رات جاگتی رہی، کوئی بچی کا حال تک پوچھنے نہ آیا اور تو اور باپ بھی سنگدل نکلا۔ دوسرے دن میں نے سسر کو بچی کے پاس بٹھایا اور اسکول آ گئی۔ وہاں میں نے اپنی کولیگ سے بات کی شام تک میں نے کرائے پر ایک کمرہ اور کچن باتھ والا گھر لے لیا۔ مزدور کو ساتھ لے کر آئی۔ مزدور سامان نکالنے لگا سب حیرت سے دیکھنے لگے آخر فاروق نے پوچھا۔
''نیلم یہ سب کیا ہورہا ہے۔''
''میں یہ گھر چھوڑ کر جارہی ہوں۔'' میں نے سختی سے کہا۔
''میں نے تمہارے لیے سب کچھ چھوڑا، ماں باپ گھر بار، مذہب ساری کشتیاں جلا کر تمہارے پاس آئی۔ یہاں آکر بھی میں نے ہر طرح تمہارا ساتھ دیا۔ تم نے ہر طرح سے میرے ساتھ ناانصافی کی۔ تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے تھے۔ کہاں گئی تمہاری محبت، وہ بڑے بڑے دعوے۔ میں نے اپنی ذات کی نفی برداشت کی مگر تم نے بے حسی کی حد کردی اپنی اولاد سے بیگانوں والا سلوک کررہے ہو۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتی ہوں۔ مگر جن کے لیے یہ اذیتیں سہہ رہی ہوں اگر ان کا اس گھر میں کوئی مقام نہیں ہے تو میں یہاں مزید نہیں رہ سکتی۔ تم اپنی بیوی اور بیٹوں کے ساتھ خوش رہو۔ میں جارہی ہوں۔ اگر تمہیں میری ضرورت ہوئی یا کبھی سمجھو تو مجھے لینے آجانا۔'' فاروق خاموش کھڑا تھا، میں گھر سے نکل آئی میری دونوں بیٹیاں میرے ساتھ تھیں۔

☆......☆

آج میں تنہا زندگی گزار رہی ہوں مجھے گھر سے آئے ہوئے تین سال گزر چکے ہیں۔ میں نے ایک اچھا مکان کرائے پر لے رکھا ہے۔
میری دونوں بیٹیاں ایک بہت اچھے انگلش اسکول میں پڑھ رہی ہیں۔ میری تنخواہ اتنی ہے کہ میں مہینے کے اخراجات کے علاوہ بچت بھی کرلیتی ہوں۔ میرے سسر آتے رہتے ہیں ان کی زبانی پتا چلتا رہتا ہے کہ اب گھر کا خرچ پورا کرنے کے لیے فاروق دو جگہ کام کررہا ہے کیوں کہ ذرا ذرا سی بات پر نرگس میکے چلی جاتی ہے۔
میرے سسر کا کہنا ہے کہ فاروق اب پچھتا رہا ہے۔ مجھے واپس لے جانا چاہتا ہے مگر اسے انا روک رہی ہے۔ اور میں یہ سن کر سوچتی ہوں کہ آخر ایک نہ ایک دن فاروق کو آنا ہی پڑے گا۔
اگر عورت محبت میں اپنا آپ قربان کرسکتی ہے تو یہ ہی محبت مرد کو اپنے سامنے جھکا بھی سکتی ہے۔

☆☆......☆☆

دوسری سچ بیانی



یقین، منزل ہے

عالیہ حرا

ایک کمزور دوشیزہ کے مضبوط عزم کی کہانی کراچی سے

''تو تم یہاں محفوظ ہو۔''
میں نے رسولاں کے برابر میں بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔
''ہاں۔!!'' اُس کے لہجے میں اعتماد تھا۔
''میں اپنی جان بچا کر بھاگ کر آئی ہوں۔ اپنی جان بچانا ہر ذی روح کا حق ہے اور اپنا حق استعمال کرنا ہر آزاد انسان کا۔ اسلام بھی ہمیں اس بات کی اجازت دیتا ہے۔''
اُس کا نام مہراں تھا وہ ڈری سہمی ہوئی نہیں تھی بلکہ اُس کے لہجے میں اعتماد تھا اور میں حیران تھا وہ پڑھی لکھی نہیں تھی، مگر اُس کی باتیں پُر اعتماد اور فہم والی تھیں۔
''وہ لوگ یہاں آ گئے تو......!'' میں نے جانچا۔
''جس خدا نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے وہی میری حفاظت کرے گا۔''
''تم کیسے ثابت کرو گی کہ تم نے جرم نہیں کیا۔''
''میرا یہاں ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے وکیل صاحب کہ میں بے قصور ہوں، اور میں دوسروں کے جرم کی سزا کیوں بھگتوں؟ میں خود پر لگے کاری کے الزام کو غلط ثابت کروں گی۔''
اُس کے لہجے میں کچھ خاص تھا۔ اُسے زندگی پر اعتماد تھا۔ مگر وہ اس کے پیچھے بھاگ کر آنے والے لوگ......

اسے کاروکاری کا الزام میں قتل کی پلاننگ کرتے لوگ، اپنا جرم دوسروں کے سر تھوپنے والے قبائلی لوگ تو سنتے ہی نہیں ہیں کر گزرتے ہیں۔ بس اک گولی ہی تو چلانی ہوتی ہے اپنا جرم دوسروں پر ڈالنے کے لیے، قصہ ختم......
کاروکاری کی سنگین قبیح رسم......
میں نے قلم میز پر رکھ کر گہرا سانس لیا۔
جس کا شکار اک اور کمزور لڑکی ہونے جا رہی تھی۔
کمزور! میں نے مہراں کے دھان پان سے وجود کی جانب نگاہ کی۔
بظاہر وہ کمزور تھی مگر اندر سے بہت مضبوط تھی۔
اسے اپنے بھائیوں سے نفرت تھی جو اسے کاری ثابت کرنے پر تُل گئے تھے تاکہ خود بچ جائیں۔
اور مہراں کہہ رہی تھی کہ اُسے اپنے بھائیوں سے نفرت ہے۔ ماں ہوتی تو بچا لیتی۔ ڈھال بن جاتی، مگر ماں کو باپ کے شک نے کھا لیا اور بھائی اسے کمزور جان کر کھا کر ہضم کر لینا چاہتے تھے۔''
''بہنیں تو بھائیوں کو بہت پیاری ہوتی ہیں پھر تم ہو بھی اکلوتی؟''
میں نے بغور اُسے دیکھا۔ اُس کے ابرو تن گئے، میں لوگوں کے چہروں کو پڑھنے کے لیے ان کے چہرے کی

لکیروں کا جائزہ لیتا ہوں۔
سچ یا جھوٹ جان لیتا
ہوں۔

''لالچ،
طمع، ہوس،
جائیداد کا بٹوارہ
اور اُن کی تنگ
نظری وہ سب کچھ خود
ہضم کر لینا چاہتے ہیں
اور مجھے حرام موت مار دینا
چاہتے ہیں۔ دنیا میں بھی
بے بس رہوں اور آخرت بھی
خوار ہو جائے۔''

اُس کے لہجے میں پھنکار تھی، آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں، میں اُس سے متاثر ہو رہا تھا۔

''صرف کتابیں پڑھنے سے علم نہیں آتا۔ کچھ شعور بھی باہوش کر دیتا ہے جی۔ اپنی حفاظت میں شہر میں رہ کر لوں گی گاؤں میں نہیں۔'' پاؤں سمیٹ کر اُس نے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے، وہ رحمت بوا کے ساتھ بیٹھی تھی، رحمت بوا ہی اسے چھپا کر گاؤں سے لائی تھی۔

''مگر میں تو معمولی سا وکیل ہوں۔''

''وکیل تو ہو نا۔'' اُس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔

''میری ضمانت کرا دو۔ مجھے کسی این جی او تک پہنچا دو۔ کسی فلاحی ادارے کے سپرد کر دو۔'' اُس کی معلومات بہت وسیع تھیں۔

''میرا بڑا بھائی الیکشن لڑ رہا ہے۔ اُسے میری بڑی فکر ہے۔ اُس نے کتے میرے پیچھے لگا دیے ہوں گے، جو میری بُو سونگھ لیں گے۔''

''تم کیا کرو گی؟''

''میں عدالت جاؤں گی۔ انصاف طلب کروں گی۔ اپنا حق وصول کروں گی۔''

''یہاں تو بھری عدالت میں گولیاں چل جاتی ہیں۔''

''تو پھر میں ان لوگوں کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاتی ہوں، مجھے مار دو جو جرم میں نے نہیں کیا اس کی سزا دے لو مجھے۔''

وہ واقعی بڑی جی دار تھی...... میں ہنس دیا۔

''تمہاری رہائش کا بندوبست کرواتا ہوں میں۔''
میں اُٹھ گیا۔
اور وہ...... رحمت بوا کے ساتھ باہر جانے لگی۔
میں اسے جاتے دیکھتا رہا۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ حقیقت میں دیہی علاقوں میں ترقی ہو رہی تھی۔ عورتیں جاگ رہی تھیں۔ اپنا حق استعمال کرنا انہیں آ گیا تھا۔ ترقی صرف ٹیوب ویل، بجلی، گیس کی آمد اور اسکولوں کی تعداد بڑھانے سے نہیں ہوتی۔ اصل ترقی ذہنوں کی بیداری ہے۔
اور مہراں! میں نے گہرا سانس لیا۔
مہراں اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت تھی۔

☆......☆

''تم اتنی ذہین، سمجھ دار کیسے ہو جب کہ تم نے اسکول کی شکل نہیں دیکھی۔ تمہارے بھائی تمہیں گھر میں قید رکھتے تھے۔''
میں مہراں کیلئے فلاحی ادارے میں اور ایک این جی او میں بات کر رہا تھا۔ وہ آج بھی پوچھنے آئی تو بتا کر میں نے اُس سے پوچھا۔
''اونہہ!'' ایک تلخ ہنسی اُس کے ہونٹوں پر تھی۔
صوفے کے بازو پر ٹک گئی۔
''کاش۔ میرے بھائی محبت سے مجھے قید رکھتے تو میں ساری عمر ان کے حصار میں رہتی۔ باہر کی دنیا سے وہ قید زیادہ اچھی تھی۔ مگر انہوں نے اپنی ہوس اپنی لالچ کے لیے مجھے قید کیا۔ انہیں مجھ سے محبت تھی ہی نہیں۔ انہوں نے مجھے جائیداد میں حصہ نہیں دینا تھا۔ شادی کرتے تو حصہ دینا پڑتا۔ قرآن سے میری شادی کرنا چاہتے تھے، مگر میں اڑ گئی۔ یہ ناممکن ہے۔
انہوں نے کہا ''اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو ہم تمہیں کاری کر کے مار دیں گے۔''
میں اندر تک کانپ گیا۔
ہمارے اندرونی علاقے ابھی تک اس ذہنی پستی کا شکار تھے۔
''بس تو پھر میں نے سوچ لیا تھا میں نے یہاں نہیں رہنا۔''
اور میں اُس کی سوچ کی مضبوطی کا قائل ہو گیا۔ اس وقت وہ ان ہی سوچ کے مطابق اپنے بھائیوں کے مقابل کھڑی تھی۔ آگے کیا ہونا تھا، یہ کسی کو خبر نہیں تھی۔
میں نے اپنے گھر میں پناہ دے کر رسک لیا تھا مگر کسی کو یہ رسک لینا پڑتا ہے، انسانی جان کی قدر و قیمت پہچان کر۔ اور ایسے بہادر لوگوں کا ساتھ ضرور دینا چاہیے جو میں دے رہا تھا۔ اُس کے بھائی یہاں آ سکتے تھے۔
میں نے اُسے اپنے دوست دلاور فیض کی این جی او کے حوالے کر دیا۔ اس این جی او کا بڑا نام تھا۔ یونہی کوئی اس پر وار نہیں کر سکتا تھا۔ اب مہراں محفوظ تھی۔
خود کو اور مضبوط کرنے کے لیے اُس نے پرائیویٹ پڑھنا شروع کر دیا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ہوتی جو دوسروں میں اُسے ممتاز کرتی۔
اُس کے بھائی، میرے گھر تک آ گئے رحمت بوا کے پیچھے مگر انہیں منہ کی کھانی پڑی۔ انہیں مہراں نہیں ملی۔
اُس کا بڑا بھائی الیکشن میں ہار گیا۔ گاؤں میں خبر پھیل گئی تھی کہ وڈیروں کی بیٹی بھاگ گئی اور گاؤں سے آنے والی مہراں این جی او میں چھپ کر اپنا مستقبل روشن اور پاؤں مضبوط کر رہی تھی۔
وہ پڑھ رہی تھی اور قسمت اُس کا ساتھ دے رہی تھی۔
اس کے بعد میں اپنی زندگی، روزگار، مقدمات میں مصروف ہو گیا، دلاور فیض سے ملنا ملانا کم ہو گیا اور اس مصروف زندگی کے ساتھ وقت گزر گیا۔
فیض امریکہ چلا گیا، پھر اُس سے ملاقات نہیں ہو سکی، آخری بات یہ ہی تھی کہ مہراں محفوظ ہے۔

☆......☆

پھر بہت سالوں بعد میری وکلاء کی ایک تقریب میں فیض سے ملاقات ہوئی۔ بہت گرم جوشی سے ہم دونوں دوست ملے اور باتوں باتوں میں مہراں یاد آئی۔ تو وہ ہنس دیا۔
''مہراں بہت اچھی اور بہت ٹھیک ہے۔''
''اُس کے بھائی تو نہیں آئے اُسے ڈھونڈتے ہوئے؟''
وہ ہنس دیا۔
''نہیں، مگر اپنے حق کو ڈھونڈتی وہ اپنے بھائیوں تک پہنچ گئی، انہیں عدالت کے کٹہرے تک کھینچ لائی۔ اپنا حق، جائیداد میں سے وصول بھی کیا اور کاری کا الزام بھی خود پر سے دھلوا دیا۔''
''ہیں!!''

میں حیران ہوا۔
اور فیض میری حیرانی سے لطف اندوز ہوا۔
''ہاں! اُس نے پڑھا اور خوب پڑھا۔ اب وہ ایک کامیاب وکیل ہے اور بیرسٹر بننے کی تیاری کر رہی ہے۔ اُس جیسی مضبوط ارادے کی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اُس نے میرا دل جیت لیا اور میں نے اُس کی بھرپور حفاظت کی اور اس کا مکمل ساتھ دیا۔ وہ میری بہت شکر گزار ہے۔''
اور میرے اندر خوشی بھر رہی تھی۔
''میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔''
''اب وہ صرف دیہی لوگوں کے لیے کام کرتی ہے۔ کاروکاری کے مقدمات لیتی ہے۔ اپنی این جی او بھی وہ انہی لوگوں کی وجہ سے چلا رہی ہے اور یہ اُس کی کوشش ہے کہ اب ذہنی طور پر پسماندہ دیہی لوگوں میں بھی شعور، آگہی اور جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ اپنے حق کے لیے آواز اٹھا رہے ہیں، ظلم کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں، نسل در نسل چلنے والی رسموں کا خاتمہ کر رہے ہیں اور اسمبلی میں بل پاس ہو رہے ہیں۔ آوازیں اٹھا رہے ہیں۔''
فیض جذب سے بول رہا تھا مگر میرے دل میں بے یقینی تھی۔
''مگر...... وہ کر سکتی تھی۔ اُس کے چہرے کی چمک اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ آج بھی میری آنکھوں میں در آیا۔ فیض میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔
''اُس کے پاس ٹائم تو نہیں ہے، چل میں کل اُسے بلوا لوں گا۔ آ جانا گھر پر وہ میری بات نہیں ٹالتی۔''

☆......☆

اور اگلی شام وقت سے پہلے میں فیض کے گھر پر تھا۔
فیض لان میں ہی تھا۔
''کدھر ہے؟''
''اندر ہے، آ رہی ہے۔'' فیض ہنسا۔ میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا اور وہ آ گئی۔ وائٹ ڈریس اور سیاہ کوٹ پہنے۔ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا اور ہنس دی۔
''آپ!''
''یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ تم ہو۔'' مجھے فخر سا ہوا۔
''اک گھر سے بھاگی لڑکی...... اتنی جدوجہد کے بعد یہ مقام عزت واقعی جذبہ انسان سے سب کچھ کروا لیتا ہے۔''
''اب خوش ہو۔''
''خود کو انصاف دلا کر کون خوش نہیں ہوگا۔'' اُس کی آنکھوں کی چمک برقرار تھی۔ فیض ہنس رہا تھا۔
''مجھے تم پر بہت فخر ہے۔ کاش میرے ملک کی ہر کمزور لڑکی تمہاری طرح مضبوط، باصلاحیت اور ہوشیار ہو جائے۔''
''انشاء اللہ!'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
''وہ دن دور نہیں ہیں، ہر کمزور لڑکی مضبوط ہوگی جب فیض جیسے لوگ اُس کی پشت پناہی کریں گے۔ حوصلہ اور ہمت کے ساتھ تحفظ دیں گے اور ہماری این جی او صرف اسی مقصد کے لیے کام کر رہی ہے۔''
مسکراتی آنکھوں سے فیض کو دیکھا۔
فیض کے اندر بھی سرشاری تھی۔
''یہ میرا کارڈ ہے۔'' اُس نے بیگ سے کارڈ نکال کر مجھے دیا۔ ''کسی بھی قسم کی مدد یا ضرورت ہو تو بلا جھجک کہیے گا۔''
میں نے کارڈ تھام لیا۔
سیاہ کارڈ پر سنہری حروف جگمگا رہے تھے۔
''ایڈووکیٹ مہراں فیض'' مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔
''میں نے بیرسٹری کا امتحان دیا ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی میرا دوسرا کارڈ مل جائے گا۔''
میں ساکت سا فیض کو دیکھنے لگا۔
فیض مسکرا رہا تھا۔
''یقین نہیں آ رہا نا؟'' فیض نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔
''کچھ لوگوں میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے جو خود کو منوا لیں اور مجھے ایسے ہی لائف پارٹنر کی ضرورت تھی۔''
اُس کے انداز میں فخر تھا۔
میں بھی ہنس دیا۔
''وکیل صاحب اب آپ کا اور ہمارا ساتھ رہے گا آپ ہماری این جی او آئیے گا۔ جو کمزور لڑکیاں ایک مقصد کے تحت زندگی گزرتے ہوئے تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔''
''انشاء اللہ میرا ساتھ بھی آپ کے ساتھ ہے۔'' میں نے دل سے کہا اور جانے کے لیے اُٹھ گیا۔

☆☆......☆☆

تیسری سچ بیانی

میں لٹ گئی لوگو!



مور شاہد حسین

قمر شہداد کوٹ، سے ایک دوشیزہ کی پامالی کی داستان

''ابو میں شہناز کے گھر جاؤں۔'' صبح سے وہ نہ میسجز کا جواب دے رہی ہے اور نہ ہی کال رسیو کر رہی ہے۔''میں نے ابو سے پوچھا۔

''جاؤ جاؤ بیٹا۔'' ابو نے بڑے ہی پیار سے کہا۔

''باہر دیکھ کتنی کڑی دھوپ ہے اور تم اتنی دور تک اکیلی جاؤ گی۔'' امی نے کہا۔

''ارے جانے دے، بیٹی ہے۔کل پرائے گھر چلی جائے گی۔'' ابو نے امی کو کہا۔

''تمہارے اس بے جا لاڈ اور آزادی نے تو اس کو سر پہ چڑھا رکھا ہے۔'' اس نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

''بیٹا تم جاؤ تمہاری ماں پتا نہیں کس زمانے میں پیدا ہوئی تھی۔'' ابو نے امی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''اوہ ابو آپ واقعی بہت اچھے ہیں۔'' میں نے ابو کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''بس بس زیادہ مسکہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے جا اور بھائی کے آفس سے لوٹنے سے پہلے گھر واپس آنا۔ جب بھی میرا شہزاد گھر آتا ہے تم کو گھر میں نہ پا کر ناراض ہوتا ہے۔'' امی نے کہا۔

میں نے امی کی بات ایک کان سے سنی اور دوسرے سے نکال دی۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی اور اکلوتے اور بہت ہی پیارے بھائی کی اکلوتی بہن ہوں۔ ہم دونوں بہن بھائی والدین کی آنکھ کا تارا ہیں۔ والدین ہماری ہر خواہش بخوشی پوری کرتے ہیں چاہے وہ جائز ہو یا ناجائز، بس ہمارے بولنے کی دیر ہوتی تھی۔

میں اور شہناز ایک دوسرے کو بچپن سے جانتی ہیں۔ ہماری دوستی ہائی اسکول میں ہوئی تھی کیوں کہ ہم نے پرائمری تعلیم الگ الگ اسکول میں حاصل کی تھی۔

شہناز تین بھائیوں اور دو بہنوں سے چھوٹی اور والدین کی آخری اولاد تھی۔ اس کے ابو سرکاری ملازم تھے اس کے دو بھائیوں اور دو بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ شہناز کے دونوں بھائی شادی کے بعد اپنے والدین کو چھوڑ کر علیحدہ رہنے لگے۔ شہناز اچھی صحبت اور خود کو مصروف رکھنے کی عادی تھی۔ اس کو پڑھائی سے بھی بہت دلچسپی تھی یہی وجہ تھی جو ہماری دوستی گہری سے گہری ہوتی جا رہی تھی۔ نہ ہم دن دیکھتے نہ رات دیکھتے میں جب دل کرتا ایک دوسرے کے گھر چلے جاتے تھے۔

اس روز دن کے تین بج رہے تھے میں صبح سے شہناز کو میسجز اور کالز کرتی رہی لیکن وہ جواب نہیں دے رہی تھی۔ مجھے بہت الجھن سی ہونے لگی، آخر وہ میری اچھی دوست اور ہم راز تھی۔ میرا اس کو میسج جائے اور وہ جواب نہ دے یہ



تو بھی نہیں ہوا۔ اس دن نہ جانے کیوں شہناز کی کون سی مجبوری تھی جو کال بھی ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ میں اس کا مسلسل نمبر ڈائل کرتی رہی۔ دل میں ہزار اندیشوں نے اپنے ڈیرے جمالیے تھے۔ آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے شہناز کے گھر جانے کی ابو سے اجازت لی اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے گھر تک پہنچی۔

☆......☆

دروازے پر دستک دی۔ دو، چار منٹ کے وقفے کے بعد شہناز کے چھوٹے بھائی ندیم نے دروازہ کھولا۔

''ثانیہ تم اس وقت! خیر تو ہے۔'' اس کا لہجہ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔

''شہناز کال ریسیو نہیں کر رہی تھیں۔ اس لیے چلی آئی۔'' میں نے کہا۔

اس نے ایک لمحہ کچھ سوچا بھی پھر کہنے لگا۔

''آؤ آؤ! وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہے۔''

میں جیسے ہی اندر داخل ہوئی اس نے دروازہ لاک کر دیا۔

میں اکثر اس گھر میں آتی رہتی تھی مگر اس روز پتا نہیں کیوں گھبراہٹ سی محسوس ہوئی اور میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا اور ندیم بھائی سے عجیب سا ڈر ہونے لگا۔ میرے قدم بھاری اور من من کے ہو گئے تھے ابھی میں دو چار قدم آگے بڑھی تھی کہ سامنے والے کمرے سے ایک لڑکا نکلا جس کے ہاتھ میں بوتل تھی۔ ایسی بوتلیں میں فلموں میں دیکھا کرتی تھی، اسے دیکھ کر میں بری طرح چونکی۔ میرا وجود لرزنے لگا اور دل کانپ رہا تھا۔

''شہناز کہاں ہے ندیم بھائی۔'' میں نے رُک کر پوچھا۔

''ارے کہا تو ہے وہ کمرے میں ہے۔''

''اچھا اس کو بتا دیجیے گا کہ میں آئی تھی۔'' میں نے انجان سا خدشہ محسوس کر کے واپسی کے لیے قدم اٹھائے۔

''ارے! اتنی جلدی بھی کیا ہے۔'' ندیم جنہیں میں

بھائی کہا کرتی تھی نے انتہائی عامیانہ لہجے میں بات کرتے ہوئے میرا بازو پکڑ لیا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں ندیم بھائی۔'' میں نے اپنا بازو ان کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

مجھے نہ آگے جانے کا حوصلہ رہا نہ پیچھے جانے کی ہمت، میری آواز حلق میں رُک گئی تھی۔ میں پسینے سے شرابور ہوگئی۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میرے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے ہوں۔

ندیم نے مجھے ایک ہاتھ سے قابو کرتے ہوئے دوسرا ہاتھ میرے منہ پر رکھا اور مجھے کمرے کی جانب دھکیلا۔ ندیم ایک پل میں شیطانی روپ میں تبدیل ہوگیا تھا۔

''ندیم بھائی پلیز چھوڑ دو۔ خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔'' میں رونے لگی اور ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑانے لگی تھی مگر ان پر شیطان پوری طرح سوار تھا۔ وہ اور ان کا دوست دونوں مجھے کمرے میں زبردستی لے گئے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ میں بُری طرح مچل رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ میں چیخی چلائی لیکن وہاں کوئی ہوتا تو میری فریاد سنتا۔ میری چیخیں در و دیوار سے ٹکرا کر واپس میرے ہی کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس عالم میں، میں نے دیکھا کہ شہناز کا موبائل بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر موجود تھا۔ گویا وہ کہیں جاتے ہوئے اپنا موبائل وہیں بھول گئی تھی۔

آخر ان دونوں نے اپنی شیطانی ہوس پوری کر لی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے اور میں اپنے ہوش حواس کھو بیٹھی تھی۔ میں انہیں نوچ کھسوٹ رہی تھی مگر اب وہ میری اس حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے۔ پھر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور شکستہ قدموں سے گھر کی طرف لوٹی۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں، مگر نہ زمین پھٹی اور نہ ہی آسمان۔ میرا ناپاک وجود شاید دونوں کو ناگوار محسوس ہو رہا تھا۔ میں بنا قصور کے سزا کی مستحق ٹھہری تھی، گناہ کیے بغیر گنہگار ہوگئی تھی۔

جب میں گھر کے دروازے پر پہنچی تو لڑکھڑا رہی تھی۔ میرے منہ سے ''امی'' نکلا اور میں وہیں گر گئی۔

درد بھری پکار پر امی، ابو اور بھائی تینوں دوڑتے ہوئے میرے پاس پہنچے۔

''بیٹا کیا ہوا؟'' یہ ابو کی آواز تھی۔

''ہائے میں اُجڑ گئی۔'' امی دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔

میری حالت نے ماں کو ساری بات سمجھا دی تھی۔

''بیٹا بولو نا کیا ہوا؟'' ابو نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

میں امی سے لپٹ کر مسلسل روئے جا رہی تھی۔ میں بھلا انہیں کیا بتاتی کہ میں لٹ چکی ہوں۔ وہ تو ان کو میری حالت دیکھ ہی معلوم ہوگیا تھا کہ وہ دنیا میں اپنا منہ کسی کو دکھانے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ لوگ طعنوں سے نوازیں گے کہ ایک بیٹی تھی، اس کو بھی سنبھال نہ پائے۔

''کہاں گئی تھی یہ؟'' بھائی نے اونچی آواز میں کہا۔

''شہناز سے ملنے گئی تھی۔'' امی نے روتے ہوئے کہا۔

''شہناز سے......؟ آج صبح اس کے تو ماموں کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ ان کی ساری فیملی وہاں گئی ہوئی ہے۔'' بھائی کا غصہ آسمان کو چیر رہا تھا۔

''اس کے گھر کون تھا، ندیم؟'' بھائی نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا اور ساری بات سمجھ گئے۔ یوں بھی ندیم کا کردار محلے میں اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔

☆......☆

امی ابو اور میں نے بھائی کو بہت روکا مگر بھائی پر ایک جنون طاری تھا، وہ زبردستی چلا گیا۔ اور اگلے دن اخبار میں خبر تھی کہ بہن کی عزت پامال کرنے والے غیرت مند بھائی کے ہاتھوں قتل۔

آج بھائی سلاخوں کے پیچھے زندگی کے دن گزار رہا ہے۔ امی کا صدمے اور غم سے بُرا حال ہے وہ دل کی مریض بن گئی ہیں۔ جب ابو کو خاموش بت بنا ہوا دیکھتی ہوں تو دل کٹ جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کچھ کھا کر مر جاؤں۔ میری وجہ سے میرے عزت دار ماں باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے، لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی۔ شاید میں بہت بزدل ہوں۔ بس اپنی بدنصیبی پر آنسو بہاتی رہتی ہوں۔ مجھے کوئی اپنانے والا بھی نہیں ہے۔ میں ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہی ہوں۔ گھر سے باہر قدم رکھنے کو دل نہیں کرتا کہ دنیا کی تحقیر آمیز نگاہوں کو برداشت کرنا میرے بس میں نہیں۔ نہ جانے کب اس ذلت آمیز زندگی سے چھٹکارا ملے گا۔ میری والدین سے التجا ہے کہ خدارا اپنی بیٹیوں کے معاملے میں کبھی لاپروائی نہ برتیں، آپ لاکھ اچھے صحیح، لیکن زمانہ اچھا نہیں۔

☆☆......☆☆

چوتھی سچ بیانی

تم سے ملوں گی میں



عظمیٰ شکور

سرگودھا سے ایک جوان بیوہ کی ہمت کی داستان

زندگی کے بہت سے رنگ دیکھے تھے میں نے، محسوس کیا خوشیوں کو، سہا تھا دُکھوں کو بھی، گرم آنسو بھی بہائے تھے اور محبتوں کی ٹھنڈی پھواروں میں بھی بھیگی تھی۔ واقعات رقم کروں تو جیسے صفحات ختم ہو جائیں۔

میں بہت مختلف تھی سب لڑکیوں سے۔ خوامخواہ خوش رہنے والی، بات بے بات ہنسنے والی، کوئی خوشی نہ ہوتی تو بھی میں تلاش کر ہی لیتی۔

پھولوں سے عشق تھا، خوشبو میری کمزوری تھی، ہوا میری محبت تھی، بادل میرا سب کچھ تھے، بارش میری سہیلی تھی۔ مٹی کی خوشبو مجھے سب خوشبوؤں میں پسند تھی۔ اُڑتی تتلیوں کو پکڑ کر قید کر لینا میرا ظالم پن تھا، مگر کیا کرتی وہ بھی تو اُڑنے میں بہت جلدی کرتی تھیں۔ میں ان تتلیوں کو بوتل میں بند کر دیا کرتی تو وہ کافی دیر تک پھڑپھڑاتیں پھر آخر جان دے دیتیں اور میں انہیں کاپی میں محفوظ کر لیتی اور اُن کے تمام رنگ کاپی کے صفحے پر چپ جاتے۔

بچپن بھول بھلیوں میں گزرا میں ذرا بڑی ہوئی تو اب ہر طرف سے مجھ پر تنقید شروع ہوگئی۔ ثناء یوں نہ کرو، ثناء یوں چھلانگیں نہ مارتی رہا کرو، بڑی ہوگئی ہو میری جان۔ تائی اماں دُلار سے کہتیں۔ ''ارے لڑکی نچلا بیٹھا کر۔ اگلے گھر جا کے کیا ناک کٹوائے گی باؤلی۔'' اور میں ایک کان سے سب کی سن کر دوسرے کان سے اُڑا دیتی کہ اگر سب کی باتوں کو سوچنا شروع کیا تو بس ڈیپریشن کی مریضہ بن جاؤں گی۔ یہ خیالات تھے میرے ان سب کے بارے میں۔

بی اے کیا کیا جان ہی عذاب میں آ گئی۔ ارے لائن ہی لگ گئی رشتوں کی۔ سب ہی کو میں پسند آتی، میں فوراً آئینہ دیکھتی ایسی کیا بات ہے اس صورت میں۔ کیا سُرخاب کے پر نکلے ہوئے ہیں مگر کبھی کچھ خاص نظر نہ آیا آئینے میں، بس ذرا گورا رنگ پتلی سی ناک، ٹھوڑی پہ چھوٹا سا تل، لمبی سی گردن، بڑی بڑی آنکھیں براؤن سی، چوڑا سا ماتھا۔ میرے نزدیک خوب صورتی کا یہ معیار نہیں تھا۔ مجھے سب وہ لوگ بے وقوف لگتے تھے جو مجھے پسند کر جاتے۔ اور اک نئی مصیبت عاصم کے گھر والے تھے، میرے پیچھے ہی پڑ گئے تھے۔ لگتا تھا ان کی نظر کمزور تھی جبھی تو میں انہیں پسند آ گئی تھی۔

حیرت تو مجھے اس وقت ہوئی جب میں نے ابا میاں کو اُن کی باتیں بغور سنتے دیکھا یعنی معاملہ خاصا آگے بڑھ چکا ہے۔ میں نے اپنی ذہانت آزمائی۔

''اُف کیا کروں؟ ہائے میرا ایم اے! اُف میرے وہ خواب؟ میں اپنے آپ میں بڑبڑا رہی تھی کہ دادی ماں

نے مجھے گھورا، خیر جی! عاصم صاحب کے گھر والے اپنی لگن کے سچے اور پکے نکلے اور بہت دھیرے سے سب کے سامنے ان کے نام کی انگوٹھی میری انگلی میں پہنا دی گئی۔ لو جی بنا دی گئی میں مسٹر عاصم کی امانت!! گرم گرم آنسو گالوں سے لڑھک کر دامن میں جذب ہو گئے۔

اب آگے کی کہانی کچھ یوں ہوئی مسٹر عاصم مجھ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتے تھے۔

''اچھا میں کروں گی ان سے اچھی طرح بات! شاہ رخ

''تو کیا صرف یہ ہی بات تھی جو آپ مجھ سے کہنا چاہ رہے تھے۔'' میں دانت پیستے ہوئے بولی۔

''میں اصل میں آپ کی رائے جاننا چاہتا تھا کہ میں آپ کو قبول ہوں۔'' عاصم صاحب نے پھر سکوت کو توڑا۔

''واہ بہت جلد خیال آ گیا آپ کو؟ آپ کے نام کی انگوٹھی میرے ہاتھ میں چمک رہی ہے۔ کیا اب بھی کوئی شک ہے۔'' میں جیسے حیران ہوتے بولی۔

بس جی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

خان نہیں کے۔'' مگر اماں فرمانے لگیں۔

''بیٹا کوئی حرج نہیں اب تم اُس کی منگیتر ہو۔''

چاروناچار میں لان میں بیٹھی اُن کا انتظار کرنے لگی۔ پرفیوم کی تیز خوشبو نے مجھے چاروں اطراف سے گھیر لیا۔

وہ اجازت لے کر یوں بیٹھے جیسے میں کسی اسکول کی پرنسپل ہوں، گلا کھنکارا جیسے چھالیہ گلے میں پھنس گئی ہو۔

''جی میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ مجھے پہلی ہی نظر میں اچھی لگی تھیں۔'' وہ گویا ہوئے۔

عاصم کنسٹرکشن کا کام کرتے تھے پہلی ہی نظر میں دل ہار بیٹھے تھے اور خوش اس بات پر تھے کہ پا بھی لیا تھا محبت کو۔

''ہائیں! میں کیسے، کب اُن کے دل میں اُتر گئی؟ مجھے تو پتا بھی نہیں چلا۔''



اور یوں میں ثناء عاصم بن کر عاصم کی جنت میں آ گئی۔

پورا کمرہ گلاب کی پتیوں میں اٹا پڑا تھا۔ بھینی بھینی خوشبو ماحول کو رومانٹک بنا رہی تھی۔ میں چپ چاپ

آنکھیں موندے بیٹھی تھی کہ جیسے آنکھ کھلے گی تو کہیں یہ خواب نہ ہے اوٹوٹ جائے کہ ہرلڑکی کا یہ ہی خواب ہوتا ہے اور پھر جیسے ہلکی پا عاصم کی آہٹ سنی میرے دل کی دھڑکنیں جیسے رُک گئی تھیں۔ وہی مانوس سی پرفیوم کی خوشبو قریب سے قریب تر آ رہی تھی۔ عاصم نزدیک آ کر بیٹھ گئے ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ڈبیا تھی جس میں ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ انہوں نے انگوٹھی نکالی اور میرے نازک ہاتھ کی انگلی میں پہنادی، میں جو لمحہ بھر کو چپ ہونے والی نہ تھی، اس وقت بالکل گنگ ہورہی تھی۔

☆......☆

صبح کا سورج نئی خوشیاں نئی امنگیں لایا تھا۔ میں عاصم کے پیار میں سر سے پاؤں تک ڈوب چکی تھی۔ لبوں پر مسکراہٹ لیے میں نے عاصم کا استقبال کیا۔

دن عید، رات شب برات والا حساب ہوگیا تھا، مہینہ بھر رشتے داروں کی دعوتیں کھا کر ہم دونوں ہنی مون کے لیے سوئٹزرلینڈ گئے۔ واپس آئے تو تحفہ ساتھ تھا میں ماں بننے والی تھی۔ اور عاصم کے تو پاؤں نہ ٹکتے تھے زمین پر۔

مشعل کے دنیا میں آجانے سے میں خاصی مصروف ہوگئی تھی لہٰذا عاصم صاحب اور اس بات پر اکثر کھولتے رہتے کہ میں اب انہیں ٹائم نہ دے پا رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے ایک عدد آیا کا انتظام کردیا تھا۔ آیا کے آنے سے مجھے خاصی سہولت ہوگئی تھی اور عاصم صاحب الگ خوش۔

وقت پر لگا کر اُڑ رہا تھا، مشعل دو سال کی ہوئی تو آیان دنیا میں تشریف لے آئے۔ عاصم بیٹے کو پا کر بہت مسرور تھے لیکن میری مصروفیت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ عاصم دن بھر کام پر ہوتے آیان بھی ابھی سال بھر کا تھا کہ میں پھر سے اُمید سے ہوگئی۔ ''اُف!'' میں سٹپٹا کر رہ گئی تھی، مگر عاصم نے مجھے سنبھالا دیا کہ اللہ کی دین ہے کیوں پریشان ہوتی ہو۔

آیان کے بھائی آگئے تھے۔ وہ مشعل اور ان کی جان تھے۔ جن کا نام حسام رکھا گیا تھا۔

☆......☆

اس روز کام سے واپس آتے ہوئے عاصم کی طبیعت ایسی بگڑی کہ ہسپتال جانا پڑا دل کی جگہ اچانک درد اُٹھا تھا۔ انہیں فوراً ایڈمٹ کرلیا تھا۔ اٹیک تھا، میں انہیں دیکھ کر ہولے جارہی تھی۔ رنگت جیسے پیلی ہوئی جارہی تھی، عاصم کو اب تک ہوش نہ آیا تھا۔ ڈاکٹر اُن کے ہوش میں آنے کے انتظار میں تھے، مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ عاصم نے چند گہری سانسیں لی تھیں اور بس سب چھوڑ چھاڑ اللہ کے پاس چلے گئے تھے۔ میں اپنے ہوش وحواس کھو چکی تھی۔ تین ننھے بچوں کا ساتھ اور بیوگی۔

گھر میں ہر طرف موت رقصاں تھی۔ عاصم کے چہرے پر گہرا سکوت اور اطمینان تھا جیسے سب کام نپٹا لیے ہوں۔ مگر کیا وہ نہ جانتے تھے کہ تین بچوں کو تنہا چھوڑ گئے ہیں میرا سب کچھ ساتھ لے گئے ہیں۔ میں بری طرح بلکی۔

گھر میں دریاں بچھ گئی تھیں۔ پورا گھر عورتوں سے بھر گیا تھا۔ سب اُچک اُچک کر مرنے والے کو دیکھ رہے تھے اور پھر اشاروں کنایوں میں پوچھتے اس کی بیوہ کون ہے اور فوراً میری طرف اشارہ ہوتا۔

میں اُن کے پاس بیٹھی تھی، انہیں منا رہی تھی کہ اُٹھ جایئے بہت ہوچکا، بہت سو لیے۔''

آنسوؤں کے سیلاب بہہ گئے مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ضد کے بہت پکے تھے میری ہزار ہا منتوں کے باوجود جاگ کر نہ دیے۔ بچے میرے ساتھ ڈر کر چپکے ہوئے تھے۔ مشعل بالکل چپ تھی جیسے سمجھ رہی ہو کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ آیان بھی گود میں تھا حسام اپنی پھوپو کے پاس تھا۔ عاصم کو لے جانے کا ٹائم آگیا تھا اور میں بے ہوش ہوچکی تھی۔ میں نے تو اُن کو جاتے بھی نہ دیکھا تھا۔

ہوش میں آئی تو گھر میں سب لوگ تھے بس ایک وہی نہیں تھے۔ میری آنکھیں انہیں تلاش کررہی تھیں مگر بے سود، امی نے زبردستی میرے منہ میں نوالہ ڈالا۔ میرے حلق میں جیسے کانٹے چبھ رہے تھے۔ پانی پیتی تو وہ بھی اندر نہ جاتا۔

''عاصم میرے عاصم کہاں ہو۔'' میری بہن نے نیند کی گولی دے کر مجھے سلا دیا تھا۔

صبح اُٹھی تو گھر سائیں سائیں کررہا تھا۔ سب اپنے اپنے گھروں کو جانے کو تیار ہورہے تھے، میرے عاصم کا تولیہ، میرے عاصم کی چپل، میں اُن کی ایک ایک چیز کو تک رہی تھی، آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔ آسمان پر نظر

پڑی تو جیسے اِک خوف کی لہر سرائیت کر گئی۔ میرے سر سے آسمان چھن گیا تھا۔

''میں اکیلی رہ گئی، میں اکیلی رہ گئی۔'' میں پاگلوں کی طرح بولے جارہی تھی، میں اُن کے کپڑوں کو ساتھ لگائے روئے جارہی تھی۔ کہ یکایک میری نظر دیوار کے ساتھ چپکی مشعل پر پڑی۔ وہ چپ چاپ یک ٹک میری طرف دیکھے جارہی تھی، تب میں اُٹھی اور آگے بڑھ کر میں نے اُسے خود سے لپٹا کر بہت سارا پیار کیا۔ آیان کو، حسام کو اپنے ساتھ لگایا، میرے بچے یتیم ہوگئے اور پھر دھاڑیں مار مار کر میں رو پڑی۔

☆......☆

سائیں سائیں کرتا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا، کبھی کبھار اتنا ڈر لگتا کہ راتیں جاگ کر گزارا کرتی اور پھر تو عادت ہی بن گئی تھی جاگنے کی۔ گزرتے وقت نے مجھے ڈیپریشن کی مریضہ بنا دیا تھا۔ عاصم کا جانا میری زندگی کا ایک بہت بڑا خلا تھا، جو کبھی پُر نہیں ہوسکتا تھا۔

زندگی اِک کڑی آزمائش سے گزر رہی تھی۔ بچے تو پڑھائی میں بہل گئے تھے مگر میں تنہا رہ گئی تھی، جیسے آسمان پہ تنہا چاند، جیسے صحرا میں تنہا پھول، جیسے ہجوم میں ہوتے ہوئے بھی اکیلی، میرے دِل کی باتیں میرے دِل میں رہ جاتیں، اگر عاصم کو یاد کرکے رونا ہوتا تو دروازہ بند کرکے خوب رویا کرتی۔ دِل کو یقین تھا۔ وہ اب کبھی نہیں آئیں گے، مگر آنسو نہیں سمجھتے تھے۔

آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ میرے ہونٹوں پہ چپ لگ گئی۔ بات بے بات ہنسنے والی ثنا چپ ہوگئی تھی۔ ہنسنا بھول گئی تھی، مسکراہٹ خواب بن گئی تھی، بس جی رہی تھی اپنے ننھے پھولوں کے لیے۔

آیان جب اپنی توتلی زبان سے پوچھتا۔

''ماما، پاپا کہاں ہیں؟'' تو میرا کلیجہ جیسے پھٹ جاتا۔

☆......☆

عدت پوری ہونے پر مجھے امی اور بھائی قبرستان لے گئے تھے میرے عاصم کا گھر دکھانے۔ میرا اندر پھٹا جاتا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے قدم من من بھر کے ہوگئے ہیں۔ ہائے میرے عاصم یہاں ہیں، اس ویرانے میں، مجھ سے اتنی دور۔

قبر پر بیٹھی میں کافی دیر تک روتی رہی، عاصم سے باتیں کرتی رہی۔ میرے بھائی نے کندھوں سے پکڑ کر مجھے اُٹھایا، میں واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔

''میرے عاصم سے دُور نہ کریں مجھے۔ وہ اکیلے ہیں۔'' میں بولے جارہی تھی۔ بھائی میرا ہاتھ پکڑے آگے سے آگے بڑھ رہے تھے۔ گھر واپس آکر اپنا دُکھ کسی کو نہ بتاسکی بچوں کو بھی نہ بتا پائی کہ میں تمہارے پاپا سے مِل کر آرہی ہوں۔ اپنا غم اندر ہی اُتار لیا، دُکھ جیسے پورے جسم کو زخمی کیے جارہا تھا۔

کانپتے وجود کے ساتھ میں نے کھانا بنایا، امی آج واپس جارہی تھیں اور تنہائی عفریت بن کر مجھے ڈرا رہی تھی۔

عدت تک تو سب ٹھیک رہا پھر سسرالیوں نے آنکھیں پھیرلیں، گھر والے بھی اپنی زندگی میں مصروف ہوگئے۔ اب میں تھی اور میرے بچے۔ گھر اور باہر کا کام میں خود کرتی، ابھی جوان تھی سو طرح کی نظریں مجھ پر اُٹھتیں جو تیروں سے چھلنی کرتیں۔ پھر میں نے اللہ سے لو لگالی۔

نماز، قرآن کو سہارا بنایا تھا۔ بہت سکون ملتا اللہ کی عبادت سے۔ گزرتا وقت مرہم بنا تھا اِس دُکھ پر، گو زخم گہرا تھا اور کبھی بھرنے والا بھی نہیں تھا۔

بچے خاموش ہوگئے تھے، مشعل کی فرمائشوں کی لسٹ جانے کہاں کھوگئی تھی جو وہ اپنے پاپا سے کہا کرتی تھی۔

بس گھر میں سناٹے کا راج تھا۔

ایک روز میں ہمت کرکے اُٹھی اور ایک اسکول میں انٹرویو دے آئی جس میں کامیاب بھی ہوگئی۔

اب میری زندگی کا مقصد محض بچوں تک محدود تھا۔ کہ اُن کو منزل دے دُوں، اپنی پوری قوت اور طاقت اُن کے مستقبل کے لیے صرف کردوں۔ میں نے ایم اے کے بعد ایم ایڈ کیا اور بطور لیکچرار ایک کالج جوائن کرلیا۔ میں آج ایک مضبوط عورت، کے روپ میں ڈھل چکی ہوں۔ مجھے کوئی نہیں ہلا سکتا۔ میرے مقاصد سے کوئی مجھے دُور نہیں کرسکتا۔ مجھے عاصم کو سرخرو ہوکر ملنا ہے۔ سر اُٹھا کر ملنا ہے کہ دیکھو تمہارے بچوں کو منزل دے دی۔ انہیں رُلنے نہیں دیا۔ اپنی جوانی رول دی مگر انہیں مٹی نہ لگنے دی۔ بس اب میرے بچوں کی کامیابی ہی میری کامیابی ہے!!

☆......☆

پانچویں سچ بیانی



گناہ گار کون؟

عمران مظہر

ژوب، بلوچستان سے ایک مقتولہ کا سوال، جواب بھی جواب طلب ہے

شاہین مسیح کو کسی نے بھرے بازار میں کلہاڑی کے وار کر کے قتل کر دیا تھا جبکہ اس کے چھوٹے بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس بات کو لے کر اس چھوٹے سے شہر میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ بازار کی ہر گلی میں اسی واقعے کا چرچا تھا۔

''اچھا ہوا مار دیا اس گناہ کے گھڑ کو۔''

''بھرے بازار میں مار دیا۔ دو معصوم بچوں کی ماں تھی، نا جائز کیا بے چاری کے ساتھ۔''

غرض جتنے منہ اتنی باتیں، لیکن حقیقت یہی تھی کہ شاہین مسیح کا قتل ہو چکا تھا اور اسے بھرے بازار میں پیچھے سے کلہاڑی کے وار کر کے قتل کیا گیا تھا۔ اس وقت وہ سودا سلف لینے کی غرض سے بازار آئی تھی اور اس کے بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ ستم یہ تھا کہ اس قتل پر نام نہاد سماجی تنظیمیں، سیاست کے ٹھیکیدار، غیرت مند سماج اور اسلام کے نام پر دکانیں چمکانے والے علماء سب خاموش تھے۔ سب کی زبانوں پر یوں قفل لگا ہوا تھا جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔

کیا ایک عورت کا اس طرح بے رحمانہ قتل جائز تھا؟

اس قتل کا پس منظر کیا تھا یہ آپ کو آگے پڑھ کر اندازہ ہو جائے گا۔

☆......☆

میرا شہر ژوب، بلوچستان کا آبادی کے لحاظ سے ایک چھوٹا شہر ہے اور بہت حد تک پسماندہ بھی۔ بڑے شہروں کی طرح یہاں آئے دن سکون غارت کرنے والے واقعات تو نہیں ہوتے لیکن ٹھہرے پانی میں کبھی نہ کبھی کوئی کنکر پھینک ہی دیتا ہے۔ پشتون اور سرائیکی آبادی پر مشتمل یہ شہر پشتون روایات، غیرت، عزت، اسلام اور دین داری کے نام پر سماجی ٹھیکیداروں اور عظیم علماء کے ہاتھوں بکتا ہے۔

شاہین تیس، بتیس سالہ بھرپور جسامت کی ایک عیسائی خاتون تھی۔ اس کی شادی اشرف مسیح سے ہو چکی تھی، اس کے دو بچے بھی تھے۔ چھوٹے شہروں میں عیسائی آبادی کو نچلے درجے سے بھی کم تر سمجھا جاتا ہے اور جہاں اسلام کے نام پر سیاست کھیلی جاتی ہو وہاں ان لوگوں کو اچھوت سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ اسلام میں کسی غیر مذہب کے ساتھ ناحق، ناروا سلوک کرنے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔

شاہین کی زندگی پُرسکون انداز سے گزر رہی تھی لیکن پھر پتا نہیں شاہین کا شوہر اشرف کیسے پیسے کی ہوس کا شکار بن گیا اور اس نے شاہین کو بد کرداری کی طرف مائل کرنا شروع کر دیا۔ شاید اسے رقم کمانے کے لالچ نے تباہی کی

طرف کھینچ لیا تھا۔ شاہین پہلے پہل راضی نہ ہوئی اور اس نے صاف انکار کر دیا لیکن اشرف نے اسے چھوڑنے کی دھمکی دے کر کسی نہ کسی طرح اُسے اس بات کے لیے تیار کر ہی لیا اور پھر گناہ کا کھیل شروع ہو گیا۔

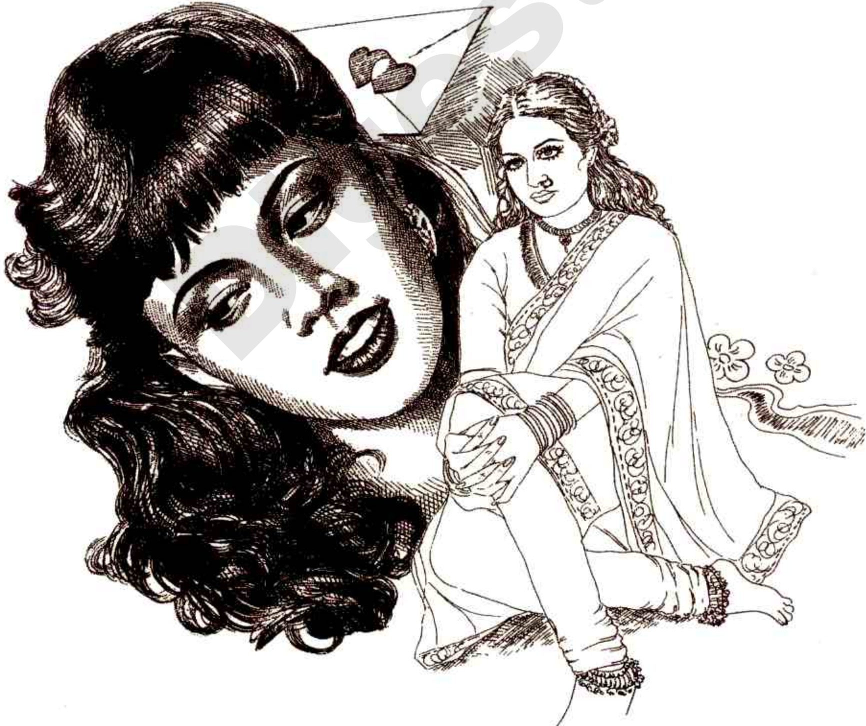
اس چھوٹے شہر میں ہر رات شاہین اشرف کو خوش رکھنے کے لیے اپنا جسم نام نہاد مسلمانوں کو بیچتی تھی اور اشرف پیسے بٹورتا تھا۔ یہ کھیل کافی عرصہ کھیلا جاتا رہا، اس گنگا میں ہر کوئی ہاتھ دھوتا تھا، یہ ایک چھوٹا شہر تھا اس لیے یہ کھیل زیادہ عرصے تک چھپا نہ رہ سکا۔ لوگوں نے کھلم کھلا اس کی مخالفت شروع کر دی تھی، شاہین کو اسلام کے ٹھیکے داروں اور دوسرے لوگوں سے بھی دھمکیاں ملنی شروع ہو گئی تھیں لیکن شاہین اشرف کے آگے مجبور تھی۔ اشرف کسی طور پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔

آخر کار یہ بات شہر کے مفتی صاحب کے سامنے لائی گئی جو کہ شہر کی سب سے بڑی مسجد کے خطیب بھی تھے انہوں نے شہر کے چند ''معزز'' لوگوں سے مشورہ کیا اور شاہین کو سمجھانے اور منع کرنے کے لیے ایک جرگہ مجلس رکھی۔

اُس دن اسلام کی [illegible] کرنے والوں میں بہت ہلچل تھی۔ مجلس میں مفتی صاحب، مولوی صاحب، معزز شرفاء، سیاسی لوگ اور عام شہری بھی موجود تھے۔

''شاہین بی بی! تم نے جو گناہ شروع کر رکھا ہے یہ اسلام میں ناجائز ہے۔ اسلام اس کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ تم ہمارے معاشرے کو ناپاک کر رہی ہو۔ یہاں سب لوگ اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ تمہارے لیے سزا تجویز کی جائے۔'' مولوی صاحب نے بہت جلال میں تقریر کی تھی جسے سن کر مجلس میں بیٹھے جاہل معزز عش عش کر اُٹھے اور مولوی صاحب کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

''جناب مولوی صاحب!'' شاہین اچانک گویا ہوئی۔ ''آپ نے ہر بات سو فیصد سچ کہی۔ میں متفق ہوں آپ سے، لیکن میں مجبور ہوں۔ میرے شوہر نے مجھے گناہ کے اس کاروبار کے لیے مجبور کر رکھا ہے کہ میں یہ کام کروں، ورنہ وہ مجھے چھوڑ دے



گا۔ میں خود اس کام سے بے زار ہوں لیکن شوہر کو چھوڑ کر کہاں آسرا تلاش کروں۔ آپ سب معزز لوگ بیٹھے ہیں۔

آپ میں سے کوئی اگر مجھ سے شادی کرلے تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ اسلام قبول کرلوں گی اور ساری زندگی اسلام کی پیروکار رہوں گی اور اس دلدل بھری زندگی کو بھی چھوڑ دوں گی۔ کوئی ہے جو میرا ہاتھ تھام لے اور مجھے اس دلدل سے نکال لے اور اگر ایسا کوئی نہیں ہے تو میں یہ کام نہیں چھوڑ سکتی اور نہ کسی سے ڈرتی ہوں کیوں کہ آج جو میرا احتساب کرنے بیٹھے ہیں ان سب کی اصلیت میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔

رات کے اندھیرے میں منہ چھپا کے آنے والوں میں بہت سے شرفاء یہاں موجود ہیں، مگر میں جانتی ہوں وہ اپنے نفس کے آگے مجبور ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے میں اپنے شوہر کے آگے مجبور ہوں۔ وہ اپنے نفس کے غلام ہیں اور میں اپنے شوہر کی غلام ہوں۔ میں ان کی مجبوری سمجھ چکی ہوں تو آپ لوگ بھی میری مجبوری سمجھیے۔''

شاہین کا اتنا کہنا تھا کہ ماحول میں سناٹا چھا گیا۔

مجلس بغیر کسی فیصلے کے برخواست ہوگئی۔

اسلام کا سچا پیروکار بننے کی ہمت کسی میں نہیں تھی، جو اسلام کے نام پر دکانیں چلائیں، وہ کہاں اسلام کے پیروکار بن سکتے ہیں؟

☆......☆......☆

اس واقعے کے چند ہی دن بعد بھرے بازار میں اسے کلہاڑی کے وار کرکے قتل کردیا گیا۔ ظاہر سی بات ہے اس قتل کے چشم دید گواہ بھی ہوں گے لیکن کسی نے منہ نہیں کھولا۔ اکثر نے اسے طالبان کے کھاتے میں ڈال دیا جبکہ حقیقت خدا جانتا ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک مجبور عورت کا اس طرح قتل کرنا جائز ہے؟ کیا شاہین نے جو مانگا تھا اسے دینا جائز نہیں تھا؟ اس سارے واقعے میں مجرم کون ہے؟؟ شاہین کا شوہر جس نے اسے بدکرداری پر مجبور کیا۔

وہ شرفاء جو شاہین کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ اسلام کے نام پر اپنی دکانیں چمکانے والے وہ نام نہاد مسلمان جو شاہین کو سہارا نہ دے سکے یا پھر خود شاہین جو بالآخر انجام کو پہنچی۔

☆☆......☆☆......☆☆

چھٹی سچ بیانی

ہر پل تیرے ساتھ رہوں گی



مجید احمد جائی

ایک جن زادی کی محبت کی عجیب داستان، ملتان سے



سردیوں کے دن تھے۔ شام اپنے پر پھیلائے کھڑی تھی۔ سورج اپنی کرنیں سمیٹ کر دھیرے دھیرے اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ آسمان ٹمٹماتے چراغوں سے سج گیا تھا۔ چاند اپنی چاندنی ہر سو پھیلانے میں مصروف تھا۔ نیلے، کالے بادل جنگی طیاروں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کبھی چاند بادلوں میں چھپ جاتا تو کبھی بادلوں کی اوٹ سے اپنی آنکھیں کھول کر روح زمین پر کانی نظر ڈال لیتا۔

میں کھانے سے فراغت پا کر گھر سے نکلنے کو تیار تھا۔ سردی زوروں پر تھی۔ موٹے کپڑے زیب تن کیے، جرابوں سے پاؤں چھپائے، ہاتھوں پر دستانے چڑھائے مفلر سے کان اور ناک ڈھانپے کام پر جانے کو تیار تھا۔ اتنے میں امی جان دودھ کا گلاس لیے میرے کمرے میں آئیں اور کہنے لگیں۔

''بیٹا! یہ لو دودھ پی لو اور جلدی نکل جاؤ۔ اندھیرا کافی ہو رہا ہے۔ پھر تیرا راستہ سنسان اور خطرناک بھی ہے۔ دن دیہاڑے وارداتیں ہو جاتی ہیں۔ بیٹا! نہر کے راستے سے مت جایا کرو۔ پانچ منٹ زیادہ سہی لیکن پکی سڑک سے جانا۔ وہ راستہ محفوظ ہے۔''

''اچھا امی جان! جو حکم۔''

میں نے امی جان کو جواب دیا اور دودھ کا گرم گرم گلاس حلق سے اتارنے لگا۔ کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر پڑی تو نو بج رہے تھے۔ اُف خدایا! آج پھر لیٹ ہو جاؤں گا۔ میں نے جلدی جلدی دودھ ختم کیا اور بائیک اسٹارٹ کر کے آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ میرا روز کا معمول تھا۔ دُنیا خوابوں کے نگر میں ہوتی اور میں پیٹ کی آگ بجھانے کی غرض سے کام پر جا رہا ہوتا۔ انسان کتنا بے بس ہے۔ پیٹ کی خاطر اسے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ہزاروں خواہشیں دبا کر جینا پڑتا ہے۔ اپنے ارمان، اپنے خواب سب کچھ تو بیچنا پڑتے ہے۔ رب تعالیٰ نے کیسا نظام بنایا ہے۔ انسان کو مجبوریوں کے عوض ناک سے چنے چبانے پڑتے ہیں۔

میں غریب سبزی والے کا دوسرا بیٹا ہوں۔ شاید آپ مجھے نہیں جانتے؟ ہیں ناں۔ چلو جی میں بتا دیتا ہوں۔ میں سبزی والے کا بیٹا ہوں۔ جسے لوگ چاچا سبزی والے کے نام سے جانتے ہیں۔ میرے ابا صبح سویرے جب موذن اذان فجر کی تیاری کر رہا ہوتا، نیند سے بیدار ہوتے۔ رب تعالیٰ کی حمد وثنا کرتے، پلاسٹک کے گٹو اٹھاتے، جیب میں گزشتہ دن کی جمع پونجی ڈالتے، قمیض کی اندرونی جیب میں دوائیوں سے بھرا شاپر، آکسیجن انہیلر ڈالے بچوں کی روٹی کی غرض سے نکل پڑتے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا یہی دیکھتا آیا تھا۔ میرے پاپا کی یہی روٹین تھی۔ بیماریوں کو سینے سے لگائے جی رہے تھے۔ سانس کی تکلیف میں مبتلا تھے۔ کبھی تو کھانستے کھانستے بے ہوش ہو جاتے تھے، تو کبھی پورے جسم پر سوجن ہو جاتی تھی۔ کوئی کہتا دمہ ہے تو کوئی کہتا ٹی بی ہے۔ ابا نے دمے کا علاج بھی کروایا اور ٹی بی کا کورس تو کئی بار کروایا تھا۔ بیماریوں سے لڑتے لڑتے بچوں کو پال رہے تھے۔ دن بھر سبزی کی دکان سے جو آمدنی ہوتی، اس کا ایک حصہ دوائی پر لگ جاتا تھا۔ باقی گھریلو اخراجات، بچوں کے اسکول کے اخراجات، بجلی کا بل بمشکل پورا ہوتا تھا۔

سبزی والا آخر کما بھی کیا سکتا ہے؟ لوگوں کے طعنے، دن بھر مکھیاں اڑاتے، دو ٹکے والا بھی لمحے بھر میں لفظوں کے تیر سینے میں پیوست کر کے چلا جاتا ہے۔ اس دور میں اکیلا آدمی خود کو نہیں پال سکتا، خاندان کو کیسے پال سکتا ہے؟ چاچا سبزی والا کیسے خاندان بھر کو پالتا ہوگا۔

چاچے سبزی والے کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ آٹھ افراد پر مشتمل یہ خاندان جو مل جاتا کھا کر صبر و شکر کر لیتا۔ آج چھوٹے کل بڑے کے مصداق چاچا سبزی والے کی اولاد بڑی ہو رہی تھی۔ روز بروز کے اخراجات بھی بڑھ رہے تھے۔

میں نے بمشکل میٹرک کے پیپر دیے اور ابا کا ہاتھ بٹانے لگا۔ ہم اس کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہم اسکول سے واپس آتے تو محنت مزدوری میں لگ جاتے۔ میری امی جاگیرداروں کے کھیتوں میں کام کرتی تھیں۔ ہم کبھی امی جان کی مدد کرتے تو کبھی ابو جان کی۔ جس دن پاپا کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی، اس دن دکان بند ہو جاتی۔ دکان بند ہوتی تو گھر کا چولہا ٹھنڈا پڑ جاتا۔ گھر کے گزر بسر کا واحد ذریعہ دکان ہی تو تھی۔

دن بھر جو سبزی بکنے سے بچ جاتی، ابا وہ گھر لے آتے، امی جان اسے صاف ستھرا کر کے پکاتیں اور ہم سیر ہو کر کھاتے تھے۔ امیروں کی طرح ڈاکٹروں کے

پاس نہیں جانا پڑتا تھا۔امیروں کی طرح روز ہمارے گھر گوشت نہیں پکتا تھا۔کبھی محلے میں خیرات ہوتی تو ہمارے گھر گوشت آجاتا۔ہم بھی گوشت کے مزے لے لیتے تھے۔ورنہ نمک ،مرچ کی چٹنی سے یا پیاز مٹھی میں توڑ کر روٹی کے ساتھ بطور سالن استعمال کر لیتے۔یوں زندگی خراماں خراماں اپنا سفر پورا کر رہی تھی۔

میرے ابا کے ساتھ ان کے بھائیوں نے اچھا نہیں کیا تھا۔روز لڑائی جھگڑے ہوتے۔یوں ایک دن وراثت سے بے دخل کر دیا گیا۔اس رات نہ آسمان رویا نہ بادل گرجے۔زمین پھٹی نہ زلزلہ آیا۔انسان تو انسان ہیں، یہ کب دوسرے کے ہمدرد ٹھہرے۔ہمارے محلے والے بھی خاموش تماشائی بنے رہے۔کسی نے چاچا سبزی والے کے خاندان کو ایک دن کا کھانا تک نہ دیا۔وہ رات ہم نے بے سروسامان، ننگے آسمان تلے گزار دی۔

اگلے دن ابا سبزمنڈی نہ گئے،دن بھر کی جمع پونجی سے آٹا لے آئے اور ہم نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔بے شک نیلے آسمان پر جو کھڑا ہے وہ بہت بڑا مہربان ہے۔وہی رازق ہے، وہی عطا کرتا ہے۔بس صبر کی رسی نہیں چھوٹنی چاہیے۔چاچا سبزی والے کا خاندان صابر وشاکر تھا۔روکھی سوکھی روٹی کھا کر گزارا کر کے شکرانہ ادا کرتا۔وقت محو پرواز رہا اور یہ دن گزر گئے۔

ابا اور ہم نے محنت مزدوری کر کے سر چھپانے کے لیے مکان بنوالیے۔جہاں ابا جان کی پیدائش ہوئی تھی وہ تو ہم کب کے چھوڑ آئے تھے۔اب خوشیوں کے دن آنے تھے۔ہاں ہم جوان ہو رہے تھے۔مگر کہتے ہیں جب اولادیں جوان ہو جائیں تو والدین کی فکریں بڑھ جاتی ہیں۔میرے ابا امی بھی پریشان رہنے لگے۔غریب کے پاس اتنی استطاعت کہاں ہوتی ہے کہ وہ بیٹیوں کو جہیز دے کر رخصت کرے۔بیٹوں کی دھوم دھام سے شادی کرے۔یہی فکر پاپا کو وقت سے پہلے بوڑھا کرتی جا رہی تھی۔

ماہ وسال گزرتے گئے۔ابا نے مجھ سے چھوٹی بہن اور بڑے بھائی کی شادی کر دی۔یہ شادی وٹہ سٹہ کی موذی رسم یہ ہوئی۔وٹہ سٹہ کی رسم دیہاتوں میں عام ہے اور کئی گھروں کو برباد کر چکی ہے۔ترقی کرنے والے مریخ پر جا پہنچے ہیں اور ہم بنیادی مسائل سے نہیں نمٹ سکے۔

شادیاں خوشیوں کی نوید ہوتی ہیں مگر یہ شادی میرے ابا کے لیے وبال جان بن گئی۔روز بروز کے جھگڑوں سے ابا ڈپریشن کے شکار ہوگئے۔نتیجہ یہ نکلا، بھائی نے منہ موڑ لیا۔اس نے علیحدگی اختیار کر لی اور ابا سارے غم من میں چھپائے جی رہے تھے۔

میں ذریعہ معاش کے لیے لاہور میں مقیم تھا۔پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے،گھر سے دور لاہور قسمت آزمائی کر رہا تھا۔ہر ماہ گھر آتا۔ابا جان میرے منتظر ہوتے ، پانچ دن گھر رہتا۔ان پانچ دنوں میں جو وقت میسر آتا ابا کے ساتھ حال احوال ہوتا۔میں ان کے چہرے کو تکتا رہتا۔ان کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔وقت سے بہت پہلے بوڑھے ہوگئے تھے۔بیماریوں نے انہیں دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا۔ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے تھے۔ایسے لگتا تھا جیسے روبوٹ سے کسی پتلی کو چلایا جا رہا ہو۔ہر دوسرے دن ان کے چہرے پر سوجن ہوتی۔سانسیں اکھڑنے لگتی۔جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا ابا کی جیب میں نوٹوں کی بجائے آکسیجن والا انہیلر اور گولیاں دیکھتا آیا تھا۔

”بیٹا!زندگی کا بھروسہ نہیں ہے۔آج ہے کل نہیں ہے،تم گھر کیوں نہیں آجاتے؟“

”ابا!وہاں ابھی جاب ملی ہے،آپ کو معلوم تو ہے کتنی جدوجہد کی تھی،تب ہی یہ جاب ملی ہے۔یہاں تو نوکری ملتی بھی نہیں۔کوشش کر رہا ہوں،مل گئی تو آجاؤں گا نا۔میری نظریں ان کے چہرے پر تھی۔میری باتوں سے ابا جان کے چہرے پر اداسی چھانے لگتی تو میں باتوں کا رخ موڑ لیتا۔ابا کا اداس چہرہ دیکھ کر میں کہتا۔

”ابا جان!آپ سے روز بات ہوتی ہے ناں پھر اداسی کیوں؟ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟“

ابا جان!جواباً کہتے تجھ کو کیا پتا بیٹا۔تیرے بغیر میری کیا حالت ہوتی ہے؟ بیٹا!اب دل نہیں لگتا۔اس بے وفا دُنیا سے تھک سا گیا ہوں۔“

☆......☆

وقت گزرتا رہا۔لمحے منٹوں میں بدلتے رہے۔عید الفطر آگئی۔یہ آخری عید الفطر تھی جو میں نے پاپا کے ساتھ گزاری تھی۔عید کے تیسرے دن بیٹھک کے باہر کیکر کے گھنے درخت کے نیچے ابا اور میں باتیں کر رہے تھے۔بڑا سا

کیکر میرے ابا کا رفیق تھا۔ جب تنہا ہوتے، کیکر ہوتا اور ابا جان ہوتے۔ ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ میرے بڑے ماموں آ گئے۔ ماموں کے آتے ہی میرے چچا بھی آ کر بیٹھ گئے۔ باتوں ہی باتوں میں ابا، ماموں کو کہنے لگے۔

''حاجی صاحب! اب تو دن مقرر کر دو۔ میری حالت دیکھ رہے ہو۔'' ابا نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس وقت ابا کے چہرے پر سوجن ہی سوجن تھی۔ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہے تھے۔ میری شادی کے لیے پریشان رہتے تھے۔ میری شادی ماموں کی بیٹی کے ساتھ ہونی تھی۔ اسی لیے پاپا ماموں کو کہہ رہے تھے کہ جلد از جلد شادی ہو جائے۔ مگر قسمت......

عیدالفطر ختم ہو گئی۔ میری چھٹیاں بھی ختم ہوئی اور میں لاہور جاب پر چلا گیا۔ قدرت خدا کی دیکھو! لاہور واپسی پہنچا ہی تھا کہ ملتان سے جاب کا لیٹر آ گیا۔ لیٹر ملتے ہی میں لاہور کو خیر آباد کہہ کر ملتان آ گیا۔

☆......☆

یہ سولہ اگست کا دن تھا۔ جب میں پہلی ڈیوٹی ملتان ایک کمپنی میں کر رہا تھا۔ ٹھیک آٹھواں دن چوبیس اگست کی صبح کو میری چھوٹی بہن نے کال کی کہ ابا کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ جلدی گھر آ جاؤ۔ ابا جان کو ہسپتال لے جاؤ۔'' میری نائٹ ڈیوٹی تھی۔ میں نے بھائی کا نمبر ڈائل کیا اور کہا کہ ابا کو ہسپتال لے آؤ۔ میں وہاں پہنچتا ہوں۔''

میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ تنخواہ کو بھی دیر تھی۔ مہینے کے آخری ایام چل رہے تھے۔ خیر ایک مہربان سے بیس ہزار ادھار لیے اور مین روڈ پر آ گیا۔ اتنے میں بھائی ابو، کو لے کر آ گیا۔ ابو جان! کی طبیعت بہت بگڑی ہوئی تھی۔ وہاں سے، میں پاپا کو لیے ہسپتال چلا گیا۔ بھائی نے ڈیوٹی پر جانا تھا سو اسے میں نے واپس بھیج دیا۔

میں بھوکا، پیاسا ابا کی تیمارداری کرنے لگا۔ ہسپتال پہنچا تو ڈاکٹر نے انجکشن لگا دیے۔ پاپا کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ مجھے کہنے لگے۔

''بیٹا! تُو نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔ نیند سے تیری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں، تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے۔''

''بس ابا تھوڑی دیر میں گھر چلتے ہیں ناں، ناشتہ بھی کر لوں گا، نیند بھی پوری کر لوں گا۔

اب وہ لمحے، وہ باتیں خون رلاتی ہیں۔ وہ لمحے زہریلے ناگ کی طرح ڈستے ہیں۔

ابا سے باتیں ہو رہی تھی کہ اچانک ان کی طبیعت بگڑنے لگی۔ ڈاکٹر نے جواب دے دیا۔ اس نے نشتر ہسپتال لے جانے کو کہا۔ وہاں سے ریسکیو ایمبولینس منگوائی اور نشتر ہسپتال کی طرف چل پڑے۔ راستے میں میری نظریں ابا کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ابا خاموش تھے۔ بس مجھے تکے جا رہے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔

''بیٹا! اب وقت آ گیا ہے۔ جدائی آن پہنچی ہے۔ گھر کی ذمہ داریاں سنبھال لو۔ چھوٹوں کا خیال رکھنا۔ اپنی ماں کو پریشان نہ ہونے دینا۔ چھوٹی بہن کا خیال رکھنا اور اپنی بھی شادی کر لینا۔''

ابا مسکرائے اور دو موٹے موٹے آنسو آنکھوں کے راستے سے نکل کر رخساروں سے ہوتے ہوئے دامن بھگو گئے۔ میں نے محبت سے سرشار ہو کر ابا جان کا ماتھا چوم لیا۔ ایمبولینس سپیڈ سے نشتر ہسپتال کی طرف محو سفر تھی۔ ابھی ہم نشتر ہسپتال ایمرجنسی وارڈ پہنچے ہی تھے کہ ابا......ہا......ں......ابا نے دم توڑ دیا۔

اُف میں یتیم ہو گیا۔ پاؤں سے زمین سرکتی چلی گئی۔ پھر دُنیا کا ہوش نہ رہا۔ میری دُنیا اُجڑ گئی۔ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کون آ رہا ہے، کون جا رہا ہے؟ بس ابا کی ڈیڈ باڈی لیے ضروری کارروائی کروا رہا تھا۔ من میں طوفان ٹھاٹھیں مار رہے تھے۔ ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ نہ کہرام ختم ہوا، نہ من کو سکون آ سکا۔ میری نیندیں، میرے خواب سب کچھ بکھر گئے۔ میں تنہا سوکھے شجر کی مانند اپنی قسمت پر آنسو بہا رہا تھا۔

گھریلو ذمہ داریاں ناتواں کندھوں پر آن پڑیں۔ ادھر ابا کی جدائی کے لمحات ساتھ نہیں چھوڑتے تھے۔ دماغ کی رگیں پھٹنے کو آتی تھیں۔ کیا کروں اُف خدایا!!

اے خدا! جب تو رشتے بناتا ہے تو پھر جدائیاں کیوں دیتا ہے۔ ابا! داغ جدائی دے کر کرب کے ابدی نیند سو گئے تھے۔ اور میں گھریلو ذمہ داریوں میں ڈٹ گیا۔

وقت سرکتا رہا۔ مجھے کمانا تھا، دن کی خبر تھی نہ رات کا پتا، بس مجھے کمانا تھا۔ ہاں مجھے کمانا تھا۔

☆......☆

اس دن بھی جب شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ گھریلو کام نمٹاتے نمٹاتے دیر ہو گئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور بائیک اسٹارٹ کر کے آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔ آفس جاتے ہوئے کچھ سفر مجھے نہر پر سے گزر کر کرنا ہوتا ہے۔ گھر سے جاتے ہوئے ابھی نہر پر چڑھا ہی تھا کہ میری سماعتوں سے نسوانی آواز ٹکرائی۔ بائیک کے شور کے باوجود وہ آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ جیسے کوئی زخمی عورت درد کی وجہ سے کراہ رہی ہو۔

پہلے تو میں نے اپنا وہم سمجھا۔ بھلا رات کے نو بجے یہاں کون ہو سکتا ہے۔؟ اتنے میں پھر وہی نسوانی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ میری نظریں بے اختیار آواز کا تعاقب کرنے لگیں۔ جیسے ہی میری نظریں نہر سے نیچے کھیتوں کی طرف گئیں، سامنے نوجوان خوبصورت لڑکی کو لنگڑا کر چلتے دیکھا۔ شاید اس کا دایاں پاؤں زخمی تھا جسے وہ زمین کے ساتھ گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہی تھی۔ بائیک کی لائٹ پڑتے ہی ان نے مجھے آواز دی تھی۔ میں رک چکا تھا۔ رات کے نو بجے گھپ اندھیرا، سنسان راستہ اور نوجوان لڑکی دیکھ کر میں حیران و پریشان تھا۔ خوف کی وجہ سے میرے پسینے چھوٹنے لگے۔

''گھبراؤ نہیں۔ میری مدد کرو۔ میں آپ کی احسان مند رہوں گی۔'' حسین و جمیل لڑکی نے مجھے خوف زدہ دیکھ کر کہا۔ کسی کی مدد کر دینا بھی نیکی ہے۔ میرے دل میں خیال آیا اور میں بائیک سے نیچے اتر آیا۔ رات کے پھیلتے اندھیرے میں چمکتا مکھڑا سامنے تھا۔ اتنی خوبصورت لڑکی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جس کے ماتھے پر درد کی وجہ سے شکن بڑی واضح نظر آتی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر رخساروں پر نشان چھوڑ گئے تھے۔ حسین چہروں پر آنسو اچھے نہیں لگتے۔ میں نے سوچا ہی تھا۔

''اے اجنبی! مجھے گھر چھوڑ دو گے؟'' میں سوچوں کے نگر سے باہر آیا۔

بے ساختہ کہا۔

''کیوں نہیں، ضرور۔

کہاں جانا ہے آپ نے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس قریب ہی۔''

''قریب ہی مطلب؟''

''سامنے جو بستی ہے، جہاں لائٹ جل رہی ہیں وہاں تک۔'' اس نے ناک کی سیدھ میں اشارہ کرتے ہوئے مجھے کہا۔

''اوکے۔'' میں نے حامی بھرتے ہوئے جواب دیا۔

حسین مہ جبیں میرا سہارا لیتے ہوئے میرے پیچھے آ بیٹھی۔ دوسرے ہی لمحے بائیک اسٹارٹ تھی۔ جیسے ہی اس نے میرا سہارا لیا، کرنٹ کا جھٹکا سا لگا۔ جیسے میں نے بجلی کی ننگی تار کو ہاتھ لگا لیا ہو۔ میرے جسم سے چنگاریاں سی اٹھنے لگی۔ میں نے باتوں کا سلسلہ بڑھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''رات کے اس وقت، وہ بھی اکیلے، اور پاؤں کو کیا ہوا ہے، جو لنگڑا کر چل رہی تھی؟''

''آہ! میں دادی ماں کو گھر چھوڑ کر بے خیالی میں اپنے گھر جا رہی تھی کہ اچانک ٹھوکر لگی اور میں گہرے گڑھے میں گر گئی۔ پھر مجھے ہوش نہ رہا۔''

واقعی نہر کے کنارے سے ہٹ کر گہرا گڑھا تھا۔ جسے میں برسوں سے دیکھتا آیا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا جو کوئی اس میں گرا تھا۔

''ہوش آیا تو شام ہو رہی تھی۔ مدد کے لیے پکارتی رہی مگر کوئی بھی ادھر سے نہیں گزرا، پہلے آدمی تم ہی ہو۔ میں کافی تگ و دو کے بعد خود کو گڑھے سے نکالنے میں کامیاب ہوئی تھی اور پاؤں کو گھسیٹتے گھسیٹتے گھر جانے کی کوشش کر رہی تھی کہ شکر ہے آپ آ گئے۔ آپ نے مجھے لفٹ دی، میں آپ کیا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔''

اس کی باتیں میرے دل و دماغ پر حاوی ہو رہی تھیں۔ میں اس کے سحر میں ڈوبتا چلا گیا، کیا حسین و جمیل لڑکی تھی۔ حسن اس کے انگ انگ سے ٹپکتا تھا۔ خوبصورت خدوخال، کیا تعریف کروں، ہیرا تھی ہیرا۔ اپنی بائیس سالہ زندگی میں اتنا حسین و جمیل چمکتا چہرہ میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

ہم دھیرے دھیرے محو سفر تھے۔ میرا خوف ختم ہو گیا تھا۔ چند لمحے پہلے جو پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ اب خوبصورت لڑکی کا ساتھ پا کر خوش تھا۔ ہم محو گفتگو

تھے۔اس کی میٹھی میٹھی باتیں مجھے اپنا گرویدہ بنا رہی تھیں۔اس کی باتوں میں چاشنی تھی،مٹھاس تھا،سرور تھا،میں اس کی سوچوں میں گم بائیک چلا رہا تھا۔

حسن کی شہزادی نے تو قریب ہی بستی کا کہا تھا۔مگر سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔دور لالٹینیں جلتی نظر آتی تھی۔جہاں سے چلے تھے وہاں بھی ایسی ہی دیکھی تھیں۔اس نے تو کہا تھا بس قریب ہی ہے لیکن فاصلہ تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔اس کی باتوں میں اتنا محو تھا کہ اس کا نام تک نہ پوچھ سکا،نہ اس کی بستی کا نام پوچھ سکا۔میں تو اس کے سحر میں ڈوب گیا تھا۔مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔اس نے مجھے رکنے کو کہا۔''بس یہی اتار دو۔''میں نے سامنے دیکھا تو خوبصورت محل نما عمارت تھی۔''پھر ملیں گے،اوکے۔'' ہاتھ کے اشارے سے بائے کہہ کر وہ اندر چلی گئی۔

میں اس محل کو بغور دیکھ رہا تھا۔ایسا محل تو میرے راستے میں نہیں آتا،یہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ابھی یہ ہی سوچا ہی تھا کہ مجھے غنودگی محسوس ہوئی اور پھر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔پل بھر میں پہلے والی روشنی ختم ہو گئی تھی،اور اندھیرا اپنی چادر ہر سو پھیلا چکا تھا۔اس سے پہلے کہ میرا دماغ ماؤف ہو جاتا۔تھوڑے ہی فاصلے پر آفس کو جانے والی سڑک نظر آ گئی۔اُف میرے خدایا۔یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔میں نے اپنی تمام تر توانائی یکجا کی اور آفس کی طرف بڑھ گیا۔آفس پہنچ کر معمول کے کام نمٹانے لگا۔

☆......☆

کئی دن گزر گئے،میں اس واقعے کو بھول ہی گیا تھا کہ آفس سے واپس جاتے ہوئے اچانک وہ حسین مہ جبیں میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

''اے اجنبی،بھول گئے ناں مجھے۔لیکن میں بھولنے والی نہیں ہوں۔آپ تو میرے دل وجان کے نہاں خانوں میں اتر گئے ہو۔''

واقعی،حسن انسان کو اپنا گرویدہ بنا دیتا ہے۔میں تو دل ہی دل میں اس کا ہو چکا تھا۔وہ تھی ہی ایسی کہ پہلی نظر میں اپنا دیوانہ کر گئی تھی۔

ایسی ملی کہ ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔روز کام پر آتے جاتے ملاقات ہو جاتی۔

ویک اینڈ پر وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔خوبصورت محل نما،خوشبوؤں سے معطر معطر،پھولوں سے سجا ہوا۔میں روم میں بیٹھا خوبصورتی کے گن گا رہا تھا کہ شہزادی کھانا لیے حاضر ہوئی۔ایسا لذیذ کھانا میں نے کبھی نہیں کھایا تھا۔اور تو اور ایسا کھانا مجھے ملا ہی نہیں تھا۔خیر کھانا کھانے کے بعد مجھے سیر کرانے لے گئی۔

''یہ مجھے تم کہاں لے آئی ہو؟۔ایسا لگتا ہے صدیوں پیچھے چلا گیا ہوں۔نہ کوئی گاڑی نظر آتی ہے،نہ کوئی موٹر سائیکل۔ارے یہ اونٹ اور گدھے قطاریں بنا کر چلے جا رہے ہیں۔نہ کوئی سڑک ہے،نہ پل،نہ فلائی اوور،میں کس دیس میں آ گیا ہوں۔؟''

''میرے بھولے شہزادے،کتنے بھولے ہو تم۔یہ میرا دیس ہے۔تمھارے دیس سے کہیں اچھا۔یہاں نہ افراتفری ہے۔نہ خون خرابہ،سکون ہی سکون ہے۔امن سے زندگی کٹتی ہے۔یہاں کوئی کسی کا دشمن نہیں ہے۔ہم آگ سے بنے ہیں مگر انسان دوست ہیں۔جس طرح تم مٹی سے بنے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں آگ سے پیدا فرمایا ہے۔انسانوں کی طرح جنات میں بھی اچھے اور بُرے دونوں قسم کے ہوتے ہیں۔تم گھبراؤ نہیں۔میں تمھیں ہر آفت،مصیبت سے محفوظ رکھوں گی۔تمھاری حفاظت میرے ذمہ ہوئی۔تم مجھے اچھے لگے ہو۔میں تم سے پیار کرتی ہوں۔بس تم مجھ سے شادی کر لو۔عیش کی زندگی گزرے گی۔بس تم میرے ہو جاؤ۔زمانے کی ہر چیز تمھارے قدموں میں لا کر رکھ دوں گی۔تمھاری ہر خواہش پوری ہو گی۔''

وہ بولتی جا رہی تھی اور میں پسینے سے شرابور تھا۔خوف کے مارے میرا انگ انگ کانپ رہا تھا۔یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔بمشکل میں نے اسے کہا۔

''ہمارا ملن نہیں ہو سکتا۔تم جنات سے ہو اور میں ابن آدم ہوں۔آگ اور مٹی کا ملاپ کیسے ممکن ہے؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔بس تم مجھے میری دُنیا میں چھوڑ دو۔''

''دیکھو سمجھنے کی کوشش کرو۔میں تمھارا ہر طرح سے خیال رکھوں گی۔بس تم ہاں کر دو۔تمھیں گھر والوں کی فکر ہے ناں،ان کی ہر ضرورت پوری کروں گی۔لیکن انکار مت کرو۔'' کافی بحث وتکرار ہوتی رہی۔میں اس کی باتوں میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

آ ہی گیا اور پھر انسان ازل سے لالچی رہا ہے۔ مجھے ہر خوشی مل رہی تھی اور تو اور میرے گھر والوں کا بھی خیال رکھا جانا تھا۔ میں ہاں کہنے ہی والا کہ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ مجھ پر غنودگی چھانے لگی، پھر مجھے ہوش ہی نہ رہا۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ ایک سفید پوش آن کھڑا ہوا۔ کہنے لگا۔

''بیٹا! یہ تم کیا کر رہے ہو۔ اپنے باپ کی نصیحت بھول گئے ہو۔ تم یہاں عیش و آرام کے مزے لے رہے ہو۔ ادھر تمھاری ماں رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔ تمھاری بہن تمھارے غم میں نڈھال ہے۔ اپنے چھوٹے بھائیوں کے بارے میں سوچا ہے۔ بیچارے گم صم رہنے لگے ہیں۔ لوٹ جاؤ اپنی دُنیا میں۔ ان کو تمھاری ضرورت ہے۔ اپنے باپ کے ساتھ کیے گئے عہد نبھاؤ۔ تمھاری منگیتر تمھاری راہیں تک رہی ہے۔ یہ کلمات میں پڑھ رہا ہوں تم بھی ویسے ہی پڑھتے جاؤ۔ یہاں سے آزاد ہو جاؤ گے۔''

پھر سفید پوش بزرگ کلمات پڑھتے گئے اور میں ان کی نقل کرتا گیا۔

جب آنکھ کھلی تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ گھر کے صحن میں میں چارپائی پر پڑا بخار سے تڑپ رہا تھا اور میرے اردگرد میرے گھر والے اداس بیٹھے تھے۔ میرا سر ماں جی کی گود میں تھا اور چھوٹی بہن میرے چہرے کو تکے جا رہی تھی۔ بھائی میرے پاؤں کے تلوے مسل رہے تھے۔

''میں یہاں کیسے پہنچا؟'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے ماں جی سے پوچھا۔

''بیٹا! تم تو دو ماہ سے غائب تھے۔ ایک دن کام پر کیا گئے پھر واپس نہیں آئے۔ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تمھیں۔ تھانے میں رپورٹ کی، گلی محلے چھان مارے، مگر تمھارا سُراغ تک نہ ملا۔ پیروں، فقیروں کے پاس دم درود کرائے۔ میری فریادیں سنی گئی۔ کل رات کو تم بیٹھک والے کیکر تلے بے ہوش پڑے تھے۔ تمھارا بھائی ادھر سے گزرا تو اس کی نظر پڑی۔ ہم تمھیں گھر اٹھا لائے۔ کل سے تم بے ہوش پڑے تھے۔ شکر ہے تمھیں تو ہوش آیا۔ بیٹا! تم آخر کہاں چلے گئے تھے۔؟ اچانک کیکر تلے رات کے اندھیرے میں بے ہوش پڑے ہونا میری سمجھ سے باہر ہے۔ کچھ تو ہمیں بتاؤ۔''

اماں جی! کے پوچھنے پر میں نے اپنے ساتھ بیتنے والی تمام داستان سنا دی۔ ماں صدقے واری ہونے لگی اور شکرانے کے نفل ادا کیے۔ اب میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ جب سے ان بزرگ نے کلمات کا ورد بتایا تھا۔ تب سے میرے اردگرد حصار سا ہے۔ محافظوں کی ایک جماعت میرے اردگرد رہتی ہے۔

اس واقعہ کے چھ ماہ بعد میں نے شادی کر لی اور خوش گوار زندگی گزار رہا ہوں۔ میری وہ محبوبہ آج بھی مجھ پر مرتی ہے۔ میرے حصار کے باہر میرے ساتھ رہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے۔

''اے ابنِ آدم کیا ہوا، جو تُو نے مجھے اپنایا نہیں۔ میں تو تم پر مرتی ہوں اور مرتی رہوں گی۔ جب تک جان ہے یہ جان تمھاری ہے۔ یہ بھی سچ ہے مجھ پر کوئی آفت آنے لگتی ہے تو وہ دیوار بن جاتی ہے۔ کئی دفعہ حادثات کا شکار ہوا ہوں مگر رتی برابر بھی چوٹ نہیں لگی۔ میری محبوبہ مجھے چوٹ لگنے بھی نہیں دیتی۔ جب بھی میں گرنے لگتا ہوں ایسا لگتا ہے کوئی ہاتھ مجھے سنبھال لیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری وہ محبوبہ مجھے کبھی بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ میں ہی بے وفا تھا جو اس کے ساتھ وفا نہ کر سکا۔ وہ مہ جبیں ہر لمحہ، ہر پل میرا خیال رکھتی ہے۔ کیا خوب بات اس نے مجھے کہی تھی۔

اے ابنِ آدمؑ! جس طرح تم قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہو اُسی طرح ہم بھی قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کا احترام کرتے ہیں۔ جس دن سے تم نے کلمات کا ورد رکھا ہے، تمھارے اردگرد حصار سا بن گیا ہے۔ میں اس حصار کو توڑ کر اندر نہیں آ سکتی مگر حصار کے باہر تمھارا خیال میرے لیے لازم ہے۔ بس میں تمھیں چاہتی تھی، چاہتی ہوں اور چاہتی رہوں گی۔ میری محبت ہمیشہ سایہ بن کر تمھارے ساتھ رہے گی۔ کیونکہ محبت کرنا جرم نہیں ہے۔ محبت عبادت ہے اور میں نے عبادت کی ہے۔ کوئی محبوب اپنے محبوب کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔ محبت قرب نہیں مانگتی، بس محبوب کو خوش دیکھنا چاہتی ہے اور میں تمھیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔''

اس کی باتیں آج بھی میری سماعتوں سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ کیسی عجیب محبت ہے۔ جب بھی تنہا ہوتا ہوں اس کی باتوں، اس کی سوچوں میں گم ہو جاتا ہوں۔

☆☆......☆☆


TIBET
NATURAL
Honey
Lotion
TIBET
NATURAL
Honey
Lotion


TIBET
Cold Cream
TIBET
Cold Cream

ساتویں سچ بیانی

اِک خلش ہے...

کرن نورین

خوشیوں اور دکھوں کی آنکھ مچولی، ایک بے بس خاندان کی داستان کراچی سے



اس واقعے کو گزرے کئی سال بیت گئے ہیں، لیکن آج بھی کہیں اگر کسی حادثے کی خبر سنوں اور اس کے بدلے میں زخمیوں اور مرنے والوں کے لواحقین کو معاوضے کی ادائیگی کے حوالے سے کوئی خبر معلوم ہو تو اس واقعے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

یہ 2001ء کی بات ہے۔ ہماری ماسی روتی پیٹتی آئی تو ہم گھبرا گئے، کیوں کہ وہ بہت نیک فطرت تھی۔ بہانے بہانے سے اور رو کر مدد مانگنے کی اس کو عادت نہ تھی، کہنے لگی۔ رات گھر کی چھت گر گئی، جس کے نیچے دب کر میری پھول سی معصوم بچی ہلاک ہو گئی اور شوہر زخمی ہو گیا ہے۔ ایک کمرہ اور برآمدے پر مشتمل کچا سا گھر، جس کے کمرے کی چھت گر گئی، تو مکان بھی چھوٹ گیا۔ شوہر کی ٹانگ بھی زخمی ہوئی۔ وہ یہ بتا کر چلی گئی تو ہم محلے کی خواتین مل کر اس کے گھر گئیں۔ وہ اسی گلی میں تین چار گھر چھوڑ کر نند کے گھر پر تھی۔ بچی کا جنازہ تیار تھا۔ چار سال کی معصوم بچی، سر پر پتھر لگنے سے موقع پر ہی دم توڑ گئی تھی۔ آہ و بکا جاری تھی۔ زلیخا کی باقی دو بیٹیاں، بیٹے اور گھر کی خواتین سب با آواز بلند رو رہی تھیں، بین کر رہی تھیں۔ زلیخا ایک کونے میں خاموش بیٹھی تھی۔ شوہر کے پیر میں فریکچر ہو گیا تھا۔ شوہر کے بہنوئی، بھائی سب مل کر اسے سرکاری اسپتال لے گئے تھے، جہاں آٹھ گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی ڈاکٹر نے کوئی توجہ نہ دی تھی۔ ہم سے جتنا ہوا، مالی مدد کر کے آدھے گھنٹے رک کر آ گئے۔

دو تین دن بعد ہمیں دوسری کام والی مل گئی۔ زلیخا کی خبر ملتی رہی کہ اس کے شوہر کا روزگار چھوٹ گیا ہے اور زلیخا بھی گھر اور اسپتال کے چکر لگا لگا کر سب کام کاج چھوڑ چکی ہے۔ بڑے بیٹے کا کام بھی چھوٹ گیا تھا، اب چھوٹا بیٹا کسی درزی کے پاس بیٹھتا ہے۔ بڑی بیٹی پروین کو زلیخا اپنے ساتھ لاتی تھی، لیکن اب اکیلے لڑکی بھیجنے کے خوف سے اس کو بھی گھر میں بٹھا دیا تھا۔ پروین اور جمیلہ اب گھر بیٹھ کر لفافے بناتیں اور چھوٹا بھائی درزی کے پاس جاتا، اسی سے گزر بسر ہوتی تھی۔ قلیل ترین آمدنی اور اسپتال کے خرچے کی وجہ سے اسے ایک تنگ و تاریک گھر میں منتقل ہونا پڑا تھا، کیوں کہ انسان کو سر چھپانے کو ٹھکانہ تو چاہیے۔

☆......☆

اس واقعے کو گزرے تقریباً سال ہو گیا تھا۔ میں اپنے بچوں کا ماہانہ رزلٹ لینے ان کے اسکول گئی تو ایک لڑکی نے مجھے سلام کیا۔ ”السلام علیکم باجی۔“ میں حیرت سے مڑی۔ دیکھا تو زلیخا کی بیٹی پروین ایک صاف ستھرے مہذب حلیے میں ٹیچر کی مددگار کے طور پر موجود تھی۔

”تم یہاں کیسے؟“ حیرت کے مارے میرے منہ سے یہی نکل سکا۔ یہ اسکول شہر کے بہترین اسکول چین میں سے ایک تھا۔

”جی بس ٹیچر کی چیزیں لانے اور دینے میں مدد کرتی ہوں۔“ پروین نے کافی خود اعتمادی سے کہا۔ مجھے بے اختیار ڈری سہمی پروین یاد آ گئی۔

”اور سناؤ زلیخا کہاں ہے؟ ابا کیسا ہے؟ بھائی کا کام کیسا چل رہا ہے؟“

میں نے مارے جوش کے اس سے کئی سوال کر ڈالے۔

”باجی میں اتوار کو آپ کے گھر آؤں گی، تو بتاؤں گی۔ آپ ابھی بھی وہیں رہتی ہیں نا؟“ پروین نے میرے جوش پہ ٹھنڈے چھینٹے مارے۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں، زلیخا کو بھی لے کر آنا، کتنے دن گزر گئے اس کو دیکھا نہیں ہے۔“ میں نے بھی ذرا سنبھل کر کہا۔

”جی! میں آؤں گی۔ دراصل ابھی یہاں کام کرتے ہوئے مجھے دو ہفتے ہی ہوئے ہیں۔ اگر کسی نے بات کرتے دیکھ لیا تو مسئلہ ہو گا اور امی تو اب نہیں رہیں۔ میں آؤں گی، خدا حافظ۔“

پروین مجھے ہکا بکا چھوڑ کر ٹیچر کے بلانے پر چلی گئی۔ میں کئی لمحے اس کے جملے پر غور کرتی رہی، پھر نڈھال قدموں سے باہر آ گئی۔

☆......☆

گھر آ کر میں نے اتوار کا انتظار بڑی بے چینی سے کیا، آخر اتوار کی شام پانچ بجے پروین آئی۔ مجھے اس کی داستان سننے کی جلدی تھی، مگر کچھ مہمان داری کا تقاضا بھی تھا۔ میں نے چائے کے ساتھ نمکو اور بسکٹ اس کے آگے رکھ دیے اور کہا۔

”اب بتاؤ تمہاری اماں کو کیا ہوا؟“ میرے لہجے

میں بے تابی تھی۔

"بس باجی کیا بتاؤں، جب چھوٹی مری تو آپ لوگ آئے تھے۔ اس کے بعد ابا کا علاج اور گھر کی مصیبت، اماں اور بھائی کا کام بھی چھوٹ گیا تھا۔ چھوٹا سلیم درزی کے پاس سیکھنے جاتا تھا۔ میں اور جمیلہ لفافے بنانے لگے، مگر اماں اور بھائی کا اسپتال جانے کا کرایہ اور دوا کے پیسوں کی وجہ سے بہت مشکل تھی۔ کئی کئی دن کھانے کو نہ ہوتا۔ کبھی آپ لوگ مدد کر جاتے تھے تو......

ورنہ باقی رشتے دار بھی ہمارے ہی جیسے تھے، پھر ماموں کا فون گاؤں سے آیا کہ گاؤں میں نانا کی ایک زمین تھی۔ نانا کے فوت ہونے پر اسے بیچا ہے تو اپنا حصہ لے جاؤ اور بیٹے کو کام پر لگاؤ۔ ابا گھر آ گیا تھا، مگر زخم صحیح نہیں ہوا تھا۔ اماں اور بھائی ٹرین سے گاؤں کے لیے نکلے تو گھوٹکی اسٹیشن پر ٹرین میں آگ لگ گئی اور......" پروین ہچکیوں سے رونے لگی۔

"اماں اور بھائی دونوں ہی جل گئے، پھر کچھ دنوں بعد ماموں پیسے لے کر آئے تو ابا کا علاج ہوا اور پھر حکومت نے اماں اور بھائی کا معاوضہ دیا تو ایک چھوٹا سا گھر لے لیا ابا نے اور اسی میں ایک چھوٹی سی دکان کھول لی۔ چھوٹا بھائی اب اپنی دکان چلاتا ہے۔ میں نے آٹھویں پڑھی تھی، تو اب میں نے اسکول میں نوکری کر لی۔ یہ نوکری پھوپھی کی باجی (جہاں وہ کام کرتی ہے) نے دلوائی ہے اور جمیلہ اسکول پڑھنے جانے لگی ہے۔"

یہ بتا کر پروین پھر رونے لگی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ حالات بہتر ہونے پر خوشی کا اظہار کروں یا کہ ماں اور بھائی کے بچھڑنے پر افسوس۔ کس طرح ایک طرف غم کا پہاڑ آ گرا بچوں پر اور دوسری طرف اسی وسیلے سے معاشی مسائل حل ہو کر زندگی آسان ہو گئی۔

میں نے سوچوں کے گرداب سے خود کو نکال کر پروین کو تسلی دی اور ماں اور بھائی کے بچھڑنے پر تعزیت کی، مگر خود زندگی کے اس روپ پر بے انتہا حیران تھی۔ واقعی زندگی کے رنگ بہت ہی الگ ہوتے ہیں۔ کبھی غم دے کر خوشی ملتی ہے تو کبھی خوشی کے پیچھے غم کے سائے بھی ساتھ چلتے آتے ہیں۔ مالک! تیرے بھید تو ہی جانے۔ مگر......دل میں خلش تو رہتی ہے نا۔

☆☆......☆☆

آٹھویں سچ بیانی

جیون آگ کا دریا

نازیہ بتول رضا

کراچی سے ایک دوشیزہ کی عبرت بھری سچ بیانی

آج دو سال بعد زینت کا فون آیا تھا لندن سے! آواز سے بہت پُرسکون اور مطمئن لگتی تھی۔ پھر بھی میں نے پوچھا۔

''کیسی ہو زینت؟ خوش تو ہو نا؟''

''ہاں میں اب بہت پرسکون ہوں، یہیں کے اسپتال میں نرس کے فرائض انجام دے رہی ہوں۔ پتا ہے نورین! لوگوں کی خدمت کرکے بہت سکون ملتا ہے۔ تکلیف سے تڑپتے بلکتے لوگوں کو جب میں دوا دیتی ہوں ان کو آرام پہنچاتی ہوں تو وہ مجھے ڈھیروں دعائیں دیتے ہیں۔ شاید اُن ہی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میری زندگی میں بھی ٹھہراؤ آ رہا ہے، مجھے سکون راس آ رہا ہے ورنہ تو میں بالکل نا اُمید ہو چکی تھی کہ شاید میری زندگی سے ساری خوشیاں روٹھ چکی ہیں، لیکن اب دوسرے لوگوں کی تکلیف دور کرکے انہیں آرام پہنچا کے مجھے جو حقیقی خوشی حاصل ہوتی ہے اُسے میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی۔''

وہ کافی حد تک پُرسکون لگ رہی تھی۔ مجھے بہت خوشی ہوئی، میں نے اُسے صدقِ دل سے دعا دی۔

''خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے، تمہاری زندگی میں دُکھ کا شائبہ تک نہ ہو۔'' جواب میں اُس نے ''آمین'' کہا پھر پوچھنے لگی۔

''اچھا یہ تو بتاؤ کہ شادی کا کب تک ارادہ ہے کوئی منگنی وگنی ہوئی کہ نہیں؟''

''ارے ہاں بابا! میری منگنی ابھی کچھ مہینوں پہلے ہی ہوئی ہے اور عنقریب شادی ہونے والی ہے۔''

''واہ واہ! سارے کام چپکے چپکے ہوگئے اور ہمیں خبر تک نہ ہونے دی۔ ایسی ہوتی ہے دوست؟''

وہ چہک رہی تھی، میری شادی کا سن کر اس کی پرانی شوخی عود آئی تھی۔ میرے دل سے دعا نکلی۔

''کاش وہ ایسے ہی ہنستی کھلکھلاتی رہے، آمین۔''

''ارے نہیں زینت میں تمہیں بتانا چاہتی تھی، لیکن تمہارا ایڈریس بھی تو نہیں تھا میرے پاس، سوچو میں تمہیں کیسے بتاتی؟'' میں روانی میں کہہ گئی۔

''اب تم بتاؤ کہ تم کب شادی کررہی ہو؟ ملا کوئی؟'' میں کہتی چلی گئی پھر مجھے احساس ہوا کہ میں نے اُس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا وہ فوراً ہی رنجیدہ ہوگئی اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

''نورین اب یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ میں زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں کیوں کہ مجھے مرد ذات سے نفرت ہے نفرت!'' وہ حقارت اور دُکھ سے بول رہی تھی۔

''لیکن زینت سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔'' میں نے اُسے صفائی دی۔

''مجھے جو ملے وہ تو سب ایک جیسے تھے۔'' وہ بے ساختہ بولی اور مجھے لاجواب کر دیا۔ میں خاموش رہ گئی۔ کچھ نہ بول سکی بولتی بھی کیا؟ اس کی زندگی تو میرے سامنے کھلی کتاب کی مانند تھی۔

''اپنا خیال رکھنا، اللہ حافظ۔'' اس نے کہا اور لائن منقطع ہوگئی اور میں ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگی۔

☆......☆

زینت ہمارے محلے میں رہا کرتی تھی اور چار بھائیوں کی اکلوتی اور لاڈلی بہن تھی گو کہ زینت ایک عیسائی فیملی سے تعلق رکھتی تھی، لیکن ہمارے گھر اس کا بہت آنا جانا تھا۔ دراصل وہ میری چھوٹی بہن کی کلاس فیلو بھی تھی اور اچھی دوست بھی، اسی لیے ہمارے گھر اس کا بہت آنا جانا تھا۔ اس کے گھر والوں کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا کیوں کہ ہمارے گھر کا ماحول بہت اچھا تھا اور ویسے بھی دن میں بھائی اور ابو تو گھر میں ہوتے نہیں تھے۔ صرف ہم دونوں بہنیں اور امی ہی ہوتی تھیں۔ اس لیے زینت بے فکری سے آجاتی تھی۔

زینت فطری طور پر ایک بھولی اور معصوم لڑکی تھی۔ وہ آٹھویں کلاس میں کیا آئی کہ دوسری لڑکیوں کی دیکھا دیکھی اُسے بھی موبائل فون کا شوق ہوا اور پھر اُس نے



اپنے بھائیوں سے موبائل فون والی ضد منوالی اور فون لے کر ہی دم لیا۔ بس پھر کیا تھا نیا شوق تھا وہ پڑھائی وڑھائی بھول کر ہر وقت موبائل پر لگی رہتی۔ کبھی گیم کھیل رہی ہوتی، تو کبھی فالتو کے ایس ایم ایس میں مشغول رہتی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آٹھویں میں بُری طرح فیل ہوگئی اور اس کو گھر والوں سے بُری طرح ڈانٹ پڑی۔ وہ پریشان پریشان میرے پاس چلی آئی میں نے اُسے بہت سمجھایا کہ ''اپنی پڑھائی پر مکمل توجہ دو، موبائل تو ساری زندگی استعمال کر سکتی ہو مگر یہ وقت اگر تمہاری مٹھی سے پھسل گیا تو پھر ہاتھ نہیں آئے گا اور تم بہت پچھتاؤ گی۔''

''ہاں ٹھیک کہہ رہی آپ میں اپنی پڑھائی پر بھرپور توجہ دوں گی لیکن مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں ہر تعاون کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے کھلے دل سے کہا۔

''دراصل مجھے روزانہ ٹیوشن کی ضرورت ہے اور میرے گھر والے سوائے گھر کے مجھے اور کہیں جانے کی اجازت نہیں دیں گے اور یہ معلوم ہی ہے کہ میرے دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔ سیدھی طرح کوئی بات سمجھ میں آتی ہی نہیں ہے۔ میں پڑھوں تو کیسے پڑھوں؟'' وہ پریشان تھی۔

''ارے بھئی! میں نے کہا نا تم میرے لیے شائستہ جیسی ہو۔ (شائستہ میری چھوٹی بہن ہے) جیسے میں اسے گائیڈ کرتی ہوں، ایسے تمہیں بھی کردیا کروں گی۔ بس اب تم یہ فالتو چکر چھوڑ کر اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔''

میں نے اُسے پڑھائی کی طرف مائل کیا اور حوصلہ دیا میں ان دنوں میٹرک میں تھی۔ وہ میری ہم عمر ہی تھی اس لیے میرا نام لیتی تھی اور بے تکلف بھی تھی، لیکن میں پھر بھی بڑے پن کا رعب جمایا کرتی تھی اور اکثر شائستہ اور زینت کو زمانے کی اونچ نیچ اور اچھائی بُرائی سمجھاتی رہتی تھی اور پھر اس نے روزانہ ہمارے گھر پڑھنے آنا شروع کردیا۔ میں پوری دلجمعی سے اُسے پڑھاتی ہر ہر بات سمجھاتی اور پھر جب میرے بورڈ کے امتحانات نزدیک آئے، تو میں نے اُسے پڑھائی کی تاکید کرتے ہوئے ٹیوشن آنے سے منع کردیا۔ بس یہیں سے اس کی تباہی کا دور شروع ہوا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اندھی راہوں کی مسافر بن جائے گی، تو میں کبھی ایسا نہ کرتی۔ کسی بھی طرح وقت نکال کر اُسے پڑھاتی، لیکن اگر انسان آنے والے حالات سے باخبر ہو جائے حفاظتی اقدامات نہ کرلے۔

زینت کند ذہن تو تھی ہی اب اُسے کوئی پڑھانے والا نہ رہا، تو اُسے دن میں تارے نظر آنے لگے۔ اس نے اپنی اس پریشانی کا ذکر جب اپنی امی سے کیا اور کہا کہ وہ کوچنگ سینٹر جانا چاہتی ہے، تو پہلے تو اس کی امی نے صاف انکار کردیا کہ ''جیسا بھی ہے گھر میں پڑھو کوچنگ سینٹر کا ماحول اچھا نہیں ہوتا۔'' لیکن زینت بھی بڑی چالاک تھی اس نے کہا۔

''نہیں امی میری اک سہیلی بھی جاتی ہے۔ میں اُسی کے ساتھ جاؤں گی اور آؤں گی۔ پلیز مجھے اجازت دے دیجیے۔'' اور پھر اس کی امی نے ہزاروں نصیحتوں کے بعد اسے اجازت دے دی اور زینت اپنی سہیلی کے ساتھ کوچنگ جانے لگی۔ کچھ دنوں تک زینت کی امی بھی ساتھ چھوڑنے جانے لگیں، لیکن جب انہیں سب ٹھیک لگا تو انہوں نے جانا چھوڑ دیا۔

زینت کو اسی طرح کی آزادی پہلی مرتبہ ملی تھی لہٰذا ہر چیز میں اسے نیا پن اور خوب صورت نظر آنے لگی۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی لہٰذا کوچنگ میں آنے والے لڑکے بھی اس کی طرف متوجہ ہونے لگے اور کچی عمر کی اس لڑکی کو بھی ان کی التفاتی نظریں اچھی لگنے لگیں۔ ان ہی میں سے ایک لڑکے نے کوچنگ سے چھٹی پر اس کے ہاتھ میں اک رقعہ تھمایا اور جلدی سے نکلتا چلا گیا۔ زینت حیران تھی۔ بہر حال اس نے اپنی سہیلی کو بتایا۔ سہیلی صاحبہ خود کسی لڑکے کے عشق میں گرفتار تھیں۔ لہٰذا اس سہیلی نے اُسے بڑھاوا دیا اور اپنے گھر لے گئی۔ وہاں سہیلی کے کمرے میں بیٹھ کر ان دونوں نے وہ خط پڑھا، لکھا تھا۔

''زینت! جب سے تمہیں دیکھا ہے میں تو دیوانہ ہوگیا ہوں۔ ہر دم بس تمہارا ہی چہرہ نگاہوں میں رہتا ہے۔ تم سے بہت دن سے بات کرنا چاہ رہا تھا، لیکن ڈرتا تھا کہ تم بُرا نہ مان جاؤ۔ اگر میرا ساتھ قبول ہے تو اس نمبر پر کال دے دینا اور اس کے نیچے موبائل نمبر لکھا تھا، میں سمجھ جاؤں گا۔

زینت کے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے جبکہ زینت کی سہیلی پُرانی اور پکی کھلاڑی تھی۔ وہ خوش ہو رہی تھی

کہ چلو اب ان راستوں پر وہ اکیلی نہیں بلکہ زینت بھی اُس کے ساتھ ہے۔

''نہ بابا میں تو اُسے صاف منع کر دوں گی۔'' اگر ہمارے گھر میں کسی کو بھنک بھی پڑ گئی، تو مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔'' زینت نے کہا۔

''ارے پگلی! کیسے پتا چلے گا کسی کو؟ تیرا کمرہ تو الگ ہے نا! بس تو رات کو اپنے کمرے میں جلدی چلی جانا اور فون ریسیو کر لینا اور اس لڑکے کو سمجھا دینا کہ وہ کبھی بے وقت فون نہ کرے، بس بات ختم۔'' سہیلی نے اسے سبق پڑھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن پھر بھی......!'' زینت بُری طرح گھبرا رہی تھی۔

''ارے تو ایک مرتبہ ان راستوں پر چل کے تو دیکھ، مزا نہ آ جائے تو کہنا۔'' وہ بدتمیزی سے آنکھ مارتے ہوئے بولی۔

''ابھی تھوڑے دنوں میں تیرا دیوانہ تجھ پہ قیمتی تحائف کی برسات کر دے گا۔ پھر تیرے موبائل میں بیلنس لوڈ بھی وہ خود کروائے گا اور تیرے عیش ہی عیش ہوں گے۔'' یہ اور نجانے کیا کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر کے اس نے زینت کا دماغ خراب کر دیا اور پھر زینت دھیرے دھیرے ان اندھی راہوں کی مسافر بنتی چلی گئی۔

زینت شاید نہیں جانتی تھی کہ ان راستوں کے مسافر کو کبھی منزل نہیں ملتی بلکہ ان خار دار راہوں میں اُلجھ کر اپنا وجود چھلنی کر بیٹھتے ہیں اور آخر میں تہی داماں رہ جاتے ہیں اور ان کے ہاتھ سوائے ذلت و رسوائی اور تنہائی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

کاش زینت سمجھ پاتی، لیکن وہ تو چپ چاپ اپنی سہیلی کے اوٹ پٹانگ مشوروں پر عمل کرتی چلی گئی اور سب کچھ لُٹا بیٹھی اور پھر آہستہ آہستہ اس لڑکے نے زینت سے کترانا شروع کر دیا۔ زینت پریشان رہنے لگی ابھی وہ اس سلسلے میں کچھ بات کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ وہ لڑکا ایک دم منظر سے ہی غائب ہو گیا۔ زینت کا تو جیسے لہو کسی نے نچوڑ لیا۔ سارا سارا دن بولائی بولائی پھرتی۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ یہ سب ہوا کیا؟ وہ تو اُسے سب کچھ مان بیٹھی تھی۔ اپنا سب کچھ اس لڑکے پر نثار کر بیٹھی تھی اور اب جب زینت کے لیے واپسی کا کوئی دَر نہ بچا، تو وہ اسے بیچ منجدھار میں چھوڑ کر اُڑن چھو ہو گیا تھا۔

اب زینت کا کہیں دل نہ لگتا تھا۔ نہ کوچنگ میں، نہ گھر میں۔ پڑھائی سے بھی جی اُچاٹ ہو گیا، لیکن زینت کی نام نہاد سہیلی نے تو گویا قسم کھا رکھی تھی زینت کو بربادی و تباہی کے دہانے پر پہنچانے کی، سو وہ اس نے پوری کر دکھائی اور زینت کی کوچنگ سے ایک ہفتہ غیر حاضری کے باعث وہ اس سے ملنے اس کے گھر تک آ پہنچی۔ زینت اس وقت اپنے کمرے میں اپنی بربادی اور اس لڑکے کی بے وفائی کا ماتم کر رہی تھی۔ عجیب حال بنا رکھا تھا۔

''ارے یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا؟ تم تو بالکل غائب ہی ہو گئیں، کہاں ہو بھئی؟''

''وہ آتے ہی شروع ہو گئی۔ زینت سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کہیں نہیں بس گھر میں ہی تھی۔ دل نہیں چاہ رہا تھا کوچنگ جانے کا سو نہیں گئی، تم سناؤ کیسی ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں، ایک دم فٹ فاٹ تم بتاؤ تم کس بات کا سوگ منا رہی ہو کہ دنیا سے ہی کٹ گئیں۔''

''کچھ نہیں یار بس کہیں دِل نہیں لگ رہا ہے۔'' یہ کہتے کہتے زینت دھواں دھار رونے لگی۔

''ارے ارے کیوں رو رہی ہو؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔'' شازیہ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟ یا...... یا شعیب سے جھگڑا ہو گیا ہے؟''

بس شعیب کا نام سننا تھا کہ زینت اور بھی زور و شور سے رونے لگی اور شازیہ بن کہے ہی سب سمجھ گئی کہ ڈرامے کا ڈراپ سین ہو چکا ہے۔ لہٰذا اطمینان سے بولی۔

''اوہ! اب بھی تم شعیب کی وجہ سے پریشان ہو نا؟ چلو مجھے بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟'' اور زینت نے آہوں سسکیوں کے درمیان اُسے ساری روداد من و عن سنا دی۔ جسے سُن کر اول تو شازیہ نے سر تھام لیا۔ پھر ہوا میں اُڑاتے ہوئے بولی۔

''بس اتنی سی بات؟ اور تم ہو کہ رو رو کر ہلکان ہوئی جا رہی ہو۔''

''مطلب؟'' زینت کو دھچکا لگا۔ ''تمہارے نزدیک یہ اتنی سی بات ہے؟''

''ہاں اور نہیں تو کیا۔'' پھر قدرے توقف سے بولی۔

''دیکھو زینت یہ جو لڑکے ہوتے ہیں ناں یہ صرف ٹائم پاس کرتے ہیں اور وقت نکل جانے پر یہ پیچھے مڑ کر

دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے اور محترمہ آپ کو کس نے کہا تھا کہ سنجیدہ ہو جاؤ تم بھی صرف ٹائم پاس کرتیں نا!''

زینت حیرت سے شازیہ کی شکل تکنے لگی۔ اُس کا تو یہ پہلا پہلا تجربہ تھا جو بہت تلخ ثابت ہوا تھا۔ زینت تو واقعی شعیب کے ساتھ سیریس ہو چکی تھی اور اسی کو سب کچھ مان بیٹھی تھی اور شعیب نے بھی تو شادی کر کے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر کیا ہوئے اُس کے وعدے؟ کیا ہوئیں وہ قسمیں، وہ محبت کے بلند و بانگ دعوے سب جھاگ کی طرح بیٹھ چکے تھے اور زینت اس غم کو دل سے لگائے زندگی بھر کا روگ بنا بیٹھی تھی اور...... اور شازیہ کے نزدیک یہ معمولی بات تھی صرف اور صرف ٹائم پاس۔

''شازیہ تم یہ کس قسم کی باتیں کر رہی ہو؟ شعیب نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میرے اعتبار کا خون کیا ہے، مجھے سہانے سپنے دکھا کر ان کو چکنا چور کر دیا ہے۔ میرے ساتھ بڑے بڑے وعدے کیے، ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائیں اور جب میں مکمل بھروسہ واعتماد کر کے اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی، تو وہ مجھے بیچ منجدھار میں چھوڑ کر بھاگ گیا اور تم ان سب باتوں کو ٹائم پاس کہہ کر اُڑا رہی ہو؟''

''ارے بابا میں مانتی ہوں کہ تمہارے ساتھ غلط ہوا۔ تمہارے ارمانوں کو خون ہوا، تمہارے خواب چکنا چور ہوئے، تو پھر اب کیا کیا جائے؟ کیا جینا چھوڑ دیا جائے؟ اور زندگی بھر اس ایک غم کے ماتم میں ساری خوشیوں کو پسِ پشت ڈال دیا جائے؟'' شازیہ سوالیہ نظروں سے زینت کو دیکھ رہی تھی اور زینت ٹکر ٹکر شازیہ کی شکل تک رہی تھی۔ شازیہ نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔

''بولو جواب دو۔ کیا تم اب ہمیشہ کے لیے اس کمرے میں قید ہو کر رہ جاؤ گی؟ اپنی زندگی سے، اپنی خوشیوں سے، اپنے رشتے ناتوں سے منہ موڑ لو گی؟ نہیں زینت یہ ناممکن ہے۔ تمہیں جینا ہے، تعلیم بھی حاصل کرنی ہے اور ہاں شعیب جیسے لڑکوں کو منہ توڑ جواب بھی دینا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' زینت ابھی تک حیران تھی۔

''ارے بھئی! سمپل ہے۔ جس کی طرح تمہیں شعیب نے ورغلایا تم سے محبت کی پینگیں بڑھائیں اور پھر جب تم اس کی محبت میں پور پور ڈوب گئیں، تو وہ تمہیں روتا بلکتا چھوڑ کر دوسری لڑکیوں کو بے وقوف بنانے نکل پڑا اور یہاں تم بیٹھی اس کا سوگ منا رہی ہو۔''

''تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ میں بھی شعیب کی طرح محبت سے کھلواڑ کروں؟ کسی کی آنکھوں میں خواب سجا کر انہیں چکنا چور کروں، نہیں شازیہ مجھ سے یہ سب نہیں ہوگا۔ پھر مجھ میں اور شعیب میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔''

''تو ختم کرو ناں اس فرق کو! وہ اگر انسان ہے، تو تم بھی فرشتہ نہیں ہو۔ وہ اگر بے وفائی کرے اور دھوکا دے تو ہم قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیں، لیکن یہ ہی بدلہ ہم اتاریں۔ تو کیا یہ دھوکا دہی اور بے وفائی میں شمار ہوگا؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ میں تو اس ہاتھ دو اور اُس ہاتھ لو کی قائل ہوں۔ بھئی ہم غلط کیا کر رہے ہیں؟ بلکہ جو دنیا ہمیں دے رہی ہے ہم وہی اُسے لٹا رہے ہیں۔ بتاؤ ذرا اس میں غلط کیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں اگر سکون حاصل کرنا چاہتی ہو تو اپنا انتقام لو۔''

''انتقام مگر کس سے؟ شعیب سے؟''

''ہاں اگر شعیب مل جائے تو شعیب سے بھی اور اگر نہیں ملتا تو اس جیسے تمام لڑکوں سے جو معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ آزما کر دیکھو تمہیں تسکین نہ ملے تو کہنا۔'' شازیہ دعوے سے بولی اور وہ قائل ہو گئی۔

زینت نے سوچا کہ میرا کیا قصور تھا؟ مجھے کس بات کی سزا ملی؟ میں نے تو صرف شعیب سے محبت کی تھی۔ اس کا ساتھ چاہا تھا، اس کی سنگت کے خواب دیکھے تھے اور شعیب نے میرے خوابوں کے تاج محل کو اپنی بے وفائی کے پتھر سے ایک ہی دفعہ میں چکنا چور کر دیا تھا۔

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو شازیہ'' زینت جیسے خواب میں بول رہی تھی۔

''میں بدلہ لوں گی شعیب سے۔ اس جیسے تمام لڑکوں سے میں بدلہ لوں گی۔'' زینت کے لہجے میں چٹانوں سی سختی تھی۔ شازیہ نے حیران ہو کر زینت کو دیکھا اس کا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ وہ بہت خوش تھی کیوں کہ وہ زینت کو اپنے رنگ میں ڈھال رہی تھی۔

''پھر کل سے کوچنگ چل رہی ہو نا؟''

''ہاں'' زینت کے اس ایک ہاں میں شازیہ کے ہر سوال کا جواب تھا۔

''اچھا! اب میں چلتی ہوں کل ملتے ہیں۔ اپنا خیال رکھنا اوکے۔'' اور ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئی۔ زینت کے لیے سوچوں کے نئے دروا ہوتے چلے گئے۔

زینت نے دوسرے دن سے کوچنگ سینٹر جانا شروع کر دیا، لیکن پہلے کی طرح زینت نے اپنی طرف بڑھتے قدموں کو دھتکارا نہیں بلکہ بہت خاموشی سے مختلف لڑکوں میں اپنے نمبر تقسیم کر دیئے اور اس بات کا خاص خیال رکھا کہ جن لڑکوں کے پاس زینت کے نمبر تھے وہ آپس میں دوست تو نہیں! اور پھر رفتہ رفتہ زینت پڑھائی سے دور اور ان لڑکوں کے قریب ہوتی چلی گئی۔ وہ ہر لڑکے کو انفرادی توجہ دیتی اور اس سے اس طرح اظہارِ محبت کرتی جیسے وہ صرف اُسی لڑکے سے محبت کرتی ہے۔ وہ لڑکے اسے قیمتی گفٹس دیتے، تو اس کی روح تک سرشار ہو جاتی۔ وہ ہر بات شازیہ سے ڈسکس کرتی اور شازیہ اسے اور حوصلہ دیتی اور بڑھاوا دیتی، نتیجتاً زینت بگڑتی چلی گئی۔ آخر ایک دن اس ڈرامے کا ڈراپ سین بھی ہو گیا۔

ہوا یوں کہ زینت کسی ریسٹورنٹ میں ایک لڑکے سے ملنے گئی۔ اتفاق سے اُس کے بھائی بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے جو زینت کو ایک غیر لڑکے کے ساتھ دیکھا، تو غصّے سے لال پیلے ہو گئے اور زینت کو چوٹی سے پکڑ کر ایک دو ہاتھ تو وہیں جڑ دیے اور گھر لا کر تو اسے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا کافی دیر پٹنے کے بعد جب زینت بے ہوش ہو گئی تو اسے کمرے میں بند کر دیا اور ماں جو کب سے چلا رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟ کیوں مار رہے ہو زینت کو؟'' ساری رام کہانی سن کر ماں سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ پھر بھائی کے گھر سے جانے کے بعد انہوں نے بھی خوب خبر لی زینت کی اور اس کے باہر نکلنے پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔

☆......☆

میں اپنے امتحان سے فارغ ہو چکی تھی، اس لیے بوریت محسوس کر رہی تھی۔ پھر کافی عرصہ سے زینت بھی ہمارے گھر نہیں آئی تھی، میں نے سوچا کہ شاید وہ میری پڑھائی کا خیال کر کے نہیں آئی، خیر میں خود ہی امی سے اجازت لے کر زینت سے ملنے چل پڑی۔

''السلام علیکم! آنٹی کیسی ہیں آپ؟'' میں نے زینت کی امی کو سلام کیا مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئیں۔

''وعلیکم السلام! بیٹا تم کیسی ہو؟ بڑے دنوں بعد چکر لگایا۔'' وہ محبت سے بولیں۔

''بس آنٹی امتحانات ہو رہے تھے اسی میں مصروف تھی اور یہ زینت کہاں غائب ہے؟ اتنے دنوں سے ہمارے گھر بھی نہیں آئی اور کہاں تو اس کی روٹی ہضم نہیں ہوتی تھی ہمارے گھر آئے بغیر...... کہاں ہے یہ؟ میں خود اس سے پوچھتی ہوں۔'' میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔

زینت کا ذکر آتے ہی آنٹی بجھ سی گئیں اور بولیں۔

''پڑی ہے اپنے کمرے میں کم بخت نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہمیں رُسوا کرنے میں۔'' یہ کہہ کر آنٹی اپنا منہ دوپٹے میں چھپا کے رونے لگیں۔ میں سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے ورنہ زینت تو اپنے گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ اکلوتی جو تھی، سب اسے پلکوں پر بٹھاتے تھے، لیکن اب ایسا کیا ہوا تھا کہ اس کی ماں ہی اسے کم بخت کہہ رہی تھی زینت نے ضرور کچھ بُرا کیا ہے۔

''آنٹی پلیز روئیں مت اور اگر مجھے اپنی بیٹی سمجھتی ہیں، تو پوری بات بتائیں۔'' میں آنٹی کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''ارے کیا بتاؤں؟ بیٹی! اس زینت نے تو میری ناک کٹوا دی ہے۔ جب تک تمہارے ساتھ رہی ٹھیک رہی۔ کوچنگ سینٹر جانا شروع کیا تو نجانے کون کون سی نئی دوستیاں پال لی ہیں جنہوں نے اس سے اچھے بُرے کی تمیز ہی چھین لی ہے۔'' پھر ذرا توقف کے بعد آنٹی نے من و عن کہانی مجھے کہہ سنائی پھر روتے ہوئے بولیں۔

''اس سے تو اچھا یہ پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔ آج یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔'' آنٹی پھر سے رو رہی تھیں، میں انہیں تسلی دینے لگی۔ میرا دماغ گھوم گیا تھا۔

''یہ...... یہ زینت کو کیا ہو گیا ہے۔ زینت ایسی تو نہیں تھی۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ انسان کی پہچان اس کے دوستوں سے ہوتی اور زینت نے انجانے میں ایسی دوستیاں کر لیں جو اسے اندھے کنوئیں میں دھکا دے رہے تھے۔ مجھے ہر صورت زینت کو بچانا تھا اور پھر میں ایک عزم سے اُٹھی۔

''آنٹی آپ پریشان مت ہوں۔ میں سمجھاتی ہوں زینت کو، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں زینت کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

زینت اپنے کمرے میں لیٹی خلاؤں میں نجانے کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈھونڈ رہی تھی۔ اسے میرے آنے کی خبر تک نہ ہوئی، عجیب حلیہ ہو رہا تھا۔ اس کے بکھرے بال، میلے کچیلے کپڑے، ویران آنکھیں اور زرد چہرہ! یہ زینت تو نہیں تھی، یہ تو۔ یہ تو کوئی اور ہی لڑکی تھی۔ زینت تو بہت زندہ دل لڑکی کا نام تھا۔

''زینت'' میں نے دھیرے سے اسے پکارا اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور پھر مجھے سامنے دیکھ کر جیسے وہ اپنے حواس میں لوٹ آئی اور ایک دم مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ میں اس اچانک افتاد سے پریشان ہوگئی۔

''زینت کیا ہوا ہے؟'' لیکن وہ مسلسل روتی رہی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ اس کی دلی کیفیت اس وقت کیا تھی۔ میں نے سوچا اسے رونے دیا جائے۔ رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ بالآخر جب وہ خوب رو چکی اور کچھ بتانے کے قابل ہوئی، تو میں نے اس سے پوچھا۔

''اب بتاؤ کیا بات ہے؟ کیوں پریشان ہو؟ کھل کے بات کرو مجھ سے کچھ بھی مت چھپانا۔'' میں پیار سے بولی۔

میں نے اس پر کچھ بھی ظاہر نہیں کیا تھا حالاں کہ میں اس وقت آنٹی کی زبانی ساری باتیں سن کر بہت غصے میں تھی، لیکن میں کچھ کہہ کر اسے بدظن کرنا نہیں چاہتی تھی۔ سب اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی تاکہ حقیقت سے آگاہی ہو سکے۔

تھوڑا وقت خاموشی کی نذر ہو گیا۔ وہ شاید ہمت مجتمع کر رہی تھی بالآخر وہ بولی۔

''نورین تم تو جانتی ہو میں کس کردار کی لڑکی تھی۔ ہمیشہ لڑکوں سے دور بھاگنے والی ہیں نے کبھی بھی لڑکوں میں دلچسپی نہیں لی ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا لیکن پھر!'' یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اسے پانی پلایا وہ پھر سے شروع ہوگئی۔ ''لیکن جب سے تم سے الگ ہوئی اور کوچنگ سینٹر جانا شروع کیا۔ مجھے وہاں نئی نئی دوستیں ملیں۔ جنہوں نے مجھے نجانے کون سی راہوں کا مسافر بنا دیا اور نورین میں...... میں ایسی بے وقوف تھی کہ میں چل پڑی وہ مجھے جو جو راستہ دکھاتی گئیں میں اندھا دھند چلتی رہی۔'' وہ کھو سی گئی۔ ''اس راستے میں مجھے سوائے بدنامی، رسوائی اور ٹھوکروں کے کچھ نہیں ملا۔ یہاں تک کہ میں اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی مجھے کیا ملا؟ نورین کچھ نہیں اور اب...... اب تو میں گھر والوں کی نظروں میں بھی گر چکی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی میں نے اسے گلے لگا لیا۔

میری آنکھیں بھی بھیگ چکی تھیں۔ پھر وہ ایک ایک بات مجھے شروع سے آخر تک بتاتی چلی گئی کہ کس طرح اس نے شعیب سے دھوکا کھانے کے بعد لڑکوں سے دوستیاں کیں، میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے بات شروع کروں کیا کہوں؟''

زینت شرمندہ شرمندہ سی بیٹھی تھی۔ اس نے جو کچھ کیا تھا غلط کیا تھا اور اب وہ بہرحال شرمندہ تھی اور میرے خیال سے اُس کی نصیحت کے لیے یہ ہی بہت تھا۔

''زینت! اس وقت میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جس سے تمہارے دُکھ کا مداوا ہو سکے۔ میں یہ بھی نہیں کہوں گی کہ جو تم نے کیا وہ صحیح تھا بلکہ تم نے بہت غلط راستے کا انتخاب کیا۔ اگر تمہیں شعیب نے دھوکا دیا تھا، تو کیا تم پوری دنیا کے مردوں سے بدلے لوگی؟ اور تمہاری نظر میں کیا یہ سب ٹھیک تھا؟ کیا مل گیا تمہیں یہ سب کر کے سوائے بدنامی اور رُسوائی کے......؟ ایک بار مجھ سے بات تو کی ہوتی مجھے اپنی پریشانی سے آگاہی تو دیتیں تاکہ میں تمہارے لیے صحیح راستے کی نشاندہی کرتی اور مجھے بھی چھوڑو کم از کم اپنی امی سے ہی حالِ دل کہہ کر دیکھتیں وہ تمہاری ماں ہیں اور میرے خیال سے ماں سے بہتر سہیلی اور رازدار کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ مگر تمہاری تو عقل پر پتھر ہی پڑ گئے تھے۔ اپنی مشکل کہی بھی تو کس سے جس نے تمہیں سیدھا کنوئیں میں ہی دھکیل دیا...... !تم نے ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا کہ ایسے غلیظ مشورے دینے والی تمہاری دوست اور تمہاری مخلص کیسے ہو سکتی ہے؟'' میں کہتی چلی گئی۔

میں دیکھ رہی تھی میری کہی ہر بات اس کے دل میں اُتر رہی تھی۔ میں اس کے چہرے سے اس کے تاثرات پڑھ سکتی تھی، وہاں سوائے دُکھ اور شرمندگی کے کچھ اور نہیں دکھائی دیا۔ مجھے اپنی بات جاری رکھنے کا حوصلہ ملا میں نے پھر سے کہنا شروع کیا۔ ''دیکھو زینت ایک لڑکی کی عزت کانچ سے بھی زیادہ نازک ہوتی ہے۔ اُسے بہت سنبھال کر دنیا کی میلی نظروں سے بچا کر رکھا جاتا ہے۔ ہماری ایک ذرا سی غلطی، ذرا سی کوتاہی سے یہ کرچی کرچی ہو جاتی ہے۔ دنیا کی ہر نعمت ہم دوبارہ حاصل

کرسکتی ہیں، لیکن یہ جو عزت ہوتی ہے نا! یہ ہی اصل ہماری دولت اور کل اثاثہ ہوتی ہے جو ایک بار چلی جائے تو پھر ہاتھ نہیں آتی۔ مجھے حیرت ہے تم ان سب باتوں کو کیسے فراموش کر بیٹھیں؟

دیکھو! زینت تم ایک عزت دار فیملی سے تعلق رکھتی ہو اور گھر والوں کی عزت اس گھر کی بیٹی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ چاہے تو اس عزت کو اپنے سر کا تاج بنالے، چاہے تو اُسے اپنے قدموں میں روند دے میرے خیال سے تمہارے لیے یہ ہی نصیحت کافی ہے۔ اگر تم نے میری اس بات کو گرہ سے باندھ لیا تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے قدم کبھی نہیں بہکیں گے۔'' میں اتنا کہہ کر خاموش ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ اس نے سر جھکا کر میری ساری نصیحت سنی تھی۔ اب پتا نہیں کتنی باتوں نے اس کے دل و دماغ پر اثر کیا تھا اور کتنی اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھیں۔ بہر حال میں نے اسے سمجھا کر حجت تمام کردی تھی اور اپنا فرض نبھا دیا تھا۔ اب عمل کرنا نہ کرنا اس کے ہاتھ میں تھا، عمل کرنے میں سراسر اُسی کا فائدہ تھا اور نہ کرنے میں خسارہ...... اور میرے خیال میں خسارہ تو وہ پہلے بھی بہت اُٹھا چکی تھی۔

''نہیں نورین میں اب سمجھ چکی ہوں۔''

میں اپنی وجہ سے اپنے گھر والوں کا سر شرمندگی سے جھکنے نہیں دوں گی، اب ٹھوکر کھانے کے بعد مجھے عقل آ گئی ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میری دِل جوئی کی اور مجھے سمجھایا۔ مجھے تمہاری جیسی دوست کی ضرورت تھی۔'' وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے تشکر بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''ارے پاگل! میں تمہاری دوست ہوں'' مجھے شکریہ مت کہو میں نے اپنا فرض پورا کیا۔ اب تمہیں اچھے بُرے کی تمیز آ گئی ہے۔ میرے لیے یہ بہت خوشی کی بات ہے بس اب اپنا پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ سے شروع کرو اور خوب محنت کرو خدا تمہیں کامیاب کرے۔''

میں نے صدقِ دل سے اسے دعا دی، تو جواب میں اس نے آمین کہا۔

میں نے گھڑی دیکھی بہت ٹائم ہو گیا تھا مجھے گھر سے نکلے ہوئے۔ امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ یہ سوچ کر میں اُٹھ کھڑی ہوئی، اس سے اجازت چاہی اور دوبارہ آنے کا کہہ کر لوٹ آئی۔

میرے کہنے پر عمل کرتے ہوئے زینت نے پڑھائی شروع کردی۔ میں نے اس کی کافی ہیلپ کی بہر حال اس نے میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کرلیا۔ اس دن وہ بہت خوش تھی میرے گھر مٹھائی لے کر آئی تھی۔ اچھی اچھی باتوں کے درمیان ہم نے چائے پی۔

☆......☆

کچھ اس دوران زینت کا ایک اچھی جگہ سے رشتہ آیا۔ تھوڑی بہت چھان بین کے بعد رشتہ منظور کرلیا گیا، لیکن باقاعدہ منگنی کی رسم ادا نہیں کی گئی۔ گھر والوں کی مرضی میں زینت نے بھی اچھی لڑکیوں کی طرح سر جھکا دیا اور اس رشتے کو دل سے قبول کرلیا۔

پھر اپنے ہونے والے منگیتر سے زینت کی فون پر بھی گفتگو ہونے لگی۔ جس کا ذکر زینت اکثر میرے سامنے بھی کرتی تھی شروع میں، میں نے اسے منع کرنا چاہا، لیکن پھر زینت کے منہ سے اس کی بے تحاشہ تعریف سن کر میں بھی مطمئن ہو گئی اور اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا، لیکن اصل میں کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا۔

☆......☆

میں کچن میں کھانا پکا رہی تھی، تب ہی کوئی کچن میں آیا اور میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ میں سمجھ گئی کہ اس وقت سوائے زینت کے کوئی اور یہ حرکت نہیں کرسکتا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''زینت!'' اس نے کھلکھلاتے ہوئے ہاتھ ہٹا لیے۔

''واہ بھئی! فوراً پہچان لیا۔''

''دیکھ لو محبت ہے میری۔'' میں نے کہا۔

''ہاں واقعی!'' پھر ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''تمہیں پتا ہے نوید (منگیتر) بھی مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ روزانہ جب تک مجھ سے بات نہ کرے اس کا دل نہیں لگتا۔''

''اور تم؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا، تو وہ قدرے شرما کر بولی۔

''ہاں میں بھی اسے بہت چاہنے لگی ہوں، تھوڑے ہی دنوں میں لگتا ہے جیسے برسوں کی واقفیت ہے۔ یہ محبت کتنی انمول شے ہوتی ہے نا؟ کتنی قیمتی متاعِ جاں سے بھی زیادہ......'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بول رہی تھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور میں حیرت سے اسے تک رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

''او میڈم کہاں کھو گئیں؟'' تو وہ چونک کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

دن یوں ہی پر لگا کر اُڑتے رہے اور اس بات کو دو ماہ گزر گئے۔ زینت اب موبائل کے علاوہ نیٹ پر بھی چیٹنگ کرنے لگی تھی، وہ ان دنوں بہت خوش دکھائی دیتی تھی۔ اور دل کی خوشی اس کے چہرے کو گلنار کر رہی تھی۔ وہ دن بدن خوب صورت ہوتی جا رہی تھی۔ اس کو خوش دیکھ کر ہم سب بھی بہت خوش تھے، لیکن اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ زینت کا منگیتر نوید دراصل زینت سے محبت کا ڈرامہ رچا کر اپنے عزیز دوست کا بدلہ لے رہا تھا۔ جسے زینت نے اپنے دام محبت میں پھنسا کر تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ وہ بے چارہ شاید شریف انسان تھا جو چپ ہو کر بیٹھ گیا، لیکن اس کے دوست نوید نے اپنے دوست کی حالت دیکھ کر زینت سے بدلہ لینے کی ٹھانی اور اس کے لیے فول پروف پلان تیار کیا۔ جس پر عمل کرتے ہوئے پہلے تو نوید نے زینت کے گھر رشتہ بھیجا اور فی الحال منگنی سے انکار کر دیا اور زینت سے راہ و رسم بڑھا کر اس کا اعتماد جیت لیا۔

نوید کے گھر والے نوید کے پلان سے بے خبر تھے اور وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ منگنی سے کیوں انکاری ہے، لیکن نوید نے بہت سوچ سمجھ کر پلان تیار کیا تھا۔ کسی کو اس بارے میں کچھ خبر نہ تھی۔ وہ زینت کو ایک بگڑی ہوئی لڑکی سمجھتا تھا اور اسے سبق سکھانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے ایک ماہر شکاری کی طرح زینت کے گرد جال پھیلانا شروع کیا جبکہ زینت اب اپنی پرانی غلطیوں پر نادم تھی اور تو ہمت کر کے نئی زندگی شروع کر چکی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

زینت اور نوید کے ساتھ کو تین ماہ ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں زینت نوید پر آنکھیں بند کر کے یقین و اعتماد کرنے لگی تھی اور اس کی محبت میں پور پور ڈوب چکی تھی۔ نوید کے نزدیک اب وہ وقت آ گیا تھا۔ جب وہ زینت سے سارے حساب بے باق کر لیتا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے زینت کو مکمل اعتماد میں لے کر فرمائش کی کہ وہ اپنی اچھی سی تصویر بھیجے۔ زینت بھولی تھی اُسے نوید کی محبت سمجھی اور اپنی تصویر بھیج دی۔ فوراً ہی نوید کا جواب آیا۔

''واہ زینت! خوش کر دیا اب دیکھنا نیٹ پر تم اپنی تصویر...... دیکھ کر خود حیران رہ جاؤ گی۔'' زینت حیران و پریشان ہو گئی۔

''کیا مطلب؟''

جواب آیا۔ ''مطلب تو اب سارے تمہاری سمجھ میں آ جائیں گے۔ خدا حافظ۔'' اس کے بعد نوید کا کوئی جواب نہیں آیا۔ زینت کے دل میں عجیب عجیب وسوسے سر اٹھا رہے تھے۔ اس نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دی کہ شاید نوید مذاق کر رہا ہوگا۔ کل خود آن لائن ہو جائے گا۔'' بڑی مشکل سے وہ دن گزرا دوسرے دن بڑے انتظار کے بعد نوید آن لائن ہوا۔ آتے ہی لکھا۔

''اپنی تصویر دیکھنا چاہو گی؟'' زینت نے ''ہاں ضرور۔'' لکھا اور پھر جو تصویر زینت کے سامنے آئی اسے دیکھ کر زینت کے ہوش اُڑ گئے۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' زینت نے غصے سے سوال کیا۔

''بے ہودگی؟ میں نے کیا بے ہودگی کی ہے؟ بے ہودگی تم پھیلا رہی ہو مس زینت! آج بہت سے لوگ تمہاری تصویر نیٹ پر دیکھ رہے ہوں گے اور میرے دل کو ٹھنڈک مل رہی ہے۔ ہاہاہا۔''

یہ پڑھ کر زینت کا خون کھول اُٹھا اس نے لکھا۔

''تم کتنے بے غیرت منگیتر ہو۔ اپنی منگیتر کی تصویر اس طرح سب میں پھیلا رہے ہو، تمہیں شرم نہیں آتی؟'' زینت اب بُری طرح رونے لگی۔

''شرم کیسی؟ میری جان! یہ میرا انتقام تھا۔ انتقام اور ہاں میں نے تم سے کوئی منگنی نہیں کی ہے۔ دراصل میرا تمہارا کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ اب میرے انتقام کو انجوائے کرو۔'' یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔

زینت کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا، اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا۔ اس نے ہمت کر کے نوید کا نمبر ملایا تا کہ اُس سے اس انتقام کی وجہ پوچھ سکے۔ خلافِ توقع نوید نے فون ریسیو کر لیا۔

''ہاں بولو۔'' جواب میں زینت پھٹ پڑی۔

''تم نے آخر مجھ سے کس چیز کا انتقام لیا ہے؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ فقط محبت ہی کی ہے تم سے۔'' زینت ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

''محبت!'' وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''ارے تم کیا جانو کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ میرے دوست شکیل سے بھی تو تم محبت کرتی تھیں۔ یاد کرو کیا کیا تم نے اس کے ساتھ...... جانتی ہو تم نے تو اسے چھوڑ دیا، لیکن وہ پاگل دیوانہ ہوگیا ہے۔ دنیا سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ اس نے کیا بگاڑا تھا تمہارا؟ اس نے بھی فقط محبت ہی کی تھی تم سے اور بدلے میں تم نے اسے کیا دیا۔ دھوکا۔''

زینت کو اب سب یاد آ رہا تھا۔ سارے پردے ہٹتے چلے گئے تھے اور وہ ایک بار پھر اپنی ہی نظروں میں گر چکی تھی۔ نوید مسلسل بول رہا تھا۔

''تو مس زینت! آپ کو سبق سکھانے کا اس سے اچھا طریقہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میرا انتقام پورا ہو چکا ہے، اب ہمارے راستے جُدا جُدا ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور زینت کی تو جیسے دنیا ہی اندھیر ہوگئی۔

زینت اپنی ہی نظروں میں گر چکی تھی، اُس نے ان سوچوں سے راہِ فرار اس طرح اختیار کی کہ نیند کی گولیاں بڑی تعداد میں کھالیں۔ لیکن بروقت طبی امداد سے اسے بچالیا گیا۔ گھر والے اس کی وجہ سے بہت پریشان تھے، زینت بالکل خاموش تھی۔ نوید کے گھر سے فون آیا تھا اور ان لوگوں نے رشتہ ختم کر دیا اور زینت کی تو جیسے دنیا ہی اندھیر ہوگئی۔

زینت اپنی ہی نظروں میں گر چکی تھی، اُس نے ان سوچوں سے راہِ فرار اس طرح اختیار کی کہ نیند کی گولیاں بڑی تعداد میں کھالیں۔ لیکن بروقت طبی امداد سے اسے بچالیا گیا۔ گھر والے اس کی وجہ سے بہت پریشان تھے، زینت بالکل خاموش تھی۔ نوید کے گھر سے فون آیا تھا اور ان لوگوں نے رشتہ ختم کر دیا تھا۔ سب کا خیال یہ ہی تھا کہ زینت نے رشتہ ختم ہونے والی بات کو دل پر لے لیا ہے۔ زینت کی امی نے مجھے بلا بھیجا کہ میں زینت کو سمجھاؤں، لیکن میں زینت کو کیا سمجھاتی۔ میں تو خود شاک کی کیفیت میں تھی، نجانے یہ انہونی کیسے ہوگئی تھی۔ دل و دماغ یہ سب ماننے کو تیار ہی نہ تھے۔ زینت کی زندگی تو ایک کھیل بن کر رہ گئی تھی۔

میں جب اُس کے سامنے گئی، تو مجھے وہ ایک زندہ لاش لگی۔ جس سے جینے کا حق چھین لیا گیا ہو یا جسے زندہ درگور کر دیا گیا ہو۔ میرے پاس الفاظ ختم ہوگئے تھے اور جب اس نے میرے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا تو جیسے میری ہمت ہی جواب دے گئی۔ میں نے اُسے جی بھر کے رونے دیا اور خود بھی روئی۔ زینت کہہ رہی تھی۔

''نورین تم نے تو کہا تھا کہ سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ پھر...... پھر مجھے سارے مرد ایک جیسے کیوں ملے؟ بتاؤ نورین۔''

میں اُسے کیا جواب دیتی سوائے دلاسے کے!

''دیکھو! زینت بے شک سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے، جس طرح ساری عورتیں ایک برابر نہیں ہوتیں۔ میں مانتی ہوں کہ تمہارے ساتھ بہت بُرا ہوا، لیکن جو تم نے ان بے قصور لڑکوں کے ساتھ کیا وہ ٹھیک تھا کیا؟'' میرے اس سوال سے وہ لاجواب ہوگئی اور پشیمانی سے ہاتھ ملنے لگی دراصل یہ ہی صحیح بھی تھا کہ اُسے احساس ہو جائے کہ جو اس نے دوسروں کو دیا وہی اس کو واپس مل گیا۔ یہ دنیا تو مکافاتِ عمل ہے۔

''دیکھو زینت جو کچھ ہوا اسے ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھول جاؤ کیوں کہ اسے یاد رکھنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں، یہ سب یاد رکھنے سے تمہیں سوائے اذیت کے کچھ نہیں ملے گا۔ اپنے اردگرد دیکھو تمہیں بہت سے دُکھی دل نظر آئیں گے۔ جب تم ان کے دکھ سنو گی، تو تمہیں اپنے دُکھ بہت حقیر محسوس ہوں گے۔ پلیز ایک نئی زندگی شروع کرو۔ اپنے لیے نہ سہی اپنے گھر والوں کے لیے تمہیں ایسا کرنا پڑے گا۔ دیکھو سب کتنے پریشان ہیں۔''

میں نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر زینت نے اپنے مسلسل بہتے آنسو پونچھ ڈالے اور پھر میرے مشورے پر اس نے نرسنگ کا کورس کرلیا اور ایک اسپتال میں نرسنگ کے فرائض انجام دینے لگی۔

کچھ ہی عرصے بعد ایسے اسباب پیدا ہوگئے کہ وہ بیرون ملک روانہ ہوگئی۔ ویسے بھی اسے یہاں سوائے دُکھوں کے کیا ملا تھا۔ باہر جانے سے پہلے وہ دیر تک میرے گلے لگ کر روتی رہی اور میں اس کی پیٹھ تھپتھپاتی رہی۔

بعد میں اس نے اپنے والدین کو بھی اپنے پاس بلوالیا اور اب کافی عرصے بعد اس کے فون نے ثابت کر دیا ہے کہ آج بھی وہ مجھے نہیں بھولی ہے۔

میری دعا ہے کہ زینت کو ایک اچھا جیون ساتھی مل جائے جو اس کے سارے دکھ سمیٹ لے اور اس کی زندگی میں خوشیوں کی بہار آ جائے۔ (آمین)

☆☆......☆☆

نویں سچ بیانی

کون دلاں دیاں جانے

گڈی آپا

لاہور سے ایک ماں بیٹے کی محبت کی لہو رلاتی سچ بیانی

وہ دِن راجہ اور رانی کے لیے اندھیری رات بن گیا، جب انہوں نے اپنے والد شفیع کا جنازہ رخصت کیا۔ شفیع صاحب کے گھر سلمان کی پیدائش کے بعد کئی سالوں تک مزید اولاد نہ ہوئی، دونوں میاں بیوی سلمان کی پیدائش ہی کا شکر ادا نہ کرتے تھکتے تھے۔ کم وبیش آٹھ سال کے بعد رانی صاحبہ اور دو سال بعد راجہ صاحب بھی دنیا میں تشریف لے آئے مگر پہلی اولاد کی محبت اپنی جگہ، اُسے اپنی حیثیت کے مطابق بڑے چاؤ لاڈ سے پالا، پڑھایا لکھا، جوان کیا۔ ارمانوں سے دلہن کو لایا گیا، پھول برسائے گئے، دروازے کی درازوں میں تیل ڈالا گیا، قرآن کے نیچے سے گزارا گیا، ماں نے سارے ارمان پورے کیے، اپنے ہاتھوں سے گاجر کا حلوہ بنایا کیوں کہ دلہن کو گاجر کا حلوہ بہت پسند تھا۔ ساری بارات کو کھلایا، بیٹے اور بہو نے ایک دوسرے کے منہ میں نوالے ڈالے، گلاب کے پھولوں سے سیج بنائی گئی، قمقمے جابجا لگائے گئے۔ صدقہ خیرات کیا گیا۔ بہترین بری اور زیورات تحفے میں دیے گئے۔

ماں نے کسی قسم کی کسر نہ چھوڑی تھی، بیٹے کی حسین زندگی کا آغاز ہوا۔ ماں باپ نے جو بھی جمع پونجی تھی خوشی میں خرچ کر ڈالی۔ یہاں تک کہ رانی راجہ کے لیے کچھ بھی نہ سوچا۔

ایک ایک لمحہ ماں کو یاد آ رہا تھا۔ بھانجی ہوتے ہوئے دلہن بیگم سب کچھ بھول بیٹھی تھی۔ شفیع محمد نے جلدی دنیا سے چلے جانا تھا، وہ تو شکر ہوا اس نے اپنے ہاتھوں سے بیٹے کا سہرا باندھ کر خوشی حاصل کر لی تھی۔

ماں کو پوری امید تھی اس کا لاڈلا بیٹا یتیم وہ مسکین بچوں کو اپنے جواں کاندھوں کے ساتھ لگا لے گا۔ صرف دو بچے تھے۔ رانی دس سال کی اور راجہ آٹھ سال کا اور ماں جس نے ساری زندگی صرف کر کے دن رات جاگ کے سلمان کو پروان چڑھایا۔ کبھی کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی تھی، سب پر سلمان کو ترجیح رہتی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرا سلمان اپنی ماں کا خیال نہ کرے۔ بہن کی بیٹی اس لیے یہ سوچتے ہوئے لائی تھی کہ اپنی ہوگی تو اپنی بن کر رہے گی، مگر وہ تو تھوڑے ہی عرصے کے بعد آنکھیں دکھانے لگی۔ اس نے خالہ کے تمام چاؤ، لاڈ بھلا دیے تھے۔ وہی لوگ جن سے شادی سے پیشتر اس قدر محبت تھی کھٹکنے لگے تھے۔

شب و روز سونے میں گزرنے لگے۔ نہ احساسِ ذمہ داری اور نہ ہی فکر و فاقہ۔ ماں ہی سارا دن سب کے لیے کام کرتی۔ بہو اور بیٹے کے لیے ناشتہ بناتی کپڑے دھوتی، بچوں کو پڑھنے کے لیے بھیجتی۔ بچوں کا سارا کام

عمر کے اس حصے میں کرتی رہی سوچتی۔ ''بچے میری ذمہ داری ہیں۔ ثریا آج نہیں تو کل سنبھل جائے گی۔ بچی ہے وہ کیا جانے فرائض کیا ہوتے ہیں۔''

لیکن پانچ سال گزر گئے۔ اُس میں تبدیلی نہ آئی، اب اتنا ضرور تھا وہ دن بھر کی روداد میاں سے چغلیوں کی صورت لگاتی رہتی اور بیٹے کا منہ بنا رہتا، ماں سے دور ہوتا گیا۔ نہ پاس بیٹھتا اور نہ ہی حال پوچھتا، ہاں بچوں کی پڑھائی میں بڑی دِل چسپی لیتا تھا۔

ایک شام وہ دفتر سے آ کر ماں کی چارپائی پہ آن بیٹھا۔ ماں دِل ہی دِل میں بہت خوش ہوئی آخر میرا خیال آ ہی گیا میرے بیٹے کو۔

''ماں! گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے، راجہ و رانی کو سرکاری اسکول میں ڈال دیتے ہیں۔''

ماں تڑپ کر رہ گئی، وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن گھر میں ہنگامے کے ڈر سے چپ رہ گئی۔

سلمان کی خواہش کے مطابق دونوں بچوں کو سرکاری اسکول میں داخل کرادیا گیا، لیکن ساتھ ہی نیا کھیل شروع ہوگیا، جیسے ہی رات آتی بچوں کی شامت آجاتی۔

ماں دِل پر پتھر رکھ کر نظارہ کرتی رہتی، یہ اُن کی زندگی بنا رہا تھا، پہلے تو تھپڑوں سے تواضع ہوتی پھر بہن کے بال پکڑ کر نوچ لیتا، ادھر اسکول میں علیحدہ استانی صاحبہ سوٹیوں سے خوب مرمت کرتی کیوں کہ سرکاری اسکول کی پڑھائی بچوں کو سمجھ ہی نہیں آتی تھی۔ اچھے بھلے بچے تھے، عجیب سے ہوگئے۔

ایک روز رانی اسکول سے واپس آ کر بولی۔ ''ماں! میں نے ایک فیصلہ کرلیا ہے، اب روز روز کی مار مجھ سے برداشت نہیں ہوتی، صفائی پیش کروں تو زبان چلانے کا الزام، پڑھائی کے علاوہ بھائی کی شکایتیں زیادہ ہوتی ہیں جس کا بدلہ بھی مار پیٹ کرلیا جاتا ہے، اس نے روتے ہوئے کہا۔

''کاش! ابا نہ مرتے تو ہمارا یہ حال نہ ہوتا۔ ماں! یتیم مسکین ہونا کیا جرم ہے؟ سنا ہے یتیم کے سر پر بھی ہاتھ پھیرنے سے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ لیکن یہاں تو حال ہی



بُرا ہے، تو بھی بھائی سے ڈرتی ہے ہماری طرف داری نہیں کرتی اور استانی جی کا کیا کہوں۔ بہت ہی ظالم ہے، بچوں پر ظلم کرنے کے علاوہ اُن کو کچھ نہیں آتا۔ مجھے نہیں ایسی تعلیم حاصل کرنی، پڑھ لیا جتنا پڑھنا تھا۔ بھائی ناراض ہوتا ہو تو ہو اور ہاں ماں! یہ بھی یاد رکھو بھائی کسی دن راجے کی ہڈی پسلی توڑ دے گا۔''

بس وہی ہوا راجہ رات کو بستہ لے کر بھائی کے کمرے میں گیا، ماں چولہے پہ روٹیاں پکا رہی تھی، تھوڑی ہی دیر کے بعد بھائی نے برسنا شروع کر دیا۔ شاید دن و رات کی تھکاوٹ وہ بھائی کو مار کر ہی اتارتا تھا، سلمان بھائی آگ بگولا ہو کر کہہ رہا تھا۔

''راجہ تم نے میری زندگی عذاب کر دی ہے نہ دن کو چین اور نہ ہی رات کو سکون آج تم فیصلہ کرو کیا تم نے پڑھنا ہے یا نہیں؟ میں کتنے سالوں سے تمہیں برداشت کر رہا ہوں، پچھلے سال بھی فیل ہو گئے تھے۔''

نہ میرے پاس تمہارا باپ دولت چھوڑ دیا گیا ہے جو تجھ جیسے نکمے پر لٹاتا رہوں۔

''بول، بولتا کیوں نہیں؟'' پھر وہ اندر گیا اور لوہے کی سلاخ لے آیا۔ ''تھپڑوں اور ڈنڈوں کا تجھ پہ کچھ اثر نہیں ہوتا، اب کچھ اور ہی کرنا پڑے گا۔'' ماں کی آنکھوں سے آنسو برسنا شروع ہو گئے، وہ پھر بھی خاموش رہی۔

''الٰہی کیا یہ اپنا خون ہے؟''

سلاخیں اس کی کمر پر برسنا شروع ہو گئیں۔

''کان پکڑ ہو جا اوندھا...... سنتا نہیں اور لگاؤں۔''

راجہ نے اُکڑوں ہو کر کان پکڑ لیے اور وہ پھر برسنا شروع ہو گیا، کمر پر سرخ نشان پڑ گئے، ماں تڑپ گئی اور روتے ہوئے بولی۔

''سلمان خدا کا خوف کرو، یہ تیرا چھوٹا بھائی ہے، یہ یتیم ہے اس پر رحم کھاؤ، شاید اسی لیے تجھے خدا نے اولاد نہیں دی۔''

وہ بولا۔ ''میں ماں ایسی اولاد کے بغیر ہی بھلا۔''

ماں نے آگے بڑھ کر لوہے کی راڈ پکڑ لی اور راجہ کو سینے سے لگا کر زار و قطار رونے لگی۔

''کاش! تیرا باپ نہ مرا ہوتا اور مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔'' راجہ بولا۔

''ماں آج کے بعد میں اسکول نہیں جاؤں گا، ورکشاپ پہ کام کروں گا روز روز کی مار مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔'' اور بھابی اندر ہی اندر سے مسکرا رہی تھی۔

''چلو خرچہ تو کم ہو گا، ان مردودوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے، کچھ نہ کچھ تو کما کر لائے گا۔''

صبح ہوتے ہی سلمان راجہ کو ورکشاپ پر چھوڑ آیا، صبح نو بجے سے شام چھ بجے تک ورکشاپ پر رہتا۔ ماں ساتھ روٹی باندھ دیتی، کبھی پیاز اور کبھی اچار اور کبھی سالن دے دیتی، ہفتے کے بعد خرچہ مل جاتا، جس میں سے اس نے ورکشاپ ہی میں ایک کمیٹی ڈال دی، کچھ اپنے پاس رکھ کر باقی بھائی کو دے دیتا۔ ہفتہ بھر کام کرنے کے بعد اتوار کی ایک چھٹی ملتی۔ اس دن بھی بھابی بھائی کو گرم کر دیتی۔ اور جیسے بھائی کی بھی راجہ کو قصور کے بغیر ہی مارنا عادت سی ہو گئی تھی۔ اس روز خاندان میں کسی کی موت ہو گئی رانی کو لے کر ماں وہاں روانہ ہو گئی اور بھابی نے بھائی کے اتنے کان بھرے کہ سلمان نے راجہ کو رسیوں سے باندھ کر دھوپ میں ڈال دیا۔ سارا دن نہ کھانے کو دیا اور نہ ہی پینے کو پانی......

سارا دن اس کا روتے گزرا۔

اچانک ہمسائی آ گئی۔ بچے کو اس حال میں دیکھ کر تڑپ گئی اور پکار اُٹھی۔ ''ظالمو اس قدر ظلم'' اور راجہ کی رسیاں کھول دیں۔

ہر روز کی مار نے راجہ کو ایک فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا، کمیٹی کے ملنے والے پیسوں نے راجہ کی کراچی بھاگ جانے میں مدد کی، سارا راستہ روتا رہا، نہ کوئی منزل اور نہ ہی کوئی راستہ۔

راجہ اسٹیشن پر بیٹھا سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اجنبی شہر جاؤں تو جاؤں کہاں پریشانی اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی، تبھی ہی ایک درمیانی عمر کا آدمی اس کے پاس آیا اور بولا۔

''بیٹا! کیا بات ہے؟ میں تمہیں بہت دیر سے یہاں بیٹھے ہوئے دیکھ رہا ہوں، کچھ پریشان لگتے ہو، تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں۔ اگر مناسب سمجھو تو مجھے اپنا دُکھ بتاؤ۔'' راجہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے اپنی تمام دُکھ بھری کہانی کہہ دی۔ ''نہ میرا وہاں کوئی ہے اور نہ ہی یہاں۔

خدا جانے میں کیا کروں گا، شاید اسٹیشن پر ہی یہ سیاہ رات ٹھنڈے فرش پہ گزارنی پڑے۔ راجہ کانپتے ہوئے پھر بولا، ٹھنڈے فرش پر رات گزارنی آسان ہے نسبت کہ بھائی کی مار کھانے کے، اجنبی سنتا جارہا تھا اس کے چہرے کا رنگ زرد ہوتا جارہا تھا۔

راجہ آنسو پونچھتے ہوئے پھر بولا۔ ''بھائی کو میرے ساتھ اللہ واسطے کا بیر ہوگیا تھا، بھابی نے شکایتیں لگا لگا کر راجہ رانی جو والدین کے لاڈلے تھے کا مستقبل تباہ کردیا، حال یہ کیا کہ بالآخر مجھے بوڑھی ماں اور بہن کو چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ خدا جانے میری ماں کا میرے بغیر کیا حال ہوگا۔ وہ شب و روز انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزارے گی۔ میں بھری دنیا میں یتیم مسکین اور تنہا ہوں۔''

اجنبی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ آہستہ سے بولا۔

''میں ہوں نا تمہارا۔'' اور اُٹھا کر سینے سے لگالیا۔

سلمان نے بھی تھوڑی بہت بھائی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

بالآخر سب خاموش ہوگئے ماں بیٹے کے سامنے راجے کا ذکر نہ کرتی سانس تھی کہ سرد آہ بن کر رہ گئی تھی، رات آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی۔

دِل دریا سمندروں ڈونگے
تے کون دلاں دیاں جاڑیں ہو
تاڑی مار اُڈانہ باہو
اسی آپے اُڈن ہارے ہو

ماں کا رونا بہو بیٹے کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا، بلکہ کبھی کبھی ماں رانی سے کہتی۔

''اچھا ہی ہوا وہ یہاں سے بازو و ٹانگیں سلامت لے کر گیا ورنہ خدا جانے اور کیا حال ہوتا۔''

ماں کی بھوک سوکھ گئی تھی۔ رانی کے کہنے کے باوجود نہ کپڑے بدلتی اور نہ ہی نہاتی تھی بس یہی کہتی تھی۔

''رانی تجھے کیا خبر مجھ پر کیا گزر رہی ہے، خدا کبھی کسی کا لعل کسی ماں سے نہ بچھڑے۔''

دِن بدن وزن بھی کم ہونے لگا، ساری رات جاگ جاگ کر آہیں بھرتی رہتی اور کہتی ''خدایا جس تن

لا گے سوتن جانے۔'' اِک میں ہوں جسے ایک پل بھی چین نہیں آتا، خدا جانے راجے کا کیا ہوگا۔ وہ کون سا دن آئے گا، جب اس کی چٹھی آئے گی۔ تیرا چہرہ ہر وقت آنکھوں میں رہتا ہے، کاش! مرنے سے پیشتر تیرا چہرہ دیکھ لوں ورنہ وہاں بھی روح بے سکون رہے گی۔ آجا بیٹے میرے سینے سے لگ جا۔ وہ بان کی ننگی چارپائی پہ سوتی یہ سوچتے ہوئے کہ اللہ جانے میرے بیٹے کو چارپائی بھی میسر ہے کہ نہیں۔

بیٹے کو قیمہ پسند تھا وہ قیمہ نہ کھاتا، وہ اتنا کھاتی جس سے صرف زندہ رہا جا سکے، اس نے سمجھ لیا تھا کہ اولاد ہی کا غم سب سے بڑا غم ہوتا ہے۔ خدا کسی کو یہ غم نہ دکھائے، جن انگاروں پر میں لوٹ رہی ہوں خدا کسی کو نہ لوٹائے۔

☆......☆

رو رو کر آنکھوں کا نور بھی بہہ گیا تھا اب دِن رات میں کوئی فرق نہ رہ گیا تھا...... اچانک راجہ کا خط آیا تو وہ لے کر تیزی کے ساتھ ہمسائیوں کی طرف بھاگی لکھا تھا۔

میری پیاری ماں و بہنا!

آداب...... میں زندہ ہوں کسی خداترس انسان نے میری زندگی بنادی تھی، وہ نہ تو میرا اپنا تھا اور نہ ہی کوئی رشتہ دار۔ مجھے پڑھایا، میں نوکری پہ لگ گیا ہوں۔ یہ میری پہلی تنخواہ ہے جو آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں، ایک اور احسان میرے محسن نے مجھے بیٹی دے کر کیا۔ وہ انسان میں صفات دیکھتے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ انہوں نے مجھ پر بھروسا کیا۔ خدا مجھے اس کا تابعدار بنائے رکھے۔ میں عنقریب آرہا ہوں، خدا کا شکر ہے جو آج اس قابل ہوا۔

رانی بہنا کیسی ہے؟ ہوسکتا اپنے گھر کی ہوگئی ہو؟ مجھے افسوس ہے میں نے آپ کو بہت دُکھ دیا، مگر میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

وسلام آپ کا بیٹا۔ راجہ

☆......☆

پھر ایک روز روشن دن چڑھا، جب راجہ گھر پہنچ گیا۔ ماں نے جب بیٹے کو سینے سے لگایا اور ٹٹولتے ہوئے چہرہ تندرست محسوس کیا تو راجہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

ماں اگر میرے بس میں تیری آنکھوں کا نور لانا ہوتا تو خدا کی قسم اپنی زندگی گروی رکھ کر بھی لادیتا۔ میں تمہارا مجرم ہوں، میں ظالم ہوں۔ میں تمہاری محبت کا اندازہ ہی نہ لگا سکا اور اپنی جان بچا کر نکل بھاگا، ماں میں تمہارے پاؤں کی طرف سوؤں گا۔ میں تمہارے سر کی طرف سونے کے قابل نہیں ہوں، ماں تو مجھے معاف کردے۔ شکر ہوا جو تُو نے رانی کو اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر رخصت کردیا، میں تو لڑکا تھا گھر سے بھاگ گیا ورنہ اب تک خدا جانے اس کا کیا حال ہوتا۔''

اب راجہ کا کام دن رات ماں کی خدمت کرنا تھا۔ ٹانگیں دباتا، ماتھا چومتا، اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ بالکل چھوٹی سی ہوگئی ہے۔

دُکھوں کی ماری آخر کب تک جیتی وہ اللہ کو پیاری ہوگئی، راجہ کو ماں کے مرنے کے بعد یوں لگا جیسے اس کے سر سے سائباں اُتر گیا ہے اور وہ صحرا میں تنہا کھڑا ہے۔ ماں کی چارپائی پر لیٹ گیا۔ دوبارہ نہ اُٹھا۔

ہر وقت زبان پر یہی ہوتا۔ ''ماں مجھے بلالے میں تجھ بن رہ نہیں سکتا۔''

☆......☆

ڈاکٹر نے بتایا۔ راجہ تمہیں شوگر کا مرض لاحق ہوگیا ہے۔ اس کے جسم پر شوگر کے پھوڑے نکلنے لگے تھے۔ قرآن اور خوب نمازیں ادا کرتا۔

جمعہ کا روز تھا نہا کر کپڑے پہنے، ہر وقت پاک صاف رہتا، سوچتا خدا جانے کون سا وقت آجائے اور مجھے جانا پڑے، سیدھا لیٹا سینے پر ہاتھ رکھے منہ کعبہ کی طرف کیا اور سوگیا۔

وہ تو ماں کے حضور جا کھڑا ہوا تھا۔ بیوی اُٹھاتی رہ گئی، اور اس طرح راجہ کی کہانی بھی تمام ہوگئی۔

زندگی میں اگر رشتے اپنا فرض پہچان لیں اور محبت کو شعار بنالیں تو کوئی بچہ، راجہ کی طرح گھر کی جنت سے فرار کا نہ سوچے۔ اور جو دن راجہ نے فرار کے بعد بتائے، قسمت نے یاوری کی ورنہ تو کون منزل پاتا ہے۔ خدا راجہ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆......☆☆

دسویں سچ بیانی

دیر لگی آنے میں



ملک صفدر عباس اعوان

جہانیاں سے بغاوت کرنے والی ایک راندہ دوشیزہ کی کتھا

چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا، بارش اتنی تیز تھی کہ ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ آسمان سے گرتا یہ پانی رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ جگہ پل 14 کے نام سے مشہور تھی۔ ملتان سے بورے وہاڑی جانے کے لیے بسیں یہاں سے گزرتی تھیں۔ اس جگہ کا نام پل 14 شاید اس لیے پڑ گیا تھا۔ کہ یہاں ایک چھوٹی سی نہر بہتی تھی جس پر ایک بڑا سا پل بنا ہوا تھا۔ اور اس جگہ کے قریب ہی چک 114/10R تھا۔ یہ جگہ ہل

14 جہانیاں شہر سے منسلک تھی۔ یہاں دن کے وقت کافی بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ لاتعداد دکانیں اور دکانوں کے پرے خاصی مقدار میں رہائشی مکانات بھی بنے ہوئے تھے۔ سڑک کے بائیں طرف ایک بڑا قدیم گھنا پیپل کا درخت تھا۔ جس کے نیچے شہر جہانیاں جانے کے لیے رکشہ صبح سے لے کر شام ہونے تک موجود رہتے تھے۔

یکایک دور ملتان سے آتی ہوئی ایک بس تیز ہارن بجاتی سڑک کے درمیان آن رُکی، بس سے آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے مسافر نیچے اُتر آئے۔ ان مسافروں میں ایک نوجوان انتہائی خوب صورت لڑکی بھی اُتری جس نے فراک اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ سر پر اچھی طرح دوپٹہ اوڑھے اور کاندھے پر پرس لٹکائے وہ تیزی سے بس سے اُتری اور اس گھنے پیپل کے نیچے جا کھڑی ہوئی، بارش چوں کہ تیز تھی اس کو ڈر تھا کہ وہ کہیں بارش سے بھیگ نا جائے۔ پیپل کے گھنے درخت نے اسے بارش سے بچاؤ کا کام دیا۔ وہاں پر موجود کئی افراد کی نگاہیں اس پر پڑیں اور پھر ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں، وہ جو درخت کے نیچے سمٹی ہوئی کھڑی تھی۔ آوارہ نگاہوں کی تپش محسوس کر کے اس نے اپنا منہ اچھی طرح سے ڈھانپ لیا۔ وہ پریشان سی کھڑی سامنے کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہیں کسی کی منتظر تھیں کسی اپنے کی......؟

نام تو اس کا مہرالنساء تھا مگر گھر والے اس کو پیار سے مہرو کہہ کر پکارتے تھے، وہ ملتان کی رہنے والی تھی۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے بڑے ناز و نعم سے پلی بڑی تھی۔ پٹھان فیملی سے تعلق ہونے کے باوجود اپنی روایات اور اپنے رسم و رواج کو بالائے طاق رکھ کر اس کے والدین نے اس کو تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ کیا تھا۔ حالاں کہ اس کے خاندان میں کسی بھی لڑکی نے اسکول کی بھی شکل نہیں دیکھی تھی۔ مگر وہ اسکول، کالج اور پھر یونیورسٹی تک جا پہنچی تھی۔

اس نے اپنے والد کی ایک کہی ہوئی بات اپنے پلو سے اچھی طرح باندھ لی تھی۔ اس کے والد نے شروع دن سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

''بیٹی مہرو والد کی عزت اور غیرت اور اس کا اوپر اُٹھا ہوا سر ایک باعزت اور شرم و حیات والی بیٹی کے ہی مرہونِ منت ہوتا ہے اور اس کی بیٹی کا ایک غلط قدم اس کو دنیا اور آخرت میں ذلیل و رسوا کر دیتا ہے اور اس کی بیٹی کا ایک غلط قدم اس کو دنیا اور آخرت میں ذلیل و رسوا کر دیتا ہے، یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔''

مہرو سمجھ دار عقل مند لڑکی تھی۔ اس نے اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں صرف اور صرف اپنی تعلیم پر ہی توجہ دی۔ اس نے تو سہیلیاں بھی بہت کم بنائیں اور پھر لڑکوں کی طرف دیکھنا تو وہ گناہ کبیرہ سمجھتی تھی۔ مگر نجانے کیسے اونچا لمبا خوبرو سا شہروز اس کے نازک دل کے کسی کونے میں جا سمایا۔ مہرو اس کی بڑی بڑی کالی سیاہ آنکھوں کے ساغر میں ڈوب کر خود کو پیار کے جال میں پھنسا بیٹھی تھی۔ مگر وہ خود بھی کوئی کم حسین تو نہیں تھی، خدا نے اسے کچھ زیادہ ہی فرصت میں بنایا تھا۔ پرکشش بدن صراحی نما گردن، ریشمی زلفیں، غزالی آنکھیں، گلابی گالوں میں پڑتا ڈمپل، شہروز کو بھی وہ پہلی نظر میں بھا سی گئی تھی، وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

شہروز کا گھر تو جہانیاں میں تھا۔ مگر وہ ملتان یونیورسٹی کے ہوسٹل میں رہائش پذیر تھا۔ وقت گزرا اور دونوں نے اپنی تعلیم مکمل کر کے یونیورسٹی کو خیر باد کر دیا۔ یونیورسٹی کے آخری دن انہوں نے اپنی ڈبڈبائی آنسوؤں بھری آنکھوں سے ایک دوسرے کو الوداع کیا۔ شہروز واپس اپنے شہر جہانیاں آ گیا، اگرچہ وہ دونوں اب مل تو نہیں سکتے تھے۔ مگر موبائل پر ان کی روز صبح شام بات ہوتی۔ مہرو کی تعلیم مکمل ہوئی اور گھر میں اس کی شادی کی بات چل نکلی۔ اس کے ماموں زاد سے اس کی منگنی کی خبر نے شہروز کو ہلا کر رکھ دیا۔ شہروز نے اپنے والدین کو اس کے گھر بھیجنے کی بات کی۔ مگر مہرو نے انکار کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے والدین اس کی شادی کسی صورت بھی غیر برادری میں نہیں کریں گے، مسئلہ وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ مہرو کی منگنی میں چند دن باقی رہ گئے تھے۔ شہروز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آخر کیا کرے۔ مہرو پر ہر دن بھاری اور رات کڑی تھی۔ آخر مہرو نے وہ فیصلہ کیا جس فیصلہ کو کوئی بھی لڑکی کرنے سے پہلے ہزار بار سوچتی ہے، اس نے گھر سے بھاگ کر شہروز کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ شہروز نے بھی اس کے فیصلے کی تائید کی، اس لیے مہرو آج اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چپکے سے ملتان سے اڈہ ہل 14 آ گئی تھی۔

پیپل کے درخت کے نیچے کھڑی مہرو اپنی سوچ میں ایسی ڈوبی کہ اس کو وقت کا پتا ہی نا چلا کہ کتنا ٹائم گزر چکا

تھا۔ بارش رُک چکی تھی، سہ پہر سے شام ہونے کو تھی، مگر شہروز کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ اس نے تو مہرو کو یہیں کھڑے رہنے کا کہا تھا، اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی وہ پورے 6 بجا رہی تھی۔ وہ پانچ بجے یہاں پہنچی تھی، یعنی اس کو ایک گھنٹہ بیت چکا تھا یہ بات اس کو پریشانی میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھی اس نے جلدی سے موبائل کو پرس سے نکالا اور شہروز کو کال ملائی، مگر آگے سے کوئی جواب وصول نہیں ہورہا تھا۔ شہروز کا موبائل آف تھا۔ اس نے نجانے کتنی بار کال ملائی، مگر بے سود، اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ وہ اکیلی اس اجنبی شہر میں کہا جائے گی۔ کیا شہروز نے اس کو دھوکا دیا؟ وہ اس کے آگے اور کچھ بھی نہیں سوچ پارہی تھی۔

''نہیں میرا شہروز ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے، اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ مگر آہستہ آہستہ بیتا وقت اور شہروز کا کہیں نام ونشان نہیں اس بات کی تصدیق کررہا تھا کہ...... شہروز نے اس کے ساتھ بے وفائی کی ہے۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اب وہ اکیلی کیا کرے گی کہاں جائے گی؟ کیا واپس اپنے گھر؟ لیکن وہ تو اپنے ہاتھوں اپنے گھر کے دروازے بند کرآئی تھی۔

مہرو کو یکدم احساس ہوا کہ اس سے جلد بازی سے وہ بھیانک غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ جس کی تلافی وہ مرکر بھی پوری نہیں کرسکتی۔ اسے اپنے والدین کا خیال آیا، جس کو وہ زندہ درگور کرآئی تھی۔ وہ منہ میں دوپٹا ڈالے ہچکیاں لے کر رونے لگی، شہروز نے نا آنا تھا نا وہ آیا۔ آہستہ آہستہ کرتے شام بھی بیت گئی، وہ وہیں کھڑی بے بسی کی تصویر بن ہوئی تھی۔

شہروز خدا تجھے برباد کرے۔ تو نے مجھے لاکر وہاں کھڑا کردیا، جہاں میں نا جی سکتی ہوں نا مرسکتی ہوں۔ تو نے اچھا نہیں کیا۔'' میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ وہ دل میں اسے کوسنے لگی، لیکن گھر سے بھاگنے کا پہلا فیصلہ تو خود مہرو کا اپنا تھا۔ وہ تو اپنے آپ سے ہی جنگ کرنے میں مصروف تھی کہ نجانے کہاں سے آوارہ لڑکوں کی ایک ٹولی اُدھر آن دھمکی۔

ایک حسین لڑکی کو یوں تنہا شام ڈھلے وہاں کھڑا دیکھا۔ تو اسے چھیڑنے اس کے پاس آن پہنچے۔

''اُستاد...... دیکھ وہاں کیا آئٹم ہے۔ اللہ میاں نے بھی کیسا کیسا بندہ بنا کر زمین پر بھیجا ہے۔'' ایک لڑکا بڑی ادا سے بولا۔ پریشان کھڑی مہرو یک دم بوکھلاسی گئی۔

''جانِ من۔ کس کا انتظار ہورہا ہے، ہماری طرف بھی تو نظر کرم کرو۔'' دوسرا لڑکا اس کے قریب آگیا، نوک سے وہ مزید سمٹ کررہ گئی۔

شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں پتر وہ آوارہ بدمعاش لڑکے اس کے ساتھ نجانے کیا سلوک کریں گے اتنا کہ وہ لڑکے اس سے مزید چھیڑ خانی کرتے، ایک رکشہ تیزی سے مہرو کے قریب آن رکا۔

''اوئے بے غیرتوں تجھے شرم نہیں آتی، اکیلی لڑکی کو چھیڑتے ہو، رکشا میں موجود بیٹھے ڈرائیور نے ان لڑکوں کو بھگایا۔ تو وہ سارے اس ڈرائیور کی یوں مداخلت پر بھاگ گئے۔ ٹھہرو میں تجھے بتاتا ہوں، بدمعاشوں، رکشا ڈرائیور نے پیچھے سے ان کو پھر آواز دی، تو ان سب کی دوڑیں لگ گئیں تو گویا مہرو کی سانس میں سانس آئی۔ رکشا ڈرائیور اس سے مخاطب ہوا۔

''آپ نے کہاں جانا ہے۔ میں کب سے دیکھ رہا ہوں، آپ یہاں اکیلی کھڑی ہیں۔'' مہرو نے اس کی جانب دیکھا، کالی بھدی صورت بکھرے ہوئے بال، لمبے پیلے دانت جس کی وہ نمائش کرتے ہوئے وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ تو خود بڑا بدمعاش اسے معلوم ہوا۔ مگر وہ چپ رہی۔ اس کی کوئی منزل ہوتی تو بتاتی۔

''دیکھیں رات ہورہی ہے، اندھیرا ہر سو پھیل رہا ہے۔ آپ اکیلی ہیں اور آپ کے ساتھ دوسرا بھی کوئی نہیں ہے، یوں یہاں کھڑا ہونا مناسب نہیں ہے رکشہ ڈرائیور نے اس کو حقیقت سے آگاہ کیا۔ جس کو وہ بخوبی جانتی تھی۔

''میں۔ میں، یہاں سے جہانیاں شہر کتنی دور ہے۔''

کافی دیر سوچنے کے بعد اس کو جہانیاں شہر کا ہی خیال آیا۔ شاید وہاں جاکر اس کی قسمت اس کا کچھ ساتھ دے۔

''ارے! جہانیاں شہر جانا ہے تو میرے رکشے میں بیٹھیں، میرا رکشا جہانیاں شہر کا ہی ہے۔ چار، پانچ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ ابھی پہنچادیتا ہوں۔''

رکشا ڈرائیور نے اس کو گہری نگاہ سے دیکھا۔ مگر مہرو کشمکش میں پڑگئی کہ وہ رکشہ میں بیٹھے یا نہ بیٹھے۔ رکشا ڈرائیور نے اس کی یہ پریشانی بھانپ لی۔

میرا یہ آخری رکشا ہی بچا ہے۔ پھر جہانیاں جانے کے لیے آپ کو کوئی سواری نہیں ملے گی، دیر نا کریں۔ جلدی بیٹھیں۔

رکشے میں بیٹھنے کے علاوہ مہرو کے پاس کوئی اور چارہ ہی نہیں تھا۔ وہ جلدی سے رکشے کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی اور رکشا تیزی کے ساتھ سڑک پر دوڑانے لگا۔

ہر طرف مکمل اندھیرا چھا چکا تھا۔ رکشا کی رفتار خاصی تیز تھی، مگر یکدم وہ نجانے کون سی جگہ تھی کہ رکشے کی رفتار آہستہ آہستہ ہو کر بالکل ہی ختم ہوگئی اور رکشا ایک جگہ رک گیا۔

وہ حیران تھی۔ آخر یہ کون سی جگہ ہے۔ یہ جہانیاں شہر تو نہیں تھا۔

''بھائی یہاں کیوں رکشا روک دیا؟'' وہ ہولے سے بولی۔ اور رکشا ڈرائیور کی طرف دیکھا، جو اپنی سیٹ پر بیٹھا گردن موڑ کر اس کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا، اس کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔ مسکراہٹ میں زنگ آلودہ پیلے دانت نمایاں تھے، یک دم ہی مہرو کے دل میں خوف سے جگہ بنالی۔ اس کا جسم کسی سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا۔

''بادشاہو......! ایک دو گھنٹے ہمیں بھی دے دو۔ بعد میں جہاں چاہو گی وہاں پہنچا دوں گا۔'' وہ رکشے سے پھرتی سے اُترا اور اس کی جانب بڑھا۔ وہ بھی تیزی سے رکشے سے اُتر آئی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا، چاند بھی نجانے کہاں بادلوں کی اوٹ میں سویا پڑا تھا۔ پراسرار اندھیرا اور اس کے ساتھ ایک عجیب سی خاموشی، سامنے تھوڑا سا فاصلے پر شاید کوئی ریلوے کا پھاٹک تھا، جہاں بتی جل رہی تھی، وہ اکیلی تنہا اس سنسان سڑک پر مکمل طور پر اس شیطان کے رحم و کرم پر تھی، اس کو لگا جیسے اب اس سے بچ کر نکلنا بہت مشکل ہے۔

رکشہ ڈرائیور اس کو پکڑنے کے لیے اس کی طرف لپکا۔ خوف سے لرزتی کانپتی مہرو میں نجانے کہاں سے اتنی ہمت آگئی کہ اس نے اپنا پرس تیزی کے ساتھ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ درد سے بلبلا اُٹھا، پرس نے شاید اس کی آنکھ کو زخمی کر دیا تھا اس نے دونوں ہاتھ سے اپنی آنکھوں کو تھام لیا، خوف سے ڈری پیچھے کی طرف قدم اٹھاتی ہوئی ایک نازک سی لڑکی میں اتنی ہمت اور طاقت کا پیدا ہو جانا شاید اس رکشا ڈرائیور کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

موقع غنیمت تھا، مہرو نے آؤ دیکھا نا تاؤ اور شہر کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑ لگا دی۔

''بھاگتی کہاں ہے سالی، چھوڑوں گا نہیں تجھے۔''
رکشہ ڈرائیور نے اسے یوں فرار ہوتے دیکھا تو وہ بھی کراہتا ہوا اس کے پیچھے ہولیا۔

مہرو میں جتنی طاقت تھی۔ وہ اس سے کئی گنا زیادہ زور لگا کر بھاگ رہی تھی حتیٰ کہ اُس کے نازک پاؤں کی نازک سی چپل بھی ٹوٹ گئی۔ مگر وہ بغیر چپل کے بھی بس آگے ہی آگے بھاگتی جارہی تھی۔ یوں اندھا دھند بھاگنے کی وجہ سے اس کی ٹانگیں درد کرنے لگ گئیں، مگر اس کے ذہن پر چھایا ہوا خوف اس کو مزید بھگائے لے جارہا تھا۔ نجانے کتنی دیر تک...... وہ یوں ہی بھاگتی رہی۔

وہ تھک کر چور ہوگئی تھی۔ ایک جگہ کھڑی ہو کر اپنی پھولتی ہوئی سانسوں کو سنبھلتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس بدمعاش کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ وہ خبیث شاید کہیں پیچھے ہی رہ گیا تھا۔ اب تو وہ اس سے بچ گئی تھی مگر آگے اس طرح کے کئی شیطان سے پھر اس کا واسطہ پڑسکتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ایک غلطی نے اس کو کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

کافی دیر وہ کھڑی روتی رہی۔ پھر اس نے آنسو اپنی ہتھیلیوں سے صاف کیے، اس کا دوپٹہ بھی راستے میں کہیں گر گیا تھا، بنا دوپٹے بنا پاؤں میں جوتے وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی شہر میں داخل ہوگئی، رات نجانے کتنی بیت چکی تھی۔ وہ ایک گلی میں داخل ہوگئی، گلی کا موڑ مڑتے ہی اسے سامنے ایک مسجد نظر آئی۔

مسجد اللہ کا گھر ہے اور اللہ کے گھر میں تو ہر کوئی پناہ لے سکتا ہے بلا کوئی خوف و خطر......! یہ سوچ کر ہی وہ مسجد میں داخل ہوگئی۔ مغرب کی نماز کافی پہلے ہو چکی تھی۔ مسجد تقریباً خالی تھی۔ سوائے ایک پختہ عمر کا ایک باریش بندہ وہ بھی مسجد سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ ایک جوان لڑکی کو بنا دوپٹہ اور ننگے پاؤں مسجد میں داخل ہوتا دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نا رہ سکا۔

''کون ہو تم لڑکی۔'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''وہ۔ وہ۔ ایک بدمعاش میرے پیچھے لگا ہوا تھا، میں بڑی مشکل سے جان بچا کر یہاں تک آسکی ہوں۔'' مہرو روہانسی آواز میں بولی۔

''اچھا۔ کہاں کی رہنے والی ہو۔'' اس پختہ عمر کے باریش جس کا نام امتیاز احمد تھا۔ نے مہرو سے سوال کیا۔

''آؤ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔''

''گھر......؟ وہ تو میں نے اپنے ہاتھوں سے فنا کر دیا، بھاگی ہوئی کسی لڑکی کا بھلا کوئی گھر ہوتا ہے۔'' وہ دردآمیز لہجے میں بولی۔

''کٹی پتنگ اور بھاگی ہوئی لڑکی کا کوئی ٹھکانا کوئی منزل نہیں ہوتی۔ میرا ابھی کوئی گھر نہیں ہے۔''

''کیا مطلب......؟ تم گھر سے بھاگی ہوئی ہو۔'' امتیاز احمد چونک پڑا۔

''ہاں۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔ میں ایک لڑکے سے پیار کرتی تھی، اور اس کے پیار کی کچی ڈور سے بندھی میں اپنے گھر کی دہلیز پھلانگ آئی۔ مگر......! وہ دھوکے باز فریبی نکلا۔ مجھے اس اجنبی شہر میں دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود غائب ہو گیا۔

''اوہ......! تم نے بہت بُرا کیا! تم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' وہ اس سے ہمدردی سے بولا۔ ''تمہارے والدین پر کیا گزری ہوگی، اس کا تمہیں اندازہ ہے۔''

''وہ، وہ تو جیتے جی مر گئے ہوں گے، ان کی اکلوتی بیٹی نے ان کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔'' مہرو زور زور سے رونے لگی۔

اس کے یوں بُری طرح رونے کی وجہ سے امتیاز احمد کو اس پر بڑا ترس آیا۔

''دیکھو۔ تم پریشان مت ہو، ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں تمہیں بس پر بٹھا دیتا ہوں، تم رات کے اندھیرے میں اپنے گھر چلی جانا۔''

''نہیں۔ نہیں۔ میں کس منہ سے واپس جاؤں گی۔ میرا باپ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا، میرے خاندان والے مجھے مار دیں گے۔''

''لیکن پھر اب تم اکیلی کہاں جاؤ گی۔'' امتیاز احمد اس کی پریشانی سے بخوبی واقف تھا۔ وہ اپنے واپسی کے تمام راستے بند کر آئی تھی۔

''آپ۔ آپ مجھے اپنے گھر لے جائیں، میں آپ کی نوکرانی بن کر آپ کے گھر رہوں گی، کہیں کونے میں پڑی رہوں گی، خدمت کروں گی آپ کی......رحم کریں مجھ پر۔''

''لیکن...... یہ مناسب نہیں۔'' امتیاز احمد گڑبڑا گیا۔ آخر جوان لڑکی کا مسئلہ تھا، کل کو کوئی اونچ نیچ ہو جاتی تو؟

''آپ کو اللہ رسول کا واسطہ۔ مجھ پر ترس کھائیں میں بدنصیب، بے سہارا، بے آسرا ہوں، اس اجنبی شہر میں آخر کہاں جاؤں گی۔''

مہرو اس کے پاؤں پڑ گئی۔

امتیاز احمد کو اس کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ واقعی جوان لڑکی ہے، کہاں دربدر بھٹکتی پھرے گی۔ کسی غلط ہاتھ میں بھی پڑ سکتی ہے۔

''اچھا۔ چلو ٹھیک ہے میں تمہیں اپنے گھر لے جاتا ہوں، اس نے اپنے پاؤں پر جھکی مہرو کو اوپر اُٹھایا۔

''نام کیا ہے تمہارا۔'' امتیاز احمد نے اس سے پوچھا۔

''جی۔ مہرالنسا۔'' وہ ہولے سے بولی۔

امتیاز احمد نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے لیے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

امتیاز احمد کا گھر دو گلیاں چھوڑ کر ہی تھا۔ وہ مہرو کو لے کر گھر کے اندر آ گیا۔ اندر صحن میں چارپائی پر بیٹھی امتیاز احمد کی بیوی بلقیس بیگم نے اپنے شوہر کے ساتھ ایک جوان لڑکی کو دیکھا تو شش و پنج میں پڑ گئی۔

''یہ کس کو ساتھ لے آئے، تم تو مسجد میں نماز پڑھنے گئے تھے نا۔'' بلقیس بیگم کے خون خوار لہجے میں بے پناہ تجسس بھی تھا۔

''یہ بے سہارا لڑکی ہے مجھے مسجد میں ملی ہے۔ اس کو میں گھر لے آیا۔ اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ یہ اب یہیں رہے گی۔'' وہ اپنی بیوی بلقیس بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟ بے سہارا ہے تو آپ اس کو اپنے گھر لے آئے، یہ کوئی یتیم خانہ ہے۔'' اسے اپنے شوہر امتیاز احمد کی بات پسند نا آئی۔ ''دال میں کچھ کالا ضرور ہے، کوئی نا کوئی بات تو ہے۔''

بلقیس بیگم کے ذہن میں کئی خدشات نے جنم لینا شروع کر دیا۔

اس کے بے حد اصرار پر آفر امتیاز احمد نے مجبوراً تمام بات اس کے گوش گزار دی، مہرو چپ چاپ کھڑی دونوں کی باتیں سنتی رہی۔

''اب تم ہی بتاؤ اس کو کہاں لے جاتا، جوان لڑکی ہے، میں نے اس پر ترس کھایا اور ادھر لے آیا۔'' امتیاز احمد نے اپنی صفائی پیش کی کہ اس کے بیوی بلقیس بیگم کے دل میں کوئی ایسا ویسا شک نا پڑے۔ وہ شروع سے

ہی بڑی شکی طبیعت کی واقع ہوئی تھی۔

''ایسی لڑکی کو تم اپنے گھر لے آئے امتیاز احمد جس کو اپنے والدین کی عزت کی بھی پرواہ نہیں، ان کی عزت کو اپنے پاؤں تلے روند کر یہ بے چاری بے آسرا بنی پھر رہی ہے، یہ ہمارے بھروسے کے لائق ہے؟ ارے ایسی لڑکی کو تو سرعام پھانسی پے لٹکا دینا چاہیے۔'' ساری بات سن کر بلقیس بیگم غصے میں آپے سے باہر ہوگی۔

''میں کہتی ہوں اس کی فوراً گھر سے باہر نکالیں۔'' غضب خدا کا آوارہ بے حیا کو منہ اٹھائے گھر لے آئے۔''

''مگر......'' امتیاز احمد بولا۔ ''اس میں ہرج ہی کیا ہے آخر؟''

''کوئی اگر مگر نہیں۔'' بلقیس بیگم تیز لہجے میں بولی۔ ''ارے لوگ کیا کہیں گے۔ ایسی بدچلن جوان لڑکی کو گھر میں رکھو گے۔ لوگ کیا کیا باتیں بنائیں گے۔'' کس رشتے سے یہ یہاں رہے گی۔ آخر میں کس کس کو جواب دیتی پھروں گی۔'' بلقیس بیگم کسی صورت بھی نہیں مان رہی تھی۔

اپنی بیوی کی بات سن کر امتیاز احمد کچھ دیر وہیں کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اس نے اندر کمرے سے ایک بڑی چادر اور ایک جوتی لاکر مہرو کے حوالے کی۔ مہرو نے جلدی سے جوتی پہنی اور چادر سے اپنے تن کو ڈھانپا پھر امتیاز احمد اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھر سے باہر لے آیا۔

''میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ میں اپنے گھر نہیں جاسکتی۔ میرے گھر والے مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' مہرو کو لگا وہ اسے اس کے گھر چھوڑنے جارہا ہے۔

''میں تمہیں تمہارے گھر نہیں لے جارہا، بلکہ مسجد لے جارہا ہوں۔ نکاح کرنے کے لیے...... مجھ سے نکاح کروگی؟ امتیاز احمد کا لہجہ مضبوط تھا۔

''کیا......! نکاح؟؟'' مہرو یکدم چونک پڑی اس نے امتیاز احمد کی طرف دیکھا۔

''ہاں نکاح۔'' وہ بولا۔ ''ایک ہی صورت ہے، جس کے ذریعے تم میرے گھر رہ سکتی ہو، بولو منظور ہے ورنہ تمہیں یہاں سے جانا پڑے گا۔''

مہرو کی تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہوچکی تھی، وہ کتنی بے بس اور مجبور تھی۔ اس کے گلے میں وہ ہڈی پھنس گئی تھی۔ جس کو وہ نا تو نگل سکتی تھی نا ہی اُگل سکتی تھی۔

وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چل پڑی۔

امتیاز احمد نے مسجد میں چند گواہوں کی موجودگی میں اس سے نکاح پڑھوالیا۔ مسجد کا مولوی امتیاز احمد کا قریبی دوست تھا۔ اس لیے مسجد کے مولوی نے بغیر کسی میں و محبت کے نکاح پڑھوادیا۔

مہرو اب امتیاز احمد کی بیوی بن چکی تھی۔ اپنی عمر سے کئی گناہ زیادہ بڑے آدمی کی بیوی، تقدیر نے اس کے ساتھ بڑا ستم کیا تھا۔

دونوں مسجد سے نکل کر تھوڑی ہی دیر میں واپس گھر آگئے۔

بلقیس بیگم نے اسے یوں دوبارہ اپنے شوہر کے ساتھ گھر میں دیکھا تو تلملا گی۔

''تم اس کو چھوڑ کر نہیں آئے دوبارہ اپنے ساتھ ہی لے آئے؟۔''

''ہاں۔ یہ واپس آگئی ہے کیوں کہ میں نے اس کے ساتھ نکاح کرلیا ہے۔'' امتیاز احمد صاف گوئی سے بولا۔ اسے اب چھپانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

''نکاح وہ بھی اس آوارہ سے؟'' بلقیس بیگم کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

''ہاں نکاح۔ تم کہہ رہی تھیں کہ یہاں کس رشتے سے رہے گی۔ تو اب یہ میری بیوی بن کر گھر میں رہے گی۔''

''کیوں اب تمہیں یا لوگوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوسکتا ناں۔''

''ہائے ہائے۔ اس عمر میں مجھ پر سوتن لاکر ظلم کرنا تھا، اس بڑھاپے میں میرے بالوں میں خاک ڈال دی۔'' بلقیس بیگم روتے ہوئے اپنی چھاتی پیٹنے لگی۔

امتیاز احمد اس سے کوئی اور بات کہے بغیر مہرو کو لیے اندر کمرے میں آگیا اور اسے اندر کمرے میں بٹھا کر واپس ادھر آیا جہاں اس کی ادھیڑ عمر بیوی رو رو کے بے حال ہورہی تھی، اس نے امتیاز احمد کو دیکھا تو پھر زور زور سے چلانے لگی۔

''ہائے لوگوں ادھر آؤ۔ دیکھو میرے ساتھ اس عمر میں کتنا ظلم ہوا ہے، میں لٹ گئی میں برباد ہوگئی۔ میرے شوہر نے میرے حق پر ڈاکہ ڈلوادیا۔''

''خاموش ایک لفظ بھی اب منہ سے باہر نکالا تو چٹیا سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دوں گا۔ ساتھ تین لفظ طلاق

کے کہے نا تو تیری عقل ٹھکانے آجائے گی۔'' امتیاز احمد شدید غصے میں بولا۔

''پھر تم لوگوں کو بتاتی رہنا کہ میرے شوہر نے مجھ پر کتنا ظلم و ستم کیا ہے، میں نے کوئی گناہ نہیں۔ شریعت میں چار شادیوں کی اجازت ہے اور پھر میں نے تو صرف دوسری شادی کی ہے، ایک مجبور بے سہارا لڑکی کو سہارا دیا ہے۔'' امتیاز احمد کا یہ غصہ تھا یا اس کے طلاق دینے کی دھمکی بلقیس بیگم کو یکدم ہی چپ لگ گئی۔

وہ اسے خاموش دیکھ کر پیار سے سمجھانے لگا۔

''اری او نیک بخت تو تو ایسے ہی پریشان ہو رہی ہے بلکہ تجھے تو خوش ہونا چاہیے، تیری خدمت کرنے اور گھر کے کام کرنے کے لیے تجھے نوکرانی مل گئی ہے، تیری نوکرانی بن کر رہے گی اور مجھے کیا چاہیے، اسے اپنی خامہ ہی سمجھ پگلی۔''

امتیاز احمد نے اسے سمجھایا وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

''اچھا میں ذرا مسجد جا رہا ہوں عشاء کی نماز پڑھنے۔ تھوڑی دیر بعد آتا ہوں۔ مگر دیکھ لینا واپس آؤں تو مجھے گھر میں سکون چاہیے شور شرابہ نہیں۔ سمجھی۔''

امتیاز احمد گھر سے باہر نکل گیا، غصے سے لال پیلی ہوتی بلقیس بیگم جلدی سے چارپائی سے اُٹھی اور اندر کمرے کی طرف گئی جہاں مہرو پلنگ پر بیٹھی اپنی تقدیر کا ماتم کرنے میں مصروف تھی۔

''کیوں ری کلموہی بے غیرت...... نکاح کر کے تو سمجھتی ہے کہ تو نے میرے شوہر کو پھانس لیا۔ پلنگ پر مہارانی بن کر بیٹھی ہوئی ہے۔'' اس نے مہرو کو بالوں سے پکڑ کر نیچے فرش پر گھسیٹا تو مہرو درد سے بلبلا اُٹھی۔

''حرام زادی گھر کے کام تیرا باپ کرے گا۔ تو مجھے جانتی نہیں ہے، مجھے ناکوں چنے نا چبوائے تو میرا نام بلقیس بیگم نہیں۔''

اس نے دو تھپڑ مہرو کے منہ پر جڑ دیے۔

''چل جھاڑو لگا، مجھے تجھے کپڑے بھی دھونے ہیں۔ اس سارے کام سے فارغ ہو کر میرے کمرے میں میرے پاؤں دبانے بھی آنا، لیکن دیکھ اگر کوئی کام ٹھیک طریقے سے نا ہوا نا تو تیری کھال اُدھیڑ دوں گی۔'' بلقیس بیگم اس کے ہاتھ میں جھاڑو پکڑا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

صحن میں جھاڑو لگاتی مہرو اتنا روئی کہ اس کی آنکھیں خشک سی ہونے لگیں، اس نے تو اپنے گھر میں اُٹھ کر کبھی پانی بھی نہیں پیا تھا۔

جھاڑو کا کام ختم ہوا تو کپڑوں کا ڈھیر اس کا منتظر تھا۔ نل کھول کر اس نے گندے کپڑے دھونے شروع کیے، نل کے پانی کے ساتھ اس کی آنکھوں کا پانی بھی لگاتار بہنے لگا، اس نے جیسے تیسے ہو کر کپڑے دھو دیے۔ ہاتھوں میں شدید درد سا ہونے لگا، وہ بہت تھک چکی تھی، اس کا دل چاہ یہیں فرش پر لیٹ جائے، مگر اندر کمرے سے بلقیس بیگم کی آتی ہوئی آواز نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

''اری او رکمینی، کدھر مرگئی بدبخت دو کپڑے تھے ابھی تک نہیں دھوئے ہڈ حرام ادھر آ میرے پاؤں دبا۔ ذلیل آوارہ کہاں سے پلے پڑ گئی میرے۔''

آدھے گھنٹے سے زیادہ مہرو اس کے پاؤں دباتی رہی اور ساتھ بلقیس بیگم سے بددعائیں اور گالیاں بھی سنتی رہی اور چپکے چپکے روتے ہوئے اس وقت تک وہاں بیٹھی رہی جب تک بلقیس بیگم سو نا گئی۔ وہ آہستہ سے پلنگ سے اُٹھی اور باہر کی طرف قدم بڑھائے باہر امتیاز احمد کھڑا اس کا منتظر تھا۔

''سو گئی بلقیس؟'' اس نے مہرو سے سوال کیا۔

''ہاں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ امتیاز احمد اس کو دوسرے کمرے میں لے آیا۔

''تو بلقیس کی باتوں کا بُرا مت ماننا، اس کی تو عادت ہے، وہ زبان کی بھلے تیز ہے مگر دل کی بہت اچھی ہے، تو مہرالنساء اس کی خدمت کر کے اس کا دل جیت سکتی ہے۔''

امتیاز احمد نے اس کو پلنگ پر بٹھایا اور خود بھی اس کے ساتھ جا بیٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا، مہرو اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر خوف زدہ سی تھوڑا پیچھے ہٹ گئی۔

''ڈر نہیں...... اب میں غیر تھوڑی ہوں، اب تیرا شوہر ہوں مجازی خدا۔'' امتیاز احمد مسکرایا۔ تو مہرو نے آہستگی سے اپنا سر جھکا لیا۔

خدا نے اس کی قسمت میں یہ بندہ ساری زندگی کے لیے لکھ چھوڑا تھا۔

رات تو جیسے تیسے گزر گئی، مگر صبح سویرے ہی بلقیس بیگم نے پھر اسے کام پر لگا دیا، گھر میں جھاڑو۔ ناشتا تیار کرنا اور پھر جھوٹے برتنوں کا ڈھیر باورچی خانے میں اس کا منتظر تھا۔ وہ برتن دھوتی پتا نہیں کن خیالوں میں ایسی کھوئی کہ اس کو باہر گیٹ پر دو تین بار دستک کی آواز سنائی

نہ دی کہ بلقیس بیگم نے دو تھپڑ اس کی کمر پر رسید کیے۔

''کس کے خیالوں میں تو کھوئی ہوئی ہے، اپنے اُسی یار کے نام...... خود تو بھاگ گیا۔ لیکن تجھے بے غیرت کو ہمارے پلے باندھ گیا، بہری ہوگئی ہے کیا منحوس باہر جا کر گیٹ پر مر جا دیکھ کون آیا ہے۔''

''جی دیکھتی ہوں۔'' وہ بھیگی آنکھیں دوپٹے کے پلو سے صاف کرتی ہوئی گیٹ کی جانب بڑھ گئی، اس نے دروازہ کھولا تو شدید جھٹکا لگا۔ سامنے شہروز کھڑا تھا۔

وہ زخمی حالت میں تھا، اس کے ماتھے اور بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی، مہرو کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

شہروز کے چہرے پر بھی اس کو دیکھ کر حیرت کے آثار تھے، جو جلد ہی خوشی و مسرت میں بدل گئے۔

''تم یہاں مہرو؟ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تم مجھے یوں مل جاؤ گی۔'' وہ خوشی سے چہکتے ہوئے بولا۔

''فریبی، دھوکے باز انسان میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا اک پیار ہی کیا تھا، تو نے مجھے اتنی بڑی سزا دی۔ مجھ سے پیار کا جھوٹا کھیل کھیلا اور اس اجنبی شہر میں مجھے دوسروں کے سہارے چھوڑ کر خود فرار ہوگئے۔'' وہ بلک بلک کر رو دی۔

''میں کتنی بے وقوف تھی تمہارے ایک اشارے پر چلی آئی اپنے والدین اپنا گھر صرف تم جیسے گھٹیا انسان کی خاطر چھوڑ دیا۔''

''بولو تم نے ایسا کیوں کیا۔ جواب دو۔'' مہرو نے آگے بڑھ کر شہروز کو گریبان سے پکڑ لیا۔

''کیا کہہ رہی ہو مہرو؟ میں دھوکے باز ہوں، میں نے تم سے پیار کا جھوٹ کھیل کھیلا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے میں تو اپنی جان سے بھی زیادہ تم سے پیار کرتا ہوں مہرو۔ میری بات کا یقین کرو۔''

''جھوٹ۔ سراسر جھوٹ۔ مجھ سے پیار کرتے تو یوں اس طرح چھوڑتے، میں کتنی دیر تمہاری راہ تکتی رہی شہروز اک اک پل جیتی اور مرتی رہی۔'' وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں، پہلے میری ساری بات تو سنو، پھر تم مجھے مجرم ٹھہرانا میں تم کو لینے موٹر سائیکل پر آ رہا تھا کہ میرا ایک کار سے ایکسیڈنٹ ہوگیا، پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں۔ ہوش آیا تو اپنے آپ کو اسپتال میں پایا۔ بہت رات بیت چکی تھی، میں اپنے زخموں کی پرواہ کیے بغیر تم کو اس شہر میں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا مہرو۔ میرا موٹر سائیکل چوری ہوگیا، پیدل ساری رات کہاں کہاں بھٹکتا رہا ہوں، تمہاری تلاش میں مگر تم نہیں ملیں اور اب ملی بھی ہو تو یہاں یوں اچانک، موبائل میرا ٹوٹ چکا تھا، ورنہ تم سے رابطہ ہی کر لیتا۔''

مہرو نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا وہ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

''میرا یقین کرو مہرو۔ تم میری حالت بخوبی دیکھ رہی ہو، وہ گھر کے اندر داخل ہوگیا جیسے وہ اسی کا گھر ہو۔ اور مہرو کے قریب آ گیا۔

''میری چاہت میرا پیار سچا تھا مہرو۔ اسی لیے تو تم مجھے دوبارہ مل گئیں۔ مگر تم یہاں آئیں کیسے......؟'' وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

''تم نے آنے میں بہت دیر کر دی شہروز۔'' مہرو کو ساری صورت حال سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی، وہ نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کا درد بسا ہوا تھا۔ وہ درد جو شہروز سے بھی چھپ نہ سکا۔ اچانک کمرے سے امتیاز احمد باہر نکلا۔

''ارے شہروز تم اس حالت میں؟ تم تو کہہ کر گئے تھے تم دوست کی شادی میں جا رہے ہو دو تین روز بعد آؤ گے۔ یہ تم زخمی کس طرح ہوگئے ہو۔'' امتیاز احمد پریشان سا اس کے قریب آ گیا۔

شہروز چپ کھڑا وہیں مہرو کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں مہرو کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''تم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔''

چلو اندر آؤ کیا یہیں کھڑے رہو گے، امتیاز احمد نے شہرو کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اندر لے جانا چاہا وہ اچانک بولا۔

''لو میں بھول ہی گیا۔ تم دونوں کا تعارف کروانا۔ تم بھی نجانے کیا سمجھ رہے ہوگے۔

مہر النساء یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے، شہروز...... اور شہروز یہ تمہاری نئی ماں مہر النساء، رات کو یہ بے آسرا بے یار و مددگار مجھے ملی، اس کا کوئی نہیں تھا زمانے کی باتوں سے بچنے کے لیے میں نے اس سے نکاح کر لیا ہے۔''

شہروز کو یوں لگا جیسے اس کے وجود کے اندر سے کسی نے جان نکال لی ہو۔ یہ جان لیوا یہ صدمہ اس کی جان ہی لے گیا تھا۔

☆☆......☆☆

ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور
قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

سطر سطر تجسس سموئے، نئے سنسنی خیز سلسلے کی پہلی کڑی

نومبر آخری دنوں سے گزر رہا تھا۔ فضاء میں خاصی خنلی تھی۔ رضائیاں تو پہلے ہی نکل آئی تھیں۔ بڑے ہال میں خصوصی نشست گاہ تھی جہاں رات کے کھانے کے بعد محفل جمتی تھی اور یہ روایت اس گھرانے کی قدیم روایت تھی، دن بھر کوئی کہیں



مصروف رہے، رات کے کھانے میں سب شریک ہوتے تھے اور کھانے کے بعد اس بڑے کمرے میں محفل جمتی تھی اور دادی اماں صدر محفل ہوا کرتی تھیں۔ یہاں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی تھی، ہر شخص اپنی مرضی سے بولتا تھا، ویسے زیادہ تر دادی اماں کو سنا جاتا تھا۔ اس وقت بھی محفل جمی ہوئی تھی اور مختلف باتیں ہورہی تھیں۔ چائے کا دور چل رہا تھا، بڑے بھیا نے اچانک ہی چائے کا کپ نیچے رکھ دیا اور بولے۔

''یہ چائے کے کپ میں پیاز کی بو آرہی ہے۔''

دادی اماں نے سامنے کھڑی ہوئی نوکرانی سعیدہ کو آواز دی۔ ''سعیدہ بی بی یہ شہباز کیا کہہ رہے ہیں، چائے کے کپ میں پیاز کی بو کیسی ہے؟''

''بڑی بی بی، میں دوسرا کپ خوب دھو کر لاتی ہوں، پتہ نہیں بو کیسے رہ گئی؟'' نوکرانی نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

''میری بات سنو سعیدہ کسی برتن میں اگر پیاز کی بو بیٹھ گئی ہو تو اس برتن کو نمک والے گرم پانی سے دھولو، پیاز کی بو بھی نہیں رہے گی۔''

''ٹھیک ہے بڑی بی بی۔'' سعیدہ نے کہا۔

''اگر کوئی چندے آفتاب چندے ماہتاب بننا چاہے تو کیا کرنا چاہیئے دادی اماں۔'' گھر کے سب سے چھوٹے سب سے لاڈلے شاہ زیب نے بھولا سا منہ بنا کر پوچھا۔

''ارے میرے لعل، تو تو ہے ہی ماہتاب کا ٹکڑا، تجھے ایسے نسخے کی کیا ضرورت پڑگئی، پھر بھی بتائے دیتی ہوں، سونے سے پہلے لیموں کے رس میں زیتون کا تیل اور زعفران ملا کر چہرے گردن اور بازوؤں پر لگالو، رنگت سرخ وسفید ہوجائے گی۔''

''سن لیا آپ نے عاتکہ بھابھی۔'' شاہ زیب نے بڑی بھابھی کی طرف رخ کرکے کہا اس کا رنگ قدرے سانولا تھا۔

''جی نہیں دیور جی، کالے اللہ میاں کے پیارے اور گورے چھی چھی چھی۔'' عاتکہ بھابی نے ترکی بہ ترکی کہا۔ اورنگ زیب امیت کا گھرانہ تھا خوشحال، خوش جمال لوگوں کا گھرانہ، اورنگزیب کا انتقال ہوچکا تھا، بیٹوں نے باپ کی جاگیر سنبھال لی تھی اور اپنا کاروبار بھی کررہے تھے۔ دو بھائیوں شہباز اور شہر یار کی شادیاں ہوگئی تھیں۔

دونوں بہنوں کی بھی شادی ہوگئی تھی اور وہ دوسرے شہروں میں چلی گئی تھیں، سب کے سب تندرست وتوانا تھے، لیکن کوئی دو مہینے پہلے سب سے چھوٹا سب سے نٹ کھٹ شاہ زیب موٹر سائیکل چلاتے چلاتے نیچے گر کر بے ہوش ہوگیا۔ چوٹ تو کوئی خاص نہیں لگی لیکن سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ ہوا کیا، جبکہ دور دور تک کوئی نہیں تھا، موٹر بائیک سلپ بھی نہیں ہوئی تھی، پھر یہ بے ہوشی یا بائیک کا گرنا کیا معنی رکھتا ہے، کچھ پتہ نہیں چل سکا، دادی اماں نے البتہ اس مسئلے کا حل بھی پیش کردیا۔

''ارے لوگ صدقے کی ماش اور تیل وغیرہ چوراہوں پر رکھ جاتے ہیں، کوئی ان پر سے گزر جائے تو اسے نقصان ہوجاتا ہے، لوگ بہت غلط کرتے ہیں، ایسی چیزیں سڑک کے کنارے رکھیں تو بہت اچھا ہوتا ہے بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ کھانے پینے کی یہ چیزیں، گوشت وغیرہ ہوتب بھی، بجائے چیل کوؤں کو کھلانے کے انسانوں کو دے دیا جائے تو زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ جانوروں کی ذمے داری تو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے پاس رکھی ہے وہی لاکھوں کروڑوں جانوروں کو اور پرندوں کو رزق عطاء فرماتا ہے، یہ تمہاری ذمے داری نہیں ہے، ہاں اگر کسی جانور کو تم نے پالا ہوا ہے اور پنجرے میں قید رکھا ہے تو پھر اس کی ذمے داری تم پر ہوتی ہے، ورنہ باقی چیل کوؤں کو کھلانے سے کوئی فائدہ نہیں، سمجھ رہے ہونا تم لوگ۔'' پھر انہوں نے شاہ زیب کے لئے کالے بکرے کا صدقہ دیا تھا۔ لیکن اس کے پندرہ دن کے بعد شاہ زیب کو گھر میں ہی چکر آیا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔

یہ خطرناک صورت حال تھی، شہر یار نے اپنے دوست ڈاکٹر سے بات کی تو اس نے کہا کہ وہ شاہ زیب کا چیک اپ

کرے گا۔

''جی ڈاکٹر صاحب، میرے بڑے بھائی صاحب جو ہیں نا، کسی اچھی لڑکی کو دیکھ کر میری شادی کرا دیں، یہ ساری اداکاری میں اسی لئے کر رہا ہوں۔'' شاہ زیب نے بدستور شرارت سے کہا۔

''پھر بھی مائی ڈیئر بوائے، تھوڑے سے ٹیسٹ کرا لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے خوشدلی سے کہا۔

''سوری ڈاکٹر میں ٹھیک ہوں، میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میرے بھائی مجھے بے حد چاہتے ہیں اور کوئی بات نہیں ہے۔'' شاہ زیب نے کسی کی نہیں سنی، وہ کچھ دنوں سے کچھ چڑچڑا سا بھی ہو گیا تھا۔ ورنہ ہر وقت ہنسنے بولنے والا نوجوان تھا، یہ بات بھی گھر والوں کے لئے باعث تشویش تھی کہ اس کے مزاج میں یہ چڑچڑا پن کیوں پیدا ہو گیا ہے، اس وقت بھی نومبر کا جاڑا منایا جا رہا تھا اور دادی اماں کے ٹوٹکے چل رہے تھے۔

''زمانہ ہی بدل گیا ہے اب نہ تو حکیم رہے نہ وید، اللہ اللہ، پہلے تو ایسے علاج ہوتے تھے حکیم تھے کہ ولیوں جیسے، بیبیاں باپردہ ہوتی تھیں چنانچہ کلائی میں دھاگہ باندھ کر دوسرا سرا حکیم صاحب کو تھما دیا جاتا تھا اور وہ نبض دیکھ کر نسخہ لکھ دیتے تھے، ایک بار کسی گستاخ نے بھینس کے کھر میں دھاگہ باندھ کر دوسرا سرا حکیم صاحب کو دے دیا تو انہوں نے نسخہ لکھا 'ایک سیر کھلی، ایک سیر سرسوں کا تیل، آدھی چھٹانک سہاگہ، آدھی چھٹانک اجوائن، بھوسے میں ملا کر تین وقت کھلا دو انشاء اللہ شفا ہو گی''

''واہ کیا بات ہے۔''

''بس وہی ماننے والی بات ہوتی ہے بھیا، مجھے پتہ ہے تم میری باتیں کہاں مانتے ہو اللہ کے بھید نرالے ہوتے ہیں، تمہیں معلوم ہے کہ مالک نے ہر انسان کے سات ہمشکل پیدا کئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' شاہ زیب کو یہ بات دلچسپ لگی تھی۔

''ہاں دنیا بھر میں ہر انسان کے سات ہمشکل ہوتے ہیں۔''

''ارے واہ، ہمیں تو دادی اماں کبھی ایک بھی نہیں ملا۔'' شہباز نے کہا۔

''لو تم سے ملنے تمہارے پاس آئیں گے نا، تلاش کرنا پڑتا ہے تلاش کرنا پڑتا ہے کوئی تمہارے پاس تو نہیں چکراتا پھرے گا۔''

پتہ نہیں شاہ زیب کے دل پر اس انکشاف نے کیا اثر کیا تھا، اس رات وہ خواب میں اپنے ہمشکلوں کو تلاش کرتا رہا۔ رات بھر میں اس نے اپنے پانچ ہمشکل تلاش کر لئے، چھٹے کی تلاش میں نکلا ہی تھا کہ فجر کی اذان ہو گئی۔

''دو باقی رہ گئے دادی اماں۔''

''کیا؟'' دادی اماں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔''

''ساری رات میں اپنے ہمشکل تلاش کرتا رہا ہوں، پانچ مل گئے دو رہ گئے۔''

''تیری ایسی تیسی۔'' دادی اماں اسے مارنے کے لئے لپکیں تو وہ کود کر بھاگا، لیکن دروازے کے قریب پہنچ کر اچانک اسے زور کا چکر آیا اور بمشکل تمام وہ خود کو گرنے سے روک سکا، اس نے دیواریں پکڑنے کی کوشش کی، لیکن خود کو نہ سنبھال سکا اور پھر اس کے حواس ساتھ چھوڑ گئے۔

ہوش ہسپتال میں آیا تھا جہاں سارا گھر سوگوار موجود تھا، یہاں تک کہ دادی اماں بھی نڈھال نڈھال سی ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کمرے کا ماحول دیکھ کر اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ ہسپتال ہے۔

''آخر آپ لوگوں کو موقع مل ہی گیا مجھے ہسپتال لانے کا۔'' اس نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

اسی وقت دو وارڈ بوائے اسٹریچر لے کر آ گئے ''چلئے جناب۔''

''کیا مطلب؟'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

''شاہ زیب بیٹے ڈاکٹر نے سی ٹی اسکین تجویز کیا ہے، تمہیں باہر جانا ہے۔'' شہباز نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔



"بھائی جان، آپ لوگ مجھے تماشہ بنانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟"

"تمہیں جانا ہے شاہ زیب۔" شہباز نے سنجیدگی سے کہا اور شاہ زیب اس سنجیدہ لہجے کی اہمیت کو سمجھتا تھا چنانچہ بستر سے نیچے اتر آیا اور پیدل چل پڑا، شہریار اور شہباز اس کے پیچھے لپکے تھے، سی ٹی اسکین کروانے کے کے بعد اس نے کہا۔

"میں گھر جانا چاہتا ہوں۔"

"رپورٹیں مل جانے دو۔"

"سب ٹھیک ہوگا میں کہتا ہوں۔"

"انشاء اللہ بیٹے۔" دادی اماں نے کہا۔ وہ گھر آ گیا، ایک ایک شخص تکدر کا شکار تھا۔کوئی بھی گڑ بڑ نہیں تھی، بلاوجہ اسے مریض بنایا جا رہا تھا۔ گھر کے ماحول میں ایک عجیب سی تبدیلی پیدا ہوگئی، جو چہل پہل ہوتی تھی وہ ختم ہوگئی، رات کی نشستیں بھی ختم ہوگئیں، ہر شخص رویا رویا سا تھا، اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا جا رہا تھا۔ تین چار دن گزر گئے، پھر ایک دن بڑے بھائی نے سرد لہجے میں کہا۔

"کل پانچ بجے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"جی... کہاں؟"

"کرنل سلیمان صاحب کے پاس؟"

"یہ کون ہیں؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"ملک کے سب سے بڑے نیورو سرجن ہیں، ان سے اپائٹمنٹ ہے۔"

"کیوں؟"

"تمہیں چیک کریں گے۔"

"مجھے ہوا کیا ہے؟"

"مجھ سے بحث کرو گے۔؟"

"نہیں، لیکن مجھے کچھ بھی نہیں ہے، آپ لوگ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔"

"چلنا ہے۔" شہباز بھائی سپاٹ لہجے میں بولے، اس کے بعد گنجائش نہیں تھی، انہیں چکمہ بھی نہیں دے سکتا تھا، چنانچہ دوسرے دن جانا پڑا، کرنل صاحب نے پہلی ہی ملاقات میں کھوپڑی گھما دی۔

"آپ لوگ ڈھائی منٹ لیٹ ہیں۔" کرنل صاحب بگڑے ہوئے لہجے میں بولے۔ خالص فوجی مزاج اور فوجی حلیے کے ساچھ فٹ لمبے آدمی تھے۔

"جی وہ۔" بھائی صاحب نے خجل سے لہجے میں کہا۔ شاہ زیب سے بھلا کہاں صبر ہوسکتا تھا، چنانچہ وہ کھٹ سے بول پڑا۔

"جی نہیں سر، ہم وقت پر پہنچ گئے تھے۔ آپ کی ریسپشنسٹ موبائل فون پر کسی سے عشق لڑا رہی تھی، آج وہ ڈنر پر ہوٹل ایکسلسیئر جا رہی ہے۔ اس نے اپنے بوائے فرینڈ سے گفتگو ختم کرکے ہمیں اٹینڈ کیا۔"

"کیا؟" کرنل صاحب کی دہاڑ گونجی، لیکن پھر وہ فوراً سنبھل گئے، البتہ ان کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا پھر انہوں نے شاہ زیب کا فائل سامنے کرلیا، اس کے بعد چیکنگ کے مراحل شروع ہوگئے اور وہ دیر تک اسے کھنگالتے رہے اس کے بعد بولے۔

"ٹھیک ہے آپ باہر جاسکتے ہیں۔"

"تم باہر چلو میں آتا ہوں۔" بھائی صاحب نے کہا اور شاہ زیب باہر نکل آیا، باہر شہریار بھائی متفکر بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے غور سے اسے دیکھا اور بولے۔

"کیا رہا؟"

''مجھے نہیں معلوم۔لیکن اب میری قوت برداشت جواب دیتی جارہی ہے۔''

شہریار نے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے انتظار کیا جانے لگا، تھوڑی دیر کے بعد شہباز بھائی باہر نکل آئے۔اور یہ لوگ واپس گھر چل پڑے۔شاہ زیب کو سخت الجھن ہورہی تھی، کوئی کچھ بتانے پر تیار نہیں تھا اور اس کا جنون بڑھتا جارہا تھا، دو دن کے بعد دونوں بہنیں آ گئیں۔چھوٹی بہن دردانہ نے تو آتے ہی رونا پیٹنا شروع کردیا۔وہ شاہ زیب سے لپٹ گئی اور بھوں بھوں کر کے رونے لگی۔

''مجھے تو یہ سب اپنے خلاف کوئی سازش لگ رہی ہے یہ سب آخر ہو کیا رہا ہے؟'' شاہ زیب نے غصیلے لہجے میں کہا، لیکن کوئی جواب نہیں ملا، البتہ رات کو کھانے کی میز پر شہباز بھائی نے کھانا ختم ہونے کے بعد کہا۔

''ڈاکٹر کرنل سلیمان شاہ نو تاریخ کو تمہارا آپریشن کریں گے، چھ تاریخ کو تمہیں ہسپتال میں داخل ہونا ہے۔''

''آپ جانتے ہیں میں آپ سے کوئی تلخ بات نہیں کہتا، کیسا آپریشن کریں گے، مجھے پتہ تک نہیں''

''تمہیں برین ٹیومر ہے۔'' شہباز بھائی نے کہا اور شاہ زیب کا منہ ایک لمحے کے لئے کھلا اور پھر بند ہو گیا۔کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''برین ٹیومر مجھے نہیں ڈاکٹر سلیمان صاحب کو ہے۔''

''نہیں بیٹے، تمام رپورٹیں ہو چکی ہیں۔'' شہباز بھائی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔پھر انہوں نے بھرائی ہوئی آواز ہی میں کہا۔

''انشاءاللہ آپریشن کامیاب ہی ہوگا۔'' شاہ زیب خاموش ہو گیا، لیکن اندر سے وہ سخت طیش میں تھا کچھ نہیں ہے مجھے کچھ بھی نہیں ہے اور یہ کرنل شاہ، ہونہہ، میرا آپریشن کرے گا، دیکھتا ہوں کیسے میرا آپریشن ہوتا ہے۔برین ٹیومر...ارے واہ..زبردستی کا برین ٹیومر...توبہ توبہ...میری کھوپڑی کھول دے گا۔سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، میرا نام بھی شاہ زیب ہے، اس نے کہا اور دل ہی دل میں کچھ فیصلے کر ڈالے۔اب اسے اندازہ ہورہا تھا کہ گھر کے حالات اتنے افسردہ کیوں ہو گئے ہیں۔

سارا نظام ہی بدل گیا تھا، کچھ ہی دن پہلے کی بات تھی کہ اس گھر میں ہر وقت قہقہے ابلتے رہتے تھے، وہ خود بھی ان قہقہوں میں شریک ہوتا تھا، لیکن اب تو ہر طرف آہ و بکا ہی تھی۔دونوں بہنیں چپکے چپکے آنسو بہاتی رہتی تھیں، شاہ زیب کو علم ہو گیا کہ وہ سب اس کی موت کے خیال سے خوفزدہ ہیں۔نہیں مروں گا میں نہیں مروں گا، کوئی مذاق ہے، لوگ برسوں بیماریوں کا شکار رہتے ہیں۔یہاں تک کہ ان کی تیمارداری کرنے والے اکتا جاتے ہیں اور ان کی موت کی دعائیں مانگنے لگتے ہیں۔میں اتنی جلدی کیسے مر سکتا ہوں، انسان بہر صورت انسان ہی ہوتا ہے وہ ڈاکٹر سلیمان شاہ سے اتفاق نہیں کر رہا تھا، ارے ایک دو بار طبیعت خراب ہوئی تھی جس کی وجوہات کچھ بھی ہو سکتی تھیں۔ڈاکٹر سلیمان شاہ نے برین ٹیومر بتا دیا، یہ سب کچھ تو مناسب نہیں تھا، اب کرنا کیا چاہیئے۔

یہ رات اس کے لئے بڑی سوچوں کی رات تھی۔نیند نہیں آرہی تھی، دل کے کسی ایک خانے میں خوف کی جگہہ بھی بن گئی تھی۔کیا واقعی مجھے برین ٹیومر ہے، برین ٹیومر کے کچھ واقعات اس نے سن رکھے تھے، یہ بیماری بہر حال موت پر ختم ہوتی تھی، لیکن بس یہی بات اس کا دل قبول نہیں کرتا تھا، ایک تندرست آدمی اتنی آسانی سے کیسے مر سکتا ہے، لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ بڑے بھیا یعنی شہباز صاحب نے ڈاکٹر سلیمان شاہ سے تمام معاملات طئے کر لئے ہیں اور اگر اس نے بغاوت بھی کی تب بھی اسے ڈاکٹر سلیمان شاہ تک پہنچا دیا جائے گا اور وہ اس کی کھوپڑی کھول دے گا، تیری تو ایسی تیسی ڈاکٹر سلیمان شاہ اگر زیادہ گڑ بڑ ہوئی تو میں خود تیری کھوپڑی کھول دوں گا۔شاہ زیب نے دل میں سوچا، لیکن آنکھیں بند کر لینے سے بلی نہیں بھاگ جاتی، خطرے کا سدباب کرنا تھا اور دوسرے دن وہ بالکل سنجیدہ ہو گیا، خوشحال گھرانے کا فرد تھا، دولت کی کوئی کمی نہیں تھی، لاکھوں روپے خود اس کے اپنے اکاؤنٹ میں پڑے ہوئے تھے۔یہ لازمی امر تھا کہ اس وقت اس خوفناک عمل سے بچنے کے لئے کچھ عرصے کے لئے گھر چھوڑ دیا جائے اور کہیں اور زندگی بسر کی جائے۔

عمل نیا تھا لیکن وہ خود نہ تو معصوم تھا نہ بچہ تھا کہ گھر سے دور نہ رہ سکتا، سب کی محبتیں اپنی جگہہ، گھر کا ماحول اپنی جگہہ لیکن ایک غلط فیصلے پر عمل کرنا تو بڑی پریشانی کی بات ہے، چنانچہ ذہانت کے ساتھ کچھ نہ کچھ کرنا ہے اور دوسرے دن اس نے اپنے پروگرام پر عمل شروع کر دیا، سب سے پہلے اس نے بینک سے بہت بڑی رقم نکلوائی، یہ رقم اس کے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع تھی لیکن اتنی کہ برسوں اس کے کام آسکے، یہ رقم نکلوانے کے بعد اس نے ایک اور بینک میں اکاؤنٹ کھولا اور یہ رقم اس میں منتقل کر دی۔

پھر اس کے بعد اس نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرہ حاصل کیا گویا کچھ وقت گزارنے کے لئے ایک جگہہ ہاتھ آ گئی، یہ کام جلد از جلد کر لینا چاہتا تھا، اسی دن شام کو اس نے ایک بہت ہی اعلیٰ درجے کے شاپنگ سینٹر سے اپنے لئے ریڈی میڈ لباس خریدے شیو بنانے کا سامان، صابن ضروریات زندگی کی دوسری تمام چیزیں، عمدہ قسم کے دو سوٹ کیس، یہ تمام چیزیں اس نے ہوٹل کے کمرے میں منتقل کیں اور کافی حد تک مطمئن ہو گیا، اب تمام تر صورتحال اس کے اپنے کنٹرول میں تھی، لیکن ان کمبخت راتوں کا کیا کرتا جو اسے زندگی کے خوف کا شکار کر دیتیں۔

اپنے خوابوں میں وہ اپنے آپ کو مرتے ہوئے دیکھتا، لیکن آنکھ کھل جاتی تو خود پر ہنستا اور کہتا کہ ڈاکٹر بکواس کرتے ہیں۔موت مجھے نہیں مار سکتی، میں نہیں مروں گا، کوئی تکلیف تو ہو میرے سر میں۔ برین ٹیومر ہے مگر تکلیف نہیں ہے واہ، ڈاکٹر صاحب اپنا شوق پورا کر لیں گے، کھوپڑی کھول دیں گے بعد میں کہیں گے کہ نہیں جی انہیں غلط فہمی ہوئی تھی، ایسا ہی ہو رہا ہے، ہزاروں خبریں اخبارات میں چھپتی رہتی تھیں، لیکن تمام کام منصوبے کے مطابق ہی ہونا تھا۔

اس نے ہر چیز مکمل کر لی، ویسے بھی دن میں آوارہ گردی ہی کرتا رہتا تھا۔ بھائیوں کی طرف سے آزادی تھی، البتہ بس یہ ہوتا تھا کہ وہ گھر میں ہوتا تو ہر فرد کو خاموش پاتا یا اگر اور ہوا زیادہ سے زیادہ تو بہنیں اس کی ہر چیز کا خیال رکھتیں۔اس کے جوتے، کپڑوں کی استری، کھانے پینے میں بھی وہ تمام چیزیں پکائی جاتیں جو اسے پسند تھیں اور یہی ماحول اس پر جنون سوار کر دیتا تھا، میں زندہ ہوں زندہ رہوں گا بلاوجہ یہ لوگ میرا سوگ منا رہے ہیں۔اب اس نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ شہباز بھائی کے حکم کے مطابق اسے چھ تاریخ کو ہسپتال میں داخل ہو جانا تھا۔

چھ تاریخ کو اسے گھر سے اس طرح رخصت کیا گیا، جیسے کسی کا جنازہ رخصت کیا جاتا ہے، بے شک لوگ رو پیٹ نہیں رہے تھے، لیکن ان کے چہرے ہلدی کی طرح زرد تھے اور آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں، وہ دانت نکوستا ہوا شہریار اور شہباز بھائی کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کر دی گئی تھیں، بہنوں نے امام ضامن باندھے تھے اور اس کے بعد وہ اس عالیشان ہسپتال کے اس عالیشان کمرے میں داخل ہو گیا تھا، ڈاکٹر سلیمان شاہ کا کیس تھا اور ڈاکٹر کرنل سلیمان شاہ بہت بڑی حیثیت رکھتا تھا، ہسپتال کے کمرے میں اسے دو خوبصورت نرسوں نے اٹینڈ کیا تو اس کا موڈ کچھ تبدیل ہوا۔

”سوری گرلز، اگر میں آپ کو سسٹر نہ کہوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔“

”ہوگا تو سہی، لیکن بہتر ہے آپ ہمیں سسٹر ہی کہیں۔“

”معافی چاہتا ہوں، اگر آپ اس بات پر مصر ہیں تو اپنا تبادلہ کسی اور کمرے میں کرا لیجئے۔“

نرسیں ہنس پڑی تھیں۔اس نے بھی بس ایک تفریحی عمل کیا تھا۔ سات تاریخ کو صبح دس بجے اسے ڈاکٹر کرنل شاہ کے سامنے پیش کیا گیا، ڈاکٹر کرنل شاہ کے ساتھ اس کے دو معاون ڈاکٹر بھی تھے جو بڑے باادب نظر آ رہے تھے۔

”یہ فارم فل کر دیجئے شاہ زیب صاحب۔“

اس نے فارم پڑھا، فارم پڑھ ہی رہا تھا کہ شہباز بھائی اور شہریار پہنچ گئے، کرنل شاہ نے گھڑی میں ٹائم دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

”بہت شکریہ آپ لوگ وقت پر آ گئے۔“

”جی کرنل صاحب۔“

''آج ان کے تین ٹیسٹ ہوں گے اور اس کے بعد ہم باقی معاملات سے آپ کو آگاہ کر دیں گے۔'' کرنل شاہ کے ایک معاون ڈاکٹر نے کہا، پھر شاہ زیب کی طرف کر کے بولا۔

''آپ براہ کرم اپنے ہاتھ سے یہ فارم فل کیجئے شاہ زیب صاحب۔''

''ایک منٹ....میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں کرنل شاہ۔'' شاہ زیب بولا اور کرنل شاہ نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا، بڑی پر رعب شخصیت تھی اس کی، ویسے بھی خاصا بد دماغ آدمی معلوم ہوتا تھا، اس نے منہ سے کچھ نہ کہا، سوالیہ نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھنے لگا۔

''آپ کے خیال میں مجھے برین ٹیومر ہے؟''

''میرے خیال میں نہیں بلکہ میری تحقیق کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی ہے، کیوں، آپ کو اچانک اس پر شک کیسے ہوا؟''

''شک نہیں، ایک چیز ہوتی ہے، اپنی محاسبت، اگر میں اپنا جائزہ لیتا ہوں اندر باہر سے اور اپنے دماغ سے تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے، ڈاکٹر صاحب اگر میں آپ کی مشینوں کو دھوکہ دے دوں تو کیسا رہے گا؟''

''مسٹر شاہ زیب آپ یہ فارم فل کر دیجئے۔''

''نہیں میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، آپ مجھ سے بات کیجئے اور اگر چاہیں تو اپنی فیس ڈبل لے لیجئے۔''

''شاید آپ بدتمیزی کر رہے ہیں۔'' کرنل شاہ نے کہا۔ شہباز بھائی کے انداز میں اضطراب پیدا ہو گیا، انہوں نے کہا

''شہباز بیٹے، ڈاکٹر صاحب بڑی محترم شخصیت ہیں۔''

''بالکل ہیں..میں مانتا ہوں، لیکن صرف ایک گنجائش کی بات ہے، میں ان کی تحویل میں آ چکا ہوں، میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر مجھے برین ٹیومر نہ ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے آپریشن کر دیا اس کے بعد معذرت کی کہ انہیں غلط فہمی ہوئی تھی تو آپ یہ بتائیے کہ یہ لمحے جو مجھ پر گزریں گے ان کا حساب کون دے گا؟''

''میں چیلنج سے یہ بات کہتا ہوں کہ تمہیں برین ٹیومر ہے اور میں نے تمہارے بھائیوں کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ آپریشن کی کامیابی کی صرف پانچ فیصد امید کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی اگر آپریشن کامیاب ہوا تو تمہاری عمر ایک یا دو سال سے زیادہ نہیں ہوگی اور اگر آپریشن نہیں کیا گیا تو پھر چھ مہینے کے اندر اندر تم کسی بھی وقت موت سے ہمکنار ہو جاؤ گے۔''

''معاف کیجئے ڈاکٹر صاحب آپ خدا کی آواز میں بول رہے ہیں جبکہ آپ خدا نہیں ہیں۔'' شاہ زیب کے ان الفاظ پر ڈاکٹر کا پارہ چڑھ گیا۔

''میں ڈاکٹر ہوں، پوری زندگی کا تجربہ ہے مجھے، میں چیلنج کر کے کہتا ہوں کہ جو الفاظ میں نے کہے ہیں وہ لفظ بہ لفظ درست ہیں۔''

''یعنی میں چھ مہینے میں مر جاؤں گا۔''

''ہاں، چھ مہینے آخری وقت ہے، اس سے پہلے کسی بھی وقت کسی بھی دن۔''

''ایک بات اپنی گرہ میں باندھ لیجئے ڈاکٹر صاحب، میں نہیں مروں گا، میں زندہ رہوں گا، آپ میرا آپریشن کریں یا نہ کریں چھ مہینے کے بعد بغیر آپریشن کئے میں آپ سے مل کر آپ کو بتاؤں گا کہ میں زندہ ہوں ڈاکٹر صاحب، بھائی شہباز آپ صرف دو سال کی زندگی دینا چاہتے ہیں مجھے، یعنی اگر ڈاکٹر صاحب اس آپریشن میں کامیاب ہو گئے تب میں دو سال زندہ رہوں گا، میں تو یہ زندگی قبول نہیں کرتا، جب موت آنی ہی ہے تو چھ مہینے میں آ جائے یا دو سال میں آ جائے۔''

''ایسی باتیں نہ کرو بیٹے۔'' شہباز بھائی نے سسکی لے کر کہا، ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ لیکن کرنل صاحب کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

''میں تمہیں لکھ کر دے سکتا ہوں کہ چھ مہینے سے زیادہ تمہاری زندگی ممکن نہیں ہوگی۔''

''لکھ کر دیجئے ڈاکٹر صاحب اور اپنی شرمندگی کا مزہ چکھئے۔''

''میں لکھ کر دیتا ہوں تمہیں.....اور مسٹر شہباز! اس بیوقوف آدمی کا آپریشن میں نہیں کروں گا۔''

''ارے نہیں نہیں کرنل صاحب آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟''

''اسے روکو.....میں لکھ کر دیتا ہوں تمہیں۔''

کرنل شاہ بھی کھسکا ہوا ہی آدمی تھا، باقاعدہ اس نے اپنے لیٹر پیڈ پر لکھ کر اپنی تحریر شاہ زیب کی طرف بڑھا دی جس میں اس نے یہی کہا تھا کہ آپریشن کے بعد اس کی زندگی دو سال اور آپریشن کے بغیر وہ چھ مہینے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ شاہ زیب نے وہ کاغذ پڑھا اور تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ شہریار اور شہباز بہت بے چین نظر آ رہے تھے۔

''شاہ زیب میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب سے سوری کہو اور یہ تحریر انہیں واپس کر دو۔''

''نہیں بھائی صاحب، میں نے آپ کا ہر حکم مانا ہے، بس براہ کرم یہ تحریر میرے پاس رہنے دیجئے، ڈاکٹر صاحب سے سوری کر لیتا ہوں میں، اگر میرے الفاظ انہیں ناگوار گزرے ہیں، لیکن ایک بات میں کہے دیتا ہوں، مجھے برین ٹیومر نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو میں مروں گا نہیں۔ میں دو سال نہیں، میں سینکڑوں سال زندہ رہوں گا، پچاس سال، ساٹھ سال، ستر سال ہو سکتا ہے اس سے بھی زیادہ۔''

کرنل سلیمان شاہ خاموشی سے شاہ زیب کو دیکھ رہے تھے، شاہ زیب نے کہا۔

''اجازت ہو تو اٹھ جاؤں۔''

''یہ فارم نہیں بھرو گے۔''

''ہاں ہاں بھرے دیتا ہوں، بھرے دیتا ہوں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' شاہ زیب نے کہا اور فارم فل کرنے لگا پھر اس نے مسکراتے ہوئے فارم ڈاکٹر شاہ کی طرف بڑھا دیا جسے اس کے ایک معاون ڈاکٹر نے لے لیا، شاہ زیب نے ایک ڈاکٹر کی آنکھوں میں تحسین کے جذبات دیکھے تھے جبکہ دوسرا جو کرنل شاہ کا کوئی خاص ہی پٹھو تھا ناگواری کے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ شہباز بھائی نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب اب ان کی موجودگی ضروری ہے۔؟''

''نہیں یہ جا سکتے ہیں۔'' کرنل شاہ نے بھاری لہجے میں کہا اور شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب چل پڑا، ایک نرس اس کے ساتھ تھی، شہباز نے کرنل شاہ کو دیکھا اور بولا۔

''اصل میں ڈاکٹر کرنل شاہ صاحب وہ کس قدر نوجوان لڑکا ہے، صحت مند، تندرست اور سرخ و سفید، تقدیر نے اس کے ساتھ یہ دلدوز کھیل کھیلا ہے، تقدیر پر کون اجارہ داری رکھ سکتا ہے۔ وہ اپنی عمر کے حساب سے بول رہا ہے، آپ براہ کرم اس کا غصہ نہ منائیے، آپ خود کہتے ہیں کہ اس کی زندگی طویل نہیں ہے۔'' شہباز رونے لگا، شہریار بھی اس کے ساتھ آنسو بہا رہا تھا۔

''ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں، وہ اپنے جنون کے عالم میں بول رہا ہے، چلیں خیر ٹھیک ہے کوئی بات نہیں ہے، میری دعائیں بھی اس کے ساتھ ہیں۔ واقعی نوجوان بچہ ہے، موت آسانی سے تسلیم نہیں کی جاتی لیکن تقدیر کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔'' کرنل شاہ نے کہا۔ کرنل سلیمان شاہ کسی قدر نارمل ہو گیا تھا۔ کافی دیر تک شہریار اور شہباز اسے سمجھاتے رہے اور اس کے بعد اجازت لے کر اٹھ گئے کیونکہ کرنل شاہ سے ایک گھنٹے کا وقت لیا گیا تھا اور یہ گھنٹہ پورا ہونے والا تھا۔ پھر اس کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہو کر شاہ زیب کے کمرے میں پہنچے شاہ زیب آرام سے سیب کے ٹکڑے کھا رہا تھا، اس نے انہیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویسے معاف کیجئے گا بھائی صاحب، ہسپتال کی زندگی اپنی ہی ہوتی ہے، میں تو کہتا ہوں کہ بندے کو سال میں ایک آدھ بار ایک آدھ مہینے کے لئے ہسپتال آنا چاہیئے، یہاں بڑا سکون ملتا ہے اور تھوڑا سا ماحول بھی بدل جاتا ہے۔''

''کرنل شاہ کے پاس سے آ رہے ہیں ہم، تمہاری رپورٹوں میں تھوڑی سی تبدیلی رونما ہوئی ہے اور کرنل کا خیال ہے کہ اگر تمہارا مناسب آپریشن ہو جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ ٹیومر نکل جائے گا اور وہ جگہ ہیل اپ ہو جائے گی اور شاید دوبارہ

ٹیومر کے امکانات نہ رہیں، لیکن ڈاکٹر شاہ نے کہا ہے کہ تمہارا مکمل تعاون ضروری ہے، اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس آپریشن کے لئے آمادہ کرلو بیٹے تاکہ ہم سب معمول کے مطابق ایک خوبصورت زندگی گزاریں، تم ہماری آنکھوں کا نور ہو، تم صحت مند ہوگے تب یہ پورا گھرانہ صحت مند رہے گا۔''

''اب تو میں نے آپ کی بات مان لی ہے بھائی جان۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا، کافی دیر وہ لوگ بیٹھے ہوئے اس سے باتیں کرتے رہے اور اس کے دل میں پیار جگاتے رہے۔ جب وہ چلے گئے تو شاہ زیب نے سوچا کہ واقعی اس کے بھائی ہیرے ہیں، پورا گھر ہی اس سے پیار کرتا ہے، لیکن میں کیا کروں میری بدنصیبی ہے کہ میں ان لوگوں کو اپنی زندگی کا زیادہ وقت نہیں دے سکا، مجھے معاف کردینا مجھ سے محبت کرنے والو، شاید میں تمہاری محبت کے قابل ہی نہیں تھا۔

منصوبہ ذہن میں مکمل تھا، نرس سے اس نے کاغذ اور قلم منگوایا اور اس کے بعد ایک تحریر لکھنے لگا اس نے لکھا۔

''پیاری دادی اماں اور میرے پیارے بھائیو!

خلوص دل سے اعتراف کررہا ہوں کہ اب تک کی زندگی میں تم لوگوں نے مجھے جو مقام دیا ہے عام لوگ اتنے خوش نصیب نہیں ہوتے، مگر دیکھیں وہ جو کہا جاتا ہے نا کہ بہت زیادہ میٹھا ڈالا جائے تو اس سے بھی نقصانات ہوجاتے ہیں، شاید میری تقدیر آپ کی محبتوں کو نہ سنبھال سکی اور بیٹھے بٹھائے مجھے یہ مشکل پیش آگئی، میں اب بھی تسلیم نہیں کرتا کہ مجھے برین ٹیومر ہے یا میری زندگی چھ ماہ یا دو سال ہے۔ پورے وثوق سے آپ لوگوں کو یقین دلا رہا ہوں کہ میں زندہ رہوں گا اور جب یہ سال گزر جائیں گے تو آپ کے پاس آؤں گا اور ڈاکٹروں کی رپورٹ غلط ثابت کردوں گا۔

ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے میری پیاری دادی اماں اور میرے پیارے بھائی شہباز، شہریار اور میری پیاری بھابھیوں، جان سے پیاری بہنوں کہ مجھے آپ سب کی دعاؤں کی ضرورت پیش آئے گی، میں یہ نہیں کہتا کہ میں تیس مار خاں ہوں اور میرے دل پر ڈاکٹروں کی پیشگوئی کا خوف نہیں ہے ذہن پر ایک مٹا مٹا سا احساس یقیناً ہے کہ شاید ڈاکٹر ہی ٹھیک کہہ رہے ہوں اور میری زندگی کا چراغ ان لمحات میں بجھ جائے، لیکن اپنے آپ سے لڑوں گا۔ موت سے پنجہ کشی کروں گا، اس لڑائی میں مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت درپیش ہے۔

جارہا ہوں، اتنی ذہانت رکھتا ہوں کہ آپ لوگ مجھے آسانی سے تلاش نہ کرسکیں، بس انتظار کریں، میں آپ سے کوئی رابطہ نہیں رکھوں گا کیونکہ اس طرح میرے دل میں آپ کی محبت کی تڑپ پیدا ہوگی، لیکن اطمینان رکھئے اگر زندگی نے وفا کی تو واپس آپ کے پاس ہی آؤں گا، میرا وعدہ ہے

آپ کا پیارا

شاہ زیب''

یہ خط لکھ کر اس نے احتیاط سے تہہ کیا اور اس کے بعد خیالات میں گم ہوگیا، ہسپتال کے معمولات جاری تھے، وہ پرسکون تھا اور اس کا پروگرام اپنی جگہ تھا، شام کو تقریباً ساڑھے سات بجے جب فضا میں تاریکیاں اتر آئی تھیں اس نے ہسپتال کے کمرے کی پچھلی کھڑکی سے پیچھے کا ماحول دیکھا اس کا جائزہ وہ پہلے ہی لے چکا تھا، بہت خوبصورت جدید طرز کی کھڑکی تھی جس میں سلاخیں وغیرہ نہیں لگی ہوئی تھیں، بلکہ سلائیڈنگ شیشے لگے ہوئے تھے اور انہیں کھول کر باآسانی پچھلی راہداری میں اترا جاسکتا تھا، چنانچہ اس نے سب سے پہلے باہر کے دروازے کی چٹخنی لگائی اور اس کے بعد اپنی تیاریوں

کے ساتھ پچھلی کھڑکی سے نیچے اتر گیا۔

تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد یہ راہداری داہنی سمت گھوم جاتی تھی اور وہاں سے تقریباً چھ فٹ اونچی دیوار کے بعد لان پر اترا جا سکتا تھا، اس چھ فٹ اونچی دیوار پر چڑھنا اور دوسری طرف کودنا مشکل کام نہیں تھا، چنانچہ کچھ لمحوں کے بعد وہ ہسپتال کے لان پر تھا اور پھر لان سے آگے بڑھ کر ہسپتال کے گیٹ سے باہر جانا کوئی مشکل کام ثابت نہ ہوا، پیسوں کا بندوبست اس نے کر رکھا تھا، چنانچہ ایک ٹیکسی اسے لے کر چل پڑی۔ البتہ اس نے ذہانت سے کام لیا تھا۔ ایک سینما ہاؤس کے سامنے وہ ٹیکسی سے اترا بل ادا کیا تھوڑی دیر تک ادھر ادھر گھومتا رہا اس کے بعد ایک آٹو رکشہ میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل چل پڑا۔

ہوٹل کے پاس اتر کر وہ آگے بڑھا اور خاموشی سے کاؤنٹر پر پہنچ کر اس نے اپنے کمرے کی چابی طلب کی، البتہ کاؤنٹر کلرک نے اسے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا، وہ ابھی ہسپتال کے لباس میں نہیں تھا، لیکن پھر بھی اس کا لباس ایسا نہیں تھا جس میں انسان باہر نکل سکے۔ تاہم کاؤنٹر کلرک کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اس بات پر زیادہ توجہ دیتا، چنانچہ وہ اپنے کمرے میں پہنچ گیا، اب تک اس نے نہایت ذہانت سے کام لیا تھا، لیکن اب بھی کچھ مرحلے ایسے تھے جنہیں طے کرنا ضروری تھا۔

اس نے چیلنج کیا تھا کہ وہ اتنا بیوقوف نہیں ہے کہ اسے آسانی سے پکڑا جا سکے، چنانچہ اسے اور بھی بہت سی باتیں سوچنا تھیں، لیکن اس کی ضرورت نہیں پیش آئی، کونسا زیادہ وقت گزارنا تھا، رات گزر گئی اور دوسرے دن وہ شام تک حالات کا منتظر رہا، پھر ٹھیک ساڑھے سات بجے اپنی جگہ سے نکلا مطمئن انداز میں ہوٹل کے کاؤنٹر پر آ کر بل وغیرہ پے کیا اور باہر نکل آیا۔ اب اس کے بعد حماقتوں میں گزارہ نہیں کرنا تھا۔ چنانچہ ایک ٹیکسی کر کے ریلوے اسٹیشن پہنچا ٹرینوں کا شیڈول معلوم کیا ایک ٹرین صرف چند منٹ کے بعد روانگی کے لئے تیار تھی، اس نے یہ معلوم کیا کہ یہ ٹرین کہاں سے کہاں تک جاتی ہے اور ٹرین کی آخری منزل تک کا ٹکٹ خریدا تا کہ کوئی پریشانی نہ ہو اور اس کے بعد ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں جا بیٹھا۔

اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات گردش کر رہے تھے، اپنے اہل خاندان سے اسے بہت پیار تھا، خصوصاً دادی اماں نے تو اسے بالکل ماں کا پیار دیا تھا، بھابھیاں بھی بہت ہی مہربان اور بڑی بہنوں کی مانند تھیں، بھائی بھی جان چھڑکتے تھے، بہنیں بہت پیار کرتی تھیں، لیکن یہ ساری باتیں اپنی جگہ اس چھوٹی سی بیماری نے اس کے اندر جو شدت پیدا کر دی تھی اور پھر اس کے لئے بھائی جس طرح مضطرب تھے اس سے اسے ایک کد سی ہو گئی تھی۔ وہ آپریشن نہیں کرانا چاہتا تھا، کوئی عقل کی بات بھی ہو، زندگی اگر چھ ماہ کے بعد ختم ہونی ہے تو اسے ڈیڑھ سال کے لئے کیوں بڑھایا جائے۔ ایک کام ایک ہی وقت میں مناسب ہوتا ہے اور پھر یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔

صبح سے شام تک اخبارات مختلف حادثات کی خبروں سے بھرے پڑے ہوتے ہیں، بڑے بڑے تندرست و توانا لمحوں میں زندگی کی بازی ہار دیتے ہیں۔ دہشت گردی اور دوسرے ایسے واقعات پتہ نہیں کس کس کو دنیا سے چھین چکے ہیں۔ میں کوئی ایسی ہی آسمانی چیز نہیں ہوں کہ میری زندگی دنیا کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہو، جانا ہے تو جانا تو پڑے گا، اور اگر قدرت کچھ وقت دینا چاہتی ہے تو پھر بھلا کون اس وقت کو ٹال سکتا ہے، میں ہی اپنی جگہ درست ہوں۔ دنیا کا لطف لے لیا جائے، وہ انہی سوچوں میں گم رہا اور پھر اچانک ہی اسے دادی اماں کے ٹوٹکے یاد آ گئے۔ ایسا ہو تو ایسا کر لو، ایسا ہو تو ویسا کر لو، ساتھ ہی ایک بات اور بھی یاد آ گئی، دادی اماں نے کہا تھا کہ اس دنیا میں ہر انسان کے سات ہمشکل ہوتے ہیں، کسی بہت بڑے مفکر کا قول تھا کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہی ہمارے ذہن تک پہنچ سکتا ہے کیونکہ ذہن کائنات کا عکس ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس ذہن میں سب کچھ بھر دیا ہے، کلام پاک کی ایک آیت کا ترجمہ یہی ہے جس میں رب کائنات فرماتا ہے کہ "اور میں نے یہ کائنات تمہارے لئے مسخر کر دی تمہاری جدوجہد ہے کہ جہاں تک علم حاصل کر سکتے ہو کر و اور اس کائنات کے کسی بھی پہلو کو اپنی گرفت میں لے لو، یا پھر یہ خیال کہ اگر تمہارے ذہن میں کوئی تصور یا کوئی خیال آتا ہے تو اس کا مقصد ہے کہ وہ تصور اور وہ خیال کائنات میں موجود ہے۔

ایچ جی ویلز نے فرسٹ مین ان دا مون لکھی تو دنیا نے اس کا مذاق اڑایا کہ لیجئے جناب اس نے چاند پر بھی آدمی کو پہنچا دیا اور چاند پر آدمی پہنچ گیا، نیل آرم اسٹرانگ وہ شخص تھا جس نے ایچ جی ویلز کے خیال کو پورا کر دکھایا، یا پھر قدیم الف لیلیٰ میں جادوگر نے جادو کا گولہ مارا اور شہر تباہ ہو گیا۔ سائنسی جادوگروں نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر وہی جادو کے گولے استعمال کیے اور دو شہر تباہ ہو گئے، لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتر گئے۔ یا پھر سامری نے اپنے سامنے رکھے ہوئے شیشے کے گلوب میں منتر پڑھ کر کہا کہ بن حبو بن حبو شہزادی گلنار سامنے آئے اور شہزادی گلنار کا حسین عکس جادو کے گولے نمایاں ہو گیا، وہ جادو کا گولہ ٹیلی ویژن کی شکل میں ذرا چوکور ہو کر آج دنیا کے ہر گھر میں ہر فرد کے سامنے ہے۔

تو مقصد یہی کہ رب کائنات نے یہ کائنات انسان کے لئے تخلیق کی ہے اور اسے انسان کو بخش دیا ہے ہاں ذرا سی جستجو ضروری ہے، سو اگر ڈاکٹر سلیمان شاہ کہتا ہے کہ میری زندگی صرف دو سال یا چھ مہینے ہے تو میں اس چیز کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ میرا دماغ اسے نہیں مانتا۔ اگر یہ حقیقت ہوتی تو میرا دماغ اسے تسلیم کرنے کے لئے بیٹھ جاتا، نہیں میں نہیں مروں گا مجھے یقین ہے کہ جس طرح ڈاکٹر نے کہا ہے اس طرح میری موت نہیں آئے گی، ہاں اس کا کوئی اور ذریعہ ہے تو بے شک دنیا کا کوئی ڈاکٹر کوئی کرنل سلیمان شاہ مجھے ایک لمحے کی زندگی نہیں دے سکتا۔

بہر حال یہی ساری سوچیں تھیں شاہ زیب نے سوچا کہ دادی اماں کے کہنے کے مطابق کیوں نہ میں اپنے ہمشکلوں کو تلاش کروں، میرے چھ ہمشکل، کیا واقعی اس دنیا میں ان کا وجود ہے۔ چلو ایک دلچسپ مشغلہ ہی ہاتھ آئے گا، جیسی بھی ہو گی زندگی بسر کروں گا، کافی رقم موجود ہے، میں تنہا کائنات کے چپے چپے میں گھوم کر اپنے ہمشکل تلاش کروں گا اور ایک بہترین مشغلہ ہاتھ آ جانے کے بعد دل کو جو طمانیت حاصل ہوتی ہے وہ شاہ زیب کو حاصل ہو گئی تھی۔ ٹرین چل پڑی تھی اور اس کے بعد شاہ زیب نے اپنے ہمسفر مسافروں کو دیکھا۔ زیادہ نہیں تھے لیکن جتنے تھے سب اپنی اپنی دھن میں مست کوئی کسی کی جانب متوجہ نہیں تھا، رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھی، ٹرین کے لوازمات جاری تھے، میں خاموش بیٹھا ہوا باہر دوڑتے ہوئے مناظر کو دیکھ رہا تھا، شیشے کے دوسری طرف ایک عجیب و غریب ماحول تھا، کبھی کبھی کسی گاؤں دیہات یا شہر کی روشنیاں سامنے آتیں اور دوڑتی ہی چلی جاتیں۔

وقت گزرتا رہا، نجانے کب نیند کی جھونک آ گئی اور دنیا نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، نیند بھی کیا لطیف شئے ہے، انسان کوئی بھی ہو، کتنی ہی مشکلات کا شکار ہو، وہ ان مشکلات کو اپنے اندر سمو کر اسے سکون دیتی ہے یہ سکون اس وقت تک طاری رہا، جب تک کچھ آوازیں کانوں میں نہ پڑیں، ٹرین کی مخصوص آواز، ٹرین رک گئی تھی اور باہر سے طرح طرح کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گرم انڈے، چائے بھاجی ترکاری، یہ صدائیں آ رہی تھیں، کوئی اسٹیشن تھا، باہر سے روشنیاں چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں اور لوگ ٹرین سے اتر اتر کر جا رہے تھے۔

عجیب سا سماں تھا، عجیب سا ماحول تھا، شاہ زیب بھی اپنی جگہہ سے اٹھ گیا، جب یہ زندگی اپنائی ہے تو اس کے لوازمات سے بھی دلچسپی لینا چاہیئے۔ شیشے کے ایک گلاس میں اس نے چائے طلب کی اور اس کے گرم گرم گھونٹ لینے لگا، اس مزے کا کوئی جواب ہی نہیں تھا، دو گلاس چائے پی اب چائے جیسی بھی تھی، لیکن اس وقت اس میں جو مزہ آ رہا تھا وہ ناقابل بیان ہے، ٹرین یہاں تقریباً پندرہ منٹ رکی اور اس کے بعد پہلی وہسل ہوئی تو شاہ زیب اپنی سیٹ پر آرام سے آ بیٹھا اور دوسری وہسل کا انتظار کرنے لگا، ٹرین آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی، پھر وہ رفتار پکڑنے لگی۔

اسٹیشن کی روشنیاں، اشیاء بیچنے والوں کی آوازیں پیچھے رہتی جا رہی تھیں اور تھوڑی دیر کے بعد یہ آوازیں معدوم ہو گئیں۔ باہر اندھیرا پھیل گیا، ٹرین کی وہی آواز پھر سے سنائی دینے لگی۔ وہ تیز رفتاری سے پٹریاں بدلتی ہوئی آگے جا رہی تھی، شاہ زیب سوچ رہا تھا کہ کیا دلچسپ سماں ہے، کیا انوکھا منظر ہے۔ وہ بہت دیر تک جاگتا رہا، سب لوگ پھر آنکھیں بند کر کے سو گئے تھے، کچھ سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ برتھوں پر لیٹ گئے تھے۔ شاہ زیب نے بھی برتھ کے بجائے اپنی سیٹ پر ہی بیٹھے رہنا مناسب سمجھا اور اسی عالم میں ایک بار پھر میں نیند کی گہری آغوش میں پہنچ گیا۔

دوسری بار جب آنکھ کھلی تو باہر اجالا پھیل رہا تھا۔ اس قدر حسین منظر تھا کہ بس ناقابلِ بیان ہے، وہ قدرت کے

تحائف تھے جو اس نے انسان کو دیئے تھے، کوئی انسان اتنا حسین منظر تخلیق نہیں کر سکتا تھا، چاہے وہ کتنا ہی بڑا مصور ہو۔ شاہ زیب مصورِ کائنات کے اس حسین منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا ٹرین آہستہ آہستہ سست ہوئی اور پھر جہاں جا کر رکی وہ جگہہ ناقابلِ یقین حسن کی مالک تھی۔ اجالے کی حدوں میں ہلکی سی دھند میں ڈوبی ہوئی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں اور ان کے دامن میں گھر بکھرے ہوئے تھے۔ کیا حسین جگہہ ہے، کتنی خوبصورت اور اچانک ہی شاہ زیب کے ذہن میں ایک خیال سرائیت کر گیا۔ کیوں نہ اس جگہہ اترا جائے کوئی منزل تو ہے نہیں۔ اس جگہہ کے حسن سے کچھ عرصے لطف اندوز ہوا جائے، دیکھوں گا کہ مجھے کیا مقام ملتا ہے۔ اس کے بعد جب بھی یہاں سے دل اکتایا آگے بڑھ جاؤں گا کوئی نہ کوئی جگہہ تو رہنے کے لئے ہوگی ہی، چنانچہ اس نے جلدی سے اپنا سوٹ کیس اٹھایا وہ باسکٹ ساتھ لی جسے ہوٹل سے لے کر آیا تھا اور اس کے بعد اتر گیا، شاہ زیب کے اترتے ہی ٹرین آگے بڑھ گئی تھی، یہاں شاہ زیب کے سوا کوئی اور مسافر نہیں اترا تھا۔

شاہ زیب نے ادھر ادھر دیکھا، بڑی خوبصورت خنکی چھائی ہوئی تھی، فضا میں ہلکی ہلکی دھند اتری ہوئی تھی، کوئی ہل اسٹیشن تھا، پہاڑی گاؤں، ایسے مناظر کے بارے میں اب تک شاہ زیب نے صرف سنا تھا یا کبھی فلموں یا ٹیلی ویژن کے ڈراموں وغیرہ میں دیکھ لیا تھا، اس کے پاؤں ایسی کسی زمین پر ٹکے ہوئے ہیں، یہ خیال اس کے لئے بڑا دل خوش کن تھا بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ دل میں مسرت کی ایک لہر اٹھی تھی اور شاہ زیب ٹرین کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا، جب ٹرین نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو شاہ زیب نے کسی انسان کو ادھر ادھر تلاش کیا لیکن وقت ایسا تھا کہ ابھی تک لوگ جاگے نہیں تھے۔ وہ آگے بڑھا اسٹیشن سے باہر نکلنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی، خاموش ماحول تھا۔

وہ تھوڑا سا آگے بڑھا تو ایک تانگہ نظر آیا، اکلوتا تانگہ تھا، تانگے والا تانگے کی اگلی سیٹ پر ایک چادر اوڑھے بیٹھا اونگھ رہا تھا، قدموں کی آہٹ نے بھی اسے نہ جگایا، لیکن شاہ زیب آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا، اور اسے آواز دی۔

''بھئی تانگے والے۔'' وہ اس طرح چونک پڑا جیسے اس نے خواب میں کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو اور پھر وہ اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شاہ زیب کو دیکھنے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ یہ انسان تو ہو ہی نہیں سکتا، بھلا اس گاؤں میں کوئی ایسا انسان کیسے نظر آ سکتا ہے جو ٹرین سے اترا ہو، لیکن چند لمحوں کے بعد اسے یقین آ گیا تو وہ ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''بابو جی، بابو جی، بابو جی۔''

''ہاں ہاں اطمینان سے سنبھل جاؤ میں اسی ٹرین سے نیچے اترا ہوں۔'' شاہ زیب نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''جی بابو جی، بڑی مہربانی کہاں جائیں گے؟''

''یار بس ایسے ہی آوارہ گرد ہوں تمہارے گاؤں میں اتر گیا ہوں۔ اب تم جہاں بھی لے جاؤ، تھوڑے دن یہاں رکنا چاہتا ہوں۔'' تانگے والا شاہ زیب کے الفاظ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر بولا۔

''کچی سرائے لے چلیں صاحب جی، وہی ایک جگہہ ایسی ہے جہاں سے باہر سے آنے والا کوئی مسافر ٹھہر سکتا ہے۔ چاند خاں بڑا اچھا آدمی ہے، وہ آپ کے ہر آرام کا خیال رکھے گا۔''

''ٹھیک ہے کچی سرائے لے چلو۔'' شاہ زیب نے اس سے کہا اور تانگے میں جا بیٹھا، تانگے والے نے گھوڑے کو چمکارا پھر اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور تانگہ آگے چل پڑا، شاہ زیب کو ایک عجیب سی پر کیف کیفیت کا احساس ہو رہا تھا، وہ قرب و جوار کے مناظر دیکھتا جا رہا تھا۔ جو آہستہ آہستہ روشن ہونے لگے تھے، انسان بھی نظر آ رہے تھے جو اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے جاگ گئے تھے، اطراف میں کھیت اور باغات بکھرے ہوئے تھے۔ ان پہاڑیوں کو تو وہ یہاں سے بھی دیکھ سکتا تھا جو ابھی تک دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔ کیا حسین جگہہ ہے شاہ زیب نے سوچا اور پھر کچی سرائے اور چاند خاں کے بارے میں غور کرنے لگا۔ تانگہ چھوٹے بڑے کچے پکے مکانوں کے سامنے سے گزرتا ہوا آخر کار ایک جگہہ رک گیا۔

سچ مچ کچی مٹی سے بنا ہوا ایک بڑا سا گھر تھا، یہی شاید کچی سرائے تھی گھر خاموش سے اونگھ رہا تھا، تانگے والا خود نیچے

اترا اور بولا۔

’’میں ابھی آیا، چاند خاں سے بات کرلوں۔‘‘

چاند خاں ایک موٹے اور بھدے بدن کا آدمی تھا، وہ بھی تانگے والے کے ساتھ دوڑا آیا اور تانگے والے نے جلدی سے شاہ زیب کا سوٹ کیس اتار کر چاند خاں کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سوٹ کیس کے ساتھ چاند خاں نے باسکٹ بھی لے لی اور تانگے والا انتظار کرنے لگا، شاہ زیب نے جو نوٹ بھی ہاتھ آیا اٹھا کر اسے دے دیا۔ تانگے والا حیرت سے اس نوٹ کو دیکھنے لگا جو اس کی اوقات سے کافی زیادہ تھا اس نے ہچکچا کر شاہ زیب کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

’’نہیں رکھ لو یہ تمہارے لئے ہے۔‘‘

تانگے والے نے اسے کتنی دعائیں دیں شاہ زیب کو اندازہ نہیں ہو سکا کیونکہ وہ چاند خاں کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا، چاند خاں اسے ایک کمرے کے سامنے لے گیا، دروازہ کھولا اندر جا کر روشنی جلائی اور ایک پیلے سے مدہم بلب کی روشنی نے کمرے کا ماحول منور کر دیا۔ بانوں سے بنی ہوئی چارپائی تھی لیکن اس کے اوپر گدا اور چادر بچھی ہوئی تھی، تکیہ بھی رکھا ہوا تھا، پانی کا ایک مٹکا اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی موجود تھیں، چاند خاں نے کہا۔

’’جنگل پانی کے لئے پیچھے جانا پڑے گا۔ ہم نے ضرورت کی جگہہ بنا رکھی ہے، وہاں لوٹا بھی ہے پانی بھی ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔‘‘

’’اور منہ ہاتھ دھونے کے لئے جگہہ الگ ہے، آپ کو یہاں زیادہ آرام نہیں ملے گا بابو جی، لیکن ہم سے جتنا بھی بن پڑا ہم آپ کی خدمت کریں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے چاند خاں، اب اگر تم جاگ ہی گئے ہو تو مجھے اچھی سی چائے پلواؤ اور ہاں یہ بتاؤ ناشتے میں کیا دے سکتے ہو۔‘‘

’’سب کچھ موجود ہے بابو جی، انڈوں کا کچومر اور پراٹھے بنا دیں گے آپ کے لئے ڈبل روٹی والا تو دیر سے ہی آئے گا، ویسے ہمارے اس گاؤں میں ملتا سب کچھ ہے، بری اچھی جگہہ ہے اگر آپ نے پہلے نہیں دیکھی تو آپ کو یہ جگہہ پسند آئے گی۔‘‘

’’ارے ہاں ہاں کیوں نہیں، مگر تمہارے اس گاؤں کا نام کیا ہے؟

’’پہلے اس کا نام رام نگر تھا، پر پاکستان بننے کے بعد بڑے کا کانے اس کا نام بدل دیا اور اب یہ کا کانگری کہلاتا ہے۔‘‘

’’واہ.... بڑا اچھا نام ہے اس کا، اچھا چلو، اب تم میرے لئے چائے وغیرہ بنا لاؤ۔‘‘ شاہ زیب نے کہا یہاں کمرے میں منتقل ہو کر اسے بڑا سکون ملا تھا۔ ایک اجنبی ماحول تھا جو شاہ زیب کو کافی پسند آیا تھا، تھوڑی دیر کے بعد چاند خاں چائے لے آیا، حیرت انگیز طور پر اچھی چائے بنی ہوئی تھی، چائے کی دو پیالیاں پینے کے بعد شاہ زیب نے سو جانے کا فیصلہ کیا اور ٹرین کے سفر میں بہر طور آرام تو نہیں ملا تھا، چنانچہ وہ تھوڑی ہی دیر کے بعد گہری نیند سو گیا۔

جاگا تو سورج کی روشنی جگہہ جگہہ سے اندر آرہی تھی، ایک لمحے تک تو ماحول کا احساس نہیں ہوا، لیکن پھر اسے سب کچھ یاد آ گیا اور خوشی کی ایک لہر اس کے بدن میں سرائیت کر گئی، اپنی جگہہ سے اٹھا باہر نکلا، چاند خاں کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر وہ پچھلے حصے کے باتھ روموں میں پہنچ گیا سب کچھ صاف ستھرا تھا اور یہاں آرام سے وقت گزارا جا سکتا تھا اس کے بعد ذرا دیکھے گا کہ یہ کا کانگر کیسی جگہہ ہے۔

تمام ضروریات سے فارغ ہو کر کمرے میں پہنچا تو چاند خاں ناشتے کے ساتھ موجود تھا، لیکن اس کے علاوہ ایک اور شخصیت بھی چاند خاں کے ساتھ تھی بوٹے سے قد کی، جنگل کا پھول دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ آنکھوں میں گہرا گہرا کاجل لگا ہوا جوان خوبصورت آنکھوں کو اور بھی خوبصورت بنا رہا تھا۔ نقوش انتہائی دلکش لیکن پھوہڑ پن لئے ہوئے، یہ الگ بات ہے کہ اس پھوہڑ پن میں بھی ایک پرکاری نظر آرہی تھی۔ سر جھکائے گردن جھکائے خاموش کھڑی ہوئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''یہ کون ہے چاند خاں صاحب؟''
''بیٹی ہے ہماری، ماں مرچکی ہے اس کی۔ بڑی نٹ کھٹ ہے، یہ تمہارے سامنے جو شکل بنائے کھڑی ہوئی ہے نا اس کے لئے ہم نے اسے ڈانٹا ہے کہ خبردار بابو صاحب کو کبھی تنگ نہ کرنا۔ اب اللہ کرے یہ اپنی حرکتوں سے باز آجائے۔''
''باز تو آگئے ہیں۔'' وہ گردن جھکائے جھکائے بولی۔ انداز بڑا معصومانہ سا تھا، چاند خاں کہنے لگا
''یہ آپ کی خدمت کرے گی بابو صاحب۔ آپ کا نام کیا ہے؟''
''شاہ زیب ہے میرا نام۔''
''شاہ زیب۔'' چاند خاں کے بجائے لڑکی نے آہستہ سے کہا، یہ انداز بھی عجیب تھا، آنکھیں اور گردن جھکی ہوئی تھیں، لیکن منہ سے بڑے شرارت آمیز انداز میں یہ الفاظ نکلے تھے، شاہ زیب کو اندازہ ہوگیا کہ بالی سی عمر کے ساتھ شرارتی ایسی ہی ہے، لیکن اس نے بہت زیادہ دلچسپی نہیں لی تھی، چاند خاں کا لایا ہوا ناشتہ اس نے کیا اور ان دونوں کے بارے میں سوچنے لگا لڑکی چاند خاں کے ساتھ باہر جاچکی تھی۔ شاہ زیب کو اس کے انداز پر ہنسی آگئی، پھر برتن لینے کے لئے وہی آئی، اس بار بھی اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ اس نے برتن اٹھائے اور واپس جانے لگی تو شاہ زیب نے کہا۔
''سنو...''
وہ رک گئی۔ ''جی۔''
''تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔''
''کجری ہے ہمارا نام، کجری۔''
''ارے واہ، عجیب نام ہے۔''
''تو اور کیا، جب ہم پیدا ہوئے تھے نا تو بڑے کالے تھے، پتہ نہیں کس سسرے نے ہمارا نام کجری رکھ دیا اور جیسے جیسے ہم بڑے ہوتے گئے نا ہمارا رنگ صاف ہوتا چلا گیا، اب دیکھ لو ہم کالے تو نہیں ہیں۔'' اس نے فوراً ہی رخ تبدیل کیا، لیکن آنکھیں بدستور بند تھیں، شاہ زیب ہنس پڑا پھر بولا
''نہیں نہیں، تم تو بالکل کالی نہیں ہو، مجھے تو حیرانی ہورہی ہے کہ لوگ تمہیں کجری کیوں کہتے ہیں یا پہلے کبھی تم کالی تھیں، چلو اب تم ایک کام کرو کہ اپنا نام بدل لو۔''
''نہیں بابو جی، اب تو ساری سکھیاں اور سارے جاننے والے بھی ہمیں کجری ہی کہتے ہیں، مگر ہمیں یہ نام بھی برا نہیں لگتا۔''
''چلو پھر ٹھیک ہے، مگر تم نے آنکھیں کیوں بند کر رکھی ہیں۔''
''نہیں بابو جی، ہم آنکھیں نہیں کھولیں گے ہم نے ابھی تک تو آپ کی شکل بھی نہیں دیکھی۔''
''ارے کیوں؟''
''بس بتائیں گے بھی نہیں آپ کو۔'' اس نے کہا اور برتن سنبھالے ہوئے باہر نکل گئی، شاہ زیب نے ہنستے ہوئے سوچا کہ واہ مزے کا کردار ملا ہے، ابھی تو دیکھیں کہ اس کا نگر میں اور کون کون نظر آتا ہے، کچھ لمحوں کے لئے دادی اماں بھابھیاں وغیرہ یاد آئیں لیکن شاہ زیب نے خود کو سمجھاتے ہوئے کہا، جو فیصلہ کیا ہے اس پر قائم رہنے کے لئے ان سب کو بھولنا بہت ضروری ہے ورنہ حالات خراب ہوجائیں گے اور واپس جا کر بڑی شرمندگی اٹھانی پڑے گی، سب لوگ یہی کہیں گے کہ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ پھر گیارہ بجے کے قریب اس نے غسل کیا اور باہر نکل آیا، پھر لباس تبدیل کیا، کمرے سے باہر آیا تو چاند خاں اسی کی طرف آرہا تھا۔
''دوپہر کو کیا کھائیں گے بابو جی؟''
''یار چاند خاں جو تمہارا دل چاہے پکا لینا، دیکھ لینا... کیا چیز اچھی ہوتی ہے، میں ذرا باہر جاؤں گا، اگر کھانے کے وقت

تک واپس نہ آسکوں تو پرواہ مت کرنا، میرا کھانا رکھ دینا۔''

''اس کی تو پرواہ ہی نہیں بابو جی، کھانا جب بھی آپ کو ملے گا گرم ہی ملے گا، مطلب یہ کہ سبزی پکالوں یا گوشت وغیرہ۔''

''نہیں سبزی ٹھیک ہے۔'' شاہ زیب نے کہا اور سرائے سے باہر نکل آیا، ماحول واقعی انتہائی دلکش تھا، آسمان پر ہلکا ہلکا ابر چھایا ہوا تھا، سورج صبح کو تو نکلا تھا لیکن اس کے بعد بادلوں کی وجہ سے بادلوں میں روپوش ہو گیا تھا اور ماحول پر ایک ہلکی سی ٹھنڈک چھائی ہوئی تھی، شاہ زیب آگے بڑھا تو ایک بزرگ صورت آدمی اس کے قریب پہنچ گئے اور انہوں نے شاہ زیب کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔''

''چاند خاں نے بتایا تھا کہ شہر سے بابو جی آئے ہیں، یہ سامنے اس طرف بائیں طرف بچوں کا اسکول ہے، میں اس اسکول کا ماسٹر ہوں اور وہیں پڑھاتا ہوں۔''

''واہ... بڑی خوشی ہوئی ہے آپ سے مل کر کیا نام ہے آپ کا؟''

''تنظیم احمد خاں۔'' ماسٹر صاحب نے بتایا۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر تنظیم صاحب، میرا نام شاہ زیب ہے، بس شہری زندگی سے اکتا کر یہاں آیا ہوں، آپ لوگوں کا تعاون چاہتا ہوں۔''

''فکر نہ کریں شاہ زیب صاحب ہمارے لائق جو بھی خدمت ہو بے تکلفی سے فرما دیجئے گا ہم حاضر ہیں۔'' تنظیم صاحب کے لہجے میں بڑا خلوص تھا۔

''میں ذرا یہاں کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور کیجئے، آب و ہوا بہت اچھی ہے، وہ پس منظر میں آپ کو پہاڑیاں نظر آ رہی ہیں، یہ ہماری پہچان ہیں، ان کے دامن میں بہت سی کہانیاں چھپی ہوئی ہیں، لیکن موسم یہاں کا بہت خوبصورت ہے اور آب و ہوا بڑی دلکش آپ دیکھیں گے یہاں آپ کو ہر شخص تندرست ہی ملے گا۔''

''ہاں دیکھ رہا ہوں۔''

''بہت شکریہ، سامنے اسکول میں میری رہائش بھی ہے جب دل چاہے تشریف لے آئیے، آپ کے آنے سے مجھے خوشی ہوگی۔''

شاہ زیب کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا، زندگی شہر ہی میں گزری تھی کبھی کسی دیہات میں آنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ شہری زندگی میں ہی اس کے لئے بے شمار دلچسپیاں موجود تھیں۔ لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ گاؤں کی اپنی ایک فضاء واقعی وہ روایتی فضاء ہے جو فلموں اور ڈراموں وغیرہ میں دکھائی جاتی ہے اور جسے صرف فرضی کہانی سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ کہانیاں فرضی نہیں ہوتیں، وہ ادھر ادھر گھومتا رہا، جدھر سے بھی گزرتا لوگ کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگتے، یہ ان کی سادگی تھی، کھیتوں میں کام ہو رہا تھا اور محنت کش کسان اپنی اپنی ذمے داریاں پوری کر رہے تھے۔

دوپہر کو تقریباً ڈھائی بجے تک وہ گھومتا رہا اور اس کے بعد واپس آیا اور سرائے میں داخل ہو گیا، سب سے پہلے اس کا استقبال کجری نے کیا تھا، آنکھیں بدستور جھکی ہوئی تھیں، لیکن زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

''بابا جی تو سید پور گئے ہیں سامان لینے کے لئے ہم سے کہہ گئے ہیں کہ جب بھی بابو جی آئیں انہیں گرم کھانا دیں، ہم تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھانا گرم کر لیتے ہیں اس وقت بھی گرم رکھا ہے لئے آئیں۔؟''

''ہاں لے آؤ۔'' وہ فوراً واپس مڑ گئی اور شاہ زیب اپنے کمرے میں چلا گیا، ہلکی سی تھکن ہو گئی تھی، لیکن طبیعت پر ایک شگفتہ سی کیفیت طاری تھی، کجری کھانا لے آئی اور بڑے اہتمام سے اس نے کھانا شاہ زیب کے سامنے لکڑی کی میز پر لگا دیا، پھر پانی کے جگ سے ایک گلاس پانی بھرا اور آگے بڑھاتی ہوئی بولی۔

''اور کوئی چیز ہو تو بتا دیجئے، اور ہاں... کھانے کے بعد آپ چائے تو پئیں گے نا۔؟''

''ہاں ہاں، کجری پلائے گی تو ضرور پی لوں گا۔''

''ایسی باتیں مت کرو کہ ہمارا دل خراب ہونے لگے۔'' وہ بدستور روکھے لہجے میں بولی۔

''ارے ارے میں نے کونسی ایسی بات کر دی جو تمہارا دل خراب ہو جائے گا۔''

''نہیں ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم سے پیار سے مت بولو۔''

''کیوں۔؟''

''ارے بس ایسے ہی ہم پاگل جو ہیں نا۔''

''اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے، جو بات تمہارے دل میں ہے وہ بتاؤ۔''

''نہیں بابو جی، ہمارے دل میں کوئی بات نہیں ہے سچ بول رہے ہیں۔''

''اب آنکھیں تو اٹھاؤ، تمہیں ٹھوکر لگ جائے گی تو کیا ہوگا؟''

''آنکھیں اٹھانے سے ٹھوکر لگے گی بابو جی، ایسے نہیں لگے گی۔'' وہ بولی۔

بڑا فلسفیانہ جملہ تھا۔ شاہ زیب اس پر غور کرنے لگا، لیکن اس دوران وہ واپس چلی گئی تھی چنانچہ وہ کھانے میں مصروف ہو گیا، لاجواب سبزی بنی ہوئی تھی، شہروں میں نہ تو ایسی تازہ سبزیاں ملتی ہیں اور نہ ہی اتنی اچھی طرح سے پکائی جاتی ہیں، اس نے بڑی رغبت سے کھانا کھایا اور اسے خاصا اچھا لگا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد کجری واپس آ گئی، گردن بدستور جھکی ہوئی تھی چائے کی پیالی سامنے رکھ کر اس نے جھوٹے برتن سمیٹنا شروع کر دیئے اس دوران شاہ زیب نے اس سے کچھ نہیں کہا تھا، لیکن وہ اسے غور سے دیکھتا رہا تھا۔ نوجوان لڑکی ہے انتہائی معصوم ہے، پتہ نہیں سرائے میں کیسے کیسے لوگ آ کر ٹھہرتے ہوں گے اس کی معصومیت کہیں داغدار نہ ہو جائے۔ شاہ زیب نے عجیب سے انداز میں سوچا اور پھر اپنے آپ پر ہنسنے لگا، انسان کتنا ہی کسی خاص کیفیت سے اجتناب کرے لیکن عمر اسے اسی جانب ڈھکیلتی ہے جو اس عمر کے تقاضے ہوتے ہیں۔

باہر کی دنیا میں شاہ زیب نے بہت کچھ دیکھا تھا، دوست احباب بھی تھے اور پھر خود بھی بیوقوف نہیں تھا، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ذہن اور طبیعت کا برا نہیں تھا، کبھی کسی ایسی برائی میں نہیں پڑا تھا جو اس کے اپنے ضمیر پر داغ ہوتی، کجری کے بارے میں بھی اس نے اسی انداز میں سوچا تھا کہ اچھی بچی ہے، لیکن ایسی کہ اس کی حفاظت کی جائے، جنگل کا پھول جو ہاتھ لگانے سے مرجھا بھی سکتا ہے، اور باتیں بھی وہ عجیب سی کر رہی تھی۔ لیکن بہر طور ایک دلچسپ کردار تھا، وہ یہاں کے ماحول میں اچھی طرح سے ایڈجسٹ ہوتا چلا گیا۔

دو دن چار دن چھ دن، تقریباً دو ہفتے گزر گئے اس دوران تنظیم احمد خاں صاحب سے بھی کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور اس نے اپنے بارے میں کوئی خاص بات نہیں بتائی تھی، بس اتنا بتایا تھا کہ اچھے گھرانے کا فرد ہے اور گاؤں دیہاتوں کی زندگی دیکھنا چاہتا ہے، یہ بھی اس نے بتایا تھا کہ وہ والدین سے اجازت لے کر آیا ہے تنظیم احمد خاں بیچارے بڑے اچھے آدمی تھے۔ ان کا پورا گھرانہ اسکول میں آباد تھا، لیکن سب پردہ نشین لوگ تھے چنانچہ دو تین بار جب بھی شاہ زیب وہاں گیا تنظیم احمد خاں کے علاوہ کسی اور سے ملاقات نہ ہوئی، ہاں کھانے پینے کی چیزیں وغیرہ اندر سے آ جاتی تھیں۔

کجری اب اس سے کافی بے تکلف ہو چکی تھی لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس نے آنکھیں اٹھا کر شاہ زیب کو نہیں دیکھا تھا اور یہی کہتی تھی کہ ہم نے آپ کی صورت نہیں دیکھی پھر ایک دن اس کا راز بھی کھل گیا، سید پور ایک قریبی شہر تھا جہاں سے چاند خاں ضرورت کی چیزیں لے آتا تھا، شاہ زیب نے چاند خاں کو اچھی خاصی رقم دی تھی اور چاند خاں بہت خوش تھا، کہتا تھا کہ بابو صاحب جب تک کا کانگر میں قیام ہے آپ ہمارے پاس ہی رہیں اور ہمیں اپنی خدمت کا موقع دیں۔

اس دن بھی چاند خاں سید پور گیا ہوا تھا اور سرائے میں کجری اکیلی تھی، کسی کام سے وہ آئی تو شاہ زیب نے کہا۔

''کجری مجھے تو تم پاگل لگتی ہو۔''

''لو ساری دنیا جو کہتی ہے وہ آپ نے بھی کہہ ہی ڈالا نا۔'' وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تو اور کیا، اچھا سچ سچ بتاؤ تم نے ابھی تک مجھے نہیں دیکھا۔''

''بابا کی قسم بابا کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی نہیں ہے۔''

''تعجب کی بات ہے تمہارا دل بھی نہیں چاہا کہ کبھی مجھے دیکھو، جبکہ میں نے تمہیں بہت اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔''

''دل تو کئی بار چاہا ہے، پر ڈر لگتا ہے۔''

''کیوں؟''

''اب بتا ہی دیں آپ کو... آپ نجو کو جانتے ہیں۔؟''

''نجو.. کون نجو؟''

''حمید و تایا کی بیٹی نجو، ذرا دیکھیں جا کر اس کو ڈھانچہ بن کر رہ گئی ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''ایسے ہی ایک شہری بابو آئے تھے، ان سے دل لگا بیٹھی شہری بابو نے کہا کہ میں تجھ سے شادی کرلوں گا پر وہ اپنے گھر والوں کو بتانے گیا تو واپس ہی نہیں آیا ار نجو بیچاری بیمار پڑ گئی، سارے گاؤں میں تھو تھو تھو ہوگئی، حمید و چاچا نے تو کنوئیں میں کود کر جان دے دی، نجو بیچاری بیمار پڑی ہوئی ہے، بس اسی وقت ہم نے قسم کھائی تھی کہ کبھی کسی شہری بابو کو آنکھیں اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے، اسی لئے ہم نے تمہیں نہیں دیکھا۔''

''ارے ارے ارے.... میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔''

''تو دیکھ لیں تمہیں۔''

''وہ تمہاری مرضی ہے۔'' شاہ زیب نے کہا اور پہلی بار کجری نے آنکھیں اٹھائیں، بڑی حسین آنکھیں تھیں، ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی اور پھر وہ بول پڑی۔

''ارے باپ رے باپ، تم تو بڑے خوبصورت ہو، اتنے پیارے لگ رہے ہو، بس اسی کا ڈر تھا ہمیں، اچھا ایک بات بتاؤ۔''

''ہاں پوچھو۔'' شاہ زیب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''شادی کروگے ہم سے؟''

''ایں۔'' شاہ زیب کا منہ حیرت سے کھلا۔

''ہم بتائیں ہم تم سے کیوں شادی کرنا چاہتے ہیں؟''

''چلو بتادو۔'' شاہ زیب بولا۔

''ہمیں چھوٹے چھوٹے بچے بہت اچھے لگتے ہیں اور سب کہتے ہیں کہ جب شادی ہوتی ہے تبھی بچے پیدا ہوتے ہیں، ایک بات بتاؤ شادی کے بغیر بچے نہیں پیدا ہو سکتے کیا، اب ہم کیا کریں، ہم شادی وادی تو نہیں کرنا چاہتے پر ہمیں بچے بڑے پیارے لگتے ہیں، وہ جو ہے نا نعیمہ اس کی شادی ہوئی نا تو اس کے ہاں چھوٹا سا بچہ آ گیا، ہمیں تو اتنا اچھا لگتا تھا کہ تمہیں کیا بتائیں، ہمارا دل چاہتا تھا کہ اسے چپ چاپ وہاں سے چرالائیں اور کھیتوں میں لے جا کر رکھیں۔ پر نعیمہ سے ہماری اچھی خاصی دوستی تھی، وہ ویسے بھی اپنا بچہ ہمیں دے دیا کرتی تھی اور ہم اسے خوب کھلاتے تھے، پر پھر یہ ہوا کہ اس کا میاں جو تھا نا اسے لے کر شہر چلا گیا ہم بڑے اداس ہو گئے، ہمیں بچے بہت اچھے لگتے ہیں بتاؤ شادی کروگے ہم سے؟''

''کجری تم بڑی پاگل ہو ایسی باتیں نہیں کرتے۔''

''نہیں ہم تو بتا رہے تھے نا کہ ہمیں بچے بہت اچھے لگتے ہیں، چلو ٹھیک ہے، تم ہم سے شادی نہیں کرنا چاہتے نہ کرو اور

ہم کیا کہیں۔'' وہ اداسی سے بولی اور اداس سی باہر نکل گئی، شاہ زیب ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا، لیکن پھر اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''پاگل لڑکی بالکل ہی پاگل ہے، کیسی فضول باتیں کرتی ہے، شاید میں تجھ سے شادی کر بھی لیتا، لیکن نجو کو جو غم ہے وہ غم میں تجھے نہیں دینا چاہتا، نجو کا محبوب تو اسے دھوکہ دے کر چلا گیا لیکن میں تجھے بتاؤں میری زندگی تجھے دھوکہ دے کر چلی جائے گی تو تو کیا کرے گی، میں تیرا وفادار رہ بھی سکتا ہوں، لیکن میری زندگی مجھ سے وفا نہیں کر رہی، کون جانے جب اس ڈاکٹر سلیمان شاہ کی پیشگوئی پوری ہو جائے اور میں اس دنیا سے چلا جاؤں اس کے بعد تیرا حشر بھی نجو جیسا ہی ہوگا، میں کبھی بھی تیرے ساتھ یہ سلوک نہیں کروں گا۔''

اور اس کے بعد اس نے کجری سے اجتناب شروع کر دیا، گاؤں کی فضاء اسے بہت ہی پیاری لگی تھی، وہ یہاں رہنا چاہتا تھا، لیکن نجانے کیوں اب اسے یہ احساس ہو چلا تھا کہ اگر وہ یہاں رہا تو بیچاری کجری کسی بڑی مشکل کا شکار ہو جائے گی وہ بڑی معمولی سی لڑکی تھی لیکن بہت ہی معصوم اور سادہ ہاں جب ایک دن کجری اس کے پاس بیٹھ کر رونے لگی اور بولی۔

''اسی لئے تو منع کرتے تھے ہم کہ ہمیں اپنی صورت مت دکھاؤ، اب ہم کیا کریں بتاؤ، راتوں کو نیند نہیں آتی جاگتے ہیں اور تمہیں دیکھتے رہتے ہیں۔''

''مجھے۔''

''ہاں نا، جب بھی آنکھیں بند کرتے ہیں تمہاری صورت آنکھوں میں آجاتی ہے، نہ دیکھتے تو یہ سب کچھ تھوڑی ہوتا۔'' شاہ زیب اسے دیکھتا رہا، اس کی آنکھوں میں نجانے کیوں نمی آگئی تھی، پھر اس نے کہا۔

''ایک بات بتاؤں کجری میں برا انسان نہیں ہوں، لیکن میری زندگی میری اپنی نہیں ہے، ایک وعدہ کرتا ہوں تجھ سے، اگر ڈاکٹر سلیمان شاہ کی پیشگوئی غلط ثابت ہوئی، اگر میری زندگی دو سال سے آگے بڑھ گئی تو میں کاکانگر ضرور آؤں گا اور کجری میں تجھ سے شادی کر لوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔'' کجری کی سمجھ میں کچھ آیا یا نہیں آیا۔ وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہی اور شاہ زیب نے فیصلہ کیا کہ اب اس کا اس گاؤں میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ گاؤں کے بہت سے لوگوں سے شناسائی ہو گئی تھی، خاص طور سے ماسٹر تنظیم احمد خاں تو بہت ہی اچھے انسان تھے، اکثر وہ شام کو ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتا تھا ان لوگوں کی خوبی یہ تھی کہ وہ کسی کی کھوج میں نہیں پڑتے تھے، شاہ زیب سے بھی کسی نے کوئی کرید نہیں کی تھی، ہر قسم کے اچھے اور برے لوگ یہاں بھی آباد تھے۔

اس دن وہ ماسٹر تنظیم احمد خاں کے احاطے کے باہر بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے کے گھروں سے شور شرابہ ابھرنے لگا، پھر لاٹھیاں نکل آئیں اور اس کے بعد دو گروہوں میں مار پیٹ شروع ہو گئی، عورتیں چیخ رہی تھیں، بچے ہاہاکار مچائے ہوئے تھے، ماسٹر تنظیم احمد خاں بری طرح بدحواس ہو کر اس طرف بھاگے، تو شاہ زیب بھی ان کے پیچھے دوڑ پڑا، دو گروہ تھے جو لڑ رہے تھے، یہ نہیں پتہ تھا کہ لڑائی کس بات پر ہوئی ہے، لیکن بڑی بری لڑائی ہو رہی تھی، کئی لوگ زخمی ہو گئے تھے ماسٹر تنظیم بیچارے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ان لوگوں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن بھرے ہوئے لوگ اس وقت تک نہ رکے جب تک کہ تین چار ادھر کے اور تین چار ادھر کے زخمی نہ ہو گئے۔ عورتیں بیچ میں آئیں تو لڑائی بند ہوئی لیکن چیخ و پکار تھی کہ اب بھی بری طرح جاری تھی۔

بالکل پتہ نہیں چل سکا کہ لڑائی کس بات پر ہوئی ہے، لیکن لوگ اپنے اپنے زخمیوں کو اٹھا کر لے جانے لگے، کافی دیر تک یہ ہنگامہ برپا رہا اس کے بعد سید پور ہسپتال کی ایمبولینس آئی اور زخمیوں کو ایمبولینس کے ذریعے منتقل کیا گیا، بعد میں پتہ چلا کہ زمینوں کا جھگڑا تھا، گاؤں گوٹھوں میں اس طرح کے لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں، تنظیم احمد خاں بیچارے بہت زیادہ پریشان تھے اور کہہ رہے تھے کہ دیکھو انسان کس طرح بے قابو ہو کر اپنا اچھا برا بھول جاتا ہے اب یہ سارے کے سارے پولیس کے چکر میں پڑیں گے، خوب لے دے ہوگی ذرا سا صبر کر لیتے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی اور یہی ہوا۔

دوسرے ہی دن پولیس آگئی، پولیس کی دو تین گاڑیاں آئی تھیں، اسکول سے سب کچھ نظر آتا تھا ماسٹر تنظیم احمد خاں نے کہا۔

''ہمارا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے، گواہوں میں نام پڑ جائے گا تو تھانے کچہری کے چکر لگانے پڑیں گے، یہ لوگ تو لڑ بھڑ کر ایک ہو جائیں گے ہم بلاوجہ پریشانیاں اٹھائیں گے، لیکن بیچارے ماسٹر تنظیم احمد خاں کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی، پولیس کی ایک گاڑی اسکول کی جانب چل پڑی تھی جسے دور ہی سے اس طرف آتے دیکھ لیا گیا تھا، ماسٹر تنظیم احمد خاں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''بس... کیا کیا جائے، کسی ایسی جگہ ہونا بھی جان کا عذاب ہی ہو جاتا ہے، معلومات کے لئے آ رہے ہیں یہ لوگ، چلو ٹھیک ہے۔''

تھوڑی دیر کے بعد پولیس کی گاڑی یہاں پہنچ گئی، ایک روایتی قسم کا پولیس آفیسر چند سپاہیوں کے ساتھ نیچے اترا اور ماسٹر تنظیم احمد خاں اور شاہ زیب کے پاس پہنچ گیا۔

''آپ میں سے تنظیم احمد خاں کون ہے؟''

''میں ہوں تھانیدار صاحب، آیئے تشریف رکھئے۔'' تنظیم احمد خاں نے سرکنڈے کے مونڈھوں کی طرف اشارہ کر کے کہا جو احاطے میں بکھرے ہوئے تھے۔

''اس لڑائی جھگڑے کے بارے میں آپ سے معلومات کرنی ہیں تنظیم احمد خاں صاحب، یہ کون ہیں۔؟'' تھانے دار نے میری طرف رخ کر کے کہا۔

''مہمان ہیں ہمارے، آپ نے ان لوگوں کے بیانات لے لئے؟''

''ہاں آپ اس لڑائی کے کہاں تک گواہ ہیں۔'' تھانے دار نے پوچھا لیکن شاہ زیب نے دیکھا کہ تھانیدار کے ساتھ ایک سب انسپکٹر بار بار شاہ زیب کو دیکھ رہا ہے، پتہ نہیں کیا قصہ تھا، بہر حال انہوں نے شاہ زیب سے تو کوئی سوال نہیں کیا، ماسٹر صاحب سے معلومات حاصل کرتے رہے اور کافی دیر وہاں بیٹھے، ماسٹر صاحب نے ان کے لئے چائے بنوائی تھی، چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ وہاں سے چلے گئے تو ماسٹر صاحب نے پریشان لہجے میں کہا۔

''پہلے بھی ایک دو بار ایسا ہو چکا ہے بھائی، بس مصیبت ہی آجاتی ہے، لوگ میری عزت کرتے ہیں لیکن بعض اوقات یہ عزت بڑی مہنگی پڑ جاتی ہے۔ ان دیکھو مقدمہ چلے گا مجھے کتنی بار تھانے اور کتنی بار عدالت جانا پڑے گا۔''

انسان جہاں بھی ہوتے ہیں وہاں ان کی کہانیاں یکساں ہی ہوتی ہیں کانگر پہاڑیوں کے دامن میں آباد ایک خوبصورت آبادی، لیکن ان سیدھے سادے لوگوں کے درمیان بھی وہی تمام چیزیں نظر آتی تھیں جو ہر جگہ نظر آتی ہیں، جھگڑا ہوا، پولیس تھانہ ہوا، زخمیوں کا علاج ہوا لیکن بہتر یہ ہوا کہ پولیس اسٹیشن میں ہی ان کے درمیان صلح بھی ہو گئی اور اس صلح میں ماسٹر صاحب کا بھی پورا پورا ہاتھ تھا، لوگ ان کی عزت کرتے تھے، ایک ہفتے کے اندر اندر ہی سارے معاملات طئے ہو گئے اور ماسٹر صاحب بھی خوش ہو گئے کیونکہ انہیں سب سے بڑی پریشانی یہی تھی کہ مقدمہ قائم ہوگا، کیس چلے گا اور بار بار سید پور کچہری کے چکر لگانے پڑیں گے۔

ادھر شاہ زیب کی زندگی کے معمولات بھی رواں دواں تھے اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی، ہاں البتہ کجری ذہن پر تھوڑا سا بوجھ بنی ہوئی تھی، اس قدر معصوم اور سادہ تھی کہ کبھی کبھی شاہ زیب بھی اس کے بارے میں عجیب سی سوچوں میں گم ہو جاتا تھا، لیکن ان سوچوں میں وہ بنیادی خیال اولیں حیثیت رکھتا تھا کہ میری زندگی تو مختصر ہے، اس مختصر زندگی میں ایک معصوم اور نوخیز لڑکی کو دکھوں کا شکار کرنا کسی طور مناسب نہیں ہوگا۔ وہ گومگو کی کیفیت میں تھا ایک دن کجری اس کے پاس آئی، اس کے ساتھ ایک اور لڑکی تھی جو گاؤں ہی سے تعلق رکھتی تھی اور ایک دو بار شاہ زیب اسے بھی دیکھ چکا تھا۔

''یہ ہیں میرے بابو جی، سمجھی، یہ میرے بابو ہیں، ہے نا بابو جی۔؟''

(اس سنسنی خیز سلسلے کی دوسری کڑی ماہِ نومبر میں ملاحظہ کیجیے)

کارجہاں دراز ہے

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت ساماں
دل سوز تحریریں جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

اچھو قصاب



جاوید راہی

وہ مجرم تھا یا انسانیت کا محسن! اسرار سے بھری ایک جرم کہانی

میرے ایک جاننے والے نے مجھے فون کر کے بتایا کہ گوجرانوالہ کے ایک نواحی گاؤں سے کسی لاوارث لڑکی کو بھگا کر لے جانے والے اسلم عرف اچھو کو اس لڑکی سمیت اسکی سہیلی کو قتل کرنے کے جرم میں سزائے موت ہو چکی ہے۔اس کی زبانی جو واقعہ پیش آیا وہ کچھ اور ہے مگر اسے دوہرے قتل کے جرم میں ٹھوس شہادتوں اور خود اس کے اقرار جرم کی بنا پر فاضل عدالت نے سزا دی ہے۔کوئٹہ سے مچھ جیل سے واپسی پر میں نے عیدالفطر کے فوراً بعد اچھو قصاب سے ملنے کا پروگرام بنایا جو جیل میں سزائے موت پانے والے سیل میں پھانسی کا منتظر تھا۔

عمر کے لحاظ سے تو وہ ہوش مند نظر آیا مگر جب اس نے مجھے اپنے ساتھ پیش آنیوالے واقعات سنانے شروع کئے تو مجھے اس کی ذہنی حالت پر شک گزرا، مگر جس ربط سے وہ مجھے اپنی روداد سنا رہا تھا میرے لیے اس پر یقین کرنا محال ہو رہا تھا، بہرکیف میں نے بڑے تحمل کا مظاہرہ کرتے سب کچھ سنا اور اس کی بتائی باتوں کو آپ کی خدمت میں من وعن دہرا رہا ہوں، ہوسکتا ہے کہ آپ میں سے کسی اور صاحب کو بھی ایسے حالات سے واسطہ پڑا ہو، مگر کم از کم میری نظر سے ایسی کوئی بات نہیں گزری۔سنی سنائی باتوں پر یقین کرنے سے پیشتر سنانے والے کی صوابدید کا فیصلہ کرنا آپ کی اپنی عقل کا بھی امتحان ہو شاید۔

گو کہ میرا اپنا بھی ذاتی مشاہدہ ہو چکا ہے ایسے حالات سے مگر یہ واقعہ مجھے کچھ اور ہی نوعیت کا دکھائی دیا ہے۔اچھو قصاب جیل حکام کی بدولت پنجگانہ نماز اور قرآن کریم کی سعادت پا کر اللہ کے حضور ہر وقت اپنے گناہ کی معافی کا طلبگار رہتا ہے۔ اس وقت بھی وہ تلاوت میں مصروف تھا جب جیل اہلکار مجھے اس کے سیل کے باہر چھوڑ گئے تھے۔تلاوت سے فارغ ہو کر اس نے بلند آواز میں اپنے اور تمام جیل کے قیدیوں کے لیے دعا مانگی اور سلاخوں سے ہاتھ نکال کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

''جی فرمائیں!'' اس نے نرم لہجہ میں مجھ سے بات شروع کی، میں نے وہی سوال دہرایا جو اکثر میں ایسے قیدیوں سے کرتا ہوں کہ یہ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ وغیرہ وغیرہ۔اچھو چند پل سارے حالات کی کڑیاں ملانے کے بعد بولا۔

''دو دن سے مسلسل بارش نے کاروبار زندگی مفلوج کر کے رکھ دیا تھا، ڈنگر زیادہ دیر باڑے میں کھڑے کھڑے تنگ پڑ گئے اور ایک دوسرے پر سینگ زنی پر اتر آئے تھے۔حویلی کی پرانی خدمت گار مائی سکینہ نے آکر بابا چودھری کا پیغام دیا کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ مال نکال کر

اوپر ٹبی کی جانب لے جاؤ تاکہ ان کی ٹانگیں کھل جائیں اور ہریالی کو منہ بھی مار لیں۔ جی مائی جی اچھو نے چارپائی سے اٹھتے باڑے کی طرف جاتے جواباً کہا اور سب ڈنگروں کے سنگل کھولنے لگا۔

اسلم کی ماں جب وہ تین سال کا تھا اسے اپنی شفقت سے محروم کر گئی۔ اسلم کے والد پر دونوں بہن بھائی کی ذمہ داری کا پہاڑ ٹوٹ پڑا گھر والی چاہے پرانی مریضہ تھی، مگر دونوں بچوں کی تو اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ رضیہ سے چھوٹی کلثوم بھی جو سوا سال کی عمر میں ہی نمونیہ کا شکار ہو کر چل بسی۔ رضیہ سات سال کی عمر میں باپ اور چھوٹے بھائی کے لیے گھر کے کاموں میں اُلجھ گئی۔ گاؤں میں تو کوئی رشتہ دار تھا نہیں جو ان بچوں کا خیال کر کے رمضان کی شادی کروا دیتا، بس رمضان ان دونوں بہن بھائی کی پرورش کا ہی ہو کر رہ گیا۔ گاؤں میں رمضان کو چھپر کے نیچے جوتے اور سائیکل مرمت کرتے کرتے رضیہ اٹھارہ سال کی ہوگئی اور اسلم پندرہ سال میں جا لگا۔ گاؤں کے نمبردار نے رمضان کی بیٹی رضیہ کو سکھ پور میں اپنی بڑی بہن کے گھر میں کام کرتی ملازمہ کے بیٹے سردار علی سے بیاہ دیا اور اسلم کو بابا چودھری کی حویلی میں ڈھور ڈنگر کے باڑے کی چاکری دلوا دی۔ رمضان دمہ کا دائمی مریض تھا اور ایک روز وہ بھی کھانستے کھانستے اللہ کو پیارا ہوگیا۔ اچھو نے اپنا چھوٹا سا کچا گھر بمعہ سامان اپنے پڑوسی چاچا کرم الٰہی کو سونپ دیا اور خود بابا چودھری کی حویلی میں دن رات مال ڈنگر والے باڑے کے ساتھ چھوٹی سی کوٹھڑی میں آن بسا، تب سے آج تک وہ حویلی کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ جب کبھی رضیہ کا دل بھائی کی یاد میں تڑپ اٹھتا تو وہ سکھ پور سے اپنے دونوں بچوں سمیت بھائی کو آ کر مل جاتی۔ اسے بس ایک فکر تھی کہ کسی طرح اچھو کا بیاہ ہو جائے اور وہ بھی اپنے گھر والا بن جائے، مگر بابا چودھری یہ کہہ کر رضیہ کی بات کاٹ دیتا کہ یہ کون سا ابھی بوڑھا ہو رہا ہے ہو جائے گا جب اللہ کو منظور ہوا۔

اچھو نے تمام بڑی چھوٹی گائے بھینسیں سنگلوں سے آزاد کرتے باڑے کا بھاری بھرکم گیٹ پوری طاقت صرف کرتے کھول دیا جو مسلسل بارش کے باعث بھیگ کر



دوگنا وزنی ہو چکا تھا۔ سارا مال ایک دوسرے سے زور آزمائی کرتا باہر نکل گیا۔ بارش گو کہ کم ہو گئی تھی، مگر سست روی سے جاری تھی۔ اچھو نے چلتے ہوئے باڑہ سے ٹاٹ کی پلی اُٹھا کر اپنے سر کو ڈھانپ لیا تھا جس میں چارہ بھر کر وہ مال کی کھرلیوں میں ڈالتا تھا۔ چاروں جانب جل تھل نے کیچڑ ہی کیچڑ کر رکھا تھا۔ اس نے کھیتوں کی بجائے مال ڈنگر کا رخ پرانی ٹبی کی جانب موڑ دیا تھا۔

پرانی ٹبی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ پچھلے وقتوں میں وہ شاہی گھڑ سرائے تھی، جہاں شاہی قافلے دوران سفر آرام کے لیے رکتے تھے پھر گردشِ ایام نے چھوٹی اینٹ کی بنی عمارت کھنڈرات میں بدل دی۔ پرانی ٹبی گاؤں سے کافی دور ہونے کے سبب کم ہی لوگوں کی گزر گاہ تھی اِدھر سے گزرنے والے یا تو شہر جاتے وقت اس راستے کو استعمال کرتے یا پھر اِدھر اُدھر کے گاؤں کو آنے جانے والے اس راستے پر سے گزرتے تھے۔ ہلکی بارش کے باوجود اچھو کے سر اور جسم پر ٹاٹ کی پلی پوری طرح بھیگ چکی تھی۔ اگست کے ملے جلے موسم کے باعث اس کے کسرتی جسم میں ٹھنڈک کی لہر گردش کرنے لگی تھی۔ مال ڈنگر بارش میں بھیگی گھاس، جڑی بوٹیوں پر منہ مارتا گھڑ سرائے کی طرف چڑھنے والی گھاٹی کی جانب آگے بڑھ رہا تھا۔ اچھو درختوں کا سہارا لیتا پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

گھڑ سرائے کی چاروں اطراف خاصا خودرو جھاڑ جھکاڑ اُگا ہوا تھا۔ سارا مال ڈنگر چرنے میں لگ گیا اور اچھو گھڑ سرائے کی کھنڈر عمارت کے اندر دلان نما راہداری عبور کر کے اوپر والے حصہ میں آ گیا جہاں سے چاروں جانب مال ڈنگر پر نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ بونداباندی کے ساتھ ساتھ کبھی تیز اور کبھی آہستہ رفتار سے ہوا کی سائیں سائیں ماحول کو پراسرار بنا رہی تھی۔ اچھو نے اپنے اوپر والا ٹاٹ کا بڑا سا ٹکڑا خود سے جدا کر کے اندر والی ٹوٹی دیوار کے اوپر پھیلا دیا تھا جس میں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اس نے اپنی ٹانگیں لمبی کرتے سر آگے کو جھکتی مہراب پر ٹکا لیا اور ہریالی چرتے مال گو گن کر اس نے تسلی کر لی اور آنکھیں موند لیں۔

اچانک اچھو کو اپنے نتھنوں میں ایک عجیب سی مہک کا احساس ہوا تو اس نے فوراً اپنی آنکھوں کو کھولتے اپنی ٹانگوں کو سمیٹا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے اردگرد کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر گیلا ٹاٹ سنبھالتا عمارت سے باہر نکل آیا۔

اس اچانک اٹھنے والی مہک نے پل بھر کے لیے اس کے وجود کو ہلکے خوف کے احساس میں اُلجھا ڈالا تھا۔ وہ پہلے بھی کئی بار گھڑ سرائے کی اس چراگاہ میں حویلی کے مال ڈنگر کو چرانے کے لیے لا چکا تھا، مگر اس نے آج والی کیفیت کبھی محسوس نہ کی تھی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ایک بار پھر اسے اپنے آس پاس ویسی ہی مہک کا سختی سے احساس ہوا تو وہ واقعی خوفزدہ ہو گیا۔ جب اس نے اپنے پیچھے گھوم کر دیکھا تو چند قدم فاصلے پر ایک انتہائی خوبرو دوشیزہ کو کھڑے پایا یکدم اس کے ذہن میں بھوت پریت کا خیال جاگ اٹھا اور وہ بھاگنے ہی والا تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے قریب آ گئی۔ اچھو کے پاؤں مَن مَن کے ہو چکے تھے اور حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔

ڈرو مت، میں کوئی ایسی ویسی چیز نہیں ہوں جو تمہیں نقصان پہنچائے گی۔ میں بھی تمہاری ہی طرح کی جیتی جاگتی حقیقت ہوں اس نے اپنے دونوں ہاتھ اچھو کے کپکپاتے ہاتھوں پر رکھتے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''تم کون ہو؟ اور یہاں اجاڑ میں اس وقت کیا کرتی پھرتی ہو۔''

''ادھر اوپر آ جاؤ میں تمہیں سب بتاتی ہوں۔ اگر کسی نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو مصیبت آ جائے گی۔''

اس نے اچھو کا ہاتھ تھامتے گھڑ سرائے کے مسمار کھنڈرات کی طرف چلنے کا کہا۔ اچھو کسی معصوم بچے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے ٹوٹی پھوٹی عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔ اب وہ دونوں اسی جگہ آ گئے جہاں اچھو نے پہلے بارش سے بھیگنے کی بچت کی تھی۔

''میرا نام سبینا ہے اور میں شہر سے بھاگ کر یہاں آئی ہوں۔ رات سے۔''

''مگر کیوں؟'' اچھو نے تذبذب کے عالم میں سبینا سے سوال کیا۔

''یہ لمبی کہانی ہے سبینا نے دیوار کا سہارا لیتے اسے جواب دیا۔''

''مگر اس تیز بارش میں شہر سے گاؤں۔'' ''یہ اتفاق جانو میں ٹریکٹر ٹرالی میں اس وقت چھپی تھی جب

ڈرائیور ڈیزل بھروانے میں مصروف تھا۔“

”اس نے تمہیں دیکھا نہیں۔“

نہیں میں ٹرالی میں پڑے خالی ٹوکروں کے پیچھے دُبک گئی تھی۔

کمال ہے اچھو نے غیر یقینی انداز میں اپنے شانے اچکائے۔ اتنے میں سبینا اٹھ کر دوسرے جانب کے ٹوٹے پھوٹے حصہ میں چلی گئی۔ جب واپس پلٹی تو اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی گٹھڑی تھی جسے اس نے کھول کر اچھو کے سامنے رکھ دیا۔ کچھ کپڑے اور کھانے پینے کی چیزیں تھیں اس کے علاوہ چھوٹے سے ہینڈ پرس میں کرنسی نوٹ جو سبینا نے اسے دکھا کر دوبارہ گٹھڑی باندھ لی۔ ”چلو یہ تو ٹھیک ہے، مگر تم گھر سے بھاگی کیوں؟“ اچھو نے پہلی بار بھرپور نظروں سے سبینا کے سراپا کا جائزہ لیا۔ بڑی بڑی طلسماتی آنکھیں کھلی کھلی رنگت، سرخی مائل ہونٹ، ستواں ناک۔ جو سوٹ اس نے پہن رکھا تھا شائد بارش میں مسلسل بھیگتے رہنے کی وجہ سے وہ مہک جو خمار آلود ہو چکی تھی اس کے احساس نے اچھو کو بے خوف کر دیا اور لمحہ بھر کے لیے سب کچھ بھول گیا۔

”تمہیں اتنی رات اکیلے اس ویرانے میں خوف نہیں آتا؟ تمہارا نام کیا ہے؟“

”اسلم، لوگ اچھو کہہ کر بلاتے ہیں تم بھی اچھو کہہ کر بلا سکتی ہو۔“ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ میں سبینا کو اپنا نام بتایا۔ ”اچھو موت کے خوف سے تو زیادہ خوفناک یہ کھنڈرات نہیں۔ ٹریکٹر ٹرالی شاید کسی گھر کے آگے رُکی تھی۔ ڈرائیور اُتر کے گیٹ کھولنے گیا تو میں چپکے سے اپنی گٹھڑی سنبھالتی ٹرالی کے کونے میں سے اتر کر درخت کی اوٹ میں ہوگئی۔ جب تک وہ ٹریکٹر ٹرالی اندر نہیں لے گیا میں اپنی جگہ چھپی کھڑی رہی، پھر اس نے اندر جا کر انجن بند کرتے گیٹ کے دونوں کواڑ آپس میں بند کر دیے۔ سارا گاؤں بارش میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اچھی طرح تسلی کرتے وہ جگہ چھوڑ دی اور گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر آگے بڑھنے لگی۔ دور سے اس ویران عمارت کے کھنڈرات نظر آرہے تھے، یہاں آکر میں نے خود کو اس تاریک اور سنسان ماحول کی گود میں گرا دیا۔“

یہ بتا کر وہ تاحد نظر جھاڑ جھکاڑ کے ناہموار میدان میں ادھر اُدھر منہ مارتے مال ڈنگر کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر توقف کے بعد اچھو بولا۔

”تم نے بتایا نہیں کہ آخر تمہیں کونسی آفت آن پڑی جو اس طوفان بھری رات میں گھر سے نکل بھاگیں۔“

”ہاں اچھو میں کیوں گھر سے نکلی اگر مجھے اس بات کا پتہ نہ لگتا کہ میرے چچازاد مجھے قتل کرنے والے ہیں تو شاید میں تمہارے سامنے اس وقت یہ سب کچھ بتانے کے لیے زندہ نہ ہوتی۔ میرے والد کے کام میں ہاتھ بٹاتا آرہا تھا پر لے درجے کا لالچی، میری پیدائش کے کچھ دن بعد میری والدہ اندرونی انفیکشن کے باعث دم توڑ گئی۔ میرے والد صاحب صدمہ کی حالت میں مشکل سے دو ماہ نکال سکے اور میں چچا اور اس کے گھر والوں کے رحم و کرم پر رہ گئی۔ میٹرک بہت ذلت سے کیا، ہر وقت چچی کے طعنے، میں شکایت کرتی تو چچا برس پڑتے تمام جائیداد جو کروڑوں میں تھی جس کی میں واحد جائز وارث تھی مجھے ایک دوبار میرے چچا نے کورٹ میں چل کر سب کچھ اپنے نام کروانے کی کوشش کی میرے سخت انکار پر وہ سارے یکدم خاموش ہوگئے۔ ان کی خاموشی کو میں ناکام جانتے مطمئن ہوگئی، مگر ایک روز میں نے ان سب کو اپنے قتل کا پلان تیار کرتے سن لیا کہ وہ مجھے رات سوتے میں گلا دبا کر مارنے کے بعد دریا برد کر کے گھر سے فرار ہونے کی افواہ پھیلا دیں گے، مگر میں خبردار ہوگئی اور گھر سے فرار کے منصوبے تیار کرنے لگی۔ یہ تھوڑا بہت سامان میں نے تیار کر کے اپنے کمرے میں چھپا رکھا تھا۔ بارش کی رات موقع پاکر میں گھر سے نکل آئی اور باقی سارے حالات سے میں نے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔“

یہ بتا کر سبینا اچھو کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ نجانے اس کی آنکھوں میں کیسی چمک تھی کہ اچھو نے گڑبڑا کر نظریں چرالیں۔

”اب تمہارا آگے کا کیا ارادہ ہے؟“ اچھو نے سوال کیا۔

فی الحال تو اس سے محفوظ جگہ میری نظر میں اور کوئی نہیں۔“ سبینا نے کھنڈرات سے باہر دیکھتے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”یہاں تم اکیلی رہوگی؟“

”پچھلی رات بھی تو اکیلے گزاری ہے میں نے۔ اگر تم

ادھر اپنا مال نہ لے کر آتے تو میں ادھر اکیلی ہی تھی نا۔'' اس نے شوخی سے اچھو کی بات کا جواب دیا، مگر اچھو کے چہرے پر ناگواری اور پریشانی کے تاثرات ابھر کر ڈوب گئے۔

''ارے پاگل لڑکی، یہی تھوڑا بہت خشک راشن اور تمہاری پانی کی یہ دو بوتلیں کب تک تمہارا ساتھ دیں گی؟''

''اب کس بات کی فکر ہے مجھے تم جو مل گئے ہو۔ خود ہی میرا خیال رکھو گے نا'' سینا نے اپنے دنوں شانے اوپر کرتے اس کی طرف دیکھا۔ اچھو آدھی خالی بوتل اس سے لے کر اٹھتا ہوا عمارت سے باہر نکل آیا، جنگلی پیال کے بڑے بڑے دو تین پتے نوچ کر ان کو آپس میں اس طرح جوڑا کہ وہ پیالہ نما برتن بن گیا بوتل والا پانی اس نے احتیاط سے نکال کر محفوظ کر کے قدم مال ڈنگر کی طرف بڑھا دیئے۔ سارے مال میں بھاگ بھری سب سے اصیل بھینس تھی جس کے قریب جا کر اس نے پیار سے اسے تھپکی دیتے دودھ دھونے کے لیے کھڑا کر لیا اور دو چار ہاتھ مارتے بوتل دودھ سے بھر لی اور واپس گھڑ سرائے کے کھنڈرات میں آ گیا۔ سینا اسی ٹوٹی منڈیر پر ٹانگیں پھیلائے اچھو کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اسے قریب آتے دیکھ کر بولی۔ ''میں تو سمجھی تھی کہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا ہے۔''

نہیں سینا میں تو تیری بھوک پیاس کا بندوبست کرنے گیا تھا لو تازہ اور خالص دودھ پیو تم شہر والے تو نقلی دودھ پر گزارا کرتے ہو'' کہتے ہوئے اس نے ڈھکن ہٹا کر بوتل اس کے ہاتھ میں پکڑا دی، جو سینا نے فوراً منہ کو لگاتے آدھی سے زیادہ چڑھا لی۔ میں مال واپس لے جا کر تمہارے لیے کھانے پینے کا سامان اور دو ایک برتن اور بستر لے آؤں گا پھر سارے کاموں سے فارغ ہو کر تیرے پاس آ جاؤں گا۔ تم دلیر لڑکی ہو مجھے پتا ہے تم سارے حالات کا مقابلہ کر لو گی اور ہاں جب تک میں ادھر ہوں، تم بے فکر ہو کر کمر سیدھی کر لو تا کہ رات کو تمہیں اگر جاگنا بھی پڑے تو تمہیں کوئی دقت نہ ہو۔''

سینا بوتل ایک طرف رکھتے اپنی گٹھڑی کا سرہانہ بناتے دیوار کے ایک سائیڈ ہو کر لیٹ گئی اور آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ اچھو کن اکھیوں سے اس کے سراپے کا جائزہ لے رہا تھا۔ بچپن سے جوانی تک بس گاؤں کی سیدھی سادھی لڑکیوں کو ہی دیکھتا آ رہا تھا مگر زندگی میں پہلی بار سینا جیسی خوبرو لڑکی کو دیکھ کر، مل کر اور اپنے سامنے اس طرح لیٹے دیکھ کر اس کی اندرونی کیفیت میں ہلچل سی اُٹھ رہی تھی۔ سینا لیٹتے ہی خراٹے بھرنے لگی اور اس کی چادر اس کے جسم سے ڈھلک کر ایک طرف ہو گئی اور اچھو کا وہاں بیٹھنا محال ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُٹھ کر باہر نکلتا سینا سوتے میں پلٹی اور اپنا آدھا جسم اچھو کے اوپر لے آئی اور ایک بازو اس نے اچھو کی رانوں پر پھیلا دیا۔ اچھو کو لگا جیسے کوئی پھولوں کی نرم ڈالی اس کے وجود سے لپٹ گئی ہو۔

باہر بارش کی رفتار قدرے تیز ہو گئی اور اچھو سینا کے قریب کھسک آیا۔ سینا نے اپنے چہرے پر گرم سانسوں کو محسوس کرتے یکدم آنکھیں کھول دیں اور اچھو فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ مگر سینا بدستور اس کی خمار بھری آنکھوں میں جیسے خود کو تلاش کر رہی تھی پھر وہ دیوار کا سہارا لیتے اس انداز میں اٹھی جیسے اسے خود پر بھی قابو نہ رہا ہو۔ اچھو اس کا سر اپنے کندھے پر محسوس کر کے بے بسی سے سمٹ گیا، باہر بارش کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا اور گھڑ سرائے کے ٹوٹے پھوٹے در و دیوار ایک دوسرے کو سنبھلنے میں مدد دے رہے تھے۔ اچھو کی روح اس کے جسم کو پاش پاش کرنے کی سعی میں بے بس ہو رہی تھی۔ بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کوندنے والی چمک نے یکدم گھڑ سرائے کی نیم تاریکی کو منور کر ڈالا۔ اچھو سینا سے نظریں چراتے باہر دیکھتے بولا ''سارا مال واپس جانے کے لیے گاؤں کے واپسی راستے کی طرف بڑھنے لگا ہے۔ سینا خود کو چادر میں لپیٹتے بولی تم کب آؤ گے اچھو؟''

''بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی مگر میں پھر بھی تمہارے پاس آؤں گا۔'' اچھو کے لہجہ میں خود اعتمادی کا رنگ نمایاں تھا۔ پھر وہ اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرتا مال ڈنگر کے پیچھے چل پڑا، سینا بڑی اپنائیت سے اسے جاتے دیکھ رہی تھی پھر اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ اُبھر کے ڈوب گئی۔

اچھو مال کو باڑہ میں بند کرتے دودھ دھونے کے برتن کو ٹھڑی سے نکالنے کے لیے جانے لگا تو مائی سکینہ نے اسے پیچھے سے آواز دیتے کہا کہ تمہارا کھانا رکھ کر جا

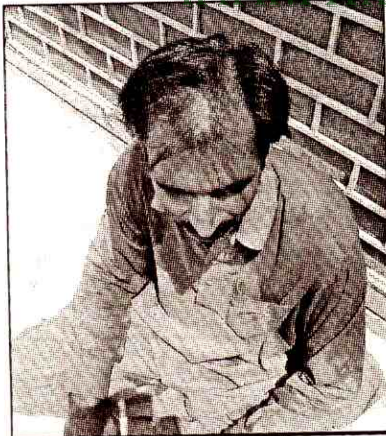
رہی ہوں۔" "ٹھیک ہے" اس نے جاتے جاتے جواب دیا اور برتن اٹھا کر باڑہ میں آگیا۔ وہ جلدی جلدی دودھ نکالنے سے فارغ ہونا چاہتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنی کوٹھری سے ضروری برتن لیے اور ڈولنی میں دودھ ڈالا اور کھانے کے قریب رکھتے دودھ میں سے لیا ہوا دودھ پورا کرنے کے لیے پانی کی آمیزش کر کے دودھ اندر حویلی میں پہنچایا اور مال کو چارہ ڈالنے کی تیاری کرنے لگا۔ جب وہ سب کاموں سے فارغ ہو گیا تو سارا سامان روٹی سمیت اٹھاتے اپنی کوٹھری سے باہر نکل کر گھڑ سرائے کی جانب چل پڑا۔

بوندا باندی جاری تھی مگر بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ گھڑ سرائے کے در و دیوار نیم تاریکی میں ڈوبے گہرے سکوت کی تصویر دکھائی دے رہے تھے۔ اچھو نے آہستہ آواز میں سبینا کو پکارا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ دوسری بار اسے ذرا اونچی آواز دی مگر گھڑ سرائے کے کھنڈرات میں اسے اپنی ہی آواز کی گونج محسوس ہوئی۔ اسے سبینا کو یہاں نہ پا کر صرف ایک ہی خیال آیا کہ کہیں اس کے ساتھ کوئی مسئلہ تو نہیں پیش آگیا۔ وہ ہاتھوں میں اٹھایا سامان ایک طرف رکھتے گھڑ سرائے کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں چڑھتا اوپر والے حصہ میں آگیا۔ چاروں جانب نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ نیچے کی جانب سے اس کے نتھنوں میں وہی مانوس سی مہک چھو کر گزر گئی۔ اچھو جلدی سے سیڑھیاں ٹٹولتا نیچے کی طرف آیا تو سامنے والی ٹوٹی منڈیر پر سبینا ٹانگیں نیچے کی طرف پسارے اپنے لمبے گھنے بال شانوں کے اِدھر اُدھر پھیلائے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"کہاں تھی تم؟" اچھو نے اسے پیار سے دیکھتے پوچھا۔

"اِدھر باہر ضروری کام سے گئی تھی میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔" سبینا نے دیوار کا سہارا لیتے منڈیر پر سے اُترتے اس کی بات کا جواب دیا۔

"چلو آؤ ہاتھ دھو کر کھانا کھائیں مجھے بھوک لگی ہے۔" اچھو نے پانی والا وہ برتن جو ساتھ لایا تھا اٹھاتے اسے مخاطب کیا۔ پھر وہ دونوں ہاتھ دھو کر کھانے میں لگ گئے۔ سبینا نے واجبی سا کھانا لیا تھا اور اچھو کا لایا دودھ وہ بڑی رغبت سے پی رہی تھی۔ پھر اچھو نے ایک کونے میں



اسلم عرف اچھو قصاب کی جیل کی چاردیواری میں لی گئی ایک تصویر

اپنے ساتھ لایا بستر زمین پر بچھاتے اسے مخاطب کیا۔

"سبینا تم کب تک یہاں چھپی رہو گی۔ موسم ٹھیک ہوتے ہی گاؤں کے لوگ اِدھر آنے جانے لگتے ہیں۔"

"اچھو تو مجھے اپنے ساتھ لے چلو نہ اپنے پاس۔ واپس تو میں نے جانا نہیں اور تم سے جو رشتہ بن چکا ہے اس کی ذمہ داری ہے۔ اب مجھے سنبھالنا تمہارے فرائض کا حصہ ہے سنا تم نے۔" اس نے اچھو کے بچھائے بستر پر بیٹھتے اس کی جانب دیکھا۔ اچھو کی خاموشی میں پریشانی بھی شامل تھی۔

"حویلی کے لوگ تو بالکل بھی اس معاملہ میں میرا ساتھ نہیں دیں گے میں یہاں ہی پیدا ہوا ہوں اور کبھی گاؤں سے باہر نکلا نہیں۔" اس کا لہجہ تذبذب میں ڈوبا ہوا تھا۔

"میں نے تو شہر دیکھا ہے، نہ میں شہر میں پلا بڑھا ہوں۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہیے مجھے۔" اچھو نے اس کے پاس بستر پر بیٹھتے پوچھا۔

"کرنا کیا چاہیے یہاں سے نکل کر شہر کی طرف چلتے ہیں اور کیا کرنا چاہیے۔ میرے پاس کافی کچھ ہے۔ گہنے روپیا، اس سے تم شہر میں کوئی کام کرنا، میں گھر میں بیٹھ کر تمہارے آنے کا انتظار کیا کروں گی۔" سبینا نے اچھو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے بے پناہ پیار سے اس کی بات کا جواب دیا۔ اچھو چند پل خیالوں میں کھویا رہا پھر اس نے سبینا کی بات کو تسلیم کرتے اس کے ساتھ جانے کی حامی بھر لی۔

"تو پھر دیر کس بات کی؟ چھوڑو سب کچھ اِدھر ہی۔ ہم وقت ضائع کیے بغیر یہاں سے نکلتے ہیں۔" سبینا نے اسے ٹٹولا۔

"ٹھیک ہے۔" اچھو نے اپنا لایا سامان اکٹھا کیا اور سبینا کی طرف دیکھا۔ سبینا اٹھ کر کھنڈرات کے اس طرف چلی گئی جہاں اس نے اپنا سامان رکھ چھوڑا تھا پھر وہ بھی چھوٹی سی گٹھڑی اٹھائے اس کے قریب آ گئی۔ دونوں آگے پیچھے گھڑ سرائے کے اندرونی حصہ کو خیر آباد کہتے باہر نکل آئے۔

نیم تاریکی میں دونوں آگے پیچھے چلتے رِم جھم میں بھیگتے چل رہے تھے۔ چلتے چلتے اچھو کی ٹانگیں پھول گئی تھیں، مگر سبینا بغیر تھکے اس کے آگے آگے بڑھی جا رہی تھی۔ گاؤں سے نکلتے وقت اچھو نے اپنے سامان کو راستے میں ہی چھوڑ دیا تھا اور سبینا نے اپنی گٹھڑی اس کے سپرد کر دی تھی۔ پچھلی پہر کا کافی سارا وقت گزرنے جا رہا تھا۔ دونوں اس وقت ایسے راستے پر گامزن تھے جہاں سے شہری حدود شروع ہو چکی تھی۔

"سبینا، میری تو اب بس بس ہو رہی ہے۔" اچھو نے اسے مخاطب کیا۔

"جب یہ سڑک بڑی سڑک کو جا لگے گی پھر کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی ہمیں سبینا۔" نے بدستور آگے بڑھتے اس کی بات کا جواب دیا۔ اچھو خاموش ہو گیا۔

دن کا اُجالا نمودار ہو رہا تھا اور وہ دونوں شہر کو جانے والی سڑک سے تھوڑے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ دور سے گزرنے والی ٹریفک کی آتی جاتی گاڑیوں کی بتیاں نظر آنے لگی تھیں۔

"سبینا کچھ دیر آرام کر لیں۔ میں تو سارا دن بیٹھنے والا اور صرف مال ڈنگر تک محدود بندہ ہوں، چل چل کر میرا برا حال ہو گیا ہے۔"

"اچھو تھوڑی ہمت کر لو۔ جہاں ٹھہریں گے وہاں خوب دباؤں گی۔" سبینا نے پیچھے مڑ کر اس کی ڈھارس قائم کی۔ سڑک پر پہنچ کر دونوں سواری کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ کئی گاڑیاں، ٹرک، بسیں گزر گئیں مگر ان کے اشارے پر کوئی نہ رُکا۔ آخر کار ایک وین والے کو دونوں پر شاید رحم آ گیا۔ اس نے وین روک کر ان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا، سبینا بے فکری سے اچھو کو لے کر وین میں سوار ہو گئی۔ ڈرائیور شریف آدمی تھا اس نے کوئی سوال جواب نہ کیا اور وین کی رفتار بڑھا دی۔

اچھو زندگی میں پہلی بار شہر آیا تھا۔ بڑی حیرانی سے چاروں جانب دیکھ رہا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے کی مسافت کے بعد وین شہر میں داخل ہو گئی۔ ایک جگہ روک کر ڈرائیور نے انہیں اتارتے وین آگے بڑھا دی۔ سبینا اچھو کو لے کر ایک طرف چل پڑی، قریب سے گزرتے خالی رکشہ کو اس نے روکا اور ڈگری کالج کا کہتے اچھو کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رکشہ مختلف شاہراہوں پر آگے بڑھا جا رہا تھا۔ دور سے بہت بڑی بلڈنگ کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ رکشہ مین گیٹ کو چھوڑتا سبینا کے بتائے پتے پر آ رُکا، وہ راستہ شائد کالج ملازمین کی رہائش گاہوں کا تھا۔ رکشہ والے کو کرایہ دیتے سبینا نے گٹھڑی دوبارہ اچھو کے سپرد کر دی تھی۔ گیٹ عبور کر کے سبینا آگے اور اچھو پیچھے چل پڑا۔ بہت بڑی کالونی تھی ڈگری کالج بڑی بڑی کوٹھیوں کے بعد کوارٹروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کوارٹروں کی آگے پیچھے دو لائنیں تھیں۔ بیک سائیڈ پر سب سے آخری کوارٹر کے سامنے رُکتے سبینا نے دستک دی۔

چند پل لگے انتظار کرنے میں، دوراز کھولنے والی دراز قد خاتون تھی جس نے سبینا کو دیکھ کر اندر آنے کا کہا۔

"آؤ۔" سبینا نے اچھو کو اشارہ کیا۔

"بیٹھو اچھو میں آتی ہوں۔" سبینا خاتون خانہ کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ جب دونوں واپس آئیں تو دونوں کے پاس ناشتے کی ٹرے اور چائے وغیرہ تھی۔ تمام رات چلنے سے اور بھوک کی شدت چمک اٹھی، سب کچھ دیکھ کر اچھو اشارہ پا کر بے صبری سے جُٹ گیا۔ ناشتہ میں اس دوران سبینا نے اسے بتایا کہ یہ روبینہ ہے میری کلاس فیلو اور یہاں اسی کالج میں لیب اسسٹنٹ کے طور پر ملازمت کرتی ہے۔ میں نے اسے اپنے اور تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ ہمیں یہاں کسی قسم کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اتنے بڑے کوارٹر میں یہ اکیلی رہتی ہے۔ شادی کی تھی، مگر خاوند اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ چائے پینے کے دوران روبینہ نے سبینا کو رہنے کے لیے کوارٹر کے اوپر والا حصہ دے دیا۔ ناشتے کے خالی برتن سمیٹ کر دونوں گیسٹ روم سے نکل گئیں۔ اچھو کی تھکاوٹ ذرا کم ہوئی اور ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہوا۔ اسے ہوش آیا

اس نے یکدم کتنا بڑا فیصلہ کر ڈالا تھا۔
سبینا کے لیے مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ سبینا آ گئی اور اس نے بیٹھتے اچھو کو مخاطب کرتے بتایا کہ میں نے روبینہ کو بتا دیا ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔ اچھو شرم سے جھینپ گیا۔ "ہم تھوڑی دیر آرام کرتے ہیں پھر اوپر والے حصہ کو مل کر رہنے کے قابل بناتے ہیں۔ دونوں الگ الگ صوفہ پر ڈھیر ہو گئے۔ اچھو تو دراز ہوتے ہی خراٹے لینے لگا۔ سبینا خاموشی سے اٹھی اور روبینہ کے کمرے میں آ گئی۔
روبینہ چکن کے ٹکڑوں کو نمک مرچ کے بغیر ہی رغبت سے کھا رہی تھی۔ اپنے سامنے پڑی بڑی سی ٹرے جس میں تازہ چکن کے بہت سارے کچے ٹکڑے پڑے تھے۔ سبینا کی طرف کر دی۔ سبینا نے لہو لگا چکن کا بڑا سا ٹکڑا اٹھایا اور دانتوں سے نوچ کر کھانے لگی۔ دونوں کے منہ سے ہڈیاں چبانے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ جب ٹرے خالی ہو گئی تو دونوں نے اپنی زبان سے اپنے ہونٹ اور ہاتھ چاٹ کر صاف کرتے ایک دوسرے کو ساتھ لگا لیا۔ دونوں ایک دوسری میں اس طرح گھٹی پڑی تھیں جیسے پالتو کتیاں راتب کھانے کے بعد ایک دوسری کا سہارا لے کر آرام میں ڈوب جاتی ہیں۔
صبح سبینا نے بے فکر سوئے اچھو کو جھنجھوڑتے اٹھایا۔
"ہم نے اوپر والا حصہ صاف کرنا تھا۔"
"اس میں میرا کیا قصور تم نے جگایا ہی نہیں۔" اچھو نے صوفہ پر ہی پڑے پڑے جواب دیا۔
"چلو اٹھو اور جا کر نہا لو پھر ناشتہ کرنے آ جاؤ روبینہ باجی نے ڈیوٹی پر جانا ہے۔" سبینا نے کچن کی طرف جاتے اسے تیار ہونے کا کہا وہ اٹھ کر واش روم کی جانب چل پڑا۔
روبینہ نے اپنے میاں کا ایک جوڑا سبینا کے کہنے پر نکال کر اسے دیتے اچھو کو پکڑانے کا کہتے اس کے ہاتھ سے ناشتے کا سامان لے لیا۔ ناشتا سے فارغ ہو کر روبینہ کالج کی لیب کے لیے کوارٹر سے نکل گئی جبکہ وہ دونوں اوپر والے حصہ کی جھاڑ پونچھ میں لگ گئے۔ روبینہ کے آنے تک سبینا نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ تینوں نے مل کر کھانا کھایا اور کوارٹر لاک کرتے اچھو کو شہر گھمانے لے کر چل پڑیں۔
رات گئے تینوں کی واپسی ہوئی پھر وہ دونوں سونے کے لیے اوپر آ گئے۔
"اچھو تمہیں کوئی کام دھندا بھی آتا ہے یا ساری توجہ مال ڈنگر پر ہی تھی۔"
"گاؤں میں گوشت والے کے ساتھ ہاتھ بٹاتا تھا جس نے مجھے بکرے، چھترے اور ڈنگر کاٹنے میں خاصا ماہر کر رکھا ہے۔ اگر یہاں کوئی کام آسانی سے کر لوں تو یہی میرے لیے آسان کام ہوگا۔"
ٹھیک ہے صبح روبینہ باجی سے بات کرتی ہوں سبینا نے اس کے بازو پر اپنا سر ٹکاتے کہا پھر وہ دنیا مافیا سے بے نیاز ہو گئے۔
صبح روبینہ نے یہ مشورہ دیا کہ مارکیٹ میں ایک جاننے والے کے پاس اسے چند روز تک کام سمجھنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں پھر جب یہ شہر کی صورتحال کے قابل ہو جائے گا تو اس کو کہیں شاپ کھول دیں گے۔ دونوں نے روبینہ کی بات سے اتفاق کیا، ڈیوٹی سے فارغ ہو کر کوارٹر لاک کرتے تینوں مٹن مارکیٹ جانے کے لیے چل پڑے، روبینہ کے واقف کار قصاب نے اپنی شاپ پر اچھو کو کام سکھانے کی حامی بھر لی۔
دوسرے روز اچھو مٹن مارکیٹ میں کام سیکھنے کی غرض سے امین قصاب کی شاپ پر پہنچ گیا۔ اب اس کا معمول بن گیا مارکیٹ سے واپس آ کر وہ سبینا کے ساتھ ادھر اُدھر گھومنے نکل جاتا اور رات گئے دونوں واپس اپنے کمرے میں آتے۔ سبینا اس پر کافی مہربان تھی جس کے باعث اچھو کو ماسوائے اس کے کہیں اور کی کوئی پرا نہیں تھی حتیٰ کہ اسے اپنی بہن تک کی یاد بھول گئی تھی۔ پورے شہر کو اچھو نے ازبر کر لیا تھا۔ گاؤں کی ایک ہی ڈگر پر چلنے والی زندگی سے نکل کر وہ شہر کی ہنگامہ خیزی میں رچ بس گیا تھا۔ امین کی توجہ سے وہ اب اس کی غیر موجودگی میں مٹن شاپ چلانے کے لائق ہو گیا۔ امین دوپہر کو اسے مٹن شاپ پر چھوڑ کر خود بکر منڈی چلا جاتا تھا اچھو اب مکمل دوکاندار بن چکا تھا۔
دونوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب اچھو کو کسی مناسب جگہ پر اپنی دوکان کھول دینی چاہئے۔ وہ بکر منڈی بھی آتا جاتا تھا امین کے ساتھ، اسے جانور بھی لینے دینے آ گئے تھے اور کئی ایک اچھے لوگوں سے اس کی واقفیت بھی ہو چکی تھی۔ روبینہ کے کسی جاننے والے نے شہر کے ایک پوش

علاقہ میں بنی مارکیٹ کے کونے پر عارضی جگہ لے دی اور سامان رکھنے کا بندوبست سامنے کے سبزی والے کو کہہ کر کر دیا۔ پہلے روز اس نے دو بکرے سلاٹر ہاؤس سے لیے اور اللہ کا نام لے کر اپنی دوکان پر آن بیٹھا۔ سبزی والے نے بھی اس کی مدد کی اور کئی گاہک اس کے پاس بھیجے، دوپہر تک اچھو دونوں بکرے بیچ کر فارغ ہو گیا۔ اچھا گوشت اور گاہک کی مرضی شامل ہونے پر اچھو کا کام بہتر سے بہتر ہوتا گیا۔ اسی دوران مارکیٹ کے اندر ایک دوکان خالی ہوئی تو مارکیٹ کے مالک نے جو اچھو سے گوشت خریدتا تھا، اس نے کرایہ پر دوسروں سے کم ایڈوانس پر دینے کی پیشکش کی تو اس نے سبینا سے بات کی جس نے فوراً لینے کا کہا۔

''مگر ہمارے پاس تو ایڈوانس کی رقم کہاں سے آئیگی؟''

''یہ سوچنا میرا کام ہے۔ سبینا نے اچھو سے یہ کہتے رقم کا بندوبست کر دیا کہ میں نے اپنا زیور اور روبینہ سے اُدھار لے لیا ہے۔ اچھو قصاب نے باہر سے اٹھ کر اندر مارکیٹ میں مٹن کی شاپ کھول لی اور روز بروز اس کا کام ترقی کرتا چلا گیا۔ گھر کی مٹن شاپ تھی اور گھر میں گوشت کی گنگا بہنے لگی۔ ایک دوبارا اچھو نے سبینا سے بات کرنے کی کوشش کی کہ ہم الگ سے مکان لے لیتے ہیں کب تک یونہی روبینہ کے گھر میں بیٹھے رہیں گے۔ جواب میں سبینا نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کر دیا کہ ہمارے رہنے سے روبینہ کو کوئی ٹینشن نہیں۔ اگر تمہیں محسوس ہوتا ہے تو اوپر والے حصہ کا کرایہ مقرر کر دو۔

''یہ بات ٹھیک ہے۔'' اچھو نے کھانا کھاتے سبینا کی تجویز کو مانتے جواباً کہا۔

''اور ہاں اچھو سامنے والوں نے قیمہ لانے کے پیسے دیئے تھے ساتھ میں گھر کے لیے بھی ڈھیر سارا قیمہ لیتے آنا شام کو۔'' دوسرے روز اچھو پڑوسیوں کا اور گھر پکانے کے لیے کافی سارا قیمہ بنا لایا۔ روبینہ اور سبینا نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیں۔

اچھو مارکیٹ سے جلد فارغ ہو کر واپس کوارٹر پہنچا تو باہر تالا پڑا ہوا تھا۔ وہ اسی طرح سامان جو وہ گھر کے لیے لایا تھا پکڑے پکڑے واپس کالج کی لیب کی طرف چل پڑا۔ اکثر سبینا روبینہ کی لیب میں چلی جاتی تھی، مگر روبینہ نے جواباً بتایا کہ وہ یہاں نہیں آئی شاید گھر کا ضروری سامان لینے نہ چلی گئی ہو، تم یہ چابی لے جاؤ آخری پیریڈ پریکٹیکل کا ہے میں بھی فارغ ہو کر آتی ہوں۔'' روبینہ نے چابی اسے پکڑاتے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے چابی لی اور کوارٹروں کی جانب چل پڑا جب وہ اپنے کوارٹر کے قریب آیا تو کئی خونخوار کتوں کو اِدھر اُدھر بے چینی سے چکر کاٹتے پایا اور کوارٹر اندر سے بند تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ سبینا اس کے جانے کے بعد واپس آ چکی تھی۔ اچھو پر نظر پڑتے وہ کتے دور بھاگ گئے، مگر کوارٹر کے آس پاس تھے جب سے وہ یہاں رہ رہے تھے آج پہلی بار اتنے سارے بڑے بڑے کتے اس نے دیکھے تھے۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر سبینا نے اندر سے کنڈی کھولی تو یکدم سارے کتے دروازے کی طرف لپکے، اچھو نے اندر داخل ہو کر جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

''کہاں گئی تھیں تم؟''

''ذرا بازار تک کچھ چیزیں لانا تھیں۔'' سبینا نے سامان اس کے ہاتھ سے پکڑتے جواب دیا۔ جب وہ سامان پکڑنے اس کے قریب آئی تو اچھو کے نتھنوں میں اس کے جسم سے پھوٹتی سمجھ نہ آنے والی مہک ٹکرائی جو پہلی بار اس کے احساس کو چھوتی اسے مدہوش کر گئی تھی۔ سبینا سامان رکھنے اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ باہر کتوں کے بھونکنے کی کرب ناک آوازیں ان کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ اچھو نے اسے مخاطب کیا اور پہلی بار اتنے کتے کوارٹر کے اِدھر اُدھر بے چینی سے بھونکنے کا سبب پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم؟'' سبینا نے لیٹ کر کروٹ بدلتے جواب دیا۔ ''ان کی بے چینی یہ ثابت کر رہی ہے جیسے آس پاس کوئی کُتیا ہے جیسے ہمارے گاؤں میں ایک کُتیا کے پیچھے کئی ایک آوارہ کتے ایک دوسرے کو نوچتے اور مرنے مارنے پر تُل جاتے مگر مجال ہے وہ اس کا پیچھا چھوڑیں۔''

''اچھا تم اپنے گاؤں کی کہانی چھوڑو ان کو بھونکنے دو یہ ان کی عادت میں عام بات ہے۔'' اچھو سبینا کے وجود سے پھوٹنے والی اس عجیب و غریب بُو سے تمام رات اُلجھا رہا، مگر اس نے سبینا پر یہ بات ثابت نہ ہونے دی

کہ وہ اس سے خاصا بیزار ہے۔

صبح جب وہ سلاٹر ہاؤس جانے لگا تو کئی بڑے چھوٹے کتے کواٹر کے باہر اِدھر اُدھر پڑے ہوئے تھے۔ اچھو پر نظر پڑتے ہی وہ یکدم چوکنے ہوگئے جیسے کوئی ان سے بڑا خونخواران کی ہی برادری کا ہو۔ وہ ان سے بچتا ہوا کالج کے گیٹ کی طرف چل پڑا، مگر تمام دن وہ کام کے دوران ان کتوں اور سینا سے آنیوالی بُو کے بارے میں غور کرتا رہا۔ شام کو جب واپس آیا تو کتے اسے اپنا استقبال کرتے ملے، مگر اسے قریب پا کر وہ دور بھاگ جاتے۔ یہ سلسلہ تین چار روز تک یونہی جاری رہا۔ اس دوران وہ عجیب بُو جو سینا کے وجود سے اُٹھ رہی تھی وہ قدرے کم ہوگئی۔ ادھر کتوں کی تعداد ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگئی تھی۔ سینا دن رات اُدھ موئی سی پڑی رہتی جیسے اس کا جسم نقاہت سے چور چور ہوا۔ چھو گھر آتے ہی اس کی خدمت میں لگ جاتا۔ روبینہ گھر کے کام کرتی جبکہ سینا بیڈ پر پڑی رہتی ایک دو بار اچھو نے کوشش کی کہ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائے مگر اس نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ خود بخود ٹھیک ہو جاؤں گی تم فکر نہ کرو اس صورتحال سے ہم خواتین کو گزرنا پڑتا ہے۔ سینا کے جواب سے اچھو مطمئن ہوگیا۔

ایک روز اچھو کو آنے میں دیر ہوگئی تو سینا پریشان ہو گئی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اچھو اتنی رات گئے تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ روبینہ بھی پریشان تھی اس بات پر۔ آخر باہر دستک ہوئی سینا نے بھاگ کر دروازہ کھولا تو سامنے اچھو کو بُری حالت میں کھڑا پایا، ہونٹوں سے خون رس رہا تھا اور سامنے کے حصہ سے قمیض بھی بُری طرح پھٹی ہوئی تھی۔ روبینہ بھی آ گئی اسے اس حالت میں پا کر وہ بھی پریشان ہوگئی اور پوچھا ''یہ کیسے ہوا؟''

''سامنے والی دوکان کے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اسے لے کر میں بھی ان کے ہمراہ ہسپتال چلا گیا تھا، وہاں دیر ہوئی واپسی پر چھوٹا گیٹ اندر سے بند تھا، میں بڑے گیٹ کو پھلانگ کر اندر آ گیا۔ بڑے دفتر کے رات والے چوکیدار سے تکرار ہوگئی اور ہاتھا پائی میں اس نے میرے تھپڑ دے مارا، میرا ہونٹ پھٹ گیا۔'' اچھو نے پھٹی قمیض اُتارتے روبینہ کو بتایا۔

''چلو کوئی بات نہیں، تم منہ دھو کر دوسرے کپڑے بدل لو، سینا کہتے اوپر چل پڑی۔ روبینہ منہ میں بڑبڑاتی اپنے کمرے کی طرف ہوگئی۔ معمولی بات تھی ایک دو روز بعد حالات نارمل ہوگئے۔

ناغہ والے دن اچھو بے فکری سے پڑا سویا رہتا تھا مگر باہر ہونے والے شور نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ سینا اور روبینہ نیچے والے کمرے میں تھیں۔ وہ اُٹھ کر ان کی طرف آیا تو وہ بھی بے خبری سے ایک دوسری میں گھٹی بے ترتیبی سے خراٹے بھر رہی تھیں۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا تو آس پاس کے سبھی رہائشی جمع تھے۔ اچھو نے دریافت کیا کہ کیا مسئلہ ہے تو اسے پتہ چلا کہ کسی خوفناک درندے نے رات کو بڑے دفتر کے چوکیدار کو نوچ نوچ کر مار ڈالا اور کئی جگہ سے اس کا گوشت بھی چبا ڈالا، اچھو نے کوارٹر کا دروازہ باہر سے بند کیا اور مین آفس کی طرف چل پڑا، وہاں خاصا رش لگا ہوا تھا۔ پولیس موقع واردات کا معائنہ کر رہی تھی سامنے اس چوکیدار کی جگہ جگہ سے نوچی لاش پڑی تھی جیسے کئی کتوں نے مل کر اس پر حملہ کر کے اس کو مار ڈالا ہو۔ فوراً اس کے ذہن میں وہ بہت سارے خونخوار کتے جاگ اٹھے جو کچھ دنوں پہلے اس کے کوارٹر کے آگے دن رات جمع رہتے تھے پھر اچانک غائب ہوگئے تھے۔ ہوسکتا ہے اس نے ان آوارہ کتوں پر حملہ کیا ہو اور وہ مل کر اس پر پل پڑے ہوں۔ کچھ دیر تک وہ وہاں ساری کارروائی دیکھتا رہا پھر واپس کوارٹر کی جانب چل پڑا۔

کچھ دن گزرے تھے کہ کالج کی اس سائیڈ جہاں پر مرکزی قبرستان تھا، اس سڑک پر رات کو ناکہ پر کھڑے پولیس قومی رضار کی اسی طرح ادھڑی ہوئی لاش صبح پڑی ملی اوپر نیچے دو وارداتوں نے پورے شہر میں خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔ لوگ رات کو گھروں سے نکلتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اچھو نے سینا اور روبینہ کو مخاطب کرتے کہا کہ یہ اچانک کونسی بلا اس شہر میں آن وارد ہوئی ہے مجھے تو خود صبح منہ اندھیرے نکلنا ہوتا ہے اچھو کے چہرے پر خوف و پریشانی دکھائی دے رہی تھی، دونوں نے ایک دوسرے کی جانب مسکراتی آنکھوں سے دیکھا۔ ''بجائے ہم دونوں کو تسلی دینے کے تم تو خود ڈر رہے ہو'' سینا نے اچھو پر فقرہ کسا۔ ''تمہارے گھر سے نکلنے کے بعد ہم دونوں گھر میں اکیلی رہ

جاتی ہیں۔ اگر وہ بَلا، یا جو کوئی بھی ہے ادھر آ گئی تو ہم ٹھہری کمزور لڑکیاں کیا بنے گا ہمارا؟" روبینہ نے اسے اپنی طرف مخاطب کرتے پوچھا۔ "تمہیں اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے جاتا ہوں۔" اچھو نے اپنا اندرونی خوف دباتے جواباً کہا۔

اچھو کہنے لگا یہ جو میں نے آپ کو ابھی تک بتایا ہے ملے جلے واقعات ہیں مگر اب میں وہ کہنے جا رہا ہوں جس کی مجھے سزا ہوئی ہے۔

جب سے سینا میری زندگی میں وارد ہوئی تھی مجھے اس کے سوا اور کچھ سوجھ بوجھ ہی نہیں رہی تھی۔ میرا کام خاصا بڑھ چکا تھا میں بہت کوشش کرتا کہ اپنی کمائی ہوئی رقم سینا پر خرچ کروں، مگر وہ انتہا درجے کی سادہ اور الگ تھلگ رہنے والی لڑکی تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس کی فرمائش یہ ہوتی تھی کہ میں گھر آتے قیمہ، دل کلیجی اور بغیر ہڈی کے بوٹیاں لیتا آؤں جو میں نے جب سے دوکان کھولی تھی باقاعدگی سے لا رہا تھا۔ دونوں بڑی رغبت سے بھون بھون کر کھاتیں اور مجھے بھی کھلاتیں جب وہ کچن میں ہوتیں تو مجھے یہ کہہ کر اوپر بھیج دیتیں کہ گوشت سے اُٹھنے والا دھواں آئے گا تمہیں، میں اوپر ہی لاتی ہوں تم جاؤ۔ میں اس کی بات مان کر اوپر چلا جاتا۔

ایک رات میں واش روم جانے کے لیے اُٹھا تو سینا بیڈ پر نہیں تھی میں سمجھا وہ واش روم ہے، مگر واش روم کا دروازہ کھلا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ سینا واش روم میں نہیں تھی میں نے اوپر دیکھ کر نیچے جانے کا فیصلہ کیا کہ اس وقت وہ مجھے سویا چھوڑ کر روبینہ کے پاس کیا لینے گئی ہوگی۔ نیچے مکمل خاموشی اور گہرا اندھیرا تھا۔ میں نے روبینہ کے کمرے کو دیکھا پھر کچن اور باہر والا کمرہ دیکھا مگر وہ دونوں نظر نہ آئیں۔ میں اندر سے لگی کنڈی دیکھ کر اور بھی زیادہ فکر مند ہو گیا اگر وہ باہر گئیں ہیں تو پھر اندر کون ہے جس نے کنڈی اندر سے لگا دی۔ میرے وجود میں عجیب طرح کی کیفیت ابھر کر ڈوب گئی۔ اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں چلتا ہوا واش روم آیا اور پھر بغیر روشنی کیے اپنے بیڈ پر آ گیا۔ میرے کان ہر آہٹ پر لگے ہوئے تھے مگر پورے کوارٹر میں صرف مجھے اپنی ہی سانس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی یکدم میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سینا دروازے سے اندر آ رہی تھی میں اسی طرح بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا جیسے میں بے خبر پڑا سو رہا ہوں۔ وہ آہستہ سے بیڈ کے دوسرے کونے میں لیٹ گئی۔ مجھے کمرے سے ایسی بُو آنے لگی تھی جیسے دو تین دن پرانی انسانی لاش سے آتی ہے۔ میں اس صورتحال سے خاصا پریشان ہو چکا تھا۔ نیند مجھ سے کوسوں دور، مگر سینا پڑی بے خبر سو رہی تھی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ سینا سو چکی ہے۔ میں چپکے سے اٹھا اور نائٹ بلب روشن کرتا ہوا اس کے قریب آ گیا، اس کا چہرہ مدھم روشنی میں مجھے عجیب سا دکھائی دیا، جو ہاتھ اور کلائی اس نے اپنے سینے پر رکھی ہوئی تھی اس پر جگہ جگہ خون لگا ہوا تھا۔ غور سے دیکھنے پر اس کے ہونٹوں پر بھی خون کی سرخی دکھائی دی، اس سے پہلے کہ کوئی گڑبڑ ہوتی میں نے نائٹ بلب آف کر دیا اور دبے قدموں چلتا ہوا بیڈ پر آن لیٹا۔

میرا تجسس بڑھ رہا تھا کہ آخر یہ ماجرہ کیا ہے سینا کے جسم پر تازہ خون اچانک میرے ذہن میں ایک خوف اُبھر کر ڈوب گیا کہیں روبینہ کو تو اس نے......

اس سے آگے میں سوچتا چلا گیا بڑی ہمت کر کے میں اُٹھا اچھی طرح تسلی کر لینے کے بعد کہ سینا بے خبر پڑی سو رہی ہے دبے قدموں چلتا سیڑھیاں اُتر آیا، روبینہ کا کھلا دروازہ اب اندر سے بند تھا۔ میں کمرے کی کھڑکی کی طرف آ گیا، لہراتے پردے کے کونے سے اندر جھانکا روبینہ نیم لباس میں اپنے بیڈ پر کروٹ لیے لیٹی سو رہی تھی اور قریب پڑی قمیض پر خون کے دھبے نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ اب میرا یہ حال تھا کہ ڈر کے مارے کانپ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں آواز کیے بغیر اوپر آ کر لیٹ گیا۔ کب نیند نے آ لیا خبر نہ ہوئی۔

سینا حسبِ عادت میرے قریب بیٹھی مجھے جگا رہی تھی سلاٹر ہاؤس جانے کے لیے۔ میں نے اس پر کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ رات کی ساری صورتحال میرے علم میں ہے۔ میں روز کی طرح اٹھا ضروریات سے فارغ ہو کر سینا کا بنایا ناشتہ کرنے کے لیے، ساتھ ہی کن اَکھیوں سے اس کے سراپے کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو صاف ستھرا کر رکھا تھا اور رات والے کپڑے بھی بدل لیے تھے۔ دھونے والے تمام کپڑے سیڑھیوں کے نیچے کونے میں رکھے ہوئے تھے۔ میں نے

سینا سے آنکھ بچا کر جلدی سے اس کے اُتارے کپڑے چیک کیے تو ان پر جگہ جگہ خون جما ہوا تھا۔ پھر میں اپنے کام پر جانے کے لیے کواٹر سے باہر نکل آیا۔ جب رکشہ اسٹیشن کے قریب پہنچا تو وہاں بہت سارے لوگ جمع تھے۔ چھوٹے سے ہوٹل کے اگلے تھڑے پر روٹیاں لگانے والے بدنصیب کی جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔ قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی سے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ اسے بھی کسی خوفناک بلا نے چیر پھاڑ ڈالا تھا۔ مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا، میری سمجھ میں کچھ کچھ آرہا تھا۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا اور بے دلی سے دوکانداری کی۔

شام کو واپس آتے میں نے جان بوجھ کر گھر کے لیے گوشت وغیرہ نہ لیا میں دونوں کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا، مگر دونوں نے اس بات کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ شام کے کھانے کی جگہ مجھے اور خود دونوں نے دودھ پیا، میں جان تو گیا تھا کہ یہ دو چار روز اسی طرح کریں گی کیونکہ چوکیدار کے قتل سے بعد بھی گھر میں ایسا ہی ہوا تھا پھر سب کچھ روٹین میں ہونے لگا۔ خون تو دونوں کے کپڑوں اور جسم پر میں دیکھ چکا تھا اب صرف مجھے اس بات کا انتظار تھا کہ دونوں کب انسانی شکار پر نکلتی ہیں۔ جو کچھ میرے مشاہدے میں آرہا تھا اسے میں سابقہ روٹین اور موجودہ صورتحال سے ملا کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

گزشتہ دو وارداتوں کے بعد دونوں اسی انداز میں نڈھال ہو کر دو تین دن واجبی سا کھاتی پیتی تھیں۔ میں نے کبھی نوٹس نہیں لیا تھا۔ جب سے میرے دیکھنے میں آیا تو پچھلی ساری کڑیاں جوڑتے جوڑتے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ دونوں مافوق الفطرت چیزیں ہیں جو انسانوں کی شکل میں انسانوں کے بیچ رہ رہی ہیں۔ فدا بھٹہ صاحب نے بتایا تھا کہ جنات اکثر سانپ کی شکل میں دکھائی دیتا ہے اگر وہ راستہ روک لے تو اسے تنبیہہ کرتے کہا جائے کہ اگر تو جن ہے تو راستہ چھوڑ دو۔ اگر وہ چلا جائے تو جن۔ اگر نہ جائے تو اسے ٹھکانے لگا دینا چاہیے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ اگر ایسے حالات میں جو بھی شکل اختیار کر رکھی ہو اس نے تو وہ مرنے کے بعد بھی اسی شکل میں رہے گا۔ میرے وجود میں سینا کا خوف اس لیے بھی کم تھا کہ وہ میری شریک حیات کے طور پر میرے ساتھ بلکہ مجھے اس نے اپنے ساتھ رکھ چھوڑا تھا مگر جو حالات پہ در پہ سامنے آرہے تھے، اس وجہ سے میں خاصا پریشان ہو چکا تھا۔ میں نے ان پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ مجھے ان دونوں پر شک ہو چکا تھا کہ جو قتل بار بار شہر میں ہو رہے ہیں ان کی نشاندہی اور میرا آنکھوں دیکھا منظر مجھے یقین کی سطح پر لے آیا تھا۔

روبینہ نے مجھے مخاطب کرتے پوچھا کہ ”اچھو بھائی آج کل آپ چپ چپ اور گم صم سے رہنے لگے ہیں اور گھر گوشت وغیرہ بھی نہیں لا رہے، کہیں کاروبار میں کمی بیشی تو نہیں چل رہی۔

”نہیں آپی، میں روبینہ کو آپی کہہ کر بلاتا تھا۔

”دراصل گوشت اچھا نہیں مل رہا۔“ میں نے بات بنائی۔

”تو ٹھیک ہے آج گھر کا سامان لینے جانا ہے۔ ہم لیتے آئیں گے۔“

”روبینہ میں بھی دیکھ رہی ہوں کہ یہ مجھ سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔“ سینا نے بیچ میں بولتے ہوئے شکایتی انداز میں میری طرف دیکھا۔

گوشت کا ناغہ تھا اس لئے میں گھر پر ہی تھا وہ دونوں مارکیٹ سودا وغیرہ لینے چلی گئیں تو میں نیچے آگیا پورے کمرے کا جائزہ لیا حتیٰ کہ روبینہ کے رکھے سامان کو بھی دیکھا مگر کوئی بھی غیر ضروری چیز نہ دکھائی دی ماسوائے اس رات کو دیکھے گئے واقعات کے۔ آہستہ آہستہ زندگی پھر سے اسی ڈگر پر رواں دواں ہو گئی۔ میں پھر سینا کے اشاروں پر چلنے لگا۔ گوشت سے فریج پھر بھر گئی۔ اب وہ خود بھی آتے جاتے مارکیٹ سے اپنی پسند کا گوشت وغیرہ لے آتی تھیں۔ میں نے اس بات کا کوئی نوٹس نہ لیا مگر میں اب رات کو خبردار ہو کر سوتا تھا۔

سینا بے فکری سے پڑی سوئی رہتی۔ اس کی محبت میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ میں اسی کشمکش میں رہا کہ وہ میرا وہم تھا ہو سکتا ہو میں نے وہ سب کچھ خواب میں دیکھا ہو اور اسے سچ جان بیٹھا، مگر ہر پل میں دونوں کی ٹوہ میں رہتا تھا۔ اب میں جان بوجھ کر گھر کے لیے قیمہ اور دل کلیجی لاتا وہ بھی خون میں لتھڑی ہوئی، مگر ان کی طرف سے کوئی ایسی بات دکھائی نہ دی جس سے میرا وہم یقین

میں بدل جاتا۔ ان وارداتوں میں کئی ماہ سے کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی تھی اور لوگ آہستہ آہستہ سب بھول چکے تھے میں دونوں کے ساتھ نارمل رویہ اختیار کر چکا تھا۔

دو دن سے آپی کی طبیعت خراب تھی اور گھر کا سارا کام دھندا سبینا کر رہی تھی، اب بھی وہ نیچے تھی، میں آپی کی خیریت دریافت کرنے کے لیے اٹھا اور سیڑھیاں اترتے نیچے آ گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور وہ دونوں کمرے میں تھیں۔ پہلے خیال آیا کہ دستک دوں، مگر پھر رُک گیا اور دروازے کی درمیانی درز سے آنکھ لگاتے اندر جھانکا۔ دونوں بیڈ پر بیٹھی کچھ کھا رہی تھیں، ذرا غور کیا تو میں بُری طرح چونکا پلیٹ میں میرا لایا گوشت اور دل کلیجی تھی اور وہ دونوں کچا ہی کھانے میں مصروف تھیں۔ میرے پاؤں مَن مَن کے ہو رہے تھے۔ میں دبے قدموں چلتا اوپر اپنے کمرے میں آ گیا اور بیڈ پر کٹے درخت کی مانند گر پڑا۔

میرا ذہن بُری طرح ڈاواں ڈول ہو رہا تھا مجھے وہ سب کچھ یاد آنے لگا کہ جب یہ دونوں کچن میں کباب وغیرہ بنا رہی ہوتی تھیں تو مجھے کیوں دھوئیں کے بہانے اوپر بھیج دیتی۔ ”یہ کون تھیں؟ اور کیا راز تھا ان کا؟“

مجھے سبینا گھڑ سرائے کے کھنڈرات میں اس حالت میں ملی تھی کہ جیسے وہ سچ مچ گھر سے فرار ہو کر آئی ہو، وہاں تاریک کھنڈر میں بے خوف و خطر اکیلی۔ ”یا خدا مجھے معاف کرنا۔“ میں ان کی اصلیت جان چکا تھا۔ شہر میں ہونیوالی قتل کی وارداتیں ان کا ہی کیا دھرا ثابت ہوا۔ یہ سوچ کر کہ یہ دونوں کبھی بھی میرا کام تمام کر سکتی ہیں، میں کانپ کر رہ گیا۔ اب میں ہر پل آنے والے وقت سے نمٹنے کے لیے تیار رہتا۔ پہلے میں نے سوچا کہ چپکے سے بھاگ جاؤں، مگر پھر یہ سوچ کر کہ جاؤں گا کہاں۔ سبینا اور روبینہ کی غیر مرئی قوت کا مظاہرہ میں اس رات دیکھ چکا تھا، جب دروازہ اندر سے بند تھا اور یہ دونوں گھر پر نہیں تھیں اور پھر اچانک جیسے آسمان سے ٹپک پڑی ہوں۔ جو بھی تھیں مگر تھیں پُراسرار، دونوں انسانی شکل اور وجود میں۔ میں نے گوشت کاٹنے والا چھرا دکان سے لا کر اپنے کمرے میں چھپا رکھا تھا۔ اپنی حفاظت کیلئے اور خود ہر پل چوکنا تھا دونوں مجھ سے بے خبر تھیں کہ مجھے ان کی اصلیت کا پتہ چل چکا ہے۔

ایک دو روز سے میں ان پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا، خاص کر سبینا پر جو ضرورت سے زیادہ ایکٹو تھی۔ اس کی آنکھوں کی بے چینی بتا رہی تھی کہ کچھ ہونیوالا ہے۔ میں کھانا کھانے کے بعد نیچے والے کمرے میں آ گیا جہاں ٹی وی رکھا ہوا تھا، تھوڑی دیر بعد میں اوپر آ گیا۔ سبینا کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے کتاب رکھ دی اور میرے پاس بیڈ پر آ بیٹھی۔

”کیا بات ہے جلد آ گئے۔“

ہاں تھکاوٹ سی تھی نیند آ رہی ہے۔“

”چلو سو جاؤ میں تمہارا سر دبا دیتی ہوں۔“ اس نے میرا سر اپنے ہاتھوں میں لیتے کہا اس کے دبانے سے مجھے راحت تو مل رہی تھی، مگر اندرونی کیفیت مجھے خبردار کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میں نے آنکھیں بند کرتے سونے کی ایکٹنگ کی اور پھر میں خراٹے لینے لگا۔ مجھے اچھی طرح سوتے دیکھ کر وہ بیڈ سے اُٹھی اور دروازہ بند کرتے باہر نکل گئی۔ میں دم سادھے پڑا سوتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد سیڑھیوں پر آہٹ ہوئی، میں کروٹ لئے بظاہر سو رہا تھا، مگر نیم وا آنکھوں سے دروازے کی ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور دونوں اندر آئیں مجھے سوتے دیکھ کر وہ دونوں مطمئن ہو گئیں اور دوبارہ دروازہ بند کرتے باہر نکل گئیں۔

جب مجھے مکمل یقین ہو گیا کہ نیچے کوئی حرکت نہیں ہو رہی میں بڑی آہستگی سے اٹھا اور بغیر آواز پیدا کیے دروازہ کھولتے بڑے محتاط انداز میں سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گیا دروازہ اندر سے بند تھا اور وہ دونوں غائب تھیں۔ اچھی طرح یقین کر لینے کے بعد میں ڈرا سہا اوپر آ گیا۔ پہلے میرا دل کیا کہ بھاگ جاؤں، مگر اس ڈر سے کہ وہ مجھے ڈھونڈ لیں گی اس لیے دل مضبوط کر کے ان کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ رات کے آخری پہر ان کے آنے کے آثار محسوس ہونے لگے۔

میرے کان مسلسل آہٹ کی طرف متوجہ تھے، واش روم میں بہتے پانی کی آواز پر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ خود کو صاف کر رہی ہے پھر تھوڑی دیر بعد سبینا میرے پاس بیڈ پر آ لیٹی۔

ایک دو بار اس نے جان بوجھ کر مجھ پر بازو پھینکا، جیسے نیند میں کروٹ لیتے وہ کرتی تھی۔ میں نے اس پر

یہی ظاہر کیا کہ میں بے خبر سو رہا ہوں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بے سدھ ہو کر سو چکی ہے۔ میں نے اپنے دل میں باندھے پکے ارادے کو عملی جامہ پہنانے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ خود کو ہر زاویے پر جانچنے کے بعد میں نے سبینا پر گہری نظر ڈالی جو سوتے میں بڑی معصوم دکھائی دے رہی تھی پھر یکدم جیسے مجھے ہوش آ گیا اور میں اپنی پوری قوت صرف کرتے اٹھا اور کمرے میں چھپایا ہوا چھرا نکالتے سبینا کے قریب آ گیا۔

اس کا چہرہ دوسری جانب تھا اور گردن میری نظر کی زد میں تھی۔ میرے اندر کا قصاب جاگ گیا تھا۔ میرا ہاتھ اُٹھا اور سبینا کا سر تن سے جدا ہو کر بیڈ سے نیچے جا پڑا۔ اس کے تڑپتے جسم کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ رکھا تھا پھر وہ ساکت ہو گئی۔ اس کا سر بالوں سے پکڑ کر میں نے اس کے جسم کے ساتھ رکھتے بستر کی چادر میں اس کو اچھی طرح لپیٹ دیا اور اسی پوزیشن میں چھرا پکڑے دبے قدموں سیڑھیوں کی طرف آ گیا۔ روبینہ کمرے میں نائٹ بلب کی روشنی میں ڈوبی بے خبر پڑی سو رہی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا جو بغیر آواز کے اندر کی جانب کھل گیا میرے اندر جو جنونی جذبہ موجزن تھا اس میں انسانیت کی بھلائی کارفرما تھی۔ جوان دونوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا موجب بن گیا۔ وہ میرے کمرے میں آنے سے بے خبر پڑی خراٹے لے رہی تھی۔ پل بھر کو میں اس کا جائزہ لیتا رہا کہ عام زندگی میں سیدھی سادھی دکھائی دینے والی روبینہ درحقیقت کوئی خون آشام بلا ہوگی۔ یہی سوچ سبینا کے لیے تھی مگر دونوں بے قصور انسانوں کی قتل و غارت گری میں ملوث، خدا جانے کب سے چلی آ رہی تھیں۔ میرا ہاتھ اٹھا اور ساتھ ہی روبینہ کا سر بھی تن سے جدا ہو گیا۔ اسے میں اسی طرح تڑپتا چھوڑ کر چھرا لے کر باہر نکل آیا۔ دروازہ باہر سے بند کرتے پیدل جانے والے راستے کی طرف ہو گیا۔ جسے کوارٹر کے مکین باہر جانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

میرا سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ چلتے چلتے میرے پاؤں میرا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالتے کوتوالی پہنچا اور چھرے سمیت خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ میرے اقرار جرم پر پولیس پارٹی کالج کے کوارٹر پہنچی اور دونوں کی لاشیں قبضہ میں لے کر پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیں جہاں پہلے سے ایک لاوارث لاش موجود تھی۔ جسے کسی بے رحم نے اسٹیشن کے بتی گودام کے قریب بُری طرح چیر پھاڑ ڈالا تھا۔

اس دن کے بعد شہر میں کوئی بھی اس طرح کی دل دہلا دینے والی واردات نہ دیکھنے اور نہ سننے میں آئی ہے۔ اچھو نے اٹھتے ہوئے بتایا اور واپس اپنے سیل کی طرف چل پڑا۔

☆☆......☆☆

دیارِ غیر سے، زندگی کی تصویریں

سرحد پار سے پہلی تاریخی تصویر

بازگشت



محمد سلیم اختر

سرحد پار سے ایک تاریخی رنگ جسے سلیم اختر نے آہنگ دیا

یہ برسوں پہلے کی بات ہے 1832ء میں شکر گڑھ، ضلع سیالکوٹ کا ایک شخص بدھ سنگھ، بہادر راجا رنجیت سنگھ کے ذاتی گھوڑے کا سائیس مقرر ہوا۔ ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے بدھ سنگھ مہاراجا سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا، اسی لیے دونوں میں اکثر بے تکلفانہ قسم کی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ بدھ سنگھ کی ایک لڑکی تھی جس کا نام چندکور تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف دس سال تھی، لیکن تب بھی وہ تیکھے نین نقش، شوخ طرح دار گورے بدن اور کشمیری حسن کا نادر نمونہ تھی۔

بدھ سنگھ اکثر اپنی چھوکری کو کندھے پر بٹھائے مہاراجا کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ بھاگتا تھا۔ مہاراجا کی عمر اس وقت پچپن برس تھی۔

بدھ سنگھ اکثر مہاراجا سے کہا کرتا تھا کہ ''بادشاہو! میری صرف ایک خواہش پوری کر دو، میری بیٹی کو اپنی رانی بنا دو۔''

رنجیت سنگھ جواب میں کہتا۔ ''بدھ سنگھ! تو بہت کمینہ آدمی ہے۔ تیری چھوکری کی عمر ابھی بہت کم ہے اور وہ میری رانی بننے کے قابل نہیں ہے۔''

غرض کہ جب مہاراجا اسے اس طرح ٹال دیتا، تو بدھ سنگھ مہاراجا کو اکسانے کی غرض سے کہتا۔

''مہاراجا جی! سچ سچ بتا دو، کیا واقعی اب تم کوئی نئی رانی رکھنے کے قابل نہیں رہے؟''

رنجیت سنگھ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کوئی اور بات برداشت کرے نہ کرے، مگر وہ اپنی مردانگی پر حملہ کبھی بھی برداشت نہیں کرتا تھا، آخر اس نے ایک دن تنگ آ کر بدھ سنگھ سے کہا۔

''اچھا اپنی لڑکی کو آج ہی محل میں بھیج دینا۔''

رنجیت سنگھ نے نابالغ چندکور کو اپنے وزیر دھیان سنگھ کی تحویل میں دے دیا کہ لڑکی کے جوان ہونے تک اسے شاہی آداب سکھائے جائیں۔

چندرکور کو امرتسر میں مصر یا کر آج (پنجاب کے کروڑ پتی بینکر اور سکھ دربار کے خزانچی) کے مکان پر رکھا گیا، جہاں وہ چھ سال تک شاہی ادب و آداب اور رکھ رکھاؤ کی تعلیم و تربیت حاصل کرتی رہی۔

جب وہ سولہ برس کی ہو گئی تو اس کے جسم سے شباب پھوٹا پڑتا تھا۔ اس کے چہرے کی رعنائی بے مثال تھی اور ادا میں بے حجابی اور وارفتگی سے لوگوں کے دلوں پر بجلیاں گراتی تھی۔ اس کے کردار میں ہرجائی پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ مردوں سے بلا تخصیص قوم و ذات و پات تعلقات رکھنے کو بے حد

پسند کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تعلقات قائم کرنے میں بھنگی، ماشکی، تیلی، سقہ، وزیر، امیر، غریب میں کوئی تخصیص نہ کرتی تھی۔

1837 میں 57 سالہ رنجیت سنگھ نے چندکور کو لاہور لاکر اور اس کو رانی کا درجہ دے کر بڑی دھوم دھام سے اس سے شادی کرلی۔ وہ شاہی قلعے میں شیش محل کے قریب ہی ایک عالی شان چوبارے میں رہنے لگی، گو کہ وہ چوبارہ اب تو منہدم ہو چکا ہے، لیکن کچھ عرصے تک وہاں یہ تختی لگی رہتی تھی کہ یہاں چندکور کا محل تھا۔

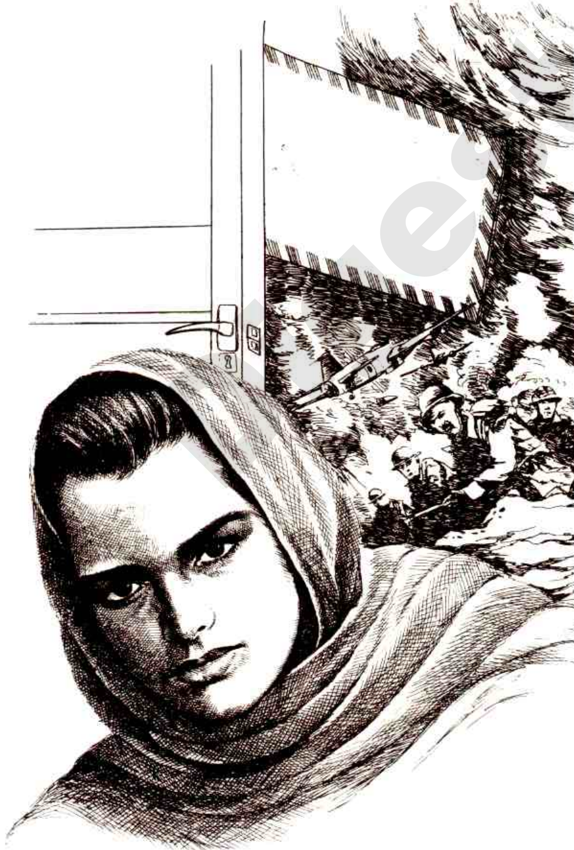
☆......☆

چندکور کی ایک سہیلی منگلا وادئ کلو کی ایک خوب صورت پہاڑن تھی۔ بچپن میں غریب والدین نے اسے غلاموں کے سوداگروں کے ہاتھوں بیچ دیا تھا اور پھر بکتی بکاتی وہ شاہی قلعہ لاہور پہنچی تھی۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھی۔ اس حرافہ کو نوجوان سکھ شہزادے بہت چاہتے تھے۔ جب چندکور رانی بن کر قلعے میں وارد ہوئی تو اس نے اپنی ذاتی لونڈی کے طور پر منگلا کو پسند کیا اور اسے اپنے پاس اپنی رازدار بنا کر رکھ لیا۔

راجا لال سنگھ ماجھے کا سکھ سردار تھا۔ نہایت ہی عیاش، بزدل اور تن آسان...... غلام محمد عرف گلو ماشکی شاہی قلعے کا سقہ تھا۔ وہ بیس بائیس برس کا تنومند لاہوری ایک گبرو جوان تھا۔ چندکور نے ایک ہی نظر میں لال سنگھ اور گلو ماشکی دونوں کو بیک وقت اپنی خدمت کے لیے منتخب کرلیا۔ گلو تو خیر صبح شام بلا روک ٹوک محل کے اندرونی کمروں میں آتا جاتا تھا اور حمام اور مٹکوں کو پانی سے بھرنے کے ساتھ ساتھ موقع ملنے پر چندکور کی قربت بھی حاصل کرلیتا تھا۔ لال سنگھ کو چندکور اپنی رازدار سہیلی منگلا کے ذریعے رات کو بلاتی تھی اور پھر دونوں خوب شراب پی کر بدمست ہوجاتے تھے۔ اس کے بعد شباب کا دور چلتا تھا۔ رنجیت سنگھ تو چندکور سے بیاہ کے وقت ہی فالج زدہ اور تقریباً بستر مرگ پر پڑ گیا تھا، اس لیے اسے اب کھل کر کھیلنے کا موقع مل گیا تھا اور اب وہ جوانی کے گوہر تاب دار لٹانے میں آزاد تھی۔ جنوری 1838ء میں چندکور کے بطن سے ایک لڑکا دلیپ سنگھ پیدا ہوا۔ 59 سالہ فالج زدہ رنجیت سنگھ کو اگرچہ خوب معلوم تھا کہ یہ لڑکا اس کا نہیں ہے، پھر بھی وہ اپنے بڑھاپے اور بیماری کے باوجود اپنی مردانگی کے کھوکھلے بھرم کو ٹوٹنے نہ دینا چاہتا تھا۔ دلیپ سنگھ کی پیدائش پر جشن بڑے منائے گئے۔ فالج زدہ رنجیت سنگھ نے مسکرا مسکرا کر مونچھوں کو خوب تاؤ دے کر مبارک بادیں وصول کیں۔ روایت ہے کہ اندرونِ خانہ رنجیت سنگھ، غلام محمد ماشکی کو تشکر آمیز لہجے میں اکثر کہا کرتا تھا۔

''حرام زادیا، لُٹ لے موجاں۔ پر میرا بھرم نہ ٹٹن دئیں!!''

جون 1838ء میں رنجیت سنگھ مثمن برج میں مرگیا



اور اس کا بڑا بیٹا کھڑک سنگھ اس کی جگہ مہاراجا بنا۔ کھڑک سنگھ نشے کا عادی اور مخبوط الحواس شخص تھا۔ جب راجا گلاب سنگھ آف کشمیر کا چھوٹا بھائی راجا دھیان سنگھ، کھڑک سنگھ کا وزیر مقرر ہوا تو انگریزوں نے اپنے ایک ایجنٹ سوہن سنگھ کو لدھیانے سے کھڑک سنگھ کے پاس بھیجا۔ سوہن سنگھ نے مہاراجا کو یہ پیغام دیا کہ انگریز مہاراجا کی حفاظت کے لیے لاہور میں اپنی فوجیں رکھنے کے لیے تیار ہیں، لیکن اس کے عوض پنجاب کے مالیہ میں سے کمپنی روپے میں سے چھ آنے وصول کیا کرے گی۔

کھڑک سنگھ ایسا معاہدہ کرنے کے لیے تیار تھا، لیکن اس کے مہاوزیر نے اس کی مخالفت کی تھی جس پر انگریز پٹھو سوہن سنگھ نے بھرے دربار میں وزیراعظم راجا دھیان سنگھ کو دھمکی دی۔ ''چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر تجھ سے نپٹ لیا جائے گا۔''

دھیان سنگھ نے اس بات کا مسکرا کر جواب دیا اور کہا۔ ''بہت اچھا، دیکھا جائے گا۔''

دھیان سنگھ اس کے بعد سیدھا چندکور کے پاس پہنچا۔ رنجیت سنگھ کا معتمد خاص ہونے کی بناء پر اسے زنان خانے میں جانے کی عام اجازت تھی۔

چندکور رنجیت سنگھ کے بیٹوں کو راستے سے ہٹا کر خود پنجاب پر حکومت کرنا چاہتی تھی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ رات کو اپنے ملازمین کے ذریعے شیش محل کا دروازہ کھلوا دے گی۔ چندکور سے بات پکی کر کے دھیان سنگھ ٹکسالی دروازے کے راستے اپنی حویلی میں آیا اور بقیہ دن اپنے بڑے بھائی گلاب سنگھ اور گارڈ کے یورپی کپتان کرنل گارڈنر کے ساتھ سازش کرنے میں لگایا۔ آدھی رات کو یہ چاروں مسلح ہو کر شاہی قلعے پہنچے۔ چندکور کے ملازمین نے شیش محل کا دروازہ کھول دیا۔ مہاراجا کے ذاتی کمرے کا دروازہ اُدھ کھلا تھا اور اندر سے روشنی آ رہی تھی اور باہر ایک ملازم لیٹا ہوا تھا۔ اس نے آہٹ سن کر ڈر کے مارے جو چیخ ماری تو سوچیت سنگھ نے گولی مار کر اسے ڈھنڈا کر دیا۔ گلاب سنگھ نے سوچیت کی اس حماقت پر اسے ایک زوردار تھپڑ جڑ کے کہا۔

''الو کے پٹھے ابھی سے سب کو چوکنا کرنا چاہتا ہے۔''

پھر یہ چاروں قاتل جب مہاراجا کے کمرے میں داخل ہوئے تو کھڑک سنگھ پلنگ پر بیٹھا ہوا سیوک کر رہا تھا اور ساتھ کی چارپائی جس پر اس کا ایک حواری سوہن سنگھ سوتا تھا، لیکن اس کی جگہ خالی تھی۔ اگرچہ دھیان سنگھ اور چندکور کے درمیان معاہدہ تھا کہ کھڑک سنگھ کو بھی ختم کر دیا جائے گا اور گدی پر شیرخوار دلیپ سنگھ کو بٹھا کر چندکور اور دھیان سنگھ مزے کریں گے، لیکن فی الحال سازشوں کا مقصد سوہن سنگھ کو قتل کرنا تھا۔ مہاراجا کو وہ کسی اور خفیہ طریقے سے بعد میں ختم کرنا چاہتے تھے۔ دھیان سنگھ نے مہاراجا سے پوچھا۔

''سوہن سنگھ کہاں ہے؟''

مہاراجا نے کہا۔ ''ابھی ابھی گولی چلنے کی آواز سن کر اٹھ کر گیا ہے۔''

ساتھ ہی مہاراجا نے گلاب سنگھ اور دھیان سنگھ کے چہروں پر خونخوار مسکراہٹ دیکھ کر منت زدہ سے لہجے میں کہا۔

''سوہن سنگھ کو کچھ نہ کہنا۔'' اور پھر اس نے رونا، چیخنا اور چلانا شروع کر دیا۔

محل کی باندیوں نے بے کس اور مجبور مہاراجا کو جکڑے دیکھا اور سازشی ایک مشعل لے کر خواب گاہ کے ساتھ والے کمرے میں سوہن سنگھ کو تلاش کرنے لگے۔ کمرہ لمبا اور تاریک تھا۔ قاتلوں کو کچھ نظر نہ آیا۔ مایوس ہو کر لوٹنے ہی لگے تھے کہ سوچیت سنگھ کو ایک تاریک کونے میں تلوار کی چمک نظر آئی۔ اس نے مشعل لے کر اس کونے کے قریب جا کر دیکھا تو سوہن سنگھ تلوار دونوں ہاتھوں میں تھامے دیوار سے لگا پسینے میں شرابور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سوہن سنگھ کو دیکھتے ہی دھیان سنگھ کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ خنجر لے کر آگے بڑھا اور پھر ایک ہی جست میں خنجر سوہن سنگھ کے سینے میں اتارتے ہوئے کہا۔ ''لے سردار! اجے چوی گھنٹے پورے نہیں ہوئے۔''

سوہن سنگھ ایک دلدوز چیخ مار کر گرا اور مر گیا۔ دھیان سنگھ چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ لیے ہوئے اپنے ساتھیوں سمیت باہر نکلا اور پھر چند ماہ بعد ہی کھڑک سنگھ کو باندیوں کے ذریعے سنکھیا دے کر ہلاک کر دیا گیا۔

کھڑک سنگھ کا بڑا بیٹا نونہال سنگھ باپ کا کریا کرم کر کے بوڑھے راوی میں نہا کر واپس آ رہا تھا۔ جب وہ حضوری باغ میں داخل ہوا تو سازشیوں نے اوپر سے دروازے کی چھت گرا دی۔ چوبی شہتیروں اور پتھروں کے ملبے سے زخمی نونہال سنگھ کو بڑی مشکل سے نکالا گیا۔ دھیان سنگھ، گلاب سنگھ، سوچیت سنگھ اور کرنل گارڈنر اسے اٹھا کر حضوری باغ کی بارہ دری میں لے آئے اور وہاں باقی لوگوں کا داخلہ بند کر دیا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک چاروں نے نیم مردہ نونہال سنگھ کو زدوکوب کر کے ہلاک کر دیا۔ اب دھیان سنگھ اور چند کور کے لیے بظاہر بالکل راستہ صاف تھا، لیکن رنجیت سنگھ کا ایک اور بیٹا شیر سنگھ، جو بٹالہ میں اپنی جاگیر پر رہتا تھا۔ قسمت آزمائی کے لیے لاہور آ دھمکا۔ اب جموں کے راجوں نے ایک مکارانہ چال چلی۔ دھیان سنگھ غیر جانبدار بن کر جموں جا بیٹھا۔ چند کور اور گلاب سنگھ اپنے ڈوگرہ اور کشمیر سپاہیوں کے ساتھ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ شیر سنگھ نے خالصہ فوج کے ساتھ قلعے کا محاصرہ کر لیا اور چاروں طرف توپیں گاڑ دیں۔ شاہد مسجد کے میناروں پر بھی بندوقچی چڑھ گئے اور قلعے کے اندر چاند ماری کرنے لگے۔

قلعے کے اندر جو ڈوگرہ سپاہی تھے، وہ ماہر نشانہ باز تھے۔ انہوں نے چن چن کر توپچیوں کو گولیوں کا نشانا بنایا اور توپوں کو خاموش کر دیا۔ شاہی مسجد کے میناروں پر جو خالصہ بندوقچی تھے، ان کو بھی نشانہ بنا کر مار گرایا۔ خالصوں نے اپنے بچاؤ کی اب ایک نئی ترکیب سوچی۔ وہ بازار حسن کی تمام طوائفیں اٹھا لائے اور انہیں توپوں کے پہیوں اور نالیوں کے دائیں بائیں اس طرح جکڑ کر باندھ دیا کہ توپ چلانے والے ان کی آڑ میں رہیں اور قلعے کی فصیل پر بیٹھے ہوئے ڈوگرہ نشانچی ان کو نہ دیکھ سکیں۔

خالصوں کی یہ ترکیب کامیاب رہی۔ اب جنگ کی صورت یہ تھی کہ قلعے کی دیواروں پر سے ڈوگرے جو گولیاں چلاتے تھے، ان سے توپوں کے ساتھ بندھی ہوئی بے چاری طوائفیں جہنم واصل ہو رہی تھیں اور نازک بدن لاشوں کی آڑ لے کر خالصے دھنا دھن توپوں کے گولے داغ کر قلعے کی فصیلوں میں شگاف ڈال رہے تھے۔ اس مرحلے پر چند کور اور گلاب سنگھ نے ہتھیار ڈالے دیے اور وقتی طور پر شیر سنگھ کو مہاراجا تسلیم کر لیا۔ شیر سنگھ نے بھی چند کور کے حواریوں کی تسلی کے لیے دھیان سنگھ کو وزیراعظم بنالیا۔

چند کور کے ذہن میں اب ایک نیا منصوبہ آیا۔ ظاہر ہے کہ دھیان سنگھ کو دو بار اس نے آزما دیکھا تھا اور وہ اس کے لیے راہ ہموار کرنے میں ناکام رہا تھا۔ دھیان سنگھ کا بیٹا ہیرا سنگھ اب چند کور کی نظر میں سمایا ہوا تھا، کیوں کہ بچپن میں ہیرا سنگھ کو رنجیت سنگھ نے ہی شہزادوں کی طرح پالا تھا۔ وہ رنجیت کا بڑا چہیتا اور لاڈلا تھا۔ وہ تو دربار میں بھی رنجیت سنگھ کی گود میں کھیلتا رہتا تھا۔ رات کو رنجیت سنگھ اسے پلنگ پر اسے اپنے پاس سلاتا تھا اور اس کے سرہانے ہر رات پانچ سو روپیہ رکھ دیا جاتا تھا، جسے صبح اٹھ کر ہیرا سنگھ اپنے ہاتھ سے قلعے کے دروازے پر آئے ہوئے فقیروں میں خیرات کے طور پر بانٹ دیتا تھا۔

ہیرا سنگھ اب ایک تنومند جوان رعنا شخص تھا۔ وہ فارسی، اردو اور انگریزی خوب رواں بولتا تھا۔ وہ بھی بگڑے ہوئے امیر نوجوانوں کی طرح شراب و شباب کا شوقین اور کھلنڈرا تھا۔ وہ پیرس کے بنے ہوئے بھڑکیلے لباس اور سامانِ آرائش استعمال کرتا تھا۔ ہم عصر یورپین عورتیں، جنہیں اسے بہت قریب سے دیکھنے اور ان سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ انہوں نے بھی ہیرا سنگھ کی خوب صورتی کا ذکر دل میں عشق کی ٹیسیں محسوس کرتے ہوئے کیا ہے۔ لاہور میں ہیرا سنگھ کی حویلی جس جگہ واقع تھی اس علاقے کا نام ''ہیرا منڈی'' مشہور ہو گیا تھا اور آج بھی اس نام سے ایک جگہ مشہور ہے جہاں شہر کے جوان سکون پاتے ہیں۔

چند کور اب دھیان سنگھ اور شیر سنگھ دونوں کو راستے سے ہٹا کر اپنے کم سن بیٹے دلیپ سنگھ کو گدی پر بٹھانے اور خود اپنے دن اور راتیں ہیرا سنگھ کی آغوش میں بسر کرنے کی حسرت لیے بیٹھی تھی۔ چناں چہ چند کور نے اپنے دیرینہ آشنا لال سنگھ کو وزیراعظم بنانے کا لالچ دے کر اس کے ذریعے مجیٹھیے سرداروں سے سازش کی کہ وہ شیر سنگھ اور دھیان سنگھ دونوں کو قتل کر دیں۔

مجیٹھے سردار پہلے شیر سنگھ کے پاس شالامار باغ گئے

اور اسے دھیان سنگھ کی جعلی تحریر دکھائی جس میں شیر سنگھ کو قتل کرنے کے بدلے انہیں بھاری رقم دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ شیر سنگھ نے غصے میں بھر کر اسی وقت دھیان سنگھ کے قتل کا حکم کا فرمان انہیں لکھ دیا۔ اب یہ فرمان شاہی قلعے لا کر انہوں نے دھیان سنگھ کو دکھایا تو دھیان سنگھ سخت متعجب ہوا۔ مجیٹھے اپنا ایک بھائی شالامار چھوڑ آئے تھے۔ اسکیم یہ تھی کہ دھیان سنگھ کو بھی شالامار لے جا کر شیر سنگھ اور دھیان سنگھ دونوں کو ایک ساتھ ہی قتل کر دیا جائے۔

دھیان سنگھ نے جب اپنے قتل کا فرمان دیکھا تو آپے سے باہر ہو گیا۔ ادھر مجیٹھے سرداروں نے دھیان سنگھ کو اکسایا کہ وہ ان کے ساتھ شالامار چلے۔ وہاں وہ اس کے سامنے مہاراجا شیر سنگھ کو قتل کر دیں گے۔ جب یہ لوگ شالامار کی دیواروں کے قریب پہنچے تو باغ کے اندر بے تحاشا گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شالامار باغ کے اندر اس وقت جو خونی ڈراما کھیلا جا رہا تھا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ مجیٹھ سردار اجیت سنگھ نے اپنے بھائیوں کا انتظار کیے بغیر مہاراجا شیر سنگھ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، پھر اس نے اپنی کمر سے اپنا دونالی پستول کھولا اور شیر سنگھ کے قریب جا کر کہا۔

''مہاراج...... یہ پستول میں نے کلکتہ سے منگوایا ہے۔ نہایت اعلیٰ چیز ہے۔''

شیر سنگھ نے رخ موڑ کر پستول لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا ہی تھا کہ اجیت سنگھ نے بھرے ہوئے پستول کی دونوں گولیاں شیر سنگھ کے سینے میں اتار دیں۔ اس پر مہاراجا کے حفاظتی دستے نے بے تحاشا فائر کرنے شروع کر دیے لیکن اجیت سنگھ بھاگ کر باغ کے دوسرے تختے پر چلا گیا۔ وہاں شیر سنگھ کا بارہ سالہ لڑکا پرتاپ سنگھ غلیل سے پرندوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اس نے اجیت سنگھ کو قریب پا کر پوچھا۔

''چاچا! یہ گولیاں کیوں چل رہی ہیں؟''

اجیت سنگھ نے جواب میں۔ ''اوئے سب دیا پترا'' کہا اور تلوار کے ایک ہی وار سے کم سن پرتاپ سنگھ کا سر تن سے جدا کر دیا۔

شالامار باغ کے باہر جب دھیان سنگھ اور اس کی پارٹی نے بے تحاشا گولیاں چلنے کی آوازیں سنیں تو وہ خطرے کی بُو پا کر قلعے کی طرف بھاگے۔ مجیٹھے سرداروں نے فوراً ان کا پیچھا کیا۔ قلعے میں داخل ہو کر دھیان سنگھ چیخ چیخ کر دربانوں کو پکارنے لگا کہ دروازے بند کر دیں، لیکن مجیٹھ سردار بھی اس وقت اندر قلعے میں گھس ہی آئے تھے۔ صرف دھیان سنگھ کا قریبی ساتھی اور یارِ غار چوہدری فتح خان ٹوانہ قلعے سے نکل کر بھاٹی دروازے پہنچا تھا اور پھر دھیان سنگھ کے بیٹے ہیرا سنگھ کو اس کے باپ کے قتل کی خبر سنائی۔

دھیان سنگھ اور اس کی پارٹی کے دیگر افراد کو مجیٹھوں نے دیوانِ عام کے سامنے میدان میں گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تھا اور دھیان سنگھ کی لاش کو روڑی (کچرا) پر پھینک دیا تھا۔ اب تک سارا خونیں ڈراما عین چندکور کی مرضی کے مطابق کھیلا گیا تھا۔ اس کے چنے ہوئے ہر کردار نے اپنا رول خوب اچھی طرح سے پردۂ اسکرین پر نبھایا تھا۔ اس کے شکار خود بخود اس کی جھولی میں گر رہے تھے۔ مہارانی چندکور کو اپنے ذرائع سے جب یہ معلوم ہو گیا کہ دھیان سنگھ کے قتل کی خبر ہیرا سنگھ کو مل چکی ہے تو اس نے خفیہ طور پر ہیرا سنگھ کو ہمدردی کا پیغام بھیجا اور کہلوا بھیجا کہ آؤ مجیٹھوں سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لو۔ اس کے لیے میں اور میرا سب کچھ تمہارے لیے وقف ہوگا۔ مجیٹھوں نے شیر سنگھ اور دھیان سنگھ کو مہارانی کے حسب خواہش ختم کرنے کے بعد قلعے کے دروازے بند کر لیے تھے۔

اس رات محلات میں خوب چراغاں کیا گیا۔ شیش محل میں محفل رقص و سرور منعقد ہوئی۔ خوب جام پر جام چلے اور مہارانی چندکور اور اس کی سہیلیوں نے اس خوشی کے موقع پر اپنے عاشقوں کے جھرمٹ میں مستانہ وار رقص کیا، لیکن یہ محفل خود منعقد کرنے سے پہلے مہارانی ہیرا سنگھ کو جو پیغام بھجوا چکی تھی، وہ نوجوان ہیرا سنگھ کے دل و دماغ میں آگ لگانے کے لیے کافی تھی۔ شاہی اقتدار، مال و دولت اور سب سے بڑھ کر حسین چندکور کی آغوش کی گرمی۔ ان سب کو حاصل کرنے کا گویا یہ دعوت نامہ تھا۔ ادھر پنڈت جالا (ہیرا سنگھ کا یارِ غار اور اس زمانے میں ہیرا منڈی کا مشہور دلال اور غنڈہ) اور چوہدری فتح خان ٹوانہ نے بھی ہیرا سنگھ کو باپ کے قتل کا

انتقام لینے پر خوب اکسایا تھا۔

☆......☆☆

ہیرا سنگھ روپے کے تھیلے ساتھ لے کر میاں میر پہنچا، جہاں خالصہ فوج کی چھاؤنی تھی اور تمام سپاہیوں میں بے دریغ روپیہ تقسیم کیا گیا۔ اس کے بعد اس نے خالصہ سپاہیوں کے سامنے ایک جذباتی تقریر کی جس میں کہا کہ میں مہاراجا رنجیت سنگھ کا پروردہ ہوں اور اس کے معتمد خاص دھیان سنگھ کا بیٹا ہوں، پھر اس نے مہارانی چند کور کا خط پڑھ کر سنایا جس میں اس نے لکھا تھا کہ مجیٹھوں نے اسے قلعے میں قید کر رکھا ہے اور خالصہ فوج سے مدد کی اپیل کی گئی تھی کہ وہ مہارانی کو ان کے چنگل سے آزاد کرائیں۔ عام سکھ سپاہی رنجیت سنگھ، اس کی بیویوں اور اس کے بیٹوں کی بے حرمتی کسی صورت برداشت نہ کرتے تھے۔ مہارانی چند کور کا خط سن کر پچاس ہزار مسلح فوجی مع دو سو بڑی اور چھوٹی توپوں کے زوردار جنگی نعرے لگاتے ہوئے میاں میر سے شاہی قلعہ لاہور پر حملہ آور ہوئے۔ توپوں کی گھن گرج اور خالصہ سپاہیوں کے جنگی نعروں سے سارا لاہور لرز اٹھا۔ قلعے کی دیواریں توڑ کر خالصے اندر جا گھسے اور مجیٹھ سرداروں اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔

مہارانی چند کور جو مجیٹھوں اور ان کے حواریوں کے ساتھ رات محفل میں ناچ رہی تھی۔ صبح دم کمال مکر و فریب سے خالصہ فوج کے سامنے مظلوم بن کر کھڑی تھی اور سادہ لوح سپاہی نہایت عقیدت و احترام سے اس کے قدموں کے بوسے لے رہے تھے۔

شام کو ہیرا منڈی چوک میں دھیان سنگھ کی چتا جلائی گئی۔ اس کی دس بیویاں، جن میں سے ایک تیرہ سالہ خوبرو لڑکی راجا کانگڑہ کی بیٹی تھی، اس سے دھیان سنگھ نے ابھی چند روز پہلے شادی کی تھی اور بیس لونڈیاں دھیان سنگھ کی چتا میں جل مریں۔

☆......☆☆

ارتھی جلانے سے پہلے ہیرا سنگھ نے تینوں مجیٹھ بھائیوں کے کٹے ہوئے سر اپنی نو بیاہتا تیرہ سالہ سوتیلی ماں کے قدموں میں لا گرائے۔ نوجوان بیوہ نے اپنے باپ کی کلغی دیپ کے سر پر سجاتے ہوئے کہا۔

سات نئے عجوبے

قدیم زمانے سے دنیا میں سات عجوبے چلے آ رہے ہیں۔ حال ہی میں دنیا کے سات نئے عجوبے بھی سامنے آئے ہیں۔ نئے عجائبات کے انتخابات کا ارادہ سوئزر لینڈ کی ایک نجی تنظیم ''دی نیو سیون ونڈرز فاؤنڈیشن'' نے کیا تھا۔ ان سات نئے عجائبات کو متعارف کروانے کے لیے دنیا کی اکیس اہم تنصیبات کو منتخب کیا گیا۔ ان اکیس عمارتوں میں روم کلوسیم' اردن کا قدیم شہر پیٹرا' برطانیہ کا ستون ہنج وار دیوار چین کے علاوہ پیرس کا ایفل ٹاور نیویارک کا مجسمہ آزادی اور سڈنی کا اوپرا ہاؤس شامل تھے۔ جو نئے سات عجائبات قرار پائے ہیں وہ یہ ہیں۔ (1) دیوار چین (2) اہرام مصر (3) میکسیکو کے آثار (4) حضرت مسیح کا مجسمہ واقع برازیل (5) اٹلی کا کلوسیم (6) ماچو پیچو (7) پیٹرا اردن۔

مرسلہ: عامر بشیر۔ کراچی

''سورگ...... میں تمہارے باپ کو جا کے بتاؤں گی کہ تمہارے لائق اور بہادر بیٹے نے تمہارے قتل کا انتقام ارتھی جلنے سے پہلے ہی لے لیا ہے۔'' پھر وہ اپنے خاوند کا سر اپنے زانو پر رکھ کر بے حس و حرکت بیٹھ گئی۔ ہیرا سنگھ نے ارتھی کو آگ لگائی۔ اردگرد خالصہ فوجی کثیر تعداد میں کھڑے تھے۔ انہوں نے بندوقوں سے ہوائی فائر کیے اور ڈھول اور نفیریاں بجنے لگیں۔ جب آگ کے شعلے بلند ہوئے تو دھیان سنگھ کی ایک اور کم سن اور خوب صورت بیوی چتا سے اٹھ کر چیخیں مارتی ہوئی آگ کی لپٹوں سے باہر نکل آئی۔ خالصوں نے اس کا راستہ روک لیا اور اسے اٹھا کر شعلوں کے درمیان پھینک دیا۔ وہ ایک بار پھر اٹھی اور شعلوں کے بیچ ہاتھ بلند کر کے اونچی آواز سے چیخی۔ ''بدبخت سکھو، تم پر گورو کی پھٹکار، سن لو میری بات کہ تم ظالم ہو۔ تمہاری قوم عنقریب تباہ ہونے والی ہے۔''

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ آگ کے شعلے اس کے اوپر اٹھے ہوئے بازوؤں سے بھی بلند ہو گئے اور وہ ان میں جل کر راکھ ہو گئی۔

☆......☆

اس رات پھر شاہی قلعے میں جشن مجنونانہ منایا گیا۔ چندکور نے اپنے ہاتھوں سے ہیرا سنگھ کو شراب کے جام پلا کر مدہوش کر دیا اور پھر مہارانی کی خواب گاہ میں جو کچھ ہوا اس کی گواہ یا تو منگلا تھی یا پھر شیش محل کے خاموش در و دیوار، دوسری صبح خالصہ فوج نے چھ سالہ دلیپ سنگھ کو مہاراجا، چندکور کو حکومت کا سرپرست اعلیٰ اور ہیرا سنگھ کو وزیراعظم مقرر کیا۔ اس دفعہ بھی بازی چندکور کے حسب منشا اور عین اسکیم کے مطابق کھیلی جارہی تھی۔ اس کی امنگیں اب عروج پر تھیں۔ وہ چندکور جو کبھی سیالکوٹ کے ایک غریب سائیس کی بیٹی تھی، اب سارا پنجاب اس کی مٹھی میں تھا۔ خالصہ سپاہی اس کو پوجتے تھے اور سردار تو اس کی ایک نگاہ مستانہ کے طلب گار رہتے تھے اور خوب صورت جوان ہیرا سنگھ، جس پر وہ مدت سے نظریں لگائے بیٹھی تھی، اب دن رات اس کی آغوش میں ہوتا تھا اور اس کی بانہوں میں دنیا و مافیہا سے بے خبر سوتا تھا۔

چندکور روز رات کو قلعے سے نکل کر، ہیرا منڈی کے ایک بالا خانے میں آتی تھی اور وہاں ہیرا سنگھ اور وہ تمام رات رنگ رلیاں مناتے تھے۔

قلعے میں تو وہ عیش و عشرت کی جو محفلیں سجایا کرتی تھی۔ وہ عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھیں، لیکن چندکور نے قلعے سے باہر نکل کر اپنی بزم جب ہیرا منڈی میں سجانی شروع کی تو اس کی لن ترانیوں کے قصے زبان زدِ عام ہوگئے۔

سکھ سپاہی رنجیت سنگھ کے لواحقین سے اندھی عقیدت کی بناء پر چندکور کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود اپنے آپ کو اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے پر تیار نہ پاتے تھے، البتہ سکھ عوام و خواص اور فوجیوں کا سارا نزلہ بے چارے ہیرا سنگھ پر گرا۔

چندکور نے جب ہوا کا رخ بدلتے دیکھا تو مشہور کر دیا کہ ہیرا سنگھ اور پنڈت جالا زبردستی اسے جان سے مار دینے کی دھمکی دے کر ہیرا منڈی میں اپنے بالا خانے پر جانے کے لیے مجبور کرتے رہے ہیں۔ اب تو لوگوں کا غیظ و غضب اور بھی بڑھا کہ رنجیت سنگھ کی مقدس بیوہ کو ہیرا منڈی کا بدنام دلال اور جموں کا ڈوگرہ ہیرا سنگھ اس طرح پامال کریں۔ چناں چہ سکھ فوج کے پنچوں نے ہیرا سنگھ اور پنڈت جالا کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کرلیا۔ ہیرا سنگھ کو خبر ملی تو وہ صبح تڑکے پنڈت جالا اور دوسرے حواریوں کے ساتھ ایک تانگے پر زر و جواہر کے توڑے لاد کر ٹکسالی گیٹ کے راستے اپنی حویلی سے نکلا اور اپنے چچا راجا گلاب سنگھ کے پاس پناہ لینے کے لیے جموں کی طرف روانہ ہوا۔ دن چڑھے ٹکسالی گیٹ کے دربان سے جب سکھوں کو ہیرا سنگھ کے فرار کی خبر ملی تو کئی سو خالصے گھڑ سوار فوراً تعاقب کو نکلے اور کالا شاہ کاکو کے قریب بھگوڑوں کو جالیا۔ جب ہیرا سنگھ نے سپاہیوں کو پیچھے آتے دیکھا تو اس نے روپوؤں کی مٹھیاں بھر بھر کر راستے میں پھینکنی شروع کر دیں کہ شاید تعاقب میں آتے ہوئے سکھ سوار روپے لوٹنے کے لالچ میں پیچھے رہتے جائیں، لیکن سکھ بڑے کائیاں نکلے۔ انہوں نے سوچا کہ راستے میں بکھرے ہوئے چند ہزار روپوؤں کے بجائے کیوں نہ آگے بڑھ کر لاکھوں کے خزانے ہی کو قبضے میں کیا جائے۔ سکھ سوار بڑھتے گئے اور ہیرا سنگھ، پنڈت جالا اور دوسرے حواریوں کو تلواروں سے ذبح کر دیا۔ ہیرا سنگھ کا کٹا ہوا سر لوہاری دروازے پر لٹا دیا گیا اور ان کا جسم کتوں کے آگے پھینک دیا گیا۔ آٹھ دن کے بعد سر بھی اتار کر خالصوں نے کتوں کے آگے رکھ دیا۔

☆......☆

یہ ایسے واقعات تھے، جن سے بظاہر چندکور کی ہزیمت اور رسوائی کا پہلو نکلتا تھا، لیکن وہ ہار نے ماننے والی عورت نہ تھی۔ اس نے زمانے کو قابو کرنے کے لیے نیا پینترا بدلا۔ کچھ عرصہ گیروئے کپڑے پہنے اور بال کھلے چھوڑ کر اس نے امرتسر اور ننکانہ صاحب کی مقدس جگہوں کے چکر پر چکر لگانے شروع کر دیے، حتیٰ کہ اس کی نیکی اور پارسائی کی دھوم مچ گئی۔ اس کے لہو و لعب کی داستانیں عوام کے ذہنوں سے محو ہوگئیں۔ عوام نے اسے مائی چنداں کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ مائی چنداں نے نیکی اور پارسائی کا لبادہ اوڑھ کر جب ایک بار پھر عوام و خواص پر اپنی گرفت مضبوط کرلی تو تمام معاملات پھر اس کی مرضی کے مطابق طے پانے لگے۔ نئے انتظام

کے تحت مائی چنداں سرپرست اعلیٰ، اس کا بیٹا کم سن دلیپ سنگھ مہاراجا، چنداں کا بھائی جواہر سنگھ وزیراعظم اور مائی کا دیرینہ عاشق سردار لال سنگھ کمانڈرانچیف مقرر کیے گئے۔

☆......☆

روایت ہے کہ مہاراجا رنجیت سنگھ نے جب کشمیر فتح کیا تو انہی ایام میں حرم کی ایک کشمیرن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام کشمیرا سنگھ رکھا گیا۔ ازاں بعد جب خالصہ فوجیں پشاور میں داخل ہوئیں تو مہاراجا کی ایک پٹھانی بیوی نے بھی انہی دنوں ایک لڑکے کو جنم دیا جس کا نام مہاراجا نے خوش ہوکر پشورا سنگھ رکھ دیا۔ کشمیرا سنگھ کو کشمیر میں اور پشورا سنگھ کو راولپنڈی کے نواح میں جاگیر ملی۔ ان دونوں نے اب پنجاب کی گدی پر اپنے حق کا اعلان کر دیا اور متحد ہوکر اٹک قلعے میں لشکر جمع کرنا شروع کر دیا۔ خالصہ عوام اور فوج کو پہلی بار پتا چلا کہ رنجیت سنگھ کے دو بالغ بیٹے ابھی زندہ ہیں۔

اس کے بعد پھر جلد ہی دربار میں کشمیرا سنگھ اور پشورا سنگھ کی حمایت میں سرداروں کی ایک پارٹی منظم ہونی شروع ہوگئی۔ اس طرح رانی چندکور کے اقتدار کے لیے ایک نئی مصیبت اٹھ کھڑی ہوگئی تھی۔ اس نے اس فتنے کے آغاز میں ہی ٹیٹوا دبانے کا فیصلہ کرلیا۔ اسی اثناء میں راجا لال سنگھ اور جواہر سنگھ اٹک پہنچے اور انہوں نے مشہور کر دیا کہ وہ رانی چندکور کا ساتھ چھوڑ کر رنجیت سنگھ کے اصل وارثوں کی حمایت کے لیے آئے ہیں۔ سادہ لوح کشمیرا سنگھ اور پشورا سنگھ ان کی باتوں میں آ گئے اور انہیں قلعے میں داخل کرلیا۔

دونوں لاہوری سرداروں نے کشمیرا اور پشورا کو ایسے سبز باغ دکھائے کہ وہ ان کے گرویدہ ہوگئے، حتیٰ کہ سونے کے لیے بھی کشمیرا اور پشورا نے لال سنگھ اور جواہر سنگھ کے پلنگ اپنے ہی کمروں میں بچھائے۔ یہ دونوں کمرے قلعہ اٹک کی پچھلی دیوار کے ساتھ، جہاں دریائے اٹک دو چٹانوں کے درمیان بڑی تیزی سے گزرتا ہے، واقع تھے۔ ایک رات لال سنگھ اور جواہر سنگھ نے کشمیرا اور پشورا کو شراب پلا کر بے ہوش کر دیا اور پھر ان دونوں کو اٹھا کر نیچے دریا میں پھینک دیا۔ اس جگہ دریا کی بہت زیادہ گہرائی اور تیز بہاؤ کی وجہ سے کشمیرا اور پشورا کی لاشوں کا بھی پتا نہ چل سکا۔

لاہور آ کر لال سنگھ اور جواہر سنگھ نے مشہور کر دیا کہ کشمیرا اور پشتورا نے شراب کی مستی میں آ کر دریا میں چھلانگیں لگا دی تھیں، لیکن کشمیرا اور پشتورا کی موت کی خبر سے ایک بار پھر سکھ فوج میں غیظ وغضب کی لہر دوڑ گئی۔ اس بار بھی وہ رانی کو کچھ نہ کہنا چاہتے تھے۔ رانی کا عاشق کمانڈر انچیف لال سنگھ خطرے کی بُو پا کر انگریزی علاقے میں لدھیانہ بھاگ گیا، البتہ رانی کا بھائی جواہر سنگھ موجود تھا، جس کو سکھ پنچوں نے رنجیت سنگھ کے بیٹوں کے قتل کے الزام میں موت کی سزا دینے کا فیصلہ کرلیا۔ رانی چند کور اور جواہر سنگھ نے پنچوں، سرداروں اور عام سپاہیوں کو منہ مانگی رشوت دینے کی کوشش کی۔ سکھ عام طور پر لالچی قوم تھے، لیکن رنجیت سنگھ اور اس کے خاندان کی عزت وحفاظت کا خیال ان کے دلوں میں اس حد تک راسخ تھا کہ وہ رانی چند کور کو رنجیت سنگھ کی بیوہ ہونے کی حیثیت سے معاف کرنے پر تیار تھے، حالاں کہ انہیں خوب معلوم تھا کہ یہ جرم رانی نے ہی سرزد کروایا تھا، لیکن وہ کسی قیمت اور کسی رشوت کے بدلے جواہر سنگھ کو موت سے کم کوئی سزا دینے پر راضی نہ ہوئے۔

جہاں آج کل بادامی باغ بس اسٹینڈ ہے۔ اس میدان میں خالصہ فوج نے ایک عام دربار منعقد کیا اور جواہر سنگھ کو پنچوں کے سامنے پیش ہونے حکم روانہ کیا۔ پورے تین دن رانی چند کور اور جواہر سنگھ قلعے کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھے رہے اور ٹال مٹول اور منت سماجت سے سکھوں کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن رانی چند کور جس نے اب تک کوئی بازی نہ ہاری تھی، اب اس کے زوال کا نقطۂ آغاز شروع ہو چکا تھا۔

تیسرے دن سکھ پنچوں نے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر جواہر سنگھ قلعے سے نہ نکلا تو قلعے پر عام دھاوا بول دیا جائے گا۔ ناچار ایک ہاتھی پر رانی سوار ہوئی اور ساتھ سونے چاندی کے بے شمار سکوں کے توڑے رکھ لیے، جن کو وہ راستے کے دونوں جانب لٹاتی جا رہی تھی۔ دوسرے ہاتھی

پر جواہر سنگھ اپنے دس سالہ بھانجے دلیپ سنگھ کو گود میں لیے بیٹھا تھا، تاکہ رنجیت کے (اور حقیقت میں گلو ماشکی کے) آخری بیٹے کو دیکھ کر سکھ عوام کا دل پسیج جائے اور کوئی اس پر وار نہ کر سکے۔ جواہر سنگھ بھی ننھے دلیپ سنگھ کے ہاتھوں بے دریغ اشرفیاں نچھاور کر رہا تھا۔ جب رانی اور جواہر سنگھ کا جلوس قلعے کے مشرقی دروازے سے نکل کر سکھ فوج کے کیمپ میں داخل ہوا تو رانی کے پنچوں کے حکم سے ہاتھی سے اتار کر ایک خیمے میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک لمبا تڑنگا سکھ سیڑھی لگا کر جواہر سنگھ کے ہودے پر چڑھا اور دلیپ سنگھ کو اس کی گود سے علیحدہ کرنے لگا۔ جواہر سنگھ نے کچھ بحث مباحثہ کرنے کی کوشش کی تو سپاہی نے وزیر اعظم کو زوردار تھپڑ رسید کرنے شروع کر دیے اور دلیپ سنگھ کو زبردستی چھین کر رانی کے پاس خیمے میں پہنچا دیا۔ چند اور سپاہی بھی ہودے پر چڑھ گئے اور لاتیں اور گھونسے مار مار کر جواہر سنگھ کو نیچے گھسیٹ لائے، تب سرپنچ آگے بڑھا اور اپنی کرپان جواہر سنگھ کے پیٹ میں گھونپ دی۔ اسی لمحے جب خیمے میں چند کور نے اپنے بھائی کی جاں بلب چیخ سنی تو اس نے دیوانی ہو کر ننھے دلیپ سنگھ کو خیمے سے باہر اچھال دیا اور چیخ کر کہا۔ ”ظالمو! اسے بھی مار ڈالو۔“ لیکن باہر کھڑے سکھ سپاہی نے دلیپ سنگھ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور ننھا مہاراجا بچ گیا۔

اس کے بعد حالات و واقعات پر چند کور کا کوئی قابو نہ رہا۔

انگریزوں کا ستارہ ان دنوں عروج پر تھا۔ پنجاب کی افراتفری جس کے تمام تار چند کور ہلاتی رہی تھی۔ وہ چند کور کہ دس سال جس کے اشاروں پر کئی شہزادے اور سردار ناچ کر اپنی جان کی بازی ہار گئے تھے۔ اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر 1849ء میں مٹھی بھر انگریز افسروں نے اودھ کی سپاہی کی مدد سے سکھوں کو چکیانوالہ اور گجرات کے مقام پر شکست فاش دی اور لاہور پر قابض ہو گئے۔ سرہنری لارنس پنجاب کا منتظم مقرر ہو۔

ہم عصر انگریز مؤرخین نے لکھا ہے کہ رانی چند کور کو اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ انگریز فوج کے کسی جرنیل یا افسر نے باقاعدہ اس کو اپنے حرم میں داخل کرنے کی کبھی پیشکش نہ کی۔ خاص طور پر اسے سرہنری لارنس سے تو بہت ہی گلہ تھا۔ نوجوان اور خوبرو انگریز کپتانوں سے رانی کے عارضی رومانس تو بہت لڑے، لیکن رانی سے باقاعدہ مستقل تعلق قائم کر کے کسی انگریز نے اپنی ملازمت کو خطرے میں نہ ڈالا۔

☆......☆

انگریزوں نے دلیپ سنگھ کو عیسائی بنا کر لندن روانہ کر دیا تو چند سال بعد رانی چند کور کو بھی یہ اجازت مل گئی کہ وہ لندن جا کر اپنے بیٹے سے مل سکتی ہے۔ چناں چہ چند کور اپنی سہیلی منگلا کو ساتھ لے کر لندن گئی اور ”بیس واٹر ڈبلیو (1) جوان دنوں ہائیڈ پارک اور بکنگھم پیلس کے نزدیک طبقہ امراء کا علاقہ تھا) کے ایک مکان میں ٹھہری۔ رانی چند کور نے ملک وکٹوریہ سے ملنا چاہا اور ملکہ نے بھی اسے بکنگھم پیلس آنے کی دعوت دے دی، لیکن انگریز رابطہ افسروں نے رانی کے سابق کردار اور سیاسی وجود کے مدنظر یہ ملاقات منسوخ کرا دی۔

ملکہ وکٹوریہ نے کئی ہندوستانی ملازم رکھے ہوئے تھے، جن میں ایک منشی صاحب تھے جو ملکہ کو اردو پڑھایا کرتے تھے۔ دہلی کے ایک حکیم صاحب ٹھنڈے میٹھے یونانی نسخے جو ملکہ کی طبیعت کو راس تھے، اسے کھلایا کرتے۔ ملکہ وکٹوریہ نے رانی چند کور کی سہیلی منگلا کو اپنے ذاتی کمروں کی صفائی اور دیکھ بھال پر مامور کر دیا۔ وادیٔ کلو کی پہاڑن جو بکتی بکاتی شاہی قلعے لاہور پہنچی تھی اور وہاں ایک عرصے قلعے کی خواب گاہوں اور تاریک غلام گردشوں میں سکھ شہزادوں کی تسکین کا سامان بنتی رہی تھی۔ اب بکنگھم پیلس لندن کے باورچی خانوں اور اصطبلوں میں انگریز بیروں اور سائیسوں کی بغلیں گرم کرنے لگی تھی۔

چند کور واپس پنجاب آ کر شیخوپورہ کے قلعے میں زندگی کے بقیہ ایام پورے کر کے 1864ء میں چل بسی اور غلام محمد ماشکی اور چند کور کے ملاپ کی یادگار دلیپ سنگھ اسکاٹ لینڈ کے ایک قلعے میں برطانوی حکومت پنجاب کی پنشن پر انگریز لارڈوں جیسی زندگی گزارنے لگا۔

☆☆......☆☆

سرحد پار سے دوسری تصویر

آتشِ نفس

ازابیل آئندے

امریکہ عظیم سے ایک لالہ رُخ پری پیکر کی کہانی، اس کا نازک سراپا عرصے تک جلتا رہا، جلتا رہا......




وہ ایک حسین و جمیل لڑکی تھی۔ اُسے بندوق چلانا نہیں آتا تھا اور نہ ہی اُس نے یہ ہنر سیکھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایک حیران کن ماجرا تھا، کیوں کہ اُس کی زندگی کا اک ہی مقصد تھا۔ وہ اپنے مقتول باپ کی مقروض تھی اور شاید اپنے آپ کی بھی مقروض، اس قرض کی ادائیگی اُس کے لیے فرض کا درجہ رکھتی تھی، وہ خود کو اسی کام کے لیے زندہ رکھے ہوئے تھی۔

ڈیلسی روزا قصبے کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی۔ یہ محض کہنے کی بات نہیں، اُسے کارنیوال کے میلے کے مقابلۂ حُسن میں باقاعدہ حسینہ اوّل منتخب کیا گیا تھا۔ مقابلے میں شامل بعض دوشیزاؤں کو اس انتخاب پر زبردست اعتراض ہوا، اُن کا کہنا تھا کہ ڈیلسی روزا کو پہلا نمبر اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ سینیٹر اور یلانو کی بیٹی ہے۔

ڈیلسی روزا کا باپ چلی کی پارلیمان میں نہ صرف سینیٹر تھا بلکہ اپنے صوبے کا سب سے طاقت ور شخص تھا۔ روزا مقابلۂ حسن جیتنے کے بعد تاج پہنے ہوئے شان سے ڈائس پر بیٹھی تھی، اُسے دیکھ دیکھ کر مقابلے کی دوسری خوش جمال لڑکیاں رشک اور حسد کر رہی تھیں اور اُسے بُرا بھلا کہہ رہی تھیں۔ شاید اُن میں سے کسی کی زبان بہت کالی تھی، کیوں کہ چند ہی ماہ بعد روزا پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ عام خیال یہ تھا کہ اُسے کسی کی بددُعا لگ گئی ہے۔

کارنیوال کے میلے نے روزا کے حُسن و جمال کی شہرت پورے ملک میں پھیلا دی تھی۔ بعض لوگ جو میلے میں شریک نہیں ہوئے تھے، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ انہوں نے بھی روزا کو دیکھا ہے، روزا کے حُسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگے۔ شاعروں نے اُس پر نظمیں لکھیں اور گلوکار اُس کی ستائش میں گیت گانے لگے۔

روزا کے حُسن جہاں تاب کی خبر اُڑتے اُڑتے تادیو تک جا پہنچی۔ تادیو، چلی کی حکومت کے خلاف چھاپا مار جنگ میں شریک تھا اور اپنی جماعت کا ایک کمانڈر تھا۔ وہ جنگل جنگل چھپتا پھرتا تھا، لہٰذا روزا سے اُس کی ملاقات کا امکان نہیں تھا۔ ویسے بھی اُس کی مصروف زندگی میں اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ کسی عورت کو انسان کی نظر سے دیکھ بھی سکے۔ محبت میں مبتلا ہونے یا شاعری کرنے کی اُسے فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ اُس کی جدوجہد کا نصب العین اپنی جماعت کو اقتدار دلانا تھا اور اس نصب العین کے لیے وہ اپنی جان دینے پر بھی آمادہ تھا۔ جس روز اُس نے پہلا شیو بنایا تھا، اُس کے ہاتھ ہتھیار سے بڑی حد تک آشنا ہو چکے تھے۔ عورت کی خوشبو کبھی اُس نے سونگھی بھی ہوگی تو اب وہ اُس کی یادوں سے محو ہو چکی تھی۔ اُس کے نتھنے بارود کی بُو سے لطف اندوز ہوتے اور کان دھماکوں کی آواز سے مسرّت محسوس کرتے۔ اُسے اپنی ماں کے بوسے بھی یاد نہیں رہے تھے۔

جنگ کے دوران وہ دشمنوں سے لڑتا اور جنگ ختم ہو جاتی تو دوستوں سے جھگڑے شروع کر دیتا۔ ممکن ہے، اس کی ساری عمر اسی طرح گزر جاتی لیکن ہُوا یہ کہ اُس کی جماعت حُسنِ اتفاق سے اقتدار پر قابض ہو گئی اور وہ ایک چھاپا مار کمانڈر کے درجے سے بلند ہو کے ملک کے اہم افراد میں شامل ہو گیا۔

سانتا تیریسا کے قصبے پر ابھی اُس کی جماعت کا قبضہ نہیں ہوا تھا، لہٰذا اُسے ایک سو بیس فوجی دے کر قصبے کی طرف بھیجا گیا۔ قصبے کا زمیں دار اوریلانو تھا، سینیٹر اوریلانو، روزا کا باپ۔

تادیو کو کوئی خاص مزاحمت درپیش نہیں آئی۔ پھر بھی اُس نے اشتعال میں گھروں کی کھڑکیوں پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ پھر وہ چرچ تک پہنچا اور چرچ کے دروازے پر اس نے توپ کا گولا داغ کر آگ لگا دی۔ قصبے کے لوگ سہم کر مکانوں میں دُبکے رہے۔ تادیو اپنی فوج کے ساتھ سینیٹر اوریلانو کی حویلی کی طرف روانہ ہوا۔ اوریلانو کو تادیو کی یلغار کی اطلاع مل چکی تھی۔ اُس نے اپنے پالتو شکاری کتے کھول دیے اور اپنی بیٹی روزا نہ کو حویلی کے سب سے خفیہ کمرے میں بند کر دیا۔ اوریلانو کے ہم راہ صرف بارہ وفادار ملازم تھے، انہوں نے ہتھیار ڈال کر معافی مانگنے کی ذلّت قبول نہیں کی بلکہ لڑ کر مرنے کو ترجیح دی۔ اوریلانو کو یہ سوچ کر صدمہ ہوا کہ اُس کا کوئی لڑکا نہیں ہے ورنہ آج اُس کے ساتھ لڑکا بھی بندوق اٹھاتا اور خاندان کے نام کو بٹا نہ لگنے دیتا۔

اوریلانو کی حویلی ایک پہاڑی کے اُوپر تھی۔ اُس نے حویلی سے پہاڑی کے نیچے نظر دوڑائی۔ رات کے اندھیرے میں بہت سی مشعلیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ مشعلیں تادیو کے سپاہی اٹھائے ہوئے تھے۔ اوریلانو سمجھ گیا کہ وہ اور اُس کے بارہ ملازم صبح تک زندہ نہیں بچ سکیں گے۔ اُس نے اپنے وفادار جمع کیے اور انہیں کچھ ہدایات دینے کے بعد بولا۔ ”ہم میں سے جو شخص سب سے آخر میں زندہ رہ جائے، وہ میری بیٹی کے کمرے میں پہنچے اور...... اور خاندان کی عزّت داغ دار ہونے کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم کر دے۔ یہ میرا آخری حکم ہے۔“ اُس کی آواز رُندھ گئی۔ اسی اثناء میں تادیو حویلی پر گولے داغنے لگا۔

اوریلانو کے یہ بارہ ملازم اُس وقت سے حویلی میں مقیم تھے جب روزا پیدا ہوئی تھی۔ روزا اُن کے ہاتھوں میں پلی بڑھی تھی۔ ایک خوب صورت بچّی سے ایک حسین لڑکی بننے تک اُسے سب نے دیکھا تھا، روزا



اُنہیں اپنی اولاد کی طرح عزیز تھی۔ اُس کے بارے میں خود اُس کے باپ کا فرمان سُن کر وہ گہرے دُکھ میں ڈوب گئے۔ پھر بھی اپنی زندگی، ہر دوسری زندگی سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ وہ یہ بات بھول کر حملہ آوروں پر تاک تاک کے گولیاں چلانے لگے۔

اوریلانو کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ سب سے آخر میں زندہ رہنے والا شخص وہ خود بھی ہوسکتا ہے۔ اتفاق سے یہی ہوا، دیکھتے دیکھتے اُس کے سب وفادار کام آ گئے۔ خود اُسے بھی بازو پر گولی لگی تھی۔ اُسے احساس ہوا کہ اب اُس کے سوا کوئی زندہ نہیں ہے اور بارود بھی ختم ہونے والا ہے، اُسے اپنی وہ بات یاد آ ئی جو اُس نے اپنے ملازموں سے کہی تھی۔ اتنے میں ایک گولی اُس کے پیٹ میں آ کر لگی، اُس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ لیا، اُس کی انگلیوں کے درمیان سے سُرخ لہو اُبلنے لگا۔ وقت کم رہ گیا تھا۔ وہ جلدی سے اپنی بیٹی کے کمرے کی طرف لڑکھڑاتا ہوا بڑھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے جیسے تیسے حویلی کی تیسری منزل پر پہنچ گیا۔ اُس کے دو وفادار کتے کمرے کے باہر ابھی تک موجود تھے۔ اوریلانو نے خون بھرے ہاتھ سے تالے میں چابی لگائی اور دروازہ کھول کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اُس کے دوسرے ہاتھ میں خون سے بھیگا ہوا پستول تھا۔

روزا نے وہی سفید جوڑا زیب تن کر رکھا تھا جو وہ مقابلہ ٔحُسن میں پہنے ہوئے تھی۔ اوریلانو نے اُسے دیکھا تو آنکھوں میں آنسو بھر آ ئے۔

''بیٹی! اپنا وقت آ پہنچا۔'' اُس نے پستول تان لیا۔ اُس کے قدموں میں خون کا تالاب سا بنتا جا رہا تھا۔

''بابا! مجھے ختم نہ کیجیے۔'' روزا ایک عزم سے بولی۔ ''مجھے زندہ رہنے دیجیے تاکہ میں دشمن سے آپ کا اور اپنا انتقام لے سکوں۔''

اوریلانو نے بجھتی ہوئی آنکھوں سے اپنی سولہ سالہ لڑکی کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ اُسے معلوم تھا کہ تادیو اس لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کرے گا پھر بھی لڑکی کے چہرے پر ایسا پختہ عزم نظر آ رہا تھا کہ اوریلانو اپنے فیصلے پر عمل درآمد کرتے ہوئے ہچکچانے لگا۔ اُس نے پستول نیچے کیا اور اپنی بیٹی کے قریب آ کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا پھر پستول کا رُخ دروازے کی طرف کردیا۔ تادیو کے سپاہیوں نے باہر کھڑے ہوئے کتوں کو گولیاں ماریں۔ کتوں کی آخری غراہٹ سے اوریلانو اور روزا کو اندازہ ہوگیا کہ سپاہی اُن کے کمرے میں داخل ہونے والے ہیں۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ دھڑام سے کھلا اور پہلا سپاہی اندر گھسا۔ اوریلانو نے یکے بعد دیگرے چھ گولیاں داغیں اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔

اُس کے مرنے کے بعد تادیو کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے دیکھا کہ سفید پوشاک میں ملبوس ایک حور گھٹنوں میں سر دیے رو رہی ہے۔ تادیو نے ہاتھوں سے اُس کا چہرہ بلند کیا، وہ اُسے بہت خوب صورت لگی لیکن اُس کی معصوم آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں نے تادیو کے دل میں رحم کا جذبہ بیدار نہیں کیا۔ وحشی تو وہ تھا ہی، خصوصاً اس وقت تو وہ جنگ کی حالت میں تھا، لہٰذا اُس کی وحشت کچھ اور بڑھ ہوگئی۔ اُس نے روزا کے ریشمیں بال پکڑ کر اُسے اٹھایا اور سپاہیوں سے کہا۔ ''یہ میرا حصّہ ہے، باقی جو کچھ ملے، وہ تم لوگ اُٹھالو۔''

روزا رات بھر نہ سو سکی، ہاں صبح کے وقت روتے روتے اُس کی آنکھ لگ گئی، پھر وہ بیدار ہوئی تو دن چڑھ آیا تھا۔ باپ کی لاش اب کمرے میں نہیں تھی۔ روزا کا سفید لباس جگہ جگہ سے سُرخ ہو چکا تھا اور اُس کے بدن میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ معاً اُسے رات کا واقعہ پورا یاد آ گیا۔ وہ اُٹھ کر غسل خانے میں گئی اور نہانے کے لیے ٹب میں اُتری۔ ٹب کا پانی بھی لال ہوگیا۔

نہا کے اُس نے ایک صاف ستھرا لباس پہنا اور حویلی سے باہر نکلی۔ اُسے ایک جگہ اپنے باپ کی لاش نظر آئی، ظالموں نے پیروں میں رسّی باندھ کر لاش پہاڑی پر گھسیٹی تھی۔ کپڑے دھجی دھجی ہو چکے تھے اور جگہ جگہ گوشت اُبھر آیا تھا۔ عام آدمی کے لیے اُسے پہچاننا مشکل ہوتا مگر روزا نے پہچان لیا اور اُس سے لپٹ گئی۔

سانتا تیریسا قصبے کے لوگ حویلی کے قریب پہنچے تو انہوں نے روزا کو اسی حالت میں دیکھا۔ پھر قصبے والوں کی مدد سے روزا نے اپنے باپ اور اُس کے ملازموں کی تدفین کی۔

تدفین کے بعد روزا کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنی دادی کے ہاں چلی جائے، وہ وہاں نسبتاً محفوظ رہ سکے گی۔ روزا نے یہ مشورہ مسترد کردیا۔

قصبے کے لوگوں نے جہاں تک ممکن تھا، حویلی کی مرمت کی اور روزا کی حفاظت کی خاطر چھ نئے کتے اُس

کے حوالے کر دیے۔

ڈیلسی روزا اور یلانو صرف انتقام کی خاطر جی رہی تھی لیکن اُس کے ذہن میں یہ واضح نہیں تھا کہ وہ تادیو سے انتقام لے گی کس طرح؟ لوگ اب بھی اُس کے حُسن و جمال کے مدّاح تھے۔ کچھ من چلے حویلی کے باہر اُس کی تعریف میں لکھے جانے والے گیت بلند آوازوں سے گنگناتے لیکن روزا پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ ہر وقت تادیو سے انتقام کے بارے میں سوچتی رہتی۔

وہ صبح تڑکے اُٹھ کر گھوڑے پر اپنی زمینوں کا جائزہ لینے نکلتی تو بالکل شہزادی نظر آتی۔ اُس نے زندگی کے معمولات میں کچھ زیادہ فرق نہیں پڑنے دیا، اور یلانو کے قتل کا واقعہ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی بہت پرانی بات ہو۔ کچھ نوجوانوں نے روزا سے شادی کی درخواست کی لیکن روزا آمادہ نہیں ہوئی، کیوں کہ وہ شادی کرنے کے لیے تھوڑی زندہ تھی۔

اُدھر تادیو بھی روزا کی یاد سے چھٹکارا نہ پاسکا۔ جب اُس نے سانتاتریسا کے قصبے میں تباہی پھیلائی تھی اور روزا کو مالِ غنیمت کے طور پر اُٹھا رہا تھا، اُس وقت وہ اس جیت پر خوش تھا لیکن جلد ہی اُس کی یہ خوشی کافور ہوگئی۔ اُس کے دل میں روزا کا نقش ایسا بیٹھا کہ پھر کبھی نہ مٹ سکا۔

تادیو نے کبھی سنجیدگی سے کسی عورت پر توجہ نہیں دی تھی مگر اب وہ دن رات، صبح و شام روزا کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُس نے روزا کو آخری مرتبہ دیکھا تھا تو وہ بستر پر اُدھ موئی لیٹی ہوئی تھی اور اُس کا لباس لہولہو تھا۔ تادیو کے تصوّر میں یہ شبیہ رہ رہ کے اُبھرتی اور اُسے مزید بے قرار کرجاتی۔ تادیو اب ملک کا ایک اہم وزیر ہوگیا تھا۔ اب اُسے جنگلوں میں گولیاں تڑتڑانے کے بجائے فائلوں کا مطالعہ کرنا پڑتا، وہ ایک کم گو اور سنجیدہ آدمی بن گیا تھا۔ خانہ جنگی کی یادیں اُس کے دماغ میں دھندلانے لگی تھیں اور لوگ اُسے ڈان تادیو کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ اگر اُسے اپنے ساتھ روزا کی کمی محسوس نہ ہوتی تو شاید وہ اپنی زندگی ایک خوش حال زندگی سمجھتا۔ جب وہ کسی نظم یا گیت میں رومانی مصرعے پڑھتا یا سُنتا تو اُسے ایسا لگتا جیسے یہ بول روزا کے لیے کہے گئے ہیں۔ اُس نے روزا کی یاد سے نجات حاصل کرنے کے لیے کئی دوسری عورتوں کا سہارا لیا لیکن ہر عورت اُس کے دل میں روزا کی یاد پہلے سے زیادہ پختہ کردیتی۔

چلّی کی خانہ جنگی کو پچیس برس گزر گئے۔ تادیو ستاون سال کا ہوگیا۔ روزا اب اکتالیس برس کی تھی، اُس کے حسن میں بہت زیادہ فرق پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ اُس کا حسن مزید نکھر گیا تھا۔ اُس کے برعکس تادیو کے سر کے بال اُڑ چکے تھے اور اُس پر بڑھاپے کے آثار واضح تھے۔ اپنی ستاونویں سال گرہ کے دن تادیو کو روزا بُری طرح یاد آئی۔ اُس نے سوچا کہ میں اب تک اُسے نہیں بھلا سکا ہوں تو آیندہ کیا بھلا سکوں گا۔ یہ سوچ کر اُس نے زور سے میز پر مکّا مارا اور اُٹھ کے کھڑا ہوگیا۔

''سر آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' اس کے سیکریٹری نے پوچھا۔ ''ایک پُرانے سودے کا حساب چکانے۔'' تادیو نے جواب دیا۔ اُسے روزا کی تلاش میں بھٹکنا نہیں پڑا کیوں کہ روزا اب تک اپنی حویلی ہی میں مقیم تھی۔ تادیو اپنی بڑی سی گاڑی میں حویلی کی طرف روانہ ہوا۔ قصبے میں پہنچ کر اُس نے روزا کی حویلی دیکھی۔ حویلی اب بھی ویسی ہی تھی جیسی تادیو کے خطرناک حملے سے قبل تھی۔ وہ مضبوط دیواریں ویسی ہی کھڑی تھیں جنہیں تادیو نے ڈائنا مائٹ لگا کر اپنی دانست میں تباہ کردیا تھا۔ جو درخت اُس نے جلا دیے تھے، وہ بھی وہیں کھڑے لہلہا رہے تھے۔ انہی درختوں پر اُس نے اور یلانو کے ملازموں کی لاشیں اُلٹی لٹکائی تھیں۔ اُس کا دل گہرے دُکھ میں ڈوب گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے یہ تمام چیزیں اُس کا مذاق اُڑا رہی ہوں کہ ''دیکھو آدمی! تم کچھ بھی نہیں کرسکے۔ ہم جیسے تھے، ویسے ہی ہیں اور تم بڈھے ہوگئے۔''

وہ مڑنے ہی کو تھا کہ اُسے سامنے سے ایک باوقار عورت آتی دکھائی دی۔ یہ ڈیلسی روزا تھی۔ تادیو نے اُس کا چہرہ دیکھا، لباس دیکھا، چال دیکھی اور اُس کی آنکھیں دیکھیں۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا اُسے اپنے خیالوں اور خوابوں میں نظر آتا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہوا گویا وہ پچیس سال سے ایک ہی خواب میں معلّق ہے۔

''آگئے تادیو؟'' روزا نے کہا۔

تادیو کو حیرت ہوئی کہ روزا نے اُسے سیاہ سوٹ اور بڑھاپے کے باوجود کیسے پہچان لیا؟ اُس نے کسی تمہید کے بغیر روزا سے کہا۔ ''جانِ من! تم بڑی ظالم ہو۔ تم نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا ایک لمحے کو بھی۔ میں دنیا میں

تمہارے سوا کسی سے محبت نہیں کرسکا، کسی سے نہیں۔ کسی سے بھی نہیں۔'' تادیو کی آواز شرم سے ڈوبی جارہی تھی۔

روزا نے اطمینان سے آہ کھری۔ وہ رات دن اسی شخص کے بارے میں سوچتی رہی تھی اور اب پچیس برس بعد یہ سامنے موجود ہے تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے کیا سلوک کرے؟ روزا نے تادیو کی آنکھوں میں دیر تک جھانک کے دیکھا۔ تادیو ایک بدلا ہوا آدمی نظر آیا، اُس میں اُسے اپنے باپ کے قاتل کا کوئی نشانہ نہ ملا، اُس کے سامنے کھڑے ہوئے شرمندہ شخص کی آنکھوں میں تو آنسو بھرے تھے۔

روزا نے اپنے دل میں تادیو کے خلاف پچیس سالہ نفرت بیدار کرنے کی کوشش کی لیکن اُسے ذرا بھی نفرت کا احساس نہیں ہوا۔ اُسے وہ وقت یاد آیا جب اُس نے اپنے باپ سے التجا کی تھی کہ بابا! مجھے ختم نہ کیجیے تاکہ میں دشمن سے نمٹنے کے لیے زندہ رہ سکوں۔ روزا نے وہ وقت بھی یاد کیا جب فتح کے نشے میں چُور ہو کر تادیو اُس سے گتھم گتھا تھا اور وہ چلاّ چلاّ کے اُسے سخت سست کہہ رہی تھی۔ اُس نے وہ وقت بھی یاد کیا جب وہ اپنے باپ کی مسخ لاش پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اُس نے تادیو کی آنکھوں میں جھانکا اور خود سے کہا۔ ''یہ وہ شخص تو نہیں ہے۔''

وہ سوچوں کے سمندر سے تب اُبھری جب تادیو نے اُس کے ہاتھ کا بوسہ لیا۔ آنسوؤں کے قطرے اُس کے ہاتھ کی پشت پر پھسل رہے تھے۔ اُسے خیال آیا کہ میں نے تادیو سے پچیس برس نفرت کی ہے مگر اب شاید جذبہ اپنی انتہائی حدود چھو کر کب کا سرد پڑ چکا ہے اور اب شاید میں اُس سے محبت کرنے لگی ہوں۔ دوسرے ہی لمحے وہ اس خیال سے ڈر گئی۔ اُسے اپنی اس کیفیت پر بے انتہا شرم آئی اور دُکھ ہوا۔

اتفاق سے یہ دُکھ بھی تادیو ہی نے بانٹا۔ اُس نے روزا کے گھٹنے پکڑ کر اُس سے معافی مانگی۔ آخر تادیو کے خلاف جتنی نفرت روزا کے دل میں تھی، وہ آنسوؤں کے راستے بہہ گئی۔ وہ دونوں مسلسل پچیس برس سے ایک اندوہ ناک زندگی گزار رہے تھے۔ کسی بھی شخص سے صحیح معنوں میں انہیں قرب حاصل نہیں ہوسکا تھا لیکن آج اُنہوں نے محسوس کیا کہ وہ یک جان دو قالب ہیں اور ایک دوسرے کا درد سمجھتے ہیں، کوئی تیسرا شخص اُن کا درد نہیں جان سکتا۔

تادیو نے دارالحکومت لوٹنے کے بجائے سانتا تیریسا کے ایک شان دار ہوٹل میں کمرا کرائے پر لے لیا اور روزا سے شادی کا اہتمام کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ شادی کے موقع پر بہت بڑا جشن برپا ہوتا کہ وہ دونوں ماضی کا ہر غم بھول سکیں اور جشن میں قصبے کے تمام لوگ شریک ہوں۔ تادیو کی عمر ستاون برس تھی لیکن روزا کی محبت حاصل کرنے کے بعد سے وہ خود کو دوبارہ جوان محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس نے روزا کو جو اذیت پہنچائی ہے، خدمت اور محبت سے اُس کا ازالہ کردے، تادیو اپنی دولت اور حیثیت کے ذریعے روزا کو ہر وہ چیز فراہم کرنا چاہتا تھا جس کی روزا نے زندگی میں کبھی تمنا کی ہو۔ وہ روزا کو اتنی خوشیاں دینا چاہتا تھا، اتنی خوشیاں کہ بیتے ہوئے دنوں کے تمام دُکھوں کی تلافی ہوسکے۔

اسی عالم میں ایک ماہ گزر گیا۔ روزا نے تادیو کی طرف سے شادی کی پیش کش قبول کرلی تھی۔ تادیو شادی کی تیاری کرچکا تھا اور اب شادی میں دو روز باقی رہ گئے تھے۔

روزا کی حویلی میں میزیں اور کرسیاں لائی جارہی تھیں، پھولوں اور برقی قمقموں سے حویلی سجائی جارہی تھی۔ روزا نے کمرے میں جاکر عروسی جوڑا پہنا اور قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اُسے وہ دن یاد آیا جب اُسے کارنیوال کے میلے میں ملکۂ حُسن قرار دیا گیا تھا۔ اُسے اندازہ ہوا کہ آج بھی وہ اتنی ہی خوب صورت ہے۔ اُسے یہ خیال بھی آیا کہ جس فرض کی ادائیگی کے لیے وہ پچیس برس زندہ رہی، وہ اب ناممکنات میں داخل ہوچکا ہے، کیوں کہ اُسے اپنے باپ کے قاتل سے محبت ہوگئی ہے۔

یکایک باپ کا چہرہ اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ روزا کے دل کا جُڑا ہوا آئینہ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ اُس نے وحشت سے شوکیس پر پڑی ہوئی قینچی اُٹھائی اور عروسی ملبوس کاٹ پیٹ ڈالا، پھر وہ اُس کمرے کی جانب چلی گئی جہاں اُس نے اپنے باپ سے کوئی عہد کیا تھا۔

تادیو دیر سے روزا کو حویلی میں تلاش کررہا تھا۔ اُس نے روزا کے ایک کتے کو حویلی کے بالائی حصے پر زور زور سے بھونکتے سنا، وہ وہاں چلا گیا۔ بالائی کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ تادیو نے مالی کو آواز دی اور اُس کی مدد سے زور لگا کے دروازہ توڑ دیا۔ جہاں آج سے پچیس برس قبل اُس نے روزا کو ایک آسمانی حور کی شکل میں دیکھا تھا، عین اُسی جگہ روزا کی لاش پڑی تھی۔

☆☆......☆☆

مکھنی



ارشد علی ارشد

ابوظہبی سے خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد دوشیزہ کی ایک حیرت انگیز، ناقابلِ فراموش سرگزشت

ایک مافوق الفہم' اسرار بھری عجوبہ داستان

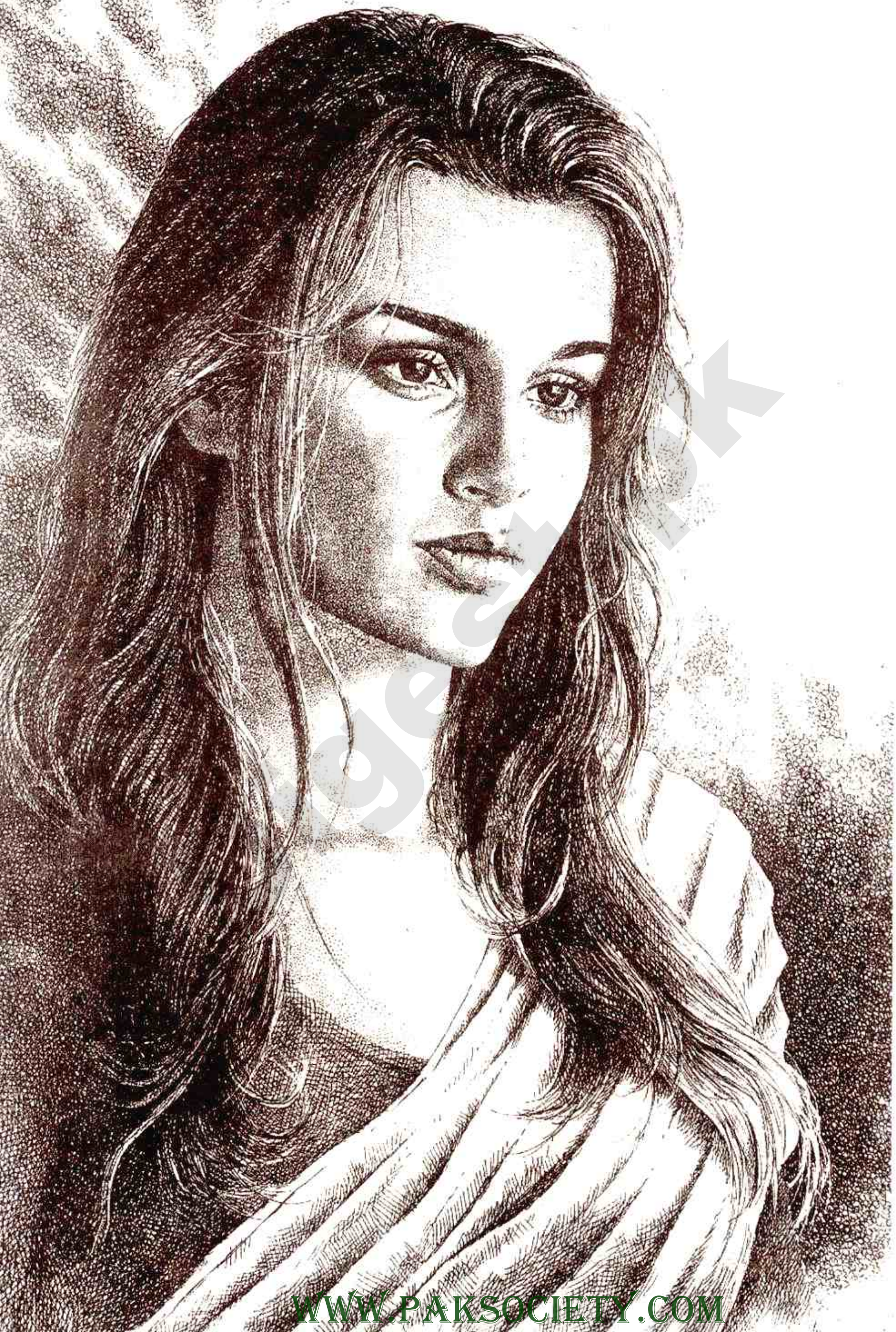
قسط نمبر 18

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

مکھنی ایک نہایت ذہین و سمجھ دار، اوروں سے مختلف سوچ، خیالات، نظریات اور غیبی طاقت رکھنے والی گاؤں کی ایک لڑکی ہے جو اپنے ماں باپ، دو بھائیوں اظہر اور مظہر، ایک بہن سکھاں اور محبت میں ناکام، غیر شادی شدہ پھپّو ذکیہ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سکھاں کو اپنے کالج فیلو سانول سے محبت ہوگئی ہے، مکھنی محبت اور عشق کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اپنی بہن سکھاں کو سفید چونے کی دیوار کو اپنی غیبی طاقت سے پردۂ اسکرین بنا کر ماضی میں مجاہدینِ اسلام کا ایک لشکر دکھاتی ہے:۔

محبت اور عشق کی باتیں کرتی، گتھیاں سلجھاتی اور مسلمانوں کے عظیم ماضی واسلاف کے کارنامے بتاتی اور دکھاتی مکھنی، سکھاں سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ سانول سے اُس کے رشتے کے سلسلے میں گھر والوں سے بات کرے گی۔ مکھنی کے بھائی اظہر کی دبئی روانگی سے پہلے شادی کردی جاتی ہے۔ مکھنی اسی دوران میں سانول کے گھر اُس سے ملنے جاتی ہے۔ ایک روز سکھاں کالج سے لوٹ رہی ہوتی ہے تو چوہدری اللہ رکھا کا بیٹا چوہدری راحیل اُسے روک کر پریشان کرتا ہے اور پھر ایک روز جب سکھاں اپنی ماں کے ساتھ جارہی ہوتی ہے تو چوہدری راحیل دوبارہ وہی حرکت کرتا ہے۔ اس دوران میں سکھاں کا باپ اس کی منگنی فاطمہ خالہ کے دیور سے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک روز یوں بھی ہوتا ہے کہ چوہدری اللہ رکھا، مکھنی کا راستہ روک لیتا ہے۔ مکھنی اس کو برا بھلا کہتی ہے تو وہ اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن مکھنی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ چوہدری اللہ رکھا اپنے کارندوں کے سامنے اس بے عزتی پر مکھنی کو دھمکی دیتا ہے کہ اب میرے حجرے میں تیرا ناچ ہوگا اور پھر ایک روز چوہدری اللہ رکھا کے کارندے مکھنی کو اغوا کر کے اس کی کوٹھری کی شکل میں موجود حجرے میں پہنچا دیتے ہیں۔

چوہدری اللہ رکھا کے حجرے میں مکھنی اس کی خواہشات پوری کرنے کی بجائے موقع ملتے ہی چوہدری اللہ رکھا کی رائفل سے اسے قتل کر دیتی ہے۔ مکھنی کو چوہدری کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا جاتا ہے اور پھر سکھاں تھانے میں آ کر بتاتی ہے کہ چوہدری اللہ رکھا کے بڑے بیٹے چوہدری مشتاق نے اسے پیغام بھیجا ہے کہ اگر سکھاں کے لیے چوہدری راحیل کا رشتہ قبول ہے تو ہم مکھنی کو معافی کے بعد دیت کے قانون سے رہائی دلوا سکتے ہیں۔ اسی دوران میں لیڈی انسپکٹر شبانہ کو مکھنی سے تفتیش کے لیے بلایا جاتا ہے۔ مکھنی اُسے دیوار پر محمد بن قاسم



کا نظارہ کر کے دہلا دیتی ہے اور وہ تھانے دار کے گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ مکھنی کے معاملات سے خائف ہوکر تھانے دار اُسے لے کر گاؤں آتا ہے جہاں مکھنی کے قاتل ہونے کے گواہ اپنے بیان سے مکر جاتے ہیں۔ مکھنی تھانے دار سے رہائی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر آتی ہے۔

گھر آ کر اسے پتا چلتا ہے کہ اس کا ابا فالج کے باعث چارپائی سے لگ گیا ہے، پھر کچھ دن بعد اس کے ابا کا انتقال ہوجاتا ہے، جبکہ اس کا بھائی، باپ کی موت سے پہلے ہی دبئی چلا جاتا ہے۔ اسی دوران میں اس کی شادی بلاول سے ہوجاتی ہے۔

مکھنی اور بلاول نے اپنے بیٹے کا نام معاویہ رکھا ہے، معاویہ چار سال کا ہوگیا ہے لیکن باتیں بہت ذہانت کی کرتا ہے۔

مکھنی کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے، کبھی وہ کہیں ہوتی ہے اور پھر غیر محسوس طریقے سے ماورائی قوت کے تحت وہاں سے کوسوں دور جا پہنچتی ہے۔

جب مکھنی کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خود کو انتہائی آرام دہ بیڈروم میں پاتی ہے۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے اور کمرے میں ایک وجیہ نوجوان ادھیڑ عمر کی باوقار سی ایک خاتون اور جینز اور جیکٹ میں ملبوس ایک خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کمرے میں لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ سب قطار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔

امن مکھنی سے وہ سارے حالات و واقعات بیان کرتا ہے کہ کس طرح وہ لوگ لاہور میں دریا راوی کے کنارے موجود تھے اور مکھنی انہیں بے ہوشی کی حالت میں ملی تھی۔ مکھنی امن سے کہتی ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ مکھنی کو اپنا شوہر بلاول اور بچہ معاویہ یاد آتا ہے وہ سوچتی ہے خاندان والوں کے بارے میں جاننے کے لیے اس کا لاہور کا سفر ضروری ہے۔ لیکن اس سے پہلے وہ امن کے خاندان کے اذہان وقلوب میں اہم پیغام پہنچانا چاہتی تھی اور اس کے لیے وہ اس دن کے انتظار میں تھی جب تمام لوگ خاص اہتمام کے ساتھ اکٹھے ہوکر اس کے روبرو پیش ہوتے تھے اس کے لیے مکھنی کو ایک خالی سفید دیوار چاہیے تھی جب سب لوگ اکٹھے ہوگئے تو مکھنی انہیں ہندو مذہب کے بارے میں سمجھاتی ہے کہ سمجھ نہیں آتا کہ پڑھے لکھے لوگ جانوروں، بیل کچھوا، پیپل تلسی وغیرہ کو کیسے مقدس سمجھتے ہیں۔ دنیا کے سارے عقیدے توحید پر مبنی ہیں پھر وہ انہیں اسلام کی بابت سمجھاتی ہے اور ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتی ہے۔ مکھنی کی بات سے وہاں ہلچل مچ جاتی ہے اور وہ لوگ اس کے مخالف ہوجاتے ہیں تب امن مکھنی کو گھر چھوڑنے کا کہتا ہے، کیوں کہ وہ لوگ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں، مکھنی وہاں سے فرار ہوکر انکل فہیم کے گھر پہنچ جاتی ہے۔

فہیم مکھنی کو اس کے گاؤں مہر داد نگر چھوڑ آتے ہیں۔ راستے میں وہ سانول کے کھیتوں کے قریب ٹھوکر کھا کر گر جاتی ہے سانول جیسے ہی اسے اُٹھانے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ مکھنی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے سانول مکھنی کو اپنے گھر لے جاتا ہے، سانول کا باپ مکھنی کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے کہ کہیں اس کی وجہ سے کوئی مصیبت ان پر نہ آجائے۔ سانول مکھنی کو روکنے کی کوشش کرتا ہے مگر مکھنی انکار کردیتی ہے اور اپنے گھر پہنچ جاتی ہے۔

مکھنی کو نیند میں احساس ہوتا ہے کہ گھر کا دروازہ بری طرح پیٹا جارہا ہے۔ وہ بھاگ کر کمرے سے باہر نکل آتی ہے اور سمجھ جاتی ہے کہ مہر داد نگر والوں کو اس کے لوٹ کے آنے کی اطلاع مل چکی ہے۔ گاؤں کے لوگ دروازہ توڑ کر گھر میں داخل ہوجاتے ہیں اور مکھنی کو گھیر لیتے ہیں۔ وہ تمام لوگ مکھنی کے دیکھے بھالے تھے، مگر اس وقت ان کے چہروں پر اجنبیت اور سفاکی تھی۔ وہ لوگ اس سے کہتے ہیں کہ تو یہاں کیوں آتی ہے؟ تیری وجہ سے کتنے گھر تباہ ہوگئے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہتر یہی ہے کہ اسے دھکے دے کر مہر داد نگر سے باہر نکال دیا جائے۔ مکھنی کا دل لوگوں کی باتیں سن کر لہولہان کررہا تھا، مگر وہ جانتی تھی کہ اس وقت چپ رہنا ہی دانشمندی تھی۔ مکھنی پر بے تحاشہ تشدد کیا جاتا ہے مگر اس نے زبان پر چپ کا تالا لگایا ہوا تھا۔ اسی وقت چوہدری مشتاق وہاں پہنچ جاتا ہے۔ وہ مکھنی کو دیکھ کر خوش ہوجاتا ہے اور کہتا ہے کہ آج تو مہر داد نگر کے بھاگ جاگ اُٹھے ہیں یہاں رحیم اللہ ترکھان کی دھی مکھنی آگئی ہے۔ چوہدری کے ارادے اور تیور دیکھ کر مکھنی خوف زدہ ہوجاتی ہے۔ مکھنی کو رسیوں سے باندھ کر گھوڑے کے ساتھ دوڑایا جاتا ہے۔ مکھنی زمین پر گھسیٹے جانے سے بری طرح زخمی ہوجاتی ہے۔ اچانک رسی

ٹوٹ جاتی ہے اور مکھنی قلابازیاں کھاتی ہوئی بے ہوش ہو جاتی ہے۔

مکھنی کو جب ہوش آتا ہے تو وہ ایک جنگل میں ہوتی ہے۔ وہ ہمت کر کے اٹھتی ہے اور ایک سمت چلنے لگتی ہے۔ مکھنی کا دل مطمئن تھا وہ سوچتی ہے کہ یہ جو میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بلا روک ٹوک پہنچ رہی ہوں، یہ اللہ تعالیٰ کی منشا ہے۔ حالات جس نہج پر لے چلیں چلنا ہوگا۔ تب مکھنی کا ذہن جست بھرتا ہے اور مکھنی پیر سید مہر علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر واقع گولڑہ شریف میں خود کو موجود پاتی ہے۔

مکھنی مزار پر موجود لوگوں کو پیر مہر علی شاہؒ کے حالات زندگی بتاتی ہے اور کہتی ہے کہ پیر صاحب سے محبت کا حق یہ ہے کہ ان کی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔ آج ہم کیوں دھڑوں میں منقسم ہیں، چند مفاد پرست مولویوں کے حق میں گلے پھاڑ کر نعرے لگاتے ہیں اور حق و سچ کی بات بتانے والوں سے دور بھاگتے ہیں خدا اور اسلام کو سمجھیے اور پہچانیے۔ یہ کہہ کر مکھنی وہاں سے چل پڑتی ہے۔ مزار کے راستے میں وہ ایک شخص کو دیکھتی ہے جو گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا اور لوگ اسے چھیڑ چھیڑ کر جا رہے تھے۔ مکھنی کہتی ہے کہ تم لوگ پیر مہر علی شاہؒ کے مزار پر جا رہے ہو، مزار پر جانے والوں کو ایسی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ تب مکھنی اس کوڑھ زدہ شخص کے ساتھ بیٹھ جاتی ہے۔ اور ایک بزرگ شخص کو پانی لانے کا کہتی ہے۔ وہ کوڑھ زدہ آدمی مکھنی کو خود پر بیتی داستاں سناتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس حال میں مزار پر موجود ہے۔ تب مکھنی اسے کہتی ہے کہ ''جب قارون زندہ دفن ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا۔ ''اے موسیٰ وہ تجھ سے معافیاں مانگتا رہا مگر تو معاف نہ کر سکا، مجھے اپنی عظمت کی قسم ہے۔ مجھ سے ایک بار بھی معافی مانگتا تو میں معاف کر دیتا۔ مکھنی کہتی ہے تو کیا ہم قارون سے بھی برے ہیں؟ ہمیں تو امت محمدﷺ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جو مہربان اللہ قارون کو معاف کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہو، غفور الرحیم رب اپنے حبیب کی امت کو کیسے معاف نہیں کرے گا بس اس کے لیے ہمیں صدق دل سے معافی مانگنی ہوگی۔''

(اور اب آگے پڑھیے)

میں اسے حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں آج تک اسے تخیلی کردار سمجھتی رہی تھی، مگر آج میرے سامنے حقیقتاً



موجود تھا، میری حیران نظروں کو بھانپتے ہوئے وہ بولا۔

''غور سے دیکھ، وہی ہوں میں، جس کے بال نوچنے کی متمنی تھی تم، پیٹ میں زور زور سے گھونسے مارنے کی خواہاں تھی، دل و دماغ پر جمی ظلم و جبر کی کائی دھونے کے چکر میں تھی'' کہنے کے بعد وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔''ہی ہی ہی۔''

''عبداللہ میں تمہیں نہیں سمجھ سکی، آج نہیں شاید کل سمجھ لوں۔ آج میرا ذہن تھکا ہوا ہے۔''

''دربار میں تماشا دکھاتے وقت کیوں نہ سوچا کہ اس اچھل کود سے ذہنی و جسمانی تھکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔''

''اوہ عبداللہ تم تھے وہاں۔''

''ہاں......''

''پھر مجھے بتایا کیوں نہیں۔'' میرے لہجے میں شکوہ تھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''آؤ بتاتا ہوں۔''

میں اسے پیچھے سے دیکھ رہی تھی، کیڑے کی طرح رینگنے والی چال میں کچھ فرق نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا عبداللہ تم واقعی عجیب و غریب اور پراسرار ہو، میں اس کے قریب پہنچی تو وہ بولا۔

''کیا ضرورت تھی یہ تماشہ کرنے کی۔''

''عبداللہ مجھے سمجھ ہی نہیں آیا، پتا نہیں کیوں میں آپے سے باہر ہوگئی تھی، مگر تم نے بتایا نہیں۔ تم یہاں کیسے؟''

''میں یہاں شہاب الدین غوری کی قبر دیکھنے آیا تھا۔''

''شہاب الدین غوری کی قبر؟'' میں نے حیرت سے اس کی بات دہرائی۔

''ہاں کوئی کام نہیں تھا تو سوچا چلو شہداء کو سلام کرتا آؤں۔ کھڑپوٹ پہنچا تو پتا چلا سرجلال شاہ کے مزار پر عرس ہو رہا ہے، عرس کا سن کر وہاں چل پڑا۔ وہاں سیکڑوں افراد دائرہ بنائے کھڑے تھے، میں بھی اس طرف ہولیا۔ دیکھا تو تم گھنگرو باندھے دھمال پہ دھمال ڈال رہی تھیں۔''

''ہی ہی ہی۔'' وہ ہنسنے لگا میں نے تیرے گلے میں سہ رنگی مالیں دیکھ کر کہا۔ ''چل بھائی عبداللہ، رحیم اللہ ترکھان کی بیٹی مکھنی آج جوگن بن گئی۔ جوگن مکھنی۔ ہی ہی ہی......'' اس کی ہنسی تھم نہیں رہی تھی، میں نے پُر شکوہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''عبداللہ تُو کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ مجھے روکا نہیں؟''

''میں نے تماش بینوں سے جوتے کھانے تھے۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ''نہ بابا نہ......سنا ہے سرجلال شاہ کے گاؤں والوں کے جوتے بھی بہت بڑے سائز کے ہوتے ہیں۔'' اس کے اندازِ تکلم پر میں ہنس پڑی۔

''ہاہاہا......ڈرپوک عبداللہ۔'' میری ہنسی میں وہ بھی شامل ہو گیا۔

''ہی ہی ہی......جوگن مکھنی۔''

''اچھا تم نے بتایا نہیں شہاب الدین غوری کی قبر کہاں ہے۔''

''دیکھنا چاہتی ہو۔ یہی کھڑپوٹ میں ہے۔''

''ہاں۔''

''آؤ چلیں۔'' چلتے ہوئے ہم چند قبروں کے قریب پہنچ گئے، عبداللہ ایک قبر کے پاس رک کر بولا۔

''یہ ہے اس مردِ مجاہد کی قبر جس نے ہندوستان پر اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے حملہ کیا تھا اور یہ ساتھ دوسری قبریں سلطان کے محافظوں کی ہیں۔''

''یہ سلطان شہاب الدین غوری کی قبر ہے؟'' میں حیرت سے قبر کو دیکھ رہی تھی، دوسری ہزاروں لاکھوں قبروں کی طرح یہ بھی ایک عام سی قبر تھی، بلکہ دوسری قبر پر نام و نسب کے کتبے نصب ہوتے ہیں۔ اس قبر پر نام کا کتبہ تک موجود نہیں تھا، حیرت ہوئی نا۔ مجھے بھی حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا اور دوسری حیران کن بات یہ ہے کہ یہاں کے مقامی لوگوں کو بھی نہیں پتا کہ یہاں شہاب الدین غوری کی قبر ہے۔

''حکومت کو اس پر توجہ دینی چاہیے عبداللہ۔ سلطان معز الدین محمد غوری کوئی عام آدمی نہیں تھا۔''

''مکھنی تمہیں ان کا اصل نام بھی پتا ہے۔''

''ہاں عبداللہ۔ ان کا اصل نام محمد تھا۔ معز الدین لقب اور افغانستان کی ریاست غور سے تعلق کی نسبت سے غوری ہوئے، اس طرح اصل نام تو محمد معز الدین غوری ہی تھا مگر شہاب الدین غوری اس لیے مشہور ہوئے کہ عہد شباب میں ایسے ہندوستان کی کئی ریاستوں پر فتح حاصل ہو چکی تھی۔ اس لیے بڑے بھائی سلطان غیاث الدین غوری کے جب نائب تھے تبھی سے شہاب الدین غوری مشہور ہو چکے تھے۔''

''ہوں......'' عبداللہ نے پرسوچ ہنکارا ابھرا۔ ''آگے بولو مکھنی، میں مزید سننا چاہتا ہوں۔''

''شہاب الدین غوری بہترین سپہ سالار اور عسکری رموز سے بہرہ مند شخص تھا۔ مستقل مزاجی اور بردباری ایسی کہ میدانی شکست بھی کبھی اس کے حوصلوں کو شکست نہ دے سکی، اس نے اگر کسی معرکے میں شکست کھائی تو دم دبا کر نہیں بیٹھا نہ حوصلہ ہارا نہ ہی دل برداشتہ ہوا بلکہ اس معرکے کو چت کر دکھایا۔''

''شاباش سلطان۔'' عبداللہ نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ وہ قبر کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

''بیٹھ جاؤ مکھنی، بیٹھ کر بتاؤ۔ میری ٹانگیں میرا بوجھ نہیں سہار سکتیں۔''

''ہی ہی ہی۔'' اس بار میں بے اختیار ہنس پڑی، اس نے نظریں اٹھا کر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔

''تمہارا وزن ہی کتنا ہے عبداللہ۔؟ پینتالیس سے پچاس کلوگرام۔''

''ہاں تو ٹانگیں بھی کھجور کی سوکھی ٹہنی جیسی ہیں۔ پچاس کلو وزن کیسے اٹھا پائیں گی۔''

میں پھر سے ہنس پڑی اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''اب بول۔''

''جب غزنی پر اس کے بھائی سلطان غیاث الدین غوری کی حکومت تھی اور سلطان بھائی کا نائب تھا، تب سے ہی انہوں نے ہندوستان پر اسلامی حکومت قائم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ وہ ارادوں کا پختہ اور قول کا دھنی شخص تھا اس لیے غزنی کے بعد ملتان اور پھر اُچ پر حملہ کر کے انہیں فتح کر لیا، مگر اس کے مقدر میں شکست لکھی ہوئی تھی۔ راجپوتوں کی فوج نے اسے آبو پہاڑ کے پاس روک کر شکست دے دی، مگر شہاب الدین شکست سے ارادے بدلنے والا سپہ سالار نہیں تھا، وہ فوج کی تربیت اور اسلحے لڑانے کے سارے فن جانتا تھا۔ دو صدیاں بیت چکی تھیں غزنوی خاندان کو پنجاب پر حکومت کرتے ہوئے، سلطان نے ان پر تین بار حملہ کیا اور غزنوی حکومت کو اپنے علاقے میں شامل کر کے دم لیا۔''

''دم لیا۔ مطلب؟ بس آگے ٹائیں ٹائیں فش۔'' عبداللہ فوراً بول پڑا۔

''نہیں عبداللہ! پنجاب پر قناعت کرنا مسلمان کی طبیعت کے منافی تھا، اس لیے ان کی نظریں اجمیر اور دہلی پر ٹک گئیں۔ لیکن دہلی اور اجمیر پر طاقت ور راجہ راج چوہان کی حکومت تھی۔ سلطان نے حملہ کیا تو تراوڑی کے مقام پر اس معرکہ میں سلطان کو شکست ہوئی۔ پرتھوی جیسا کہ میں نے پہلے بتایا عبداللہ کہ سلطان شہاب الدین غوری مردِ میدان شخص تھا۔ شکست سے کبھی دل برداشتہ نہیں ہوا۔ تراوڑی کی شکست بھی اس کے حوصلے پست نہ کر سکی، لہٰذا محض ایک سال بعد وہ پھر پرتھوی راج چوہان کے مدمقابل آ کھڑا ہوا۔ اس بار فتح سلطان شہاب الدین کے مقدر میں لکھی ہوئی تھی۔ طاقتور راجہ پرتھوی راج چوہان جس کے نام پر آج ہندوستان پرتھوی میزائل بنا رہا ہے۔ بری طرح شکست کھا کر مارا گیا۔ دہلی اور اجمیر بھی سلطان کے زیر تسلط آ گئے، سلطان کا اگلا ہدف قنوج تھا۔ ریاست قنوج راجپوتوں کی بڑی بڑی حکومتوں میں شمار ہوتی تھی۔ یہاں کا طاقتور حکمران جے چند تھا۔ 1194ء میں شہاب الدین غوری نے قنوج اور ارد گرد کے کئی علاقے فتح کر لیے، راجپوتانہ، صوبہ بہار کا بہت بڑا حصہ اور ہمارا یہ پاکستان کا سارا علاقہ سلطان غوری کے قبضے میں آ چکے تھے، اس دوران پنجاب میں کھوکھروں نے بغاوت کر کے صوبے کو غزنی سے علیحدہ کر دیا، سلطان انہیں سبق سکھانے کے لیے ایک بار پھر پنجاب آئے اور کھوکھروں کو شکست فاش دی۔ پنجاب میں ہی اسے خیمے میں گھس کر اس وقت ایک شخص نے قتل کر دیا

جب سلطان سو رہا تھا اس طرح 1175ء میں پیدا ہونے والا شہاب الدین غوری 1206ء میں ابدی نیند سو گیا۔''

''اچھا ملکھنی! تم نے مع تاریخوں کے شہاب الدین غوری کی تاریخ سنا دی۔ کیا یہ بھی کہیں پڑھا ہے کہ اس کی قبر سوہاوا کے مضافاتی گاؤں کھڑیوٹ میں ہے۔'' عبداللہ کے سوال پر میں نے سوچ کر نفی میں گردن ہلا دی۔

''پنجاب کا وہ مقام کھڑیوٹ ہی تھا جہاں انہیں شہید کیا گیا تھا۔ مؤرخین شاید یہاں تک پہنچ ہی نہیں سکے۔'' عبداللہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ''مگر اب مؤرخین یہاں تک پہنچیں گے انشاء اللہ۔ فاتحہ پڑھ لی۔''

''ہاں، عبداللہ۔''

''تو پھر آؤ واپس چلیں۔'' کہہ کر وہ اپنی مخصوص چال چلنے لگا۔ میں نے قبروں کو ایک نظر دیکھا اور اس کے پیچھے چل پڑی۔

''بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے شہاب الدین غوری اور اس کے محافظوں کی کھڑیوٹ میں قبریں دریافت کر کے ان پر مقبرہ تعمیر کروا دیا تھا۔ اب وہاں بہت بڑا مقبرہ تعمیر ہے اور لوگ زیارت کے لیے جاتے ہیں۔''

ایک بات پوچھوں عبداللہ۔ میں نے اس کے نزدیک جاتے ہی کہا۔

''ہاں پوچھو۔''

''جب ہم پہلی بار ملے تھے تو تمہاری داڑھی اور سر کے سارے بال کالے تھے، مگر اب آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے ہیں۔''

اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''الٹے سوال مت کرو ملکھنی۔''

''اس میں الٹا پن کہاں ہے؟'' میں نہ سمجھنے والے انداز میں بولی۔

''ہم پہلے ملے ہی کب ہیں۔''

''اگر ملے نہ ہوتے تو تم وہ باتیں نہ دہراتے جو میں نے تمہارے بارے میں سوچی یا کہی تھیں۔''

''تمہاری عمر کیا ہے۔'' اس بار عبداللہ نے سوال کر دیا۔

''یہی کوئی اٹھائیس انتیس سال۔''

''تو پگلی جب ہم پہلے ملے تھے تب تمہاری عمر انیس یا بیس برس تھی۔ سات آٹھ سال گزر چکے ہیں۔''

''ایسا کیا۔'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

چل چل اب حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

''اچھا سنو میں تمہیں چاچا کہہ کر پکاروں تو کیسے لگے گا۔''

''ہاہاہا۔ آج وہ پر تکلف موڈ میں تھا۔'' ایک بار پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔ مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''چاچا۔ پھر پوچھا۔ کیا میں ساٹھ کا لگتا ہوں۔''

''نہیں۔''

''تو پھر چاچا کیوں؟''

''اچھا عبداللہ بھائی پکاروں۔''

''صرف پکارو گی؟''

''نہیں رے! عبداللہ پکار تو زبان کی ہوتی ہے، میں دل سے مانتی ہوں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ مانتی ہو تو ضرور پکارو۔'' اس نے کہا پھر یوں چونکا جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔

''اچھا ملکھنی! تو نے ابھی تک جنت البقیع نہیں دیکھا۔'' اس کے سوال پر میں نے چادر کا پلو کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''کیا ہے؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پیسے۔''

''پتا ہے کہ پیسے ہیں پر مجھے کیوں دکھا رہی ہو؟''

''اس لیے کہ دیکھ سکو۔ اتنے پیسوں میں نہ حج ممکن ہے نہ عمرہ۔ تُو بتا جنت البقیع کیسے دیکھوں؟''

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے بے پروائی سے کندھے اُچکے، ''مگر جنت البقیع دیکھو گی تو بات بنے گی۔''
''کون سی بات۔ میں سمجھی نہیں۔''
''جب دیکھ کر لوٹ آؤ گی تب بتادوں گا۔''
''بتاؤ نا عبداللہ بھائی۔ جنت البقیع تو شاید میں عمر بھر نہ دیکھ سکوں۔'' میں نے سرد آہ کھینچ کر کہا۔
''ملکھنی تم دیکھو گی ضرور دیکھو گی۔''
''کیسے عبداللہ بھائی۔''
''پتا نہیں پر میں نے تمہیں جنت البقیع میں دیکھا ہے۔''
''تم نے کیسے دیکھا ہے مجھے۔'' حیرت سے میرے قدم بے اختیار رک گئے۔ اس نے کہا۔
''رکنا نہیں ہے ملکھنی چلتے رہنا ہے۔'' میں قدم بڑھا کر اس کے ہم قدم پہنچی اور اپنا سوال پھر دہرایا۔ عبداللہ بھائی خاموش رہا تو ایک خیال کے تحت میں نے کہا۔
''عبداللہ بھائی تمہیں کشف ہوتا ہے۔'' میرے سوال پر وہ بے اختیار رک گیا، میں نے اس کے انداز میں کہا۔
''رکنا نہیں ہے عبداللہ بھائی چلتے رہنا ہے۔''
''ہی ہی ہی۔'' وہ ہنس کر چلنے لگا۔
''ملکھنی! کشف کیا ہوتا ہے؟'' اس نے الٹا سوال کر دیا۔
''محاصرہ، مکاشفہ اور مشاہدہ تینوں چیزیں مل کر تصوف کی اصطلاح میں کشف کہلاتی ہیں۔ اس کے معنی ہیں پوشیدہ شے کا ظاہر ہونا۔ میں نے جو تین چیزیں بیان کی ہیں وہ بالترتیب، علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین سے مروج ہیں، آسان لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ علم الیقین، عین الیقین، عقل اور معرفت یا مشاہدہ۔ ان کیفیات میں جو شخص چیزیں بیان کرتا ہے وہی زیر کشف ہوتی ہیں۔'' میرا جواب سن کر وہ بولا۔
''ملکھنی تو مجھے چاروں شانے چت کر کے رہے گی۔''
''ہی ہی ہی۔'' میں زور زور سے ہنسنے لگی۔ ''اچھا اب بتا عبداللہ بھائی میں جنت البقیع کیسے دیکھوں گی۔''
''پگلی وہاں جا کر ان دو موتی ہوئی آنکھوں سے دیکھو گی جو خدا نے تیری روشن پیشانی پر لٹکائی ہیں۔''
''پر میں وہاں جاؤں گی کیسے۔''
''چلی جاؤ گی۔ زیادہ مت سوچو۔ چل آ اب چلتے ہیں۔''
''کہاں......؟''
''تیرے شہر راولپنڈی۔ میں تجھے وہاں چھوڑ آتا ہوں۔''
''آتا ہوں۔ کیا مطلب لوٹ کر یہاں آنا ہے؟''
''یہاں نہ بھی آؤں تو تمہارے ساتھ مستقل تھوڑی رہ سکتا ہوں۔''
''کیا قباحت ہے عبداللہ بھائی......''
''کچھ قباحت نہیں مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔''
''تو پھر؟''
''تو پھر کیا چلو پنڈی چلتے ہیں۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔ میں نے اس کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھا اور اس کے ہم قدم چل پڑی۔
ہم کھڑ پوٹ سے سوہاوا اور سوہاوا سے سیدھا فیض آباد راولپنڈی پہنچ گئے۔
''اب کیا ارادہ ہے عبداللہ بھائی؟''
''اب تیری اپنی منزل، میری اپنی منزل۔''

''میری منزل'' میں نے لحظہ بھر سوچا۔ ''میری منزل تو کوئی نہیں عبداللہ بھائی۔''

''ایسا نہیں ہے ملکھنی۔ ہر انسان کی منزل ضرور ہوتی ہے۔ خصوصاً مسلمان کی۔ سو تمہاری منزل بھی ہے، اس کا یقین کرو اسے سمجھو اور چل پڑو۔''

''عبداللہ بھائی میرے لیے دعا کریں، میرے گھر والے مجھ سے کھو گئے ہیں وہ جلد مجھے مل جائیں۔''

عبداللہ نے جواب دینے کی بجائے ادھر اُدھر دیکھا۔ شہر کی رونقیں بام عروج پر تھی۔

''آؤ ادھر چلتے ہیں، ہم ایک ویران گوشے میں چلے آئے۔''

''ملکھنی دن میں کتنی نمازیں پڑھتی ہو۔''

''الحمدللہ عبداللہ بھائی ہوش میں ہوتی ہوں تو پانچوں پڑھتی ہوں۔''

''اور وظائف۔''

''کچھ نہیں۔''

''مطلب عبادات میں صرف فرض اور سنت ہیں تیرے پاس۔''

''جی ہاں، مگر قرآن مجید با ترجمہ پڑھتی ہوں۔''

''ہاتھ آگے بڑھاؤ۔'' میں نے عبداللہ کہنے پر سیدھا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میرا ہاتھ نیچے اور اس کا اوپر تھا، اس نے ہاتھ گھما کر اپنا نیچے اور میرا ہاتھ اوپر کر لیا۔

''بیعت کرو گی ملکھنی۔''

''ہاں عبداللہ بھائی۔''

''ٹھیک ہے۔'' عبداللہ بھائی نے کہا اور پھر مجھے بیعت کرنے لگا۔

میں نے عبداللہ بھائی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ بیعت ہونے کے بعد اس نے مجھے صبح و شام اور دن و رات کے وظائف بتائے۔ ''ملکھنی انہیں ہر صورت پورا کرتے رہنا۔''

''ٹھیک ہے عبداللہ بھائی۔''

''اب میں چلتا ہوں۔'' اس نے جانے کے لیے قدم بڑھائے تو میں نے اسے پکارا۔

''سنو عبداللہ بھائی۔'' وہ کا نہیں صرف قدم آہستہ کر لیے۔ میں نے قریب جا کر کہا۔

''میرے گھر والوں کے لیے ضرور دعا کرنا۔''

''ہاں کروں گا۔ تم خود بھی کرنا۔''

''وہ مجھے مل جائیں گے نا عبداللہ بھائی۔''

''پتا نہیں۔ مگر جب ملیں گے تمہیں خود بخود پتا چل جائے گا۔ اللہ حافظ''

عبداللہ ایک بار پھر ہزاروں لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو چکا تھا۔ کچھ دیر میں اپنی جگہ گم صم کھڑی رہی اور اس راہ کو دیکھتی رہی جس راہ پر چل کر عبداللہ لوگوں کی بھیڑ میں گم ہوا تھا۔ ایک طویل سانس لینے کے بعد میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ''مجھے کس طرح جانا ہے۔'' میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''اڈیالہ جیل۔ ہاں مظہر بھائی کو حالات سے آگاہ کرنا چاہیے۔ شاید اسے کچھ اندازہ ہو، ساونڑاں چھوڑنے کے بعد امی سکھاں اور پھوپھو کو لے کر کہاں جا سکتی ہیں۔'' اڈیالہ جیل جانے کا فیصلہ کرنے کے بعد میں نے رکشے کے لیے ادھر اُدھر دیکھا۔ روڈ پر ایک رکشا رکا ہوا تھا جس سے دو بندے اُتر رہے تھے، میں نے اشارہ کرتے ہوئے اس کی طرف قدم بڑھائے۔ میں اس کے قریب پہنچی تو اچانک فضا تڑتڑ کی آواز سے گونج اُٹھی۔ ساتھ ہی میرے اردگرد چلنے والے لوگوں میں سے دو افراد نے فلک شگاف چیخیں ماریں اور روڈ پر گر کے تڑپنے لگے۔ رکشے والے نے گیئر لگایا اور گولی کی طرح بھاگ نکلا۔ میں نے ایک نظر زمین پر گرنے والوں کو خون میں لت پت دیکھا۔ اس کے بعد مجھے زور کا دھکا لگا۔ گولیاں

چلنے سے جو افراتفری پھیلی تھی اس کی مد میں مجھے ایک شخص کا دھکا لگا تھا۔ دھکا لگنے سے میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی، چند سیکنڈز کا فرق تھا ورنہ اس جگہ بھی گولیوں کی بوچھاڑ برسی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ مجھے ٹارگٹ کیا جا رہا ہے۔ اچانک مجھے ایک تیز چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

''مکھنی اُس طرف، میں نے آواز کی سمت دیکھا، سفید کرتا پائجامہ میں ملبوس لمبی داڑھی والا نوجوان مجھے قریبی گلی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ لوگ پہلے ہی حواس باختہ حالت میں ادھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے، یہ لمحوں کی بات تھی میں نے فوراً گلی کی طرف دوڑ لگادی۔ چند سیکنڈز بعد آواز دینے والا شخص بھی مجھ سے آملا۔ آتے میرا ہاتھ دبوچ کر بولا۔ ''جلدی کرو مکھنی وہ لوگ پیچھے آرہے ہیں۔'' میں اس کے ہم قدم بھاگ پڑی تھی، گلی کے آخر پر روڈ تھا۔ روڈ پر نکلتے ہی اس نے بائیں جانب ٹرن لیا۔ لوگ ہمیں حیران و پریشان نظروں سے دیکھ رہے تھے، جو بھی سامنے آتا نوجوان اسے ہاتھ سے دھکا دے کر کہتا۔ ''ہٹ جاؤ راستہ چھوڑو۔'' ٹرن کرنے کے بعد ہم تھوڑا سا سیدھا بھاگے، آگے بائیں جانب ایک گلی تھی وہ مجھے کھینچتا ہوا اس گلی میں مڑ گیا۔ بھاگتے ہوئے میں نے سوچا اس طرح تو ہم اسی روڈ پر نکل جائیں گے جہاں پر فائرنگ ہوئی تھی، مگر دوسرا خیال یہ آیا کہ تعاقب کرنے والوں کو ڈاج دینے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ چند لمحوں بعد ہم واپس سابقہ روڈ پر نکل آئے، لیکن اس بار جائے وقوعہ سے بیس پچیس گز آگے نکلے تھے، لحظہ بھر اس نے ٹھٹھک کر اس طرف دیکھا، وہاں کافی رش لگا ہوا تھا۔ شاید لوگ زخمیوں کو اٹھا رہے تھے، ٹریفک بری طرح جام ہو چکا تھا۔ تاہم فائرنگ کا سلسلہ بند تھا۔ عقبی گلی میں بھی ہمارے بھاگنے اور فائرنگ کی آواز سننے سے جو بھگدڑ مچی تھی وہ تھم چکی تھی۔ تعاقب کرنے والے کہیں نظر نہیں آئے۔ شاید وہ دوسری طرف نکل گئے تھے۔ روڈ پر ٹریفک جام تھا اس لیے یہاں سے ٹیکسی یا رکشا پکڑنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

ہم نے گاڑیوں کے بیچوں بیچ روڈ کراس کیا اور اس طرف کی ایک اور گلی میں گھس گئے۔ یہاں لوگوں پر فائرنگ کا اثر ہنوز موجود تھا۔ کچھ دکاندار عجلت میں دکانوں کا سامان سمیٹ رہے تھے۔ ہم بغیر کسی رکاوٹ کے دوسری طرف روڈ پر نکل آئے یہاں ٹریفک معمول کا تھا۔ روڈ پر آتے ہی میرے ہمسفر نے ٹیکسی کو روکنے کا اشارہ کیا۔ میرا ہاتھ ابھی تک اس کے مضبوط ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور میں اس کے ساتھ کھنچی چلی جارہی تھی۔ ٹیکسی کے رُکتے ہی اس نے عقبی دروازہ کھول کر کہا۔ ''بیٹھ جاؤ مکھنی۔'' میں بنا سوچے سمجھے اندر بیٹھ گئی۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے پھرتی سے فرنٹ دروازہ کھولا اور بیٹھتے ہی ڈرائیور سے بولا۔ پی سی ہوٹل۔



افراتفری میں اسے میں بغور نہ دیکھ سکی تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور میں زمین وآسمان کے درمیان معلق ہو چکی تھی۔ حیرت کے مارے زبان گنگ اور دماغ سن ہو چکا تھا۔ میرے سامنے بلاول کھڑا ہوا تھا۔ جسے میں عبداللہ بھائی کی طرح تخیلی کردار سمجھ رہی تھی۔ حقیقت کی دنیا میں وہ جیتا جاگتا میرے سامنے موجود تھا۔ اسرار کی جس دنیا میں، میں محوِ سفر تھی اس انوکھی دنیا میں یہ شخص میرا جیون ساتھی تھا۔ میں اسے اور وہ مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر دیکھ رہے تھے۔ ہمارا درمیانی فاصلہ شاید چار پانچ میٹر کا رہا ہوگا۔ میں بے اختیار اس کی طرف بھاگ پڑی۔

مگر نہیں۔ آدھا میٹر کے فاصلے پر پہنچ کر میرے قدم تھم گئے، میں جیسے ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی۔ میرے اندر احساس کی قندیل روشن ہوگئی اور میرا دماغ دلیلیں پیش کرنے لگا۔ یہ شکل وصورت بے شک بلاول جیسی ہے، مگر قد وقامت میں بہت بڑا فرق ہے۔ بلاول چھوٹے قد کا مالک عام سا لڑکا تھا۔ چھوٹے چھوٹے گھنگھریالے بال، داڑھی چہرے سے چپکی ہوئی اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں، جبکہ یہ شخص لمبے قد اور کسرتی جسم کا مالک ہے۔ سر کے بال لمبے اور سلکی تھے، بیچ میں مانگ نکال رکھی تھی۔ داڑھی عبداللہ بھائی کی طرح لمبی تھی، جبکہ مونچھیں بالکل صاف تھیں، البتہ بلاول کی طرح ناک کی ہڈی پچکی ہوئی تھی، چہرے کی گولائی اور رخسار بھی بلاول سے مشابہہ تھے۔ اگر اس کا قد، بال اور داڑھی چھوٹ کر دی جائے تو عین بلاول جیسے ہی دکھے گا، مگر یہ بلاول نہیں ہے، یہ سارے خیالات چند لمحوں میں وارد ہوئے تھے، اس دوران میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز رہی۔ اُدھر بھی یہی صورتِ حال تھی۔

''ملکھنی مجھے پہچانا نہیں۔'' اس کی آواز نے مجھے سوچوں سے واپس کھینچ لیا۔
''نن۔نہیں۔'' مجھے اپنی آواز اجنبی سی لگ رہی تھی۔سوچوں کے تانے بانے پھر جڑنے لگے۔یہ آواز مانوس سی لگ رہی ہے، ''غور سے دیکھو ملکھنی۔'' اس بار اس کی آواز نے میرے حواس قلی طور پر بحال کر دیے۔میری آنکھوں نے گہرائی تک جھانکا تو میں حیرت کا بت بن گئی۔میں مبہوت اسے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی۔
''ام۔امن......'' میرے تھرتھراتے لبوں سے بمشکل نکلا۔اپنا نام سن کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔
اس کا حلیہ دیکھ کر میری رگ وپے میں سنسنی دوڑ گئی۔امن ایک نئے اور جداگانہ حلیے میں میرے سامنے کھڑا مسکرارہا تھا۔حیرت کے شدید شاک سے میں ابھی تک باہر نہیں نکل سکی تھی۔
''یقین نہیں آرہا ملکھنی کہ میں امن ہی ہوں۔''
''نن۔نہیں۔امن۔یہ آپ......'' میں نے ذہن کو جھٹکا دیا۔
''اللہ کی قسم ملکھنی۔میں امن ہی ہوں، گوٹھ چندھن کا امن چند دولتانی۔''
''کک۔کیا کہہ رہے ہو امن۔اللہ کی قسم۔'' اس کے الفاظ میرے ذہن میں رس گھولنے لگے۔دیر تلک الفاظ کی بازگشت میرے دماغ میں گونجتی رہی۔
''رب کائنات کی قسم کھائی ہے ملکھنی۔تمہی نے بتایا تھا، غیر اللہ کی قسم کبھی نہیں کھائی۔''
''یہ۔یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔امن۔''
''ملکھنی، حضرت ابراہیمؑ نے بھی صحیح کہا تھا اور محمد بن قاسم اور سلطان محمود غزنوی نے بھی درست اقدام اٹھائے تھے سومنات کے مندر میں چاند دیوتا کے قوی ہیکل بت کو محمود غزنوی نے اپنا گرز مار کر پاش پاش کر دیا تھا تو دیوتا خود کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے نہ بچا سکا تھا۔ملکھنی تو درست کہتی تھی۔جن مورتیوں کو ہم اپنے ہاتھوں سے بناتے سجاتے اور سنوارتے ہیں وہ ہمارے خدا کیسے ہو سکتے ہیں۔ملکھنی میں نے اپنے اندر اور باہر کے سارے بت توڑ دیے ہیں۔میں مسلمان ہو گیا ہوں ملکھنی۔'' تھوڑے سے توقف کے بعد وہ بولا۔''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔''
امن کہہ رہا تھا اور میں حیران و پریشان اس کی باتیں سن رہی تھی، وہ چپ ہوا تو میں نے پوچھا۔
''تو کیا وہ کالی ماں کی پوجا۔بھگوان شنکر اور گنیش کی پوجا، سب چھوڑ دیا تم نے۔''
''پگلی ایک سچا مسلمان ایسا کفر کر سکتا ہے۔''
''تم نے اپنا نام کیا رکھا ہے امن۔''
''بلاول۔تم مراقبے میں جس شخص سے باتیں کرتی تھیں اس کا نام بلاول تھا۔اور......''
''اور کیا ام۔میرا مطلب ہے بلاول۔''
''وہ بعد میں بتاؤں گا۔'' بلاول نے بات گول کر دی، مگر میں سمجھ گئی تھی، اسرار کی اس دنیا میں میرے جیون ساتھی کا نام بلاول تھا۔
''بلاول تم راولپنڈی تک کیسے آئے اور مجھے کیسے کھوجا۔'' میں غیر ارادی طور پر اسے آپ سے تم کہنے لگی تھی۔
''ساری باتیں یہاں کھڑے کھڑے کرنی ہیں یا کہیں بیٹھنا بھی ہے۔'' بلاول کا اندازِ تکلم انتہائی بے تکلفانہ تھا۔لگتا نہیں تھا کہ ہم میں کسی قسم کا تکلف یا کوئی اجنبی پن ہے۔میں نے اس کی بات پر صوفے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔
''ہاں ضرور آؤ یہاں بیٹھتے ہیں۔'' وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔
''اب پوچھ کیا پوچھنا ہے۔''
''بلاول سوالات بے شمار ہیں، اتنی الجھ گئی ہوں کہ سمجھ ہی نہیں آرہی یہ گتھی کیسے سلجھاؤں۔''
''تمہارے ساتھ ایسی مایوسی کی باتیں زیب نہیں دیتی ملکھنی تم تو وہ عظیم لڑکی ہو جس نے ہماری زندگیاں پلٹ دی ہیں۔بلاول تم انفرادی طور پر مسلمان ہوئے ہو یا گھر میں کوئی اور بھی۔''

''کوئی ایک نہیں مکھنی۔ تین کنال کی حویلی میں بسنے والا ہر چھوٹا بڑا مرد و زن اسلام کی روشنی سے بہرہ مند ہو چکا ہے۔''
میں اُٹھی اور بے اختیار سجدے میں گر گئی، سجدے سے اُٹھ کر میں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔
''تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ذلت دیتا ہے۔''
''بے شک۔'' بلاول نے بلند آواز میں جواباً کہا۔ میرے چہرے پر خوش گوار حیرت پھیلتی گئی۔ میں نے واپس صوفے پر بیٹھ کر پوچھا۔'' بلاول کفر کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مسلمانی کا یہ روشن چاند کیسے طلوع ہوا۔ کچھ مجھے بھی بتاؤ نا۔'' میں نے پرتجسس لہجے میں کہا۔
''مکھنی جس دن پہلی بار ہم نے تمہیں دریا سے بے ہوش نکالا تھا اسی دن تمہیں دیکھ کر میرے اندر ہلچل مچ اُٹھی تھی، سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے اندر اُٹھنے والی تبدیلی کی ہوا کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہی تمہیں اپنے ساتھ گوٹھ چندھن لے جانا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی سے میری یہ خواہش بر آور ثابت ہوئی۔ تم ہماری حویلی پہنچ گئی۔ پاپا اور دیگر گھر والے تمہیں مافوق الفہم اور پراسرار سی لڑکی سمجھتے تھے مگر میں بحیثیت ڈاکٹر تمہیں ایک مریض سمجھتا تھا۔ میں نے تمہیں اپنورزم کی مریضہ جان کر علاج شروع کیا تھا۔''
''اپنورزم کون سا مرض ہے؟''
''طب کی اصطلاح میں یادداشت کھونے کے مرض کو اپنورزم کہا جاتا ہے۔ اپنورزم میں دماغ کی شریان پھیل جاتی ہے جو یادداشت چلے جانے کا سبب بنتی ہے۔''
''او کے۔ آگے بولو بلاول۔''
''میں تمہارا علاج تو کر رہا تھا مگر تمہاری اسرار میں گندھی باتیں اس طرح پرت در پرت کھلتی جا رہی تھیں کہ مجھے اپنی سوچ پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ ابتدا میں، میں نے اسے جزوی طور پر لیا مگر رفتہ رفتہ تمہاری پیش گوئیاں حقیقت بنتی گئیں، اس لیے ہم نے تمہیں بھگوان کا درجہ دے کر پراتھنا شروع کر دی، پاپا نے واضح طور پر کہہ دیا۔ یہ عام لڑکی نہیں بلکہ بھگوان کا راوتار ہے۔ ہمارے عقیدہ اور تمہاری پیش گوئیوں کا پورا ہونا۔ دونوں کا موازنہ کیا جائے تو پاپا کا کہا کچھ غلط نہ تھا، مگر اس دوران تم کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کر جاتی تھیں جو ہندو عقیدے کے قطعی منافی اور اسلام کی حامی تھیں۔''
''مثلاً کون سی باتیں۔''
''جب تم نے انسان پرستی کا حوالہ دیتے ہوئے بتوں اور مورتیوں کو خدا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنے کو رد کر دیا اور انسانی روپ میں بھگوان آئے مثلاً وشنو، نرسنگھ کرشن اور رام وغیرہ تم نے انہیں بھی یکسر مسترد کر دیا۔ دوسرے مرحلے میں تم نے روح کے فلسفے کو رد کیا اور تیسرے مرحلے میں دوسرے جنم کے مرحلے کو۔ تمہاری باتوں میں اس قدر پختگی اور سچائی ہوتی تھی کہ ایک دن میرے پاپا اپنے بڑے بھائی سے کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ مہک جی کی بہت سی باتیں ہمارے خلاف جاتی ہیں، مگر سچے دل اور ٹھنڈے دماغ سے سوچا جائے تو وہ بالکل درست ہیں۔ اس طرح ہمارے اندر کے چور کو تم نے باندھنا شروع کر دیا تھا، پھر ایک دن جب میں اور تم کمرے میں تنہا تھے، تم نے روتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور میں نے اپنی پوروں سے تمہاری آنکھوں کے آنسو صاف کیے تھے۔ جاتے سمے تم نے مجھے کہا تھا۔ امن جب جاگو تو پوری طرح جاگنا۔ میں دو دن اپنے آپ سے حالت جنگ میں رہا۔ میں خود کو باور کرانے لگا کہ تم بھگوان کا اوتار نہیں ہو بلکہ ایک لڑکی ہو۔ عام لڑکی۔ اس دن پہلی بار میں نے تمہیں اپنے دل میں ایک عام لڑکی کے روپ میں مسکراتے ہوئے دیکھا، پھر تمہیں یاد ہے مکھنی ہم گھوٹکی کے ایک پارک میں گئے تھے۔''
''ہاں بلاول بہت اچھی طرح یاد ہے۔''
''وہاں میں نے تم سے دانستہ مرنے کے بعد انسان کا بالکل اسی رنگ و روپ میں زندہ ہو جانے کے بارے میں سوال پوچھا تھا۔''
''مجھے بالکل یاد ہے بلاول، میں نے تمہیں قرآن مجید کی آیات پڑھ کر سنائی تھی۔''
''ہاں مکھنی۔ اس کے بعد تم نے گھر میں روشن اسکرین پر ہندوستان کی تاریخ کھولی، ہندو مذہب پر جو تم نے روشنی

ڈالی تھی اس نے گھر کے بہت سے افراد کو سحر زدہ کر دیا تھا۔ اندر سے سبھی ہل گئے تھے مگر ایک دوسرے سے اظہار نہیں کرتے تھے۔اچھا پھر......" بلاول کی باتوں میں میری دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔

"تم نے مہابھارت، رامائن اور گیتا سے چن چن کر باتیں بتائیں اور ساتھ ہی قرآن مجید کی آیات سے ثابت کر دیا کہ اصل میں سچا مذہب اسلام ہے۔ خصوصاً جو بات تم نے اتھر وید اور یجروید کے حوالے سے کہی تھیں اس نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔"

"کون سی بات بلاول۔"

"وہی حضرت محمد ﷺ والی۔ یجروید میں لکھا ہے، اے لوگو محمد نامی آدمی دھرتی پر آئے گا جو اندھیرے کو ناش کرے گا اور اتھر وید میں لکھا ہے۔ کوئی پنڈت اس وقت تک نہیں مرتا جب تک اپنے بیٹے کو کلمہ نہ پڑھا دے اور یہ کلمہ لا الہ الا اللہ ہے۔

تمہاری ان باتوں سے میں نے ازخود تحقیق شروع کر دی۔ میں نے چاروں وید کو کھنگال ڈالا۔ رگ وید، اتھر وید، سام وید اور یجروید ان پر تحقیق کی تو پتا چلا ان مذہبی کتابوں میں تو بار بار تحریف ہوئی ہے اور بیشتر میں سے جو کلمات تم نے کہے تھے اب نکال دیے گئے ہیں۔ میں نے سوچا شاید تم نے جھوٹ بولا ہو۔ اس لیے اپنی تحقیق کو آگے بڑھایا تب چند مشہور ہندوں مصنفین کی باتیں سامنے آئیں۔ جیسے سوامی دیانند جی نے لکھا ہے کہ چار وید وہ ہیں بہت سی تحریف ہوئی۔ اپنی شد، نرسنگھ اور تاپتی ان میں بہت بعد میں شامل کیے گئے۔ اسی طرح کرشن جی نے بالکل واضح کہہ دیا کہ ان میں نقلی اور قیاسی باتیں ٹھونس دی گئی ہیں۔

راجہ بدشہڑ نے کیا ویدوں کا مضمون کئی بار تبدیل کیا گیا۔"

بلاول تھوڑی کے لیے چپ ہوا تو میں نے کہا۔

"بولتے رہو بلاول۔"

"تمہارے جانے کے بعد میں نے تمہاری ڈائری پڑھی۔ اس میں ہندو مذہب اور اسلام کا موازنہ ان کی مذہبی کتابوں سے کیا گیا تھا۔ دوسرا جنم اور روح کے بارے میں کیا خوب روشنی ڈالی گئی تھی۔ ایک آیات قرآنی کا ترجمہ میں نے بار بار پڑھا اور اس پر غور کیا۔"

"وہ ترجمہ اب تمہیں یاد ہے بلاول۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ دیکھا جائے تو اسی آیت نے مجھے اندھیرے سے روشنی کے سفر کی پہلی کرن دکھائی تھی۔

ترجمہ! کیا آدمی کو معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا سو وہ اعلانیہ اعتراض کرنے لگا اور اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا اور اپنی اصل کو بھول گیا۔ کہتا ہے کہ ہڈیوں کو (خصوص) جبکہ وہ بوسیدہ ہوگئی ہوں کون زندہ کرے گا۔ آپ جواب دے دیجیے کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے اول بار میں ان کو پیدا کیا۔"

"میں نے بھی ایک ڈائری لی اور اس میں یہ تمام اہم باتیں نوٹ کر لیں، اب میری تحقیق کا دائرہ وسیع ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے حضرت محمد ﷺ پر تحقیق شروع کر دی۔"

"اچھا پھر!"

"ملکھنی اس نے تو مجھے چاروں شانے چت کر دیا اور میں خود سے ہی شرمندہ ہو گیا۔ میں نے خود کہا۔ اے امن تو پاکستان کے نامور ڈاکٹرز میں شمار کیا جاتا ہے مگر تو کس قدر جاہل شخص ہے، ہم سے ہمیشہ کذب بیانی ہوتی رہی ہے۔ ہم دنیاوی نمود و نمائش میں گرفتار ہیں جبکہ اصل بات تو کچھ اور ہے میری تمام تر ذہنی قوتیں اور سوچ پراگندگی کا شکار ہو گئیں۔"

"بلاول اپنی تحقیق کے بارے میں کچھ مجھے بتاؤ گے۔"

"ملکھنی میں تو ابتدا ہی میں لڑکھڑا گیا تھا، جبکہ ابھی آقائے نامدار سرکار دو عالم حضرت محمد ﷺ کی پیدائش مبارک نہیں ہوئی تھی مگر دنیا میں عجیب و غریب ہلچل مچ اٹھی تھی۔ آپ ﷺ ابھی عالمِ ارواح میں تھے مگر لوگ آپ پر ایمان لا چکے تھے۔ تبع یمن کا بادشاہ باقاعدہ خط لکھتا ہے کہ اے اللہ کے نبی محمد ﷺ اگر آپ میری زندگی میں تشریف فرما ہوئے تو میں آپ پر ایمان لایا اور اگر میری موت کے آپ مبعوث ہوئے تو پھر گواہ رہیے گا میں آپ پر ایمان لا چکا ہوں اور جس طرح ملکھنی تم نے بتایا تھا ہندوؤں کی کتابوں میں حضرت محمد ﷺ کا باقاعدہ ذکر ہے۔ اسی طرح تاریخ شاہد ہے کہ چاروں آسمانی کتب میں بھی

ذکرِ محمد ﷺ موجود تھا، بلکہ توریت میں تو کافی تفصیل پائی جاتی ہے۔"

مجھے وہ تفصیل معلوم تھی مگر میں بلاول کے منہ سے سننا چاہتی تھی، اس لیے میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔

"توریت میں لکھا ہے، جو آخری نبی ہوں گے ان کی زبان میں درشتگی یا سختی نہیں ہوگی بلکہ نرمی ہوگی، وہ بازاروں میں خاموش ہوں گے شور مچانے والے نہیں ہوں گے، ان کی شان یہ ہوگی کہ ہدیہ قبول کریں گے، مگر صدقہ کا مال نہیں لیں گے۔ دونوں کندھوں کا درمیانی فاصلہ عام انسانوں کے کندھوں کے فاصلے سے زیادہ ہوگا اور دونوں کندھوں کے درمیان علامتِ نبوت ہوگی۔ آپ کی امت پنڈلیوں تک چادریں پہنے گی اور وضو کرنے والی ہوگی اور اول وقت میں نمازیں پڑھنے والی ہوگی۔" "بالکل درست بلاول۔ ایک بات اور تمہیں بتاؤں۔"

"بولو ملکھنی۔"

"اب تو تمام آسمانی کتابوں ماسوائے قرآنِ مجید کے بہت سی تحریف ہو چکی ہیں، مگر یہ باتیں جو تم نے توریت کی بتائی ہیں میں نے سنا ہے ابھی تک ایک نسخے میں موجود ہیں۔"

"ملکھنی یہ نسخہ میرے تایا محمد رفیق (کمل چند) نے خود کہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے بھی تصدیق کی ہے کہ یہ سب اس میں لکھا ہوا ہے۔"

"بلاول جب حضرت محمد ﷺ کی پیدائش مبارک ہوئی تو اس وقت کی سپر پاور طاقت فارس کے بادشاہ نوشیرواں کے محل میں سخت زلزلہ آیا اور محل کے چودہ کنگرے گر گئے۔ استخر کا مشہور آتش کدہ جس میں کبھی آگ بجھی نہ تھی آپ ﷺ کی پیدائش ہوتے ہی آتش کدہ بجھ گیا تھا اور حضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ بی بی آمنہ جب حالت حمل میں مکہ کے پہاڑوں میں گئیں تو انہیں پہاڑوں سے آوازیں سنائی دیتی تھیں، ابشری یا آمنہ...... ابشری یارض۔ یا آمنہ۔ یعنی اے آمنہ تجھے مبارک۔"

"ملکھنی تمہیں پتا ہے کاہن کسے کہتے ہیں۔"

"بلاول کاہن عربی لفظ ہے اور لغت میں اس کے معانی ہیں جنوں سے دریافت کر کے غیب کی خبریں بتانے والا۔"

"ملکھنی کیا کاہن اس زمانے میں بہت تھے، انہیں جنوں پر دسترس حاصل تھی اور جن آپ ﷺ کی پیدائش مبارک سے قبل آسمانوں پر جا کر فرشتوں کی باتیں سن کر کاہنوں کو بتا دیتے تھے۔ اس طرح کاہنوں کو آنے والے حالات سے بھی آگاہی مل جایا کرتی تھی۔ مکہ شریف میں ایک کاہن تھا جو مدتیں ہوئیں پہاڑوں میں نکل گیا تھا اور سالہا سال ہوئے تھے باہر نہیں نکلا تھا۔ جس رات نبوت کا نور دنیا میں چمکا تھا اس دن صبح یہ کاہن پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا آیا اور لوگوں سے پوچھا۔

اے لوگو رات مکہ میں کوئی بچہ پیدا ہوا ہے۔

لوگوں نے جواب دیا ہاں۔ عبدالمطلب کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا ہے۔

کاہن نے کہا مجھے جلدی سے عبدالمطلب کے گھر لے چلو۔ کاہن عبدالمطلب کے پاس آیا اور بولا۔

عبدالمطلب مجھے وہ بچہ دکھاؤ جو رات کو آپ کے گھر پیدا ہوا ہے۔

عبدالمطلب نے جواب دیا۔ وہ بچہ میرا پوتا ہے۔ اس کا باپ عبداللہ فوت ہو چکا ہے۔

عبدالمطلب میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے وہ بچہ دکھاؤ۔ کاہن بے تابی سے بولا۔

عبدالمطلب نے اندر جا کر بچہ اٹھا کر لایا۔

کاہن کی نظر جیسے ہی بچہ کے چہرہ انور پر پڑی وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

جب ہوش میں آیا تو زور زور سے چلّانے لگا۔

اے لوگو اس امت کا نبی پیدا ہو چکا ہے، آج بنو اسرائیل سے نبوت چلی گئی۔ آج بنو اسرائیل سے نبوت چلی گئی۔ وہ یہ کہتا ہوا بھاگتا رہا اور بھاگتے بھاگتے ایک بار پھر پہاڑوں میں گم ہو گیا۔

بلاول اسی طرح کا ہن کا ایک واقعہ شاعرِ رسول ﷺ حسان بن ثابت نہ نے بھی روایت کیا ہے۔''

''وہ کون سا ملکھنی۔''

''حسان بن ثابتؓ فرماتے ہیں میری عمر اس وقت سات برس تھی۔ میں مدینہ شریف میں موجود تھا۔ مدینہ میں ایک بہت بڑا کاہن تھا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا اور زور زور سے چلانے لگا۔ اے لوگو اس امت کا نبی پیدا ہو چکا ہے۔ سنو سنو اس امت کا نبی پیدا ہو چکا ہے۔''

''سبحان اللہ۔'' بلاول نے با آواز بلند کہا۔ میں نے اس کے خوب صورت چہرے کو دیکھا۔ وہاں صحیح معنوں میں نورِ اسلام کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں جس نے اس کی معلومات میں مزید اضافے کی خاطر کہا۔

''بلاول متعدد صحابہ کرام کی روایت ایسی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت سے قبل ہی دنیا کو پتا چل چکا تھا کہ اس امت کا آخری نبی آنے والا ہے۔ زبیر ابنِ مہتمم کہتے ہیں، ایک بہت بڑے گرجے میں مجھے ایک راہب ملا اور مجھ سے میرا ٹھکانہ پوچھا۔ میں نے کہا میرا ٹھکانہ مکہ ہے۔ وہ بہت بڑا راہب تھا، مکہ کا نام سن کر بولا۔ مکہ میں ایک شخص نے اعلانِ نبوت کیا ہے۔

میں نے کہا۔ جی ہاں، جبکہ میں ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا، میرا جواب سن کر راہب بولا۔

میرے ساتھ آؤ۔

میں راہب کے ساتھ چل پڑا۔ راہب نے کہا۔ میرے پاس کچھ تصاویر ہیں۔ اگر میں تمہیں تصویریں دکھاؤں تو تم اس نبی کو پہچان لوگے۔

میں نے کہا کیوں نہیں، میں مکہ کا ہوں اور وہ ہمارے قریب کے ہیں۔

راہب مختلف خانوں سے بہت سے تصویریں نکالنے لگا۔ ایک تصویر میں نے انگلی رکھ کر کہا۔

ہٰذا محمد رسول اللہ۔ یہ اللہ کے رسول ہیں۔

راہب نے کہا یہ بالکل سچا ہے۔ یہ تصویر تھی جو حضرت دانیالؑ نے اور کچھ راہبوں نے اپنی کتابوں سے پڑھ کر بزور تخیل بنائی تھی۔''

''اس کے بعد بلاول کیا ہوا۔ تم اپنی کہانی سنا رہے تھے۔''

''ملکھنی ہر بات مجھ پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی، لہٰذا میں سعودی عرب چلا گیا۔''

''ہاں بلاول جب میں انکل فہیم کے گھر گئی تھی تبھی مجھے تمہارے سعودی عرب جانے کی اطلاع ملی تھی۔

ملکھنی میں سعودی عرب نیو مسلم سینٹر میں گیا۔ میرے اندر جو کچھ باقی تھا وہ انہوں نے بالکل واش کر دیا اور وہاں میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا۔''

''بلاول اندھیرے سے نکل کر روشنی کا یہ سفر مبارک ہو۔''

''شکریہ ملکھنی۔ اس مبارک باد کی تم بھی برابر کی مستحق ہو۔''

''بلاول تمہاری ناک کو کیا ہوا۔''

''ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔'' بس تب سے ناک پچک گئی، بلاول نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ میں سوچ میں پڑ گئی، یہی بات میں نے بلاول سے تب کہی تھی جب وہ مجھے لان میں بلی اور کبوتر کی آنکھ مچولی دکھا رہا تھا۔ میں کچھ کچھ بات سمجھ رہی تھی کہ پچھلی دنیا میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں وہ کسی نہ کسی صورت آگے جا کر پیش آئے ہیں۔ شاید یہ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی کہ اس نے مجھے کوے کی حالت میں بہت کچھ دکھا دیا تھا، گویا یہ بلاول میرا شوہر،

''کیا سوچ رہی ہو ملکھنی۔'' بلاول کی آواز پر میں نے کہا۔ ''کچھ نہیں بلاول۔''

''اچھا تم رکو میں تھوڑا مارکیٹ تک جاتا ہوں۔'' وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''خیریت ہے اچانک مارکیٹ جانے کا خیال کیسے آ گیا۔''

''ہاں بالکل خیریت ہے۔ بس تم تھوڑا انتظار کرو میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔'' میرے کچھ کہنے سے پہلے بلاول باہر جا چکا تھا۔ ایک گھنٹہ بعد واپس آیا تو سامان سے لدا ہوا تھا۔ میں حیرت سے بیڈ پر پڑے ہوئے سامان کو دیکھ رہی تھی۔

''بلاول یہ اتنا سامان۔''

''سب تمہارے لیے لایا ہوں۔''

میں نے کھول کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ ہینڈ بیگ، پرس، کپڑے، جوتے، جیولری، میک اپ کا سامان اور نجانے کیا کچھ تھا۔ ملکھنی اچھے سے کپڑے پہن لو اور جوتے بھی بدل لو، باقی سامان ہینڈ بیگ میں ڈال لو۔

''بلاول ان سب کی کیا ضرورت تھی۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ تمہارا قرض اُتار سکوں۔ میں نے دیکھا بلاول کا چہرہ ایک دم اُداس ہو گیا ہے۔''

''ملکھنی کیا میں اتنا بھی حق نہیں رکھتا۔'' اس کے لہجے میں بے حد اُداسی تھی۔

''تو کیا تم اتنا ہی حق رکھتے ہو۔'' میں نے نسبتاً شوخی سے پوچھا۔ اس بار اس کی اُداسی خوشی میں بدل گئی۔

''نہیں جو حق رکھتا ہوں اس کی یہ ابتدا ہے۔''

''بلاول میں یہ پہن لوں......'' میں نے ایک کاٹن کا سوٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ملکھنی یہ سوٹ تم پر بہت جچے گا۔''

''بلاول کیا ہم ایک ہی روم میں......'' میں نے دانستہ فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''نہیں ملکھنی میں نے تمہارے نام کا پہلے سے ایک روم بک کروا رکھا ہے۔ جب چاہو نیچے جا کر کاؤنٹر سے روم نمبر 206 کی چابی لے لینا۔ اس روم سے دو روم آگے والا کمرہ ہے۔''

''بلاول میرے ملنے کا اتنا اعتماد تھا کہ کمرہ پہلے سے بک کروا رکھا ہے۔''

''بالکل ملکھنی۔ میں گھر سے پختہ تہیہ کر کے نکلا تھا، جب تک ملکھنی مل نہیں جاتی لوٹ کر چندھن پور نہیں آؤں گا۔''

''میں یہ کپڑے پہن کر آتی ہوں۔'' میں نے تمام سامان اٹھاتے ہوئے کہا۔

''او کے۔''

میں نے اپنے کمرے میں جا کر اچھی طرح ہاتھ لیا، کپڑے اور جوتے تبدیل کیے، سامان کھول کر دیکھا تو وہاں ہیئر ڈرائی مشین دیکھ کر ششدر رہ گئی، بلاول نے کوئی چیز نہیں چھوڑی تھی، میں نے بال ڈرائی کیے، اچھی طرح برش کر کے انہیں ہیئر کیچر لگا کر سنبھالا۔ مکمل تیاری کے بعد میں نے باقی سامان بیگ میں ڈالا اور واپس بلاول کے کمرے میں لوٹ آئی۔ بلاول نے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھا، عورت اپنی طرف اٹھنے والی پیار کی نظر لمحوں میں پہچان لیتی ہے۔ میں نے بلاول کی آنکھوں میں پیار کا سمندر موجزن دیکھا۔ مجھے اپنے گال تپتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔ شرم و حیا کی سرخی خود بخود میرے چہرے پر دوڑ گئی۔

''ملکھنی ایک بات کہوں۔''

''ہو۔ ہوں۔ ہاں کہو۔''

''ماشاءاللہ بہت پیاری لگ رہی ہو، بالکل چودھویں کا چاند ایسی چمکتی دمکتی اور گلاب کے پھول جیسی کھلکھلاتی ہوئی۔''

میں مزید خود میں سمٹ گئی، میں نے کن انکھیوں سے بلاول کو دیکھا مگر پھر فوراً نظریں جھکا لیں۔ وہ بڑی وارفتگی سے مجھے دیکھ رہا تھا، میرے دل کی دھڑکنیں رفتار پکڑ چکی تھیں۔ بہت پہلے میں نے میڈم خانم کے کوٹھے پر انم سے کہا تھا۔ ملکھنی آج کے بعد کسی مرد سے پیار نہیں کر سکتی، مگر اس لمحے مجھے لگ رہا تھا جیسے میں پگھل رہی ہوں۔ میرے چہرے پر شہاب ثاقب کی طرح ایک لہر آ کر گزر گئی۔ میں نے خود کو سنبھالا اور ماحول کو بدلنے کے لیے بلاول سے پوچھا۔

''بلاول مہر داد نگر گئے تھے۔'' میرے سوال پر اس نے طویل سانس کھینچی۔

''سیدھا مہر داد نگر گیا تھا۔ انکل فہیم سے ایڈریس لکھوالیا تھا۔ وہیں سے معلوم ہوا کہ تمہارے گھر والے بھی غائب ہیں

اور تم بھی چھ سات ماہ قبل اس وقت غائب ہوگئی تھیں جب چوہدری تمہیں گھوڑے سے باندھ کر گھسیٹ رہا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ تم یا تمہارے گھر والے مہر داد نگر نہیں ہیں اس لیے راولپنڈی چلا آیا۔ یہاں کمرے بک کروائے اور تیری تلاش میں باہر نکل گیا۔ مجھے راولپنڈی میں آج تیسرا دن ہے۔''

''بلاول مہر داد نگر کے حالات ......'' میری بات ادھوری رہ گئی نیچے سے تیز فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ بلاول نے جمپ لیا اور پھرتی سے باہر نکل گیا۔ میں بھی کسی ناگہانی صورتِ حال کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ دو منٹ بعد دروازہ دھڑ سے کھلا اور بلاول بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''چلو ملکھنی ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ جلدی کرو۔'' اس نے کیبنٹ کی طرف جاتے ہوئے تیز لہجے میں کہا، میں نے قریب میں رکھا ہوا ہینڈ بیگ اٹھالیا، اس دوران کیبنٹ سے بلاول اپنا سفری بیگ نکال چکا تھا۔ میرا ہینڈ بیگ لیتے ہوئے بولا۔ چلو ملکھنی۔ کمرے سے باہر آتے ہی ہم راہداری میں بالکل سیدھا بھاگنے لگے، بلاول کے ایک ہاتھ میں دونوں بیگ تھے اور دوسرے ہاتھ میں میری کلائی، بلاول نے نہ لفٹ استعمال کی نہ مرکزی سیڑھی بلکہ بہت آگے جا کر موڑ مڑتے ہی ایک ذیلی زینہ نیچے جا رہا تھا۔ ہم اس سے نیچے اُترنے لگے، دو چکر کاٹ کر ہم ایک اسٹور نما کمرے میں اُتر گئے۔

یہاں ہوٹل کا سامان پڑا تھا۔ کمرے میں دو دروازے تھے، ایک دروازہ کھول کر بلاول نے احتیاط سے باہر جھانکا۔ مگر پھر فوراً دروازہ بند کر دیا۔ وہ سرگوشی سے بولا ہم ہال کے انتہائی کونے میں ہیں، ہال کی صورت حال اچھی نہیں ہے۔ وہ دبے پاؤں دوسرے دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ دروازہ، کچن کی طرف کھلتا تھا۔ مجھے اشارہ کرتے ہوئے بلاول کچن میں نکل گیا۔ کچن ویران تھا، شاید فائرنگ کرنے والوں نے سب کو ہال میں اکٹھا کر رکھا تھا۔ ہم با آسانی کچن سے دوسری طرف نکل گئے۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر گھومنے کے بعد ہمیں عقبی دروازہ مل گیا۔ ہوٹل سے باہر نکلتے ہی بلاول نے ایک گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ملکھنی وہ سفید والی مرسڈیز۔ بلاول مجھ سے پہلے تیز قدموں کے ساتھ گاڑی کے پاس پہنچ چکا تھا۔

اس نے پھرتی سے دونوں بیگ عقبی سیٹ پر اچھالے اور بھاگ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ساتھ ہی جھک کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ بھی کھول دیا، میرے بیٹھتے ہی بلاول نے گیر لگایا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ روڈ پر آتے ہی ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ بلاول تم نے گاڑی عقبی طرف پارک کر رکھی تھی۔

''جب شاپنگ کے لیے گیا تھا تو احتیاطاً اس طرف گاڑی لے آیا تھا، مبادا وہ لوگ جنہوں نے تم پر شہر میں فائرنگ کی تھی اگر یہاں پہنچ آئے تو ہمیں نکلنے میں سہولت ہو۔''

میں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے یہ بات مسلسل پریشان کر رہی تھی کہ مجھ پر فائرنگ کرنے والے کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔

''ملکھنی تم ٹھیک ہو۔'' مجھے خاموش پا کر بلاول نے پوچھا۔

''ہاں بلاول۔ میں سوچ رہی ہوں میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں جو میری جان کے دشمن بنے بیٹھے ہیں۔''

''ملکھنی تیرے تلاش میں مہر داد نگر کے چوہدری مشتاق نے ایک پیشہ ور گروپ ہائر کر رکھا ہے۔''

''اوہ!'' میں بری طرح چونک پڑی۔ میں نے بلاول کی طرف دیکھا وہ روڈ پر نگاہیں جمائے گاڑی دائیں جانب ٹرن کر رہا تھا۔ تمہیں کیسے پتا چلا بلاول۔

''تمہیں بتایا نا مہر داد نگر سے ہو کر آیا ہوں۔ کچھ عرصہ قبل جب تم گھوڑے کی رسی توڑ کر پراسرار طور پر گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوگئی تھیں چوہدری نے تبھی سے قسم اٹھا رکھی ہے کہ ملکھنی کو پیروں میں لا کر دم لوں گا۔''

''بلاول تم نے کمرے میں بھی بتایا تھا چوہدری نے مجھے گھوڑے سے چھ سات ماہ قبل باندھ کر گھسیٹا تھا۔''

''ہاں ملکھنی لوگوں نے مجھے یہی بتایا تھا۔ تمہیں تو پتا ہوگا کتنے ماہ قبل ایسا ہوا تھا۔''

''نہیں بلاول مجھے حتمی طور پر نہیں پتا۔ میں تو دو تین ہفتے پہلے کی بات سمجھ رہی تھی۔ میری بات سن کر بلاول نے حیرت

سے گردن موڑ کر مجھے دیکھا۔

''حیرت ہے ملکھنی تمہیں خود نہیں پتا، جبکہ مہرداد نگر میں، میں نے جس سے بھی پوچھا اس نے چھ یا سات ماہ پہلے کا کہا ہے۔'' بلاول کی بات سن کر میں نے ایکبار پھر آنکھیں بند کر کے سر سیٹ سے لگا لیا۔ پتا نہیں بلاول۔

''اچھا تم پریشان مت ہو اللہ بہتر کرے گا، اب تم اکیلی نہیں ہو، میں ہوں تمہارے ساتھ۔''

میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بار بار بیک مرر بھی دیکھے جا رہا تھا۔

''اب ہم کہاں جا رہے ہیں۔'' تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔

''ہمارے گھر......'' بلاول نے جواب دیا۔

''تمہارے گھر۔'' میں بے اختیار ایک جھٹکے سے آگے ہو کر بولی۔

''ہاں ملکھنی اس کے علاوہ ہم کہاں جا سکتے ہیں۔''

''بلاول تمہیں پتا ہے مجھے اپنے گھر والوں کو تلاش کرنا ہے۔''

''ملکھنی انشاءاللہ وہ بھی ضرور ملیں گے، مگر ابھی کچھ دن تمہیں صبر کرنا ہوگا۔''

''بلاول یہ ممکن نہیں ہے...... میں۔''

''ملکھنی بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ابھی یہاں کے حالات تمہارے لیے موزوں نہیں ہیں، تم ان لوگوں کی نظروں میں آ چکی ہو۔ ہم سندھ میں کچھ دن رہیں گے تو یہاں کے حالات معمول پر آ جائیں گے۔ اس کے بعد ایک منظم طریقے سے تمہارے گھر والوں کو ڈھونڈا جائے گا اخبارات اور ٹی وی پر اشتہارات چلاؤں گا، رپٹ لکھواؤں گا، اور ہم خود بھی انہیں ہر ممکنہ جگہ تلاش کریں گے۔''

''بلاول انکل فہیم سے ملے ہو۔ ان کے گھر میں سب ٹھیک ہیں۔''

''سب ٹھیک ہیں ملکھنی۔ ہماری طرح وہ بھی آپ سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہیں۔''

''انم سے ملے ہو تم۔''

''یہ انم کون ہے؟''

''او وہ سوری انکل فہیم کی بیٹی اعظمٰی۔ میں اسے پیار سے کبھی کبھی انم کہا کرتی تھی۔''

''بہت بار ملا ہوں۔ جب بھی ملی ہے ایک ہی سوال پوچھتی ہے، بلاول بھائی ملکھنی کا کچھ پتا چلا۔ اس سے کوئی رابطہ ہوا، شام تک انشاءاللہ سب سے مل لو گی۔'' بلاول نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

میں کھڑکی سے باہر تیزی سے گزرتے مناظر دیکھ کر آنے والے حالات کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے عبداللہ بھائی کا بتایا ہوا وظیفہ شروع کر دیا، بلاول خاموش ہو گیا تھا۔

☆......☆

شاید بلاول نے گھر پہلے ہی اطلاع کر دی تھی، جب ہم ان کی تین کنالہ حویلی میں داخل ہوئے تو گیٹ کے اندر دونوں اطراف میں تمام گھر والے استقبال کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ جس گھر کے مکین میری جان کے دشمن تھے وہی آج ہاتھوں میں گلاب کی پتیاں اور پھولوں کے ہار لیے میرا استقبال کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھ پر گلاب کی پتیوں کی بارش کر دی۔ مجھے ہار پہنائے اور بڑے پرتپاک طریقے سے ملے۔ میں انہیں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ مرد و زن سب کے سب بدل چکے تھے۔ ان کے کلچر، رہن سہن اور پہناوے میں بالکل واضح فرق دکھ رہا تھا۔ مردوں نے میرے سر پر شفقت و محبت سے ہاتھ پھیرا اور عورتوں نے مسکراتے ہوئے گلے لگایا۔ باری باری سب نے اپنے نئے نام بھی بتا دیے۔

نرملا کی باری آئی تو اس نے انتہائی جوش سے مجھے گلے سے بھینچ لیا۔

''ملکھنی آپی۔ اب صحیح معنوں میں آپ میری بہن ہیں۔ میرا نام سمیرا ہے اور دیکھیے یہ کون ہے۔'' میں نے اس کے اشارے پر قریب کھڑے ہوئے نوجوان کو دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

''عزیز الرحمٰن۔'' میں نے خوش گوار حیرت سے کہا۔

''جی آپی۔ آپ کا کہا اللہ نے سچ ثابت کر دیا ہے۔ مجھے میرا پیار مل گیا ہے۔'' عزیز الرحمٰن نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

''بیٹی آپ کا کہنا بالکل ٹھیک تھا، ہماری بیٹی سمیرا اپنے سسرال میں بے حد خوش ہے۔'' سعید احمد خان دوستانی (کمل چند دوستان) بلاول کے تایا نے قریب آ کر کہا۔ میں ان کی بات پر مسکرا کر رہ گئی۔

وہ سب مجھے اپنے گھیرے میں لے کر ہال میں چلے گئے۔ یہ وہی ہال تھا جس کی سفید دیوار کو میں نے روشن کیا تھا۔ مگر تب ان لوگوں کے دلوں میں کفر کا اندھیرا تھا۔ آج دیوار روشن نہیں تھی مگر یہاں موجود ہر شخص کا دل اسلام کے نور سے منور تھا، میں جس پراسرار دنیا میں محو سفر رہ چکی تھی۔ وہاں میری ایک پوری فیملی تھی۔ بلاول میرا شوہر تھا اور وہ اوپر ہمارا بیٹا جس کے سینے پر میں نشانِ حیدر دیکھنے کی متمنی تھی۔ میرے سسرال میں بیسوں افراد شامل تھے۔ ہم تین کنال کی حویلی میں رہتے تھے، میرے لیے حیران کن بات یہ ہے کہ یہ حویلی بھی تین کنال ہے۔ اس میں رہنے والے افراد بھی تقریباً اٹھارہ انیس ہیں، اور نئے حلیوں میں تقریباً سبھی کے سبھی وہی ہیں جنہیں میں اس دنیا میں دیکھ چکی تھی۔ جب وہ نان مسلم تھے تو میں انہیں پہچان نہیں سکی تھی، مگر اب کی بار جب ڈھیرے ڈھیرے میرے دماغ کے خانے میں اُترے تو اُن چہروں پر بالکل فٹ آئے تھے۔ جیسے امن ہو بہو بلاول بن گیا تھا۔ اس کے ڈیڈی قدم چند دولتانی اب احمد خان دولتانی تھے۔ انہوں نے میرے سسر جیسی داڑھی رکھ لی تھی، سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں تسبیح تھی، لباس میں کرتہ پائجامہ پہنتے تھے، نرملا سمیرا بن گئی، امن کا بھائی جنید اسی طرح دیگر افراد بھی کم و بیش انہی ناموں کے ساتھ مجھے ملے تھے۔ اس کا مطلب ہے عین ممکن ہے اس گھر میں میرے ساتھ ہی حالات پیش ہوں جنہیں میں پہلے دیکھ چکی تھی۔ یہ سوچ کر میں اندر سے پریشان ہو گئی، اگر سب کچھ ویسا ہی ہو تو اس میں بہت سی باتیں میرے لیے اچھی نہیں تھی۔ بلاول کا چھوٹا بھائی جنید میرا سخت مخالف تھا۔ گھر کے بیشتر افراد معاویہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اسے جان سے مارنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس میں سیلاب بھی آیا تھا۔ ایک بہت بڑی دیوہیکل مچھلی بھی تھی اور...... میں نے زمین کو جھٹکا دیا۔ مگر یہ سب تب ممکن ہے جب میں اس حویلی میں بطور بہو اُتروں گی۔ میری سوچوں کو بریک لگ گئی تھی، شاید کسی نے مجھے پکارا تھا۔

مکھنی بیٹی کیسی ہو تم۔ بلاول کے ڈیڈی احمد خان دولتانی مجھ سے مخاطب تھے، میں نے خود کو سنبھالا اور بااعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہوں انکل۔ آج آپ لوگوں کو اس حالت میں دیکھ کر بے حد خوش ہوں، اللہ تعالیٰ آپ سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔''

''یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم اور تمہاری محنت کا ثمر ہے بیٹی۔'' بلاول کے تایا سعید خان بولے۔ ''تمہیں نے ہمیں جنت اور جہنم کی سیر کروائی تھی اور اسی ہال میں ہندو مسلم مذاہب کی تاریخ سنا کر ہمیں تشدد کر دیا تھا۔''

''مکھنی بیٹی تو کل بھی ہمارے گھر میں ایک مہک بن کر آئی تھی اور آج بھی خوشبو کے جھونکے کی طرح آئی ہو۔ کیا یہ اچھا نہ ہو کہ ہم تمہیں اسی نام یعنی مہک کہہ کر پکاریں۔'' بلاول کی تائی نورالعین دولتانی نے مشورہ طلب نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کی تائید میں چند دوسری آوازیں بھی آ ملی تھیں۔

''آپ لوگوں کی مرضی ہے آپ مجھے جس نام سے چاہیں پکاریں، یہ آپ لوگوں کی خاص محبت ہے، مگر میرا نام مکھنی میرے مرحوم ابا رحیم اللہ نے رکھا تھا اس لیے مجھے اس نام سے بے حد محبت ہے۔''

''جس نام سے تمہیں محبت ہے بیٹی وہی نام ہمیں پیارا اور معتبر ہے۔'' بلاول کی امّی کے لہجے اور آنکھوں میں میرے لیے بے حد پیار تھا، میں نے تشکر آمیز نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''ہاں بالکل ہم تمہیں مکھنی ہی کہا کریں گے۔''

''مکھنی ہم نے تمہارے لیے وہی کمرہ تیار کر رکھا ہے جس میں تم پہلے رہا کرتی تھیں۔ چاہو تو جا کر فریش ہو جاؤ۔''

تائی نے کہا۔ میں نے خود ہی تھوڑی دیر کے لیے تنہائی چاہتی تھی، میں جی آنٹی کہہ کر کھڑی ہوگئی، باہر کسی گاڑی رُکنے کی آواز سنائی دی، ملازم نے آ کر بتایا انکل فہیم فیملی کے ساتھ آئے ہیں۔

''انہیں یہیں لے آؤ۔'' احمد خان نے ملازم کو ہدایت کی پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔

''بیٹی ان لوگوں سے مل لو پھر چلی جانا۔''

''جی بہتر انکل۔'' میں واپس بیٹھ گئی، آنے والوں کی خوشبو میں ان کے اندر آنے سے پہلے محسوس کر رہی تھی۔ میرے اندر تجسس اور بے چینی دوڑ گئی۔ انم کو دیکھنے کے لیے میری نگاہیں ہال کے دروازے پر جم گئی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں انکل فہیم ان کی اہلیہ انم اور ایک خوب صورت نوجوان اندر داخل ہوئے، انم نے مجھے دیکھتے ہی خوشی سے ہلکی سی چیخ ماری اور مکھنی کہہ کر بچوں کی طرح میری طرف دوڑ پڑی۔ میں نے بھی کھڑے ہو کر اپنی باہیں وا کر دیں۔ وہ آ کر مجھ سے لپٹ گئی، وہ کئی منٹ مجھ سے لپٹی رہی پھر پیچھے سرک مجھے بچوں کی طرح چومنے لگی۔ میں نے بھی اسے دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی پر بوسہ دیا۔

''کیسی ہے رے مکھنی۔ بے وفا جانے کے بعد بھول ہی گئی ہو۔ پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔'' وہ بولی تو مسلسل بولتے چلی گئی۔ میری نظر انکل اور آنٹی پر پڑی، وہ انم کا والہانہ پن دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ میں نے انم کے کان میں سرگوشی کی۔

''انم مجھے انکل اور آنٹی سے ملنے دو۔'' اس نے مجھے چھوڑ دیا۔

''السلام علیکم انکل۔'' میں نے انکل کے سامنے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام مکھنی کیسی ہو بیٹی۔'' انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں انکل۔'' میں نے جواب دیا ساتھ ہی میں آنٹی سے لپٹ گئی۔

''میں نے آپ کو بہت یاد کیا ہے آنٹی۔'' میری آنکھوں میں آنسو چمک اُٹھے تھے۔ پتا نہیں کیوں اس عورت سے میں جب بھی ملی اس کے بدن سے مجھے اپنی امی جیسی خوشبو محسوس ہوئی۔

''مکھنی ہم نے بھی تمہیں بہت مس کیا ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی ایسا دن نہیں چڑھا جس میں تمہیں یاد نہ کیا ہو۔'' آنٹی نے میرے گالوں سے پیار لیتے ہوئے کہا۔ ''بیٹی تم ہمیشہ ہمارے پاس رہی ہو۔''

''السلام علیکم مکھنی......'' آنٹی کے قریب کھڑے ہوئے نوجوان نے مجھے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔''

''آپ کا بہت ذکر سن چکا ہوں۔ آج دیدار کا شرف بھی حاصل ہوگیا۔ میں بہت خوشی محسوس کر رہا ہوں، میرا نام حاصل مراد بزنجو ہے اور میں اعظمیٰ کا شوہر ہوں۔'' تعارف ہونے پر میں نے حیرت و مسرت کے ملے جلے تاثرات سے اعظمیٰ کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ اسے اسکول ٹیچر کی طرح کان سے پکڑ کر کہا۔

''بدمعاش لڑکی گلے مجھ سے کرتی ہو اور خود مجھے بلائے بغیر شادی بھی رچالی۔'' ہال میں موجود تمام افراد مسکرانے لگے تھے۔ ''سوری بابا...... مگر تفصیل ابھی نہیں بتا سکتی۔'' مکھنی فوراً بولی۔ پھر منہ میرے کان کے قریب لا کر کہا۔ ''ابھی چپ رہو یار بعد میں بتاؤں گی۔''

یہ خوب صورت محفل کوئی گھنٹہ بھر جاری رہی، چائے اور کافی کا دور بھی چلا اور خوب باتیں ہوئیں، چوں کہ مرکز نگاہ میں تھی اس لیے بیشتر باتیں میری ذات کے گرد چکراتی رہی۔ جب انہیں میری پریشانی اور پھوپھو کے گھر جانے کا علم ہوا تو سب نے مجھے تسلّی تشفی دی اور انہیں ڈھونڈنے کا عہد کیا۔

انکل فہیم نے کھڑے ہوئے محفل برخاست کی اور بولے۔

''احمد خان! آج ہم مکھنی بیٹی کو اپنے گھر لے جا رہے ہیں۔ جب تک اعظمیٰ یہاں ہے مکھنی وہاں رہے گی۔''

''ارے ارے نہیں بھائی صاحب۔ یہ آج ہی تو آئی ہے۔ آپ کل یا پرسوں لے جائیے گا۔'' بلاول کی امی نے فوراً جواب دیا، ساتھ ہی سمیرا بول اُٹھی۔

''انکل مکھنی آپی آپ کے ہاں جائے گی مگر ایک ہفتے بعد وہ بھی چند گھنٹوں کے لیے۔''

''یہ زیادتی ہے سمیرا ڈیئر۔'' اس کی بات سن کر اعظمیٰ بھی حیرت میں کود پڑی۔ ہم مکھنی کو ابھی ساتھ لے کر جائیں گے۔ ساتھ ہی اعظمیٰ نے باقاعدہ احمد خان انکل کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے، ''انکل پلیز مجھے دو دن بعد واپس سسرال چلے جانا ہے۔''

''تو گویا ہم تو یہاں گھر داماد بن کر آئے ہیں۔'' عزیز الرحمٰن نے لقمہ دیا تو سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ میں ان کی نوک جھونک سے محفوظ ہو رہی تھی۔

''بھئی آپ لوگ آپس میں جھگڑا مت کرو مکھنی سے پوچھ لو یہ آج کا دن کہاں ٹھہرنا چاہتی ہے۔'' سعید خان نے گیند میرے کورٹ میں پھینک دی۔ اب سب کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میں نے سرسری سا دیکھا بلاول کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر سے وہ اُٹھ کر چلا گیا تھا۔

''انکل آپ اجازت دیں گے تو میں آج ان کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔'' میں نے سعید خان کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اعظمیٰ میرے ساتھ چپک کر کھڑی ہوئی تھی مسلسل میرا ہاتھ دبائے جا رہی تھی۔ ''ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے بیٹی۔ مگر صرف آج کا دن کل ہم لینے کے لیے پہنچ جائیں گے۔''

''تھینک یو انکل۔''

وہاں دن میں محفل سجی تھی اور یہاں رات میں جمی ہوئی تھی۔ انکل فہیم، آنٹی، اعظمیٰ اور حاصل بھائی، لگتا تھا انہوں نے مجھے رات بھر سونے نہیں دینا۔ انکل فہیم کی دل چسپی پر میں حیران تھی، وہ اس محفل میں بالکل بچے بن گئے تھے۔ یہ محفل غم و خوشی کا امتزاج بنی رہی۔ باتوں کا رُخ مہرداد نگر اور میرے گھر والوں کی طرف نکل جاتا تو ماموں میں افسردگی اور پژمردگی چھا جاتی تھی۔ اس سے ہٹ کر کوئی موضوع چھیڑا تو ہلکا پھلکا قہقہہ بھی گونجا، رات دو بجے میں ان سے اجازت لے کر اپنے لیے مختص کیے گئے کمرے میں چلی آئی۔ میں ابھی کمرے میں پہنچی ہی تھی کہ اعظمیٰ بھی وارد ہو گئی۔

''سونا ہے کیا؟'' اس نے آتے ہی سوال کیا۔

''نہیں تو۔ تین بجے نمازِ تہجد ادا کرنی ہے، پھر کچھ وظائف ہیں وہ پورے کرنے ہیں تب تک نمازِ فجر کا وقت ہو جائے گا، اب ایک ہی بار سوؤں گی۔''

''میرا موڈ بھی ابھی سونے کا نہیں ہے۔'' اعظمیٰ بیڈ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

''مراد بھائی کہاں ہیں؟''

''اپنے کمرے میں چلے گئے۔ سونے کے معاملے میں بہت بزدل ہیں، میں تو حیران ہوں آج اتنی رات گئے تک جاگ کیسے گئے۔''

''اعظمیٰ یہ اچانک احسان سے مراد...... میں ابھی تک الجھی ہوئی ہوں، کیا احسان نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ کیا تھا۔''

''پھر......؟''

''ہم کئی بار ملے بھی ہیں۔''

''نتیجہ کیا نکلا۔''

''حاصل سے شادی۔'' اعظمیٰ نے سرد آہ کھینچ کر کہا۔

''میں سمجھی نہیں۔ تفصیل بتاؤ ناں پلیز۔''

''مکھنی احسان مجھے اپنی جان سے بڑھ کر چاہتا تھا۔ مگر وہ بھی اس معاشرے کا فرد تھا، سماج سے جیت نہ سکا۔'' اعظمیٰ نے افسردہ نگاہیں اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں خاموش رہی تا کہ وہ مزید بول سکے۔ ''احسان اپنے ماں باپ کو قائل نہ کر سکا کہ وہ ایک طوائف کو بہو بنا لیں۔''

''اس کے گھر والوں کو تمہارے بارے میں بتایا ہی کس نے تھا۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔

''یہ غلطی وہ خود پہلے کر چکا تھا۔''

''اوہ۔'' میں نے تاسف سے ہنکارا بھرا۔

''احسان وہاں سے ناکام لوٹا تو مجھے بولا۔ انم ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''احسان میں نے انم سے اعظمیٰ بننے تک کا سفر بڑے پُر درد مصائب اور دکھوں کو جھیل کر طے کیا ہے، میں اپنے گھر میں باعزت زندگی گزار رہی ہوں، میں ایک بار پھر اعظمیٰ سے انم نہیں بننا چاہتی۔''

''اعظمیٰ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ ہم کورٹ میرج کریں گے، میں تمہیں علیحدہ گھر میں رکھوں گا۔ باعزت زندگی دوں گا۔''

''احسان مجھ سے شادی کرنی ہے تو میری واحد شرط ہے۔ اپنے گھر والوں کو راضی کرو، وہ ہمارے گھر رشتہ لے کر آئیں اور باعزت طریقے سے مجھے رخصت کر کے لے جائیں بصورت دیگر میں خاموش ہوں گی۔'' احسان بے چینی سے بولا۔

''بصورت دیگر انم۔''

''بصورت دیگر احسان ہماری راہیں جدا جدا ہیں۔ آج کے بعد نہ کبھی ہم ملیں گے نہ ہمارے درمیان کسی قسم کا کوئی ربط رہے گا۔''

''انم۔ انم تم ٹھنڈے دماغ سے سوچ کر فیصلہ کرو۔ ہم......''

''پاگل اس سے بڑھ کر اور کیا ٹھنڈے دماغ کا فیصلہ ہوگا، کورٹ میرج یا گھر سے بھاگ کر شادی کے فیصلے جذباتی ہوتے ہیں۔'' وہ خاموش ہو گیا۔

''اس کے بعد احسان مجھے کبھی نہیں ملا۔'' اعظمیٰ تھوڑی دیر کے لیے رُکی اور ایک لمبی سانس لے کر پھر گویا ہوئی۔

''حاصل مراد ممی کی چچازاد بہن ہیں حیدر آباد میں ان کا بیٹا ہے، حیدر آباد میں حاصل کی سسٹر کی شادی تھی، ہم بھی وہاں مدعو تھے۔ ہماری ملاقات وہیں ہوئی تھی، واپس گھر لوٹے تو ایک ماہ بعد وہ لوگ رشتہ لے کر آ گئے، ہاں ہونے کے بعد چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات ہوئی۔ دو ماہ بعد رخصتی بھی ہو چکی تھی۔''

''خوش تو ہو ناں اعظمیٰ۔''

''اللہ کا شکر ہے مکھنی بہت خوش ہوں اور اب تو میری کوکھ میں ایک ننھا مہمان بھی آ چکا ہے۔'' اعظمیٰ کے چہرے پر دنگ کے سارے رنگ بکھر چکے تھے۔

''سچ اعظمیٰ۔'' میں نے خوشی سے اسے گلے لگا لیا۔

''ہاں مکھنی۔ اللہ تعالیٰ مجھ پر ایسے بھی مہربان ہوگا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مکھنی مجھے زندگی کے سفر تمہاری ایک بات بہت یاد آتی ہے۔''

''کون سی بات؟''

''انم کبھی زندگی میں قرآن مجید با ترجمہ پڑھنا خود پر فخر کرو گی۔''

''میں سوچتی تھی ایک طوائف خود پر کیسے فخر کرے گی۔ ان دن میں نے خالقِ کائنات پر گلے شکوے کر کے بہت بڑا کفر کیا تھا۔ مگر اندھیرے میں تھی اس لیے وہ غلطی کر گئی تھی، ازاں بعد جب قرآنِ مجید با ترجمہ پورا کر چکی تو مجھے پتہ چلا ہم کیا ہیں۔ ہمارا رب کیا ہے۔ ہمارا مذہب اور ہمارا پیغمبر کیا ہے۔ ہمارے لیے سب سے بڑا فخر تو یہی ہے کہ ہم امتِ محمد ﷺ میں سے ہیں۔ جن کی امت میں شامل ہونے کے لیے نبیوں نے تمنا کی تھی۔ میں جیسے جیسے دین کو سمجھتی گئی۔ خود سے شرمندہ ہوتی رہی۔ مکھنی میں نے بہت بار اللہ تعالیٰ سے رو رو کر معافی مانگی ہے۔ میں نے بہت گستاخ زبان استعمال کی تھی۔ مکھنی اللہ مجھے معاف کر دے گا ناں۔''

''انشاء اللہ ضرور اعظمیٰ۔ وہ تو اپنے بندوں کو معاف کرنے کے لیے بالکل تیار ہوا بیٹھا ہے، اس ضمن میں متعدد روایات ہیں۔ امام مسلمؒ نے روایت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ رات کو اپنا ہاتھ بڑھاتے ہیں کہ دن کو گناہ کرنے والا توبہ کرے اور دن کو ہاتھ بڑھاتے ہیں کہ رات کو برائی کرنے والا توبہ کرے۔ ایسا ہمیشہ ہوتا رہے گا جب تک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ ہو جائے۔ امام طبرانیؒ نے عمدہ سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں سات تاریک ہیں اور ایک توبہ کے

لیے کھلا ہے اور وہ سورج مغرب سے نکلنے تک کھلا رہے گا۔"

"ابنِ ماجہؒ نے بھی اس بارے سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ اگر گناہ کرتے رہو کہ تمہارے گناہ آسمان تک پہنچ جائیں۔ پھر تم توبہ کر لو تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول کر لیں گے۔"

"امام ترمذیؒ، ابنِ ماجہؒ اور حاکمؒ نے صحیح روایت کی ہے کہ ہر انسان خطا کار ہے اور اچھے خطا کار توبہ کرنے والے ہیں۔ امام ترمذیؒ نے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی توبہ قبول کرتا رہتا ہے جب تک نزع طاری نہ ہو جائے۔"

"پتا ہے اعظمیٰ جب میں چوہدری اللہ رکھا کو قتل کر کے جیل گئی تھی۔ ایک دن سکھاں کو کہا تھا، آج رات میں اللہ تعالیٰ کو آزماؤں گی۔ میں روانی میں یہ کہہ گئی تھی مگر بعد میں مجھے پچھتاؤں نے گھیر لیا۔ میں نے رات بھر جاگ کر اپنے آپ سے پوچھتی رہی، ملکھنی یہ تو نے کیا کہہ دیا۔ اللہ تعالیٰ کو بھلا کون آزمانے کی جرأت کر سکتا ہے۔ ہم تو خود آزمائش کے لیے آئے ہیں۔ استغفر اللہ۔ میں نے اس رات تہجد میں روتے ہوئے جہاں اپنی باعزت رہائی مانگی تھی وہاں توبہ ہی کی تھی۔ میں سمجھی تھی شاید مجھے اتنے سخت الفاظ استعمال کرنے پر کبھی معافی نہیں ملے گی اور میں تمام عمر جیل میں ذلیل و رسوا رہوں گی، مگر اللہ۔ اُس غفور، مہربان، کریم اللہ نے میری سن لی اور میں باعزت بری ہو کر باہر نکل آئی۔"

اعظمیٰ میری بہن اگر تم نے بھی سچے دل سے توبہ کر لی ہے تو سمجھ لو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سرخرو ہو۔"

"ملکھنی کاش تم ہمیشہ ہمارے ساتھ رہو، تمہاری باتیں ہمیں جینے کا نیا حوصلہ بخشتی ہیں۔"

"مگر ایسا ممکن نہیں میری جان۔" میں نے کہتے ہوئے وال کلاک کی طرف دیکھا تین بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔

"میں چلتی ہوں ملکھنی۔ تم نماز پڑھو کل صبح انشاء اللہ بات ہوگی۔" اعظمیٰ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

"ٹھیک ہے اعظمیٰ شب بخیر۔"

☆......☆

بلال یا اس کے گھر والے دوسرے دن نہیں آئے میں توقع کر رہی تھی کہ وہ دوسرے دن شام تک آ جائیں گے مگر ایسا نہ ہوا، بلکہ دو دن بعد صرف بلاول کے ڈیڈی۔ ممی اور تایا مجھ سے رسمی سی بات چیت کر کے انکل فہیم اور آنٹی کے ساتھ دوسرے کمرے میں گھس گئے۔ میں حیران ہو رہی تھی کہ ایسا کیوں کیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اعظمیٰ کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے اس کی وجہ معلوم ہوئی۔ اعظمیٰ کے چہرے پر غیر معمولی جوش تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"ملکھنی تمہیں پتا ہے انکل احمد اور سعید ڈیڈی سے کیا بات کر گئے ہیں۔"

"تم ہی بتا دو اعظمیٰ مجھے پتا ہے تم وہاں کی سن گن لے کر آئی ہو۔"

"بالکل ملکھنی۔ انہوں نے تمہارے اور بلاول کے رشتے کی بات کی ہے۔"

"کک۔ کیا کہہ رہی ہو۔ اعظمیٰ۔"

"ہاں ملکھنی۔ وہ بلاول اور تمہاری شادی کرنے کے متمنی ہیں۔ اسی سلسلے میں ڈیڈی سے مشورہ کرنے آئے تھے۔"

"یہ۔ یہ کیسے ممکن ہے۔"

"کیوں ممکن نہیں ملکھنی۔ کیا تم نے شادی نہیں کرنی۔"

"اعظمیٰ تم نہیں سمجھو گی۔ میں نے انتہائی دکھ سے کہا۔"

"ملکھنی میں دردوں کی گود میں رہ کر پلی بڑھی ہوں۔ تمہارا دکھ مجھ سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔"

"مگر ملکھنی حالات کا تقاضا یہی ہے کہ تم بلاول سے شادی کر لو۔"

"اعظمیٰ۔ میں" میری بات ادھوری رہ گئی۔ کمرے میں انکل فہیم اور آنٹی داخل ہو رہے تھے۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں بھئی۔"

"وہی باتیں ڈیڈی جو آپ ابھی انکل سعید کے ساتھ کر کے آ رہے ہیں۔"

''اوہ تو ہم سے پہلے یہ خبر یہاں پہنچ گئی ہے۔''

''جی ڈیڈی۔ مگر ملکھنی کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی ہیں۔''

''بیٹی زندگی ایک بھاری بھرکم اور انتہائی سخت و بلند و بالا چٹان ہے۔ اسے تنہا پاٹنا بھی ایک لڑکی کے لیے انتہائی دُشوار ہے۔ زندگی کے جن پُرپیچ اور سنگلاخ راستوں سے تم گزر آئی ہو وہ ہی تمہاری ہمت اور بہادری ہے۔ مگر آگے حالات مزید سخت ہوتے جارہے ہیں۔ یہ لمبی مسافت کا کٹھن سفر ہے، چوہدری مشتاق نے تمہاری تلاش کے لیے باقاعدہ پیشہ ور گروپ کی مدد لے لی ہے۔ اس کے بہت ثبوت بھی تم دیکھ چکی ہو۔ ان حالات میں یہ سوچنا کہ تم اکیلی لڑکی ان کا مقابلہ کرلوگی انتہائی بے وقوفی ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں۔''

''جی انکل۔''

''ملکھنی بیٹی تمہارے خاندان میں دو ہی مرد ہیں۔ مظہر جیل کی زندگی کاٹ رہا ہے اور اظہر اپنی فیملی کے ساتھ دوبئی میں سیٹل ہے۔ تمہیں امّی، سکھاں اور پھوپول بھی جائیں تو میدان میں صرف تم عورتیں ہی رہ جاتی ہو۔ عورت منہ اور دل کی جتنی بھی بہادر ہو مردوں کا مقابلہ بہرحال نہیں کرسکتی۔ ہر عورت کے لیے ایک مضبوط مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلاول کا پورا گھرانہ ماشاءاللہ سچا اور پکا مسلمان ہوچکا ہے۔ اس ضمن میں وہ تمہارے احسان مند بھی ہیں۔ تمہیں ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھیں گے۔ جب وہ ہندو تھے تب بھی سماج میں ان کا ایک مقام تھا۔ اب تو وہ اور بھی اثر ورسوخ والے ہوچکے ہیں اس لیے یہ رشتہ ٹھکرانا انتہائی بے وقوفی اور ناسمجھی ہوگی۔''

انکل فہیم نے کہا۔

''ملکھنی تم ماشاءاللہ مذہبی سوچ اور عمل والی لڑکی ہو۔ استخارہ کرلو۔ جس بات پر دل مطمئن ہو وہ فیصلہ کرلو۔'' آنٹی نے کہا۔

''ملکھنی ہم تمہارے ماں باپ ہیں، مجھے اپنا ابا رحیم اللہ سمجھو آنٹی کو امی خورشید اور راعظمیٰ کو سکھاں۔ بیٹی ہم تمہیں ویسے ہی رخصت کریں گے جیسے تمہیں تمہارے والدین نے رخصت کرنا تھا۔''

''میں جانتی ہوں انکل۔ مجھے آپ لوگوں سے ہمیشہ گھر جیسا پیار ملا ہے۔ بس مجھے تھوڑا سا وقت چاہیے۔ اس کے لیے میں استخارہ بھی ضرور کروں گی۔''

''بالکل بیٹی تم اچھی طرح سے سوچ لو، ہم سب کی نظر میں تمہارے حق میں ہی بہتر ہے کہ تم ہاں کردو۔'' انکل نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

انکل اور آنٹی چلے گئے ان کے پیچھے اعظمیٰ بھی کمرے سے باہر نکل گئی۔ شاید مجھے سوچنے کا موقع دے رہی تھی۔

حالات خود بخود اس نہج پر چل پڑے تھے کہ مجھے زندگی کا اہم فیصلہ کرنا ہی تھا۔ میں ہمیشہ سوچا کرتی تھی۔ یہ وقت جب مجھ پر آئے گا تو کیا ہوگا۔ میں اپنے آپ سے لڑسکتی ہوں جیت نہیں سکتی۔ میں آج تک کبھی اپنے آپ سے نہیں جیتی۔ میرا اندر میرے باہر سے زیادہ قوی اور مضبوط ہے، آج وہ گھڑی آن پہنچی تھی کہ میرا اندر میرے باہر سے جنگ کررہا تھا۔

میں سوچوں میں گم تھی کہ ٹیبل پر پڑے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ یہ سیٹ کل یہاں نہیں تھا، شاید آج دن میں کسی ٹائم رکھ دیا گیا تھا۔ میں نے سوچا ڈرائنگ روم میں سے فون ریسیو کرلیا جائے گا اس لیے نہیں اُٹھا، گھنٹیاں مسلسل بجتی رہیں۔ میری سوچوں کا سلسلہ موقوف ہوچکا تھا۔ ایک بار لائن کٹ جانے کے بعد پھر سے کال آنے لگی، اس بار آگے بڑھ کر میں نے ریسیور اُٹھالیا۔

''السلام علیکم''

''وعلیکم السلام۔ ملکھنی کیسی ہو تم۔'' دوسری طرف بلاول تھا، اس کی آواز سن کر مجھے اپنے گالوں میں حرارت محسوس ہونے لگی تھی۔

☆☆......☆☆

(اس حیرت انگیز اور اسرار بھرے ناقابلِ فراموش سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے)

ڈیل، ایک فیصلہ



سنبل

شہر کراچی کے ایک نوجوان کی سیاسی بساط پر مہرہ بننے کی داستان

کچھ ڈیلز ایسی ہوتی ہیں جو کہ انسان کو لہو رلواتی ہیں، اپنے ساتھ ہر صاحبِ دل کو بھی رُلا دیتی ہیں۔ یہ بھی ایک ایسی ہی ڈیل تھی جس نے کتنے ہی لوگوں کو ہی لہو رُلوایا تھا اور جو پایۂ تکمیل تک بھی نہیں پہنچ سکی۔

شہزاد کا تعلق شہر عروس البلاد کے ایک علاقے سے تھا جس کی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے یہ نہ جانے کتنے ہی ممالک کی نظروں میں کھٹکتا ہے۔ یہاں کے حالات کی خرابی میں اندرونی سے زیادہ بیرونی عوامل کا ہاتھ ہے اور اس بات سے واقفیت کے باوجود پہلوتہی کی جاتی ہے۔ وجوہات کو جان کر بھی انجان بنا جاتا ہے۔ ایک دوسرے پر الزام دھرے جاتے ہیں۔ ایک قوم دوسری قوم کو الزام دیتی ہے۔ ایک زبان بولنے والے دوسری زبان بولنے والوں سے نفرت کرتے ہیں۔ حالاں کہ ہم کوئی بھی زبان بولیں ایک قوم ہیں۔ ہماری قومیت میں پاکستانی ہی لکھا جائے گا۔ کہیں بھی پنجابی، پختون، سندھی، مہاجر یا سرائیکی نہیں لکھا جاتا۔ ہماری قومی اور رابطے کی زبان اُردو ہی ہے۔

رہ گئے سیاستدان تو وہ ان بیرونی ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں ہیں، وجہ صرف اپنے مفادات قوم اور قومی دولت میں اپنا حصہ۔ وہ بس گنتیاں پوری کروانے کے شوقین، اس میں فائدہ ان کا جو ہے۔ پاکستان وہ بدقسمت ملک ہے جسے لیڈرانِ آزادی کے بعد ایک بھی اچھا اور ملک سے وفادار لیڈر دستیاب نہیں ہوسکا۔

ہاں تو شہزاد کا تعلق اسی پیارے وطن کے اس پیارے شہر سے ہے جو عروس البلاد ہے، جسے ہمارے اندرونی اور بیرونی دشمنوں نے عروس سے بیوہ بنا دیا ہے۔ جو جل رہا ہے، جہاں خون پانی کی طرح بہتا ہے، جہاں بچے ایسے یتیم و یسر ہو جاتے ہیں جیسے کہ جانوروں کے...... ناں کہ انسان کے۔ جہاں عورتوں کی مانگیں یوں سونی ہو جاتی ہیں جیسے کبھی بسی ہی نہ ہوں۔ جہاں بوڑھے ماں باپ اپنے جوانوں کے لاشے اپنے کاندھوں پر ڈھوتے ہیں اور جہاں اتنی مہنگائی ہے کہ اس کے ناگہانی ہاتھوں بیٹھے جانے والے لوگ کبھی کھڑے نہیں ہو پاتے۔ وہ پیٹ پر پتھر باندھ کر ایک اور سنت نبوی ﷺ پوری کرتے ہیں اور بالآخر یا تو بھوک و بیماری کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں یا پھر خودکشی کے ہاتھوں......

☆......☆

شہزاد کا بچپن اسی عروس البلاد شہروں کی دلہن کراچی کے ایک علاقے سے تھا۔ اسے اس کے گھر والے شیز اور دوست اس کے لمبے قد کی وجہ سے ایوریسٹ (ماؤنٹ

ایوریسٹ) کہتے تھے۔ وہ جس علاقے کا رہائشی تھا وہاں ایک پارٹی کا ہولڈ تھا۔ دوسری پارٹیز کے لوگ بھی تھے۔ مگر وہ بہت کم تھے۔ ان کے آپس میں ہی جھگڑے چلتے رہتے تھے۔ یہ سب ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ کوئی کسی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

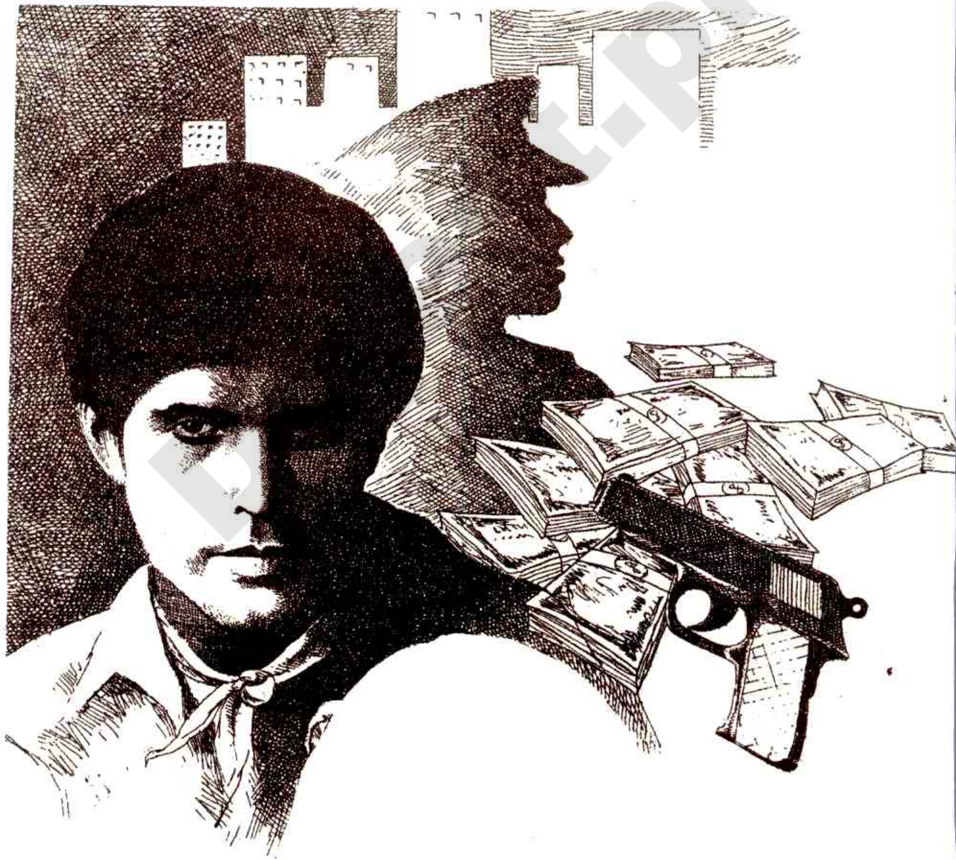
شہزاد کا تعلق کسی پارٹی سے نہیں تھا، مگر اکثریت والی پارٹی کے کارکنان سے دوستی رکھتا تھا۔ اس کا ان لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہ بچپن سے یہاں کا رہائشی تھا۔ پارٹی ورکرز کے علاقے کے لیے کیے گئے مثبت کاموں سے وہی نہیں اس کے گھر والے بھی واقف تھے۔ اس لیے ان کا ووٹ ہمیشہ سے پارٹی کے لیے وقف تھا۔ یہی نہیں وہ الیکشن کمپین میں بھی اپنے ان دوستوں کے ساتھ ہوتا تھا اور الیکشن والے دن بھی ان کے شانہ بشانہ کام کرتا تھا اور پھر کامیابی کا جشن بھی سب کے ساتھ بھرپور مناتا تھا۔ مگر ان سب کے باوجود بھی وہ پارٹی کا حلف یافتہ کارکن نہیں تھا۔ اس پارٹی کو الیکشن میں واضح اکثریت حاصل ہوتی تھی اور ان کی شمولیت کے بغیر کوئی بھی حکومت تشکیل نہیں پاتی تھی۔

وقت گزرتا رہا حکومتیں آتی رہیں جاتی رہیں ساتھ ہی گرفتاریاں، چھاپے، اغواء، قتل اور ان کاؤنٹرز ہوتے رہے۔

☆......☆

اس دن اسے پارٹی کے عہدیدار ناصر بھائی نے بلایا تھا۔ وہ گیا تو کچھ دیر وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور آخر میں انہوں نے کہا۔

''بیٹا شیز! اب آپ احتیاط کیا کریں؟'' ناصر بھائی نے کہا۔



"بھائی! کس سلسلے میں؟" شہزاد نے انجان پنے سے پوچھا۔

"باہر نکلنے کے سلسلے میں۔ آس پاس کی خبر رکھا کریں اور جب گرفتاریاں اور چھاپے بڑھ جائیں تو رات گھر پر گزارا کریں۔" ناصر بھائی نے کہا۔

"مگر کیوں بھائی! میرا تو پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"بالکل نہیں ہے مگر یہ بات آپ جانتے ہیں یا ہم جانتے ہیں، مگر اور لوگ نہیں جانتے ہیں۔ ہمارے مخالفین کی مخبری نے آپ کو ہمارا کارکن بنادیا ہے اور آپ کا نام شیزا یوریسٹ کے نام سے پولیس کی لسٹ میں موجود ہے۔ آپ بہت سیدھے اور شریف انسان ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کسی مشکل میں گرفتار ہوں، اس لیے احتیاط کریں۔" ناصر بھائی نے بات سمیٹی۔

"گویا کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے۔" اس نے کہا تو ناصر بھائی کھل کر ہنسے۔

"ہاتھ ہی نہیں منہ بھی کالا۔" انہوں نے ہنسی روک کر کہا تو وہ بھی بامشکل ہنسا۔ اور پھر وہ ناصر بھائی کی باتوں کو سوچتا گھر آ گیا۔

☆......☆

آگے اس کا ارادہ تھا کہ اس نے پارٹی کے لوگوں کے ساتھ ساتھ آئندہ اُٹھنا بیٹھنا نہیں ہے، مگر آگے کے حالات اس کے اختیار سے باہر ہو گئے۔ ان دنوں چھاپے اور گرفتاریاں زوروں پر تھیں۔

اسی دن اس کے کزن اور دوست کی مہندی تھی۔ رات میں اپنے کزن منیب کے کہنے پر وہ وہیں ان کے گھر رک گیا۔ اس رات ان کے علاقے میں کئی چھاپے پڑے اور اس میں اس کا اپنا گھر بھی شامل تھا اور پولیس نے اس کی عدم دستیابی پر اس کے والد اور بارہ سالہ بھائی کو گرفتار کرلیا، یہ ہی نہیں ان دونوں کے حوالے سے گھر کی خواتین کو بھی ہراساں کیا گیا کہ وہ شیزا یوریسٹ کا پتا بتادیں ورنہ ان دونوں کو یہیں ختم کر دیں گے۔"

شہزاد کے ابو اور اس کے بھائی کو ذہنی ٹارچر زیادہ اور جسمانی ٹارچر کم کیا گیا مگر اس واقعے کے بعد سے شیزر کے ابو نفسیاتی ہو گئے۔ وہ اپنے دونوں بیٹوں کے حوالے سے ڈرنے لگے۔ وہ اکثر کہتے "ان کو ماردیں گے۔" اور اگر ذرا بھی شہر کے حالات خراب ہوتے وہ اپنے دونوں بیٹوں کو کسی رشتے دار کے گھر بھجوادیتے۔ اس سارے قصے کے بعد شہزاد کا چھوٹا بھائی بہروز، اس کی تو آنکھوں میں خون اُتر آیا اور وہ بانگ دہل پارٹی ورکرز کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگا۔

حالات پہلے سے زیادہ خراب ہو گئے۔ لوگ اپنی اولادوں کو بیچنے سڑکوں پر نکل آئے۔ مگر مہنگائی کے عفریت کی بھوک مٹنے میں ہی نہیں آئی۔ ایک آدم کی اولادیں، ایک مذہب، ایک تسبیح میں جڑے دانے محض زبان کی بنیاد پر مختلف قومیتوں میں تبدیل ہو کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ مذہب کے ٹھیکیداروں نے ایک زبان بولنے والوں کو اسلام سے خارج قرار دے کر دوسری زبان بولنے والوں کو ان کے قتل جہاد اور شہادت کا رستہ بتایا۔ تو سیاستدانوں نے بھی اپنی دکانداری چمکائی اور آپس میں نفرت کی وہ آگ بلند کی جس کو پاٹنا ناممکن ہو گیا اور اس سارے عمل سے ہمیشہ کی طرح فائدہ اٹھایا بیرونی ہاتھ نے۔ حکومتیں آتی اور جاتی رہیں مگر غریب کے حالات نہیں بدلے اور امیر کے کبھی تجوری کا پیٹ نہ بھرنا تھا نہ بھرا۔

شہزاد کی دونوں بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔ اس کی اپنی بھی شادی ہو گئی اس کے والد ٹینشن کے مریض ہو گئے بلڈ پریشر اور شوگر نے انہیں کھوکھلا کر دیا۔ ان کی آنکھیں اور گردے ناکارہ ہو گئے اور بالآخر وہ انتقال کر گئے۔ بہروز پارٹی کا حلف یافتہ کارکن تھا۔ وہ پارٹی کے ہر اچھے برے میں ان کے ساتھ تھا۔ مگر شہزاد نے کافی عرصے سے کنارہ کرلیا تھا۔ مگر اس کا نام ابھی بھی پولیس کی لسٹ میں موجود تھا۔

خدا نے شہزاد کو دو بیٹوں سے نوازا تھا۔ قلبی طور پر وہ اپنے بڑے بیٹے شہروز سے زیادہ قریب تھا۔ وہ تھا بھی بڑا پیارا بچہ۔ اس کی زبان کو ایک پل کے لیے بھی قرار نہیں تھا، وہ جب تک گھر میں رہتا بولتا ہی رہتا۔ دادی، پھوپو اور ماں کی جان تھی اس میں۔ یہی نہیں شہروز محلے کے ہر فرد کا لاڈلا تھا۔ وہ گھر میں کم ہی ٹکا

کرتا تھا۔ اسے کوئی نہ کوئی گھر سے آ کر لے جاتا تھا۔

☆......☆

ان دنوں شہر کے حالات پھر خراب تھے۔ نئی حکومت، پرانی لسٹیں...... چھاپے، گرفتاریاں، ٹارگٹ کلنگ اور ان کاؤنٹرز۔ اور پھر اسی ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بہروز بن گیا۔ امّاں تو اسی دن آدھی مر گئیں۔ بہروز کا جنازہ اُٹھا تو وہ ایک ہاسپٹل کے I.C.U میں تھیں۔ جنازے پر اہل محلہ دھاڑیں مار رہے تھے اور علاقے میں کہرام تھا اس جوان موت پر اور پھر اماں اس غم میں نفسیاتی مریض بن گئیں، پٹاخہ بھی پھوٹتا تو وہ شہروز، شہروز اور امروز کو کمرے میں بند کر دیتی تھیں۔

شہروز کا ایڈمیشن کرا دیا گیا اب وہ پری نرسری کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اس کی معصوم اور پیاری پیاری باتوں نے گھر کی فضا میں خوشگوار تبدیلی کی تھی۔ اب وہ ایکشن کے ساتھ Poems سناتا۔ ٹیچرز کی بتائی چھوٹی چھوٹی باتوں پر عمل کرتا۔ پانی بیٹھ کر پیتا۔ ہر کام کی ابتداء بسم اللہ سے کرتا۔ ہر موقع کی دعا پڑھتا گویا وہ ان سب کے لیے چابی والا گڈا بن گیا تھا جوان کا دل بہلاتا، ان کو ہنساتا تھا ورنہ تو بہروز کے بعد سے کسی کا بھی ہنسنے بولنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

☆......☆

وہ بدھ کا دن تھا۔ ثمر (شہروز کی ماما) نے شہروز کو اسکول کے لیے تیار کروایا۔ اس کو پانی کی بوتل اور لنچ دیا ساتھ ہی ہلکا پھلکا ناشتہ کروایا تب تک وین آ گئی اور وہ اسکول چلا گیا۔

ان دنوں علاقوں میں کشیدگی تھی۔ امّاں نے شہزاد کو اس کی پھوپو کے گھر بھجوا دیا تھا۔ ورنہ صبح میں شہروز کو وہی چھوڑ دیتا تھا اور اس دن شہروز اکیلا ہی چلا گیا مگر پھر اس کی واپسی نہ ہوئی، ہاں شام میں ایک فون آیا کہ ”اگر بیٹے کی سلامتی چاہتی ہو تو شہزاد کو ہمارے حوالے کر دو۔“ اور ثمر کے ہاتھ سے ریسیور گر پڑا۔ امّاں انجائنا کی مریضہ تو پہلے سے ہی تھیں اس خبر سے انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا۔

ثمر پر یہ بہت بُرا وقت تھا امّاں ہاسپٹل میں، گھر لوگوں سے بھرا ہوا اور دلِ ناتواں ساس اور بیٹے کی سلامتی کیلئے دعا گو۔ اس کی دونوں نندیں بھی اس کے ساتھ برابر سے کھڑی ہوئی تھیں۔ ان سب کا ایک پیر گھر اور ایک ہاسپٹل میں تھا۔ عبادتیں خضوع وخشوع کے ساتھ، طویل سجدوں اور طویل تر دعاؤں کے ساتھ بڑھ گئیں۔

یہ خبر شہزاد تک پہنچی تو ثمر کے موبائل پر اس کی کال آ گئی۔

”ثمر میں واپس آ رہا ہوں ان لوگوں کی اب کال آئے تو ان سے کہہ دینا کہ ہمیں ان کی شرط منظور ہے۔“

وہ بہت بے تاثر لہجے کہہ رہا تھا۔

”خدا کے لیے شیز! مجھے اور آزمائش میں مت ڈالیں۔ آپ کو اماں اور امروز کی جان کی قسم ہے۔ آپ واپس نہیں آئیں گے۔“ وہ پہلے ہی بھرے دل سے بیٹھی ہوئی تھی اس کی بات پر بے بسی سے رو دی۔

”تو پھر کیا کروں؟ اپنے بچے کو مرنے دوں ان بے حسوں کے ہاتھ۔“ وہ چیخ کر غصّے سے بولا۔

”شیز! آپ کو کیا لگتا ہے جو لوگ انسانیت کے معیار سے اتنے گرے ہوئے ہوں کہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے عورتوں اور بچوں کا استعمال کریں وہ زبان کے اتنے پکّے ہوں گے کہ آپ کے حصول کے بعد شہروز کو چھوڑ دیں گے۔ بھول ہے آپ کی۔ وہ لوگ ہماری نسلیں مٹانا چاہتے ہیں، ورنہ ایک ایک گھر سے دو دو، چار چار اور چھ چھ جنازے بیک وقت نہ اٹھتے۔ اور شیز! اگر شہروز کی زندگی باقی ہے تو وہ ہمیں ایسے ہی مل جائے گا اور اگر نہیں باقی ہے تو کسی طرح سے نہیں ملے گا۔ بس اس کے حق میں دعا کریں یہی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ آپ اپنی زندگی کو خطرے میں مت ڈالیں۔“ وہ بے طرح روتے ہوئے بولی۔ شیز کو بھی اس کی ذہنی حالت کو پتا تھا لہٰذا اب وہ بولا تو لہجہ دھیما تھا۔

”پولیس میں رپورٹ لکھوادی ہے۔“

”وہاں لکھوادی ہے مگر اس جنگل پولیس کا جو کردار ہے اس سے آپ بھی واقف ہیں اور میں بھی۔ میں نے تو صبر کر لیا ہے آپ بھی کر لیں۔ ہاں اس صبر میں جبر بہت ہے“ آنسوؤں کی نمی اس کے لہجے میں گھلی ہوئی تھی۔

”اماں! کیسی ہیں۔ ان کی خیریت کی اطلاع دیتی رہنا۔“ وہ آزردگی سے بولا۔

”نہیں شیز! میں آپ سے کوئی رابطہ نہیں رکھوں گی۔ میں نے آپ کا نمبر اپنے موبائل سے بھی

Delete کر دیا ہے اور ابھی ریسیو کال سے بھی Delete کر دوں گی۔ احتیاط بہتر ہے۔'' اس نے آنسو دوپٹے سے پونچھتے ہوئے کہا اور پھر ایک دو باتوں کے بعد شہزاد نے فون بند کر دیا۔ اس نے سب سے پہلے ریسیو کال کو Delete کیا۔

☆......☆

مطالبہ پورا نہیں کیا گیا تھا سو پانچویں دن گھر کے قریب سے ہی شہروز کی بوری بند لاش مل گئی۔ بات یہ نہیں تھی کہ اس معصوم کو مار دیا گیا تھا۔ وجود سے عدم کا فاصلہ لمحوں کا ہوتا ہے مسئلہ یہ تھا کہ کیسے مارا گیا ہے؟

اس معصوم کا نیل و نیل جسم بتا رہا تھا کہ اس پر کتنا بہیمانہ تشدد کیا گیا ہے۔ ثمر اپنے لاڈلے، اپنے جگر گوشے کا یہ حال برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو گئی۔ ہوش میں آ کر اسے سکتہ ہو گیا۔ جس وقت شہروز کا جنازہ اٹھا تو اپنے ہی نہیں بیگانے بھی ایک دوسرے کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ وہ اتنا پیارا بچہ سب کا ہی لاڈلا تھا۔

صدمہ کتنا ہی بڑا ہو وقت گزرنے پر اس کی شدت میں کمی آ جاتی ہے۔ کہتے ہیں قبرستان کی طرف بڑھتے ہر قدم پر فرشتے محبتیں کاٹتے چلے جاتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو جینا کتنا مشکل ہو جائے۔ ثمر کا سکتہ بھی ٹوٹ گیا اور اسے صبر بھی آنا شروع ہو گیا۔

اماں اسپتال سے گھر آ گئیں انہیں بھی اس سانحے کا پتا چل گیا تو وہ جیسے تڑپ اٹھیں۔

''اماں! چپ ہو جائیں۔ آپ کی طبیعت بگڑ جائے گی۔'' ثمر نے اماں کو دلاسہ دیتے ہوئے ان کے کاندھے تھپکے۔

''کیسے چپ کر جاؤں ثمر! کہاں سے لاؤں وہ پتھر کلیجہ کہ اس دُکھ کو سہار جائے۔ ثمر میری بچی تُو نے کیسے برداشت کیا یہ صدمہ۔ ہائے اللہ مرنے کی عمر تو میری تھی، تُو نے مجھے چھوڑ دیا اس معصوم کو بلا لیا۔ یا خدا مجھے اُٹھا لیتا اس معصوم کو بخش دیتا۔'' اماں دھاڑیں مار کر رو رہی تھیں اور ثمر ان سے لپٹ کر خود بھی زار و زار رو پڑی۔

''نہیں اماں! سچ کہوں یہ غم میں برداشت نہیں کر سکی۔ یہ صدمہ میں سہار نہیں سکی۔ میرے دل میں سوراخ ڈال دیے اس دُکھ نے۔ بہت مشکل فیصلہ تھا۔ ایک طرف شوہر دوسری طرف بیٹا، دونوں کی محبت کا انداز جدا مگر محبت میں رتی بھر بھی فرق نہیں تھا۔ فیصلہ کس کے حق میں ہو بہت مشکل فیصلہ تھا بہت مشکل۔'' وہ اماں کے سینے سے لگی زار و زار رو رہی تھی۔

''بس میری بچی! صبر کر صبر۔ جو رہ گئے ہیں ان کی سلامتی کی دعا کر۔'' اماں نے اسے پیار سے تھپکا۔

شہروز ایسا طوطا تھا، جس میں سب کی جان بند تھی۔ اس کے جانے سے جیسے گھر اور زندگی میں خاموشیوں نے ڈیرے ڈال لیے تھے، اب یہ گھر، گھر نہیں شہرِ خموشاں لگتا تھا۔ کوئی آہٹ کوئی آواز آتی تو سب سہم جاتے۔

☆......☆

کچھ عرصے بعد ان لوگوں نے یہاں سے گھر چھوڑ دیا شہزاد بھی گھر آ گیا تھا۔ اس دن وہ کام سے واپس آیا تو ثمر، شہروز کی تصویر کو دیکھتے ہوئے رو رہی تھی اور وہ دیکھ کر جھنجھلا گیا کہ دُکھی تو وہ خود بھی تھا۔

''میں نے کہا تھا ناں کہ میں آ جاتا ہوں۔ یہ فیصلہ خود تمہارا اپنا تھا پھر اب یہ رونا دھونا کس کے لیے ہے۔'' وہ چڑ کر بولا اور اس کی آواز پر اماں بھی اندر آ گئیں۔

''شیز! یہ کس لہجے اور انداز میں ثمر سے بات کر رہے ہو۔ بیٹا تھا وہ اس کا، ماں ہے وہ اس کی۔ اور ایسا پیارا بچہ کے غیر بھی یاد کر کے روتے ہیں تو ماں نے دل کی جگہ پتھر نہیں فٹ کیا ہے اور شہروز نہ ہوتا تو تم ہوتے، یہ رونا تو ہمارے نصیبوں میں لکھا جا چکا تھا۔ یہ بتاؤ تم نہیں یاد کرتے اسے۔ وہ عورت ہے اس کا انداز تمہاری طرح مضبوط نہیں ہو سکتا، وہ آنسوؤں پر قابو نہیں پا سکتی۔ پھر بھی میں ثمر کے حوصلے اور اس کی بہادری کی داد دیتی ہوں کہ ایک ایسے وقت میں، جب تم یہاں موجود نہیں تھے، میں اسپتال میں تھی اور بیٹا اغوا کر کے مار دیا گیا تو حالات کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا ہے۔ کوئی اور عورت ہوتی تو ڈھے جاتی، مر جاتی غلط فیصلہ لے کر دونوں کو کھو دیتی۔ مگر اس نے ہوش مندی کا مظاہرہ کر کے ایک بہتر فیصلہ لیا۔'' اماں بولتی چلی گئیں۔

''اماں! مرد سے ہمیشہ یہ توقع کیوں رکھی جاتی ہے

کہ وہ صبر و ضبط اور بہادری کا مظاہرہ کرے گا۔ امّاں میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں اس دُکھ کو آنسوؤں سے رووُں اور میں چھپ چھپ کر روتا بھی ہوں مگر میں یہ دُکھ کسی اپنے کے کاندھے پر سر رکھ کر رونا چاہتا ہوں۔'' اس نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا تو اس کی آنکھیں سرخ اور ان میں نمی تھی اور امّاں نے اپنے بازو وا کر دیے اور شہزاد امّاں کے سینے سے سر ٹکا کر زار و زار رونے لگا ساتھ ہی ثمر کے آنسوؤں میں بھی روانی آ گئی۔

☆......☆

اس دن رات کو شہزاد کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ امروز سو چکا تھا کافی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد اس نے سوتی ہوئی ثمر کو دیکھا مگر اس کے ہلکے سے لرزتے جسم نے اسے بتا دیا کہ وہ سو نہیں رہی ہے وہ جاگ رہی ہے اور رو رہی ہے۔ شہزاد نے ہولے سے اس کا کاندھا پکڑ کر اسے آواز دی ثمر نے آنسو بھری نگاہوں سے مڑ کر شہزاد کو دیکھا اور اس کے کھلے بازوؤں میں سما کر سینے سے آ لگی اور اس کا سینہ بھگونے لگی۔

''ثمی! اگر تم برداشت نہیں کر سکتی تھیں تو تم نے ایسا فیصلہ کیوں کیا۔'' شہزاد نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''اس لیے شیز کہ وہ نہ ہوتا تو آپ ہوتے، رونا تو میری زندگی میں لکھا جا چکا تھا۔ آپ نہیں جانتے، آپ اندازہ نہیں کر سکتے اس بات کا کہ فیصلے کا اختیار کسی عورت کو تھما دیا جائے کہ وہ بیٹا بچائے یا شوہر۔ کتنا ظالمانہ عمل ہے یہ۔'' وہ بے طرح رو رہی تھی۔

''بتایئے کوئی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ دل کو بچائے یا جان کو۔'' وہ سسکی لیتے ہوئے بولی۔

''مگر میں نے سنا ہے کہ عورت صرف ماں ہوتی ہے۔'' اس نے ثمر کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

''غلط سنا ہے، عورت اپنے ہر رشتے میں یکساں کھری ہوتی ہے اور پھر امّاں بھی تو ماں ہیں۔ ایک ماں نے اپنا کلیجہ جلا کر دوسری ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رکھا۔'' اس نے بڑی بے دردی سے اپنے آنسو پونچھے۔

''اور یوں بھی مہروز نے اماں کو آدھا تو مار ہی دیا ہے، کیا میں پورا مار دیتی۔'' وہ تلخ ہوئی۔

''مگر اصل سے سود زیادہ پیارا ہوتا ہے۔''

''ہاں مگر ان کا سود موجود ہے اور آگے آنے کی امید بھی ہے مگر ان کا اصل ایک ہی تھا اور آگے آنے کی امید بھی نہیں ہے۔'' وہ اب رو نہیں رہی تھی مگر اُداسی اور ایک مستقل غم کی کیفیت اس کے چہرے پر موجود تھی۔

''چلیں چھوڑیں خدا نے ہمیں غم بڑا دیا ہے تو بہتری بھی کوئی بڑی ہی رکھی ہوگی۔ بھیّا نے آپ کے لیے دبئی میں نوکری کا انتظام کیا ہے آپ وہاں چلے جائیں۔'' اس نے بڑی امید سے شیز کو دیکھا۔

''تم لوگوں کو اکیلا چھوڑ جاؤں۔'' وہ ڈانواڈول تھا۔

''جن کا اللہ ہوتا ہے وہ کبھی اکیلے نہیں ہوتے۔'' وہ یقین سے بولی۔

''موت کے ڈر سے اپنا ملک چھوڑ جاؤں۔ اس کی ترقی میں سے اپنا حصہ نکال لوں۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''یہ خدا کو ناپسند ہے۔''

''موت کے ڈر سے نہیں زندگی کی امید پر۔ زندگی کی حفاظت ہم پر فرض ہے۔ ان حالات میں یہاں رہنا خودکشی ہے اور خودکشی حرام ہے، خدا کا ناپسندیدہ فعل۔'' وہ بھی آج ہر حالت میں منوانا چاہتی تھی۔

''مجھے اس ملک سے بہت محبت ہے ثمی! ہمارے ساتھ جو بُرا ہوا، وہ یہاں کے لوگوں نے کیا، اس ملک نے نہیں۔ یہ ہماری ماں ہے، ہماری دھرتی ماں اور ماں کو چھوڑنا کتنا مشکل ہوتا ہے تم سے بہتر کون جانتا ہوگا۔ لیکن میں جاؤں گا تم لوگوں کو اس خوف زدہ زندگی سے چھٹکارا دینے کے لیے۔''

اور یوں شہزاد دبئی چلا گیا۔

لیکن یہاں ایک سوال اُٹھتا ہے کسی بھی پارٹی سے دلی یا جذباتی وابستگی رکھنا کیا جرم ہے۔ کسی کے نظریات سے متفق ہونا جرم ہے اگر نہیں تو محض پارٹیز سے وفاداری کی بنا پر ہم کب تک مجرم اور ملزم پیدا کرتے رہیں گے اور اپنی افرادی قوت کا حصہ اپنے ملک کی ترقی سے نکال کر دوسرے ممالک کی ترقی کا ایندھن بناتے رہیں گے۔ میں بہت سوچتی ہوں اس بات پر آپ بھی سوچیں۔

☆☆......☆☆

دوسرا شعلہ

تریا چلتر



منشی محمد عزیز مئے

لڈن، وہاڑی سے ایک چلتر عورت کے منصوبہ ساز ذہن کا شاخسانہ

ضلع وہاڑی کے تھانہ ٹبہ سلطان پور میں تعینات ہوئے ابھی مجھے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہی ہوئے تھے جب یہ وقوعہ پیش آیا۔ جاتی گرمیوں کے دن تھے اُس دن میں ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے لیٹا ہوا تھا، جب ایک کانسٹیبل نے آ کر مجھے سیلوٹ کیا اور کہا۔

''سر! اُدھر آڑی محلّہ میں ایک عورت جل کر مرگئی ہے اور اس سلسلے میں دو آدمی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''کیسے جل کر مری ہے؟'' میں نے کانسٹیبل سے استفسار کیا تو اُس نے جواب دیا۔

''سر! زیادہ تفصیل تو میں نے نہیں پوچھی، اگر آپ کہیں تو اُن آدمیوں کو کیا یہیں بھیج دوں؟''

''نہیں۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں اُدھر ہی چلتا ہوں۔''

جب میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو کانسٹیبل نے اُن دو افراد کو میرے کمرے میں بھیج دیا۔ میں نے ناقدانہ انداز میں اُن پہ نظر ڈالی۔ وہ دونوں اُدھیڑ عمر کے تھے۔ پینتالیس اور پچاس کے درمیان۔ سلام کے بعد میں نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ شکریہ کہتے ہوئے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''جناب! میرا نام اشفاق احمد ہے'' اُن میں سے ایک نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ میرا ہمسایہ عنایت حسین ہے۔''

''جی فرمایئے کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''حضور! مسئلہ تو کوئی خاص نہیں ہے۔'' اشفاق نے کہا۔ ''ہمارے پڑوس میں رہنے والی ایک بیوہ عورت نذیراں بی بی جل کر مرگئی ہے۔''

''اوہ! اچھا پیش آیا ذرا تفصیل سے بتائیں کہ یہ حادثہ کب اور کیسے ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

اُس نے میرے مختلف سوالوں کے جواب میں جو بات بتائی، وہ کچھ یوں تھی کہ نذیراں بی بی کا شوہر فیض بخش عرف فیضو تیلی تین سال پہلے مر چکا تھا۔ اولاد اُن کی کوئی تھی نہیں۔ نذیراں کے میکے والے عارف والا میں رہتے تھے اور یوں یہاں نذیراں بی بی اکیلی رہتی تھی۔ اس روز وہ اپنے صندوق سے بستر نکال رہی تھی، غالباً دیکھ بھال کی غرض سے، جب اُس کے اپنے سلگائے ہوئے سگریٹ سے بستروں نے آگ پکڑ لی اور وہ صندوق سے باہر بھی نہ نکل سکی اور صندوق کے اندر ہی جل کر مرگئی۔ ہمسایوں نے چیخوں کی آواز سن کر کمرے میں دیکھا تو وہ دھوئیں سے بھر چکا تھا اور جب



اپنی مدد آپ کے تحت اُن لوگوں نے آگ بجھا کر صندوق کا ڈھکن اُٹھایا تو لاش مکمل طور پر جل چکی تھی۔‘‘

میں نے ایک حوالدار کو کارروائی کی خاطر آڑی محلے میں بھیج دیا۔ نذیراں بی بی کے میکے بھی اطلاع پہنچادی گئی تھی اور عارف والا سے نذیراں بی بی کے رشتے دار ضروری کارروائی کے بعد سوختہ لاش کو لے کر واپس چلے گئے تھے۔ بظاہر بات ختم ہوگئی تھی لیکن نجانے کیوں مجھے اس کیس کے حوالے سے بے چینی سی ہو رہی تھی۔ مجھے یہ بات اس طرح سے لگتی نہیں تھی جس طرح بظاہر یہ حادثہ ہوا تھا۔ کوئی خلش سی تھی جو رہ رہ کر مجھے بے چین کیے ہوئے تھی۔

کوئی ایسی گرہ تھی جو نظر نہیں آ رہی تھی لیکن حقیقت میں موجود تھی۔ میں نے کانسٹیبل فیاض کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ فوراً ہی حاضر ہوگیا۔

’’جی سر! آپ نے مجھے یاد کیا؟‘‘ فیاض نے سیلوٹ مارتے ہوئے پوچھا۔

’’فیاض! بیٹھو اور مجھے نذیراں بی بی سے متعلق جتنی بھی معلومات تمہارے پاس ہیں، سب بتاؤ۔‘‘ میں نے کہا۔

فیاض کافی عرصے سے اس تھانے میں تعینات تھا

اور پھر اُس کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ وہ بہت تیز طرّار اور چلتا پُرزہ قسم کا آدمی تھا اور مجھے امید تھی کہ وہ نذیراں بی بی کیس کی نادیدہ گرہ کھولنے میں میری ضرور مدد کرے گا۔

''سر جی!'' فیاض نے کہنا شروع کر دیا۔ ''کہتے ہیں کہ مرنے والے کی بُرائی نہیں کرنی چاہیے۔''

''تم حقیقت بیان کرو، گناہ ثواب کی پڑتال بعد میں ہوگی۔'' میں نے کہا تو اُس نے کہنا شروع کر دیا۔

''نذیراں بی بی آج سے کم و بیش پندرہ سال پہلے بیاہ کر عارف والا سے یہاں آئی تھی۔ وہ بڑی ہنس مکھ اور خوش اخلاق لڑکی تھی۔ بہت جلد ہی اُس نے اپنے حسن اخلاق سے پورے محلے والوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ اُس کا شوہر فیضو تیلی صبح سے شام تک اپنے کولھو پر مصروف رہتا تھا۔ گھر میں نذیراں اکیلی ہوتی تھی لیکن وہ کبھی پریشان یا افسردہ نہیں ہوئی تھی کیوں کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی محلے کی عورت اُس سے گپ شپ کے لیے موجود رہتی تھی اور تنہائی یا اکیلے پن والی کوئی بات نہ تھی جس سے نذیراں گھبرا جاتی۔

فیضو تیلی کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہ اس دنیا میں اکیلا تھا۔ نذیراں کے ساتھ اُس کا رشتہ کروانے والی اُس کی سوتیلی خالہ تھی جو کہ فیضو کی شادی کے ڈیڑھ سال بعد اللہ کو پیاری ہوگئی تھی۔

دونوں میاں بیوی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ شادی کے چار سال تک جب اُن کے یہاں کوئی امید نہ ہوئی تو فیضو اور نذیراں کو لوگ ''بانجھ'' کے طعنے دینے لگے۔ اُن دنوں نذیراں بہت گم صم اور افسردہ سی رہتی تھی۔ فیضو کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ وہ اُسے سمجھاتا۔

''دیکھو! لوگوں کی باتوں پہ دل چھوٹا نہ کرو۔ دنیا والوں کی زبان نہیں پکڑی جاسکتی ہے اور پھر ابھی تو ہماری شادی کو صرف چار سال ہی ہوئے ہیں، کون سا صدیاں گزر گئی ہیں۔ اللہ ہمیں بھی اولاد سے نوازے گا۔''

''لیکن آس پاس کی عورتیں مجھے تو طعنوں سے مارے ڈالتی ہیں۔'' نذیراں نے بے بسی سے کہا۔

''میں نے کہا ناں، ان کی باتوں پہ دھیان مت دیا کرو۔ دنیا کا تو کام ہی طعنے دینا ہے۔'' فیضو نے بیوی کو سمجھایا۔ ''ہم کسی اچھی سی ڈاکٹر کے پاس چلیں گے، تمہارے چیک اپ کے لیے۔''

ڈاکٹر کی رپورٹس بھی مثبت تھیں۔ دونوں میاں بیوی نارمل تھے۔ بس اللہ کی طرف سے دیر تھی، جو آخر تک رہی اور وہ لاولد رہے۔ آہستہ آہستہ محلے والے بھی نذیراں کو چھوڑ گئے۔ اب وہ سارا دن گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ لیکن پھر اُسے ایک سہارا مل ہی گیا عامر کی صورت میں، عامر کا تعلق بھی عارف والا سے تھا بقول نذیراں وہ اُس کا پھوپی زاد تھا۔

فیضو صبح سے شام تک اپنے کولھو پر مصروف رہتا تھا۔ عامر کے بارے میں اُسے بھی پتا چلا تھا کہ وہ رشتے میں اُس کا برادر نسبتی تھا۔ عامر اکثر اُن کے گھر آتا جاتا رہتا تھا اور ہر آٹھ دس دن بعد وہ لوگ عارف والا نذیراں کے میکے بھی جاتے تھے۔ عامر کے آ جانے سے نذیراں بھی خوش باش رہنے لگی تھی۔

وقت گزرتا رہا اور نذیراں کی شادی کو تیرہ سال کا عرصہ ہو گیا۔ فیضو بیمار پڑ گیا تھا۔ عامر اب بھی اُن کے گھر آتا تھا لیکن بہت کم۔ شنید تھی کہ اُس کی شادی ہوگئی ہے لیکن یہ کوئی حتمی بات نہیں تھی۔ فیضو تیلی کی بیماری نے ایسا طول پکڑا کہ وہ ٹھیک ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اپنا کولھو اُس نے ایک شخص کو کرائے پر دے دیا تھا۔ مسلسل تین چار ماہ بیمار رہنے کے بعد فیضو تیلی اللہ کو پیارا ہو گیا اور یوں نذیراں تنہا رہ گئی۔ لیکن یہ وہ نذیراں نہیں تھی جو آج سے چودہ پندرہ سال پہلے بیاہ کر یہاں آئی تھی۔ آج کی نذیراں بہت تیز طرار و چست چالاک تھی۔ وہ ڈری سہمی نذیراں نہ تھی بلکہ نڈر تھی۔

''ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ فیضو کے مرنے کے بعد عامر کو صرف ایک دفعہ اس علاقے میں دیکھا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی کو نظر نہیں آیا تھا۔''

کانسٹیبل فیاض خاموش ہو چکا تھا۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور سوچ میں کھو گیا۔

☆......☆

نذیراں بی بی والے حادثے کو چھ دن گزر چکے تھے، جب کانسٹیبل فیاض نے مجھے بتایا۔

''سر! یہاں سے تیسرے گاؤں میں ایک پاگل

عورت رہتی ہے۔ اُس کے متعلق اطلاع ہے کہ وہ آج سے پانچ چھ دن پہلے سے گھر سے غائب ہے اور اُس کے رشتے دار اُسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔'' میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔

''اُن لوگوں نے تھانے میں اطلاع کیوں نہیں دی؟'' میں نے پوچھا تو فیاض نے کہا۔

''سر! وہ عورت پہلے بھی کئی دفعہ گھر سے غائب ہوتی اور بازیاب ہوتی رہی ہے۔''

''اب شاید وہ نہ ملے'' میں نے خود کلامی کی تو فیاض چونک اُٹھا۔

''جی سر؟''

''فیاض! تم ایک کام کرو۔ ابھی اسی وقت عارف والا نکل جاؤ اور عامر سے متعلق معلومات اکٹھی کر کے لے آؤ۔'' میں نے فیاض سے کہا۔ وہ پُر جوش ہو گیا۔

''اوکے سر!'' اُس نے سیلوٹ مارا اور میری اجازت پا کر باہر نکل گیا۔

☆☆......☆☆

دوسرے دن سہ پہر کو فیاض لوٹا تو وہ بہت پر جوش دکھائی دے رہا تھا۔

''کیا بات ہے فیاض؟ بڑے نکھرے نکھرے لگ رہے ہو؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا تو وہ اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولا۔

''سر جی! آپ نے بھی واضح الفاظ میں نہیں بتایا لیکن اب مجھے بھی یقین ہو چکا ہے کہ نذیراں بی بی زندہ ہے اور قتل ہونے والی وہ پاگل عورت ہے۔''

''شاباش فیاض'' میں نے اُسے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ''اپنی ایسی ہی کارکردگی اور قابلیت کے بل بوتے پر تم بہت ترقی کرو گے۔''

''سر جی! آپ کی ذرہ نوازی ہے۔'' وہ سراپا انکسار بن گیا۔

اس کے بعد کی کہانی بڑی مختصر ہے۔ میں نے اپنی معلومات کی روشنی میں دو ٹیمیں تیار کیں اور دوسرے دن عامر اور نذیراں میرے سامنے زمین پر بیٹھے گڑگڑا رہے تھے۔ اُن کو تلاش کرنے والی ٹیم کا انچارج اے ایس آئی صفدر حسین جوئیہ تھا۔ یہ بھی میرے تھانے کا بڑا تیز اور جوشیلا پولیس والا تھا۔ بڑے بڑے نامی گرامی چور اور ڈاکو گرفتار کرنے میں میرا معاون رہا ہے۔

نذیراں بی بی کا پلان بڑا زبردست تھا۔ اُس کے ہتھے وہ پگلی عورت لگی تو اُس نے منصوبے کے تحت اُسے صندوق کے اندر بند کر کے بستروں کو آگ لگا دی تاکہ لوگ اُسے مردہ سمجھ لیں اور وہ اس علاقے سے دُور اپنے آشنا کے ساتھ زندگی کے مزے لوٹتی رہے لیکن سب کچھ ویسا تو نہیں ہوتا جیسا انسان کی خواہش ہو۔ وہ بھی بالآخر پکڑی گئی اور اُس نے قتل کا اعتراف بھی کر لیا۔

مزید تفتیش کرنے پر یہ انکشاف ہوا کہ فیضو تیلی کی موت کی وجہ بھی نذیراں اور عامر کی دوستی ہی تھی۔ اس سے جان چھڑانے کے لیے باقاعدہ منصوبہ تیار کیا گیا تھا در حقیقت اسے دوا کی صورت میں زہر دیا جاتا رہا تھا۔ فیضو کے عزیز واقارب نہ ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ دب گیا تھا لیکن پولیس کے تھرڈ ڈگری کے استعمال پر عامر نے تمام راز اُگل دیے تھے۔

نذیراں اس قتل میں عامر کو بھی اپنا شریکِ جرم ٹھہراتی تھی لیکن عامر اپنی جان بچانے کے لیے اس بات سے انکاری تھا۔ میں نے دونوں کے خلاف قتل کا کیس بنا کر چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ دونوں بے گناہوں کا خون انصاف کو راہ دکھانے میں معاون ثابت ہوگا۔

☆☆......☆☆

ٹیڑھی کھیر

ایک شخص نے پیدائشی نابینا شخص سے پوچھا۔ ''حافظ جی کھیر کھاؤ گے؟'' حافظ جی نے کبھی کھیر نہیں کھائی تھی پوچھا۔ ''کھیر کیسی ہوتی ہے؟'' اس شخص نے جواب دیا۔ ''سفید۔'' پوچھا۔ ''سفید کیسی ہوتی ہے؟'' اس شخص نے کہا۔ ''جیسا بگلا۔'' نابینا شخص تنگ آ چکا تھا۔ ہاتھ کو بگلے کی چونچ کی طرف سے اس نے انگلی کو ٹیڑھا کر کے کہا۔ ''ایسا۔'' وہ صاحب چونکہ پیدائشی نابینا تھے۔ انہوں نے دوسرے آدمی کے ہاتھ پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ ''یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے ہم سے نہیں کھائی جائے گی۔'' اس وقت سے ''ٹیڑھی کھیر'' ضرب المثل بن گئی۔ یہ ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کوئی کام دشوار اور کیا نہ جا سکتا ہو۔

مرسلہ: اشعر کاشف۔ اسلام آباد



ڈیلیٹ آپشن

روبینہ شاہین

کراچی سے ایک معصوم دوشیزہ کے بھیانک مستقبل کی تصویر

''رات کی تاریکی میں بادلوں کی لہروں میں ڈوبتا اُبھرتا چاند ایک جادوئی کھلانا لگ رہا تھا۔ بہت دیر سے وہ اپنی بیرونی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کا ہر رات کا یہی معمول تھا لیکن جن راتوں میں آسمان کا دامن چاند سے خالی ہوتا تو ماہ رخ اُداس ہو جاتی۔ آج جب اُس نے کھڑکی کھولی اور آسمان پر چاند تلاش کرنے لگی لیکن اس کی نگاہیں مایوسی کی تاریکی میں ڈوب گئیں۔

''نہ جانے یہ چاند کہاں چلا جاتا ہے؟ کیوں چل جاتا ہے؟'' لیکن ماہ رخ کو ان سب سوالوں سے کوئی دِلچسپی نہیں تھی۔ اُسے تو اچھا یہ لگتا تھا کہ چاند کچھ دنوں بعد واپس آجاتا تھا۔ بہت باریک اور خوب صورت ہو کر اور آسمان کو بھی دِلکش بنا دیتا۔

''ماہ رخ چلو جلدی سے کھڑکی بند کرو اور سو جاؤ۔'' اُس کو اس کی ماں کی یہ آواز اُس کے چاند نگر سے زمین پر لے آتی۔

وقت کے پرندے نے اُڑان لی اور ماہ رُخ اب شعور و شباب کی منزل پر آ پہنچی، لیکن وہ اب بھی بہت بھولی اور معصوم تھی۔ اُسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے گھر کی بیرونی کھڑکی کے سامنے لڑکے کھڑے ہو کر کیا کیا اشارے کرتے ہیں اور اسے دیکھتے ہی اُن کی آنکھوں میں چمک کیوں آجاتی ہے۔ اُن کے ذو معنی فقروں کے مفہوم سے وہ ناواقف تھی۔ اُسے تو رنگوں اور خوشبوؤں سے پیار تھا۔ اُسے تو اپنے گھر سے باہر کی دنیا دیکھنے کا بہت شوق تھا بالکل اسی طرح جیسے بچپن میں اُسے چاند کو چھونے اور اپنے کھلونوں کے ساتھ سجانے کی تمنا تھی۔ چاند سے وہ اُن دنوں بہت ساری باتیں کرنا چاہتی تھی تاکہ چاند کو بتا سکے کہ اُس کی کون سی سہیلی اُس سے ناراض ہو گئی۔ کس ٹیچر نے اُسے شاباش دی اور اس کی اسکول فیس لیٹ ہونے پر اسے سزا میں کھڑا رہنا پڑا۔ اُس کی مما کھلونوں کی دکانوں اور آئس کریم پارلر کے سامنے سے اُسے تیزی سے لے کر کیوں گزرتی ہیں اور اسے آئس کریم پارلر میں آئس کریم کیوں نہیں کھلاتیں، بس عید۔ بقر عید پر ہی اُسے یہ موقعہ ملتا جب اُس کا ننھا سا ستاروں والا پرس عیدی کے پیسوں سے بھرا ہوتا اور اس پر بھی اُسے مما کی ڈانٹ کھانا پڑتی۔ لیکن آئس کریم کھانے کے لیے تو وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ یہ اور ایسی بہت ساری باتیں چاند سے شیئر کرنا چاہتی تھی لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ اُدھر چاند چمکتا اور اس کی مما جویریہ بیگم مچھروں کے ڈر سے کھڑکی پر دبیز پردہ کھینچ دیتیں اور چھت پر جانے کی اُسے اجازت نہیں تھی کیوں کہ رات کو چھت پر جانے سے لڑکیوں پر سایہ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اُس کی مما کا فرمان

تھا اور وہ بھی ان باتوں کو سچ ماننے لگی تھی اس لیے خوف زدہ ہو کر اپنے کمرے میں چھپ جاتی۔ لیکن چاند کا سحر اُسے اپنی طرف کھینچ لیتا اور وہ ماں کی نظر بچا کر چاند کو ضرور دیکھتی۔ کبھی اپنے کمرے کی کھڑکی کے دبیز پردے ہٹا کر، کبھی چپکے سے چھت پر جا کر۔

''ایک تو رات کا وقت اور تم چھت پر کھڑی چاند دیکھ رہی ہو۔ کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ لڑکیوں پر سایہ ہو جاتا ہے اور پھر ہمارا گھر بھی ایسی جگہ ہے جہاں ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ دائیں بائیں ہر طرف دکانیں ہیں، تمہیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہے کہ تم اب بڑی ہو رہی ہو۔ باپ تمہارے سر پر نہیں ہے۔ لوگ ایسی لڑکی کو کن نگاہوں سے دیکھتے ہیں تم نہیں جانتیں، چلو نیچے اور سیدھی اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔'' بیگم جویریہ کی آواز و لہجہ کرخت تھا وہ حکم دیتی ہوئی ایک شاہانہ اُدا سے اپنے کمرے کی جانب چلی گئیں۔

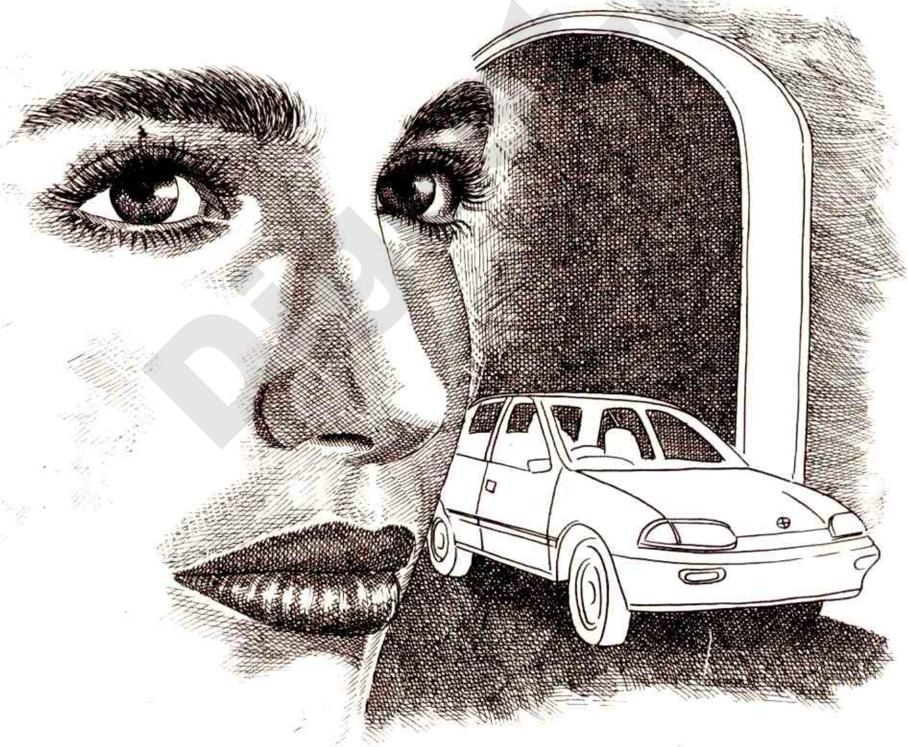
''یہ گھر میں نے اپنی مرضی اور پسند سے تو اس جگہ پر نہیں بنوایا۔ بلاوجہ مجھ پر ہی ناراض ہوتی ہیں۔ پپا اگر اس دنیا میں نہیں رہے تو میرا کیا قصور ہے؟''

نا چاہتے ہوئے بھی وہ زیر لب اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے بیڈ کور کی شکنیں دُرست کرنے لگی۔

☆......☆

ایک دن اسکول سے گھر آتے ہوئے لڑکے نے اُسے دیکھ کر گندا سا فلمی گانا گاتے ہوئے اُس سے بھی گندا اشارہ کیا تو نا سمجھنے کے باوجود بھی اُسے اچھا نہیں لگا اور گھبرا کر تیز تیز قدموں سے چلنے لگی لیکن اُسے اپنی رفتار سے زیادہ تیز بہت سارے قہقہوں کی آوازیں آئیں جو گھر میں داخل ہونے کے بعد اُس کے کانوں میں گونجتی رہیں۔

وہ تمام دن اُن نامعلوم اشاروں گانے کے گندے



بولوں اور قہقہوں کا مفہوم جاننے کی کوشش میں لگی رہی اور جب اُس نے اپنی سہیلی کے گھر اُس فحش گانے کی ویڈیو دیکھی تو اس گانے کے بولوں کا مطلب بہت اچھی طرح سمجھ آ گیا۔

☆......☆

اسکول سے واپسی پر آج پھر وہی لڑکا ماہ رخ کے تعاقب میں تھا۔ آج اُس لڑکے نے فلمی اسٹائل میں اپنے بال بنانے سے زیادہ بگاڑے ہوئے تھے۔ ماہ رُخ کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک پرچہ اُسے دے کر چلا گیا اور وہ اس لڑکے اور اس کے دیے ہوئے پرچے کو دیر تک دیکھتی رہی اور پھر اپنے گھر کی جانب چل پڑی۔

ماں کو سلام کرتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''ماہ رُخ جلدی یونیفارم چینج کرو اور سلاد بنالو کھانا تیار ہے۔ میں دسترخوان لگا رہی ہوں۔'' ماں نے حسبِ معمول نادر شاہی حکم دیا۔

''آئی مما'' ماہ رُخ نے کہا اور تیزی سے کچن میں چلی گئی۔

نامعلوم کیا جذبہ تھا، کون سا احساس تھا جو اُسے بے چین کر رہا تھا۔ شاید پہلی محبت کی خوشبو موسم کی پہلی بارش کی طرح اس کے وجود کو سرشار کر رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں رومنٹک فلموں کے گانے گردش کر رہے تھے مگر ایک انجانا سا خوف اُس کا دامن تھام لیتا۔ اُسے یہ باور کراتا کہ محبت وہ آگ ہے جو جلا کر ختم کر دیتی ہے اور اگر جلا نہ سکے تو رسوائیوں کے گرداب میں لے جاتی لیکن اُس لڑکے کے دیے ہوئے پرچے پر لکھے اشعار نے ایسا سحر طاری کیا کہ وہ پور پور چاہتوں کے رنگین طوفان میں ڈوب گئی۔

اُس لڑکے نے اپنا موبائل نمبر بھی اس پرچے میں لکھا تھا، وہ لائٹ جاتے ہی یوں ہی بے وجہ کھڑکی کھول کر سامنے کا منظر دیکھ رہی تھی کہ وہی لڑکا کھڑا نظر آیا اسے دیکھ کر وہ مجسمے کی طرح ساکت ہوگئی اور وہ نا جانے اشاروں اشاروں میں کیا کچھ کہتا رہا۔ ماہ رُخ کو کچھ خبر نہ ہوئی۔

''کیا ہے یہ سب کچھ؟ بند کرو یہ کھڑکی۔'' جویریہ بیگم کی زوردار آواز ماہ رُخ کے کانوں سے ٹکرائی اور ایک زوردار دھپ پیٹھ پر پڑی۔

''کچھ نہیں میں تو چاند کو دیکھ رہی تھی۔'' ماہ رخ نے جواب دیا۔

''معلوم ہے مجھے لیکن دیکھا تھا کتنا عجیب سا لڑکا تھا اور تمہیں کیسے گھور گھور کے دیکھ رہا تھا۔''

''لیکن مما لائٹ جانے کے بعد اسی کھڑکی سے ہوا کا گزر ہوتا ہے، ورنہ تو گھٹن سے دم ہی نکل جائے۔ لائٹ بھی نہیں ہے اور کھڑکی بھی آپ نے بند کر دی ہے۔ لگتا ہے میرا تو دم ہی گھٹ جائے گا۔''

''دم گھٹے یا جان نکل جائے۔ کھڑکی نہیں کھلے گی۔'' جویریہ بیگم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ بہت دیر تک موبائل ٹیکسٹ پڑھتی رہی۔ اُسے اپنی تصوراتی دُنیا کے چھن جانے کا بہت دُکھ تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اسی چاند نگر سے اُس کے خوابوں کا شہزادہ رتھ پر سوار ہو کر اُسے لینے آئے گا اور اسے چاند نگر کی سیر کرائے گا۔

''کہیں میرا چاند نگر کا شہزادہ میرا تعاقب کرنے والا اور مجھے کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر گھورنے والا یہی اجنبی لڑکا تو نہیں؟ مجھے تو اُس کا نام بھی نہیں معلوم اور مما!! نہیں بھئی'' میں مما سے کیسے کہوں گی کہ آئی ایم اِن لو۔'' انہی سوچوں میں اُلجھتے سلجھتے وہ سوگئی۔

☆......☆

''میری بات غور سے سنو! سیدھی اسکول جاؤ اور سیدھی گھر آنا، یہاں وہاں کھڑے ہو کر سہیلیوں سے باتیں مت کرنا۔''

ماہ رُخ کو ماں نے سختی سے ہدایت کی۔

''جی مما میں سیدھی گھر آؤں گی۔ یُو ڈونٹ وری۔''

''ماہ رُخ کل تمہیں کسی لڑکے نے کوئی لیٹر دیا تھا؟'' اُس کی اسکول فرینڈ شیزا نے پوچھا۔

''نہیں وہ ہاں!! لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' ماہ رُخ نے بڑی مشکل سے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''ارے تم ڈر کیوں رہی ہو۔ جس لڑکے نے تمہیں لیٹر دیا ہے اُس کا نام شاہ زیب ہے اور وہ میرا کزن ہے۔ اُسے تم بہت اچھی لگتی ہو۔ وہ تمہیں چاہنے لگا ہے۔ تم اُسے کال یا ٹیکسٹ میسج تو کرو۔'' شیزا نے اُسے مشورہ دیا۔

''نہیں مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ میری مما بہت

زلزلے کیوں آتے ہیں

بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ زلزلہ کیا ہے اور کیوں آتا ہے۔ آتش فشاں پہاڑ سے جو گرم مادہ نکلتا ہے اسے لاوا کہتے ہیں۔ یہ گرم سیاہ مادہ ہے جو زمین کی اوپری سطح سے بہت نیچے مختلف مادوں اور گیسوں کے ملاپ سے بنتا ہے۔ زیر زمین یہ مواد ادھر ادھر گردش کرتا رہتا ہے اور جہاں کہیں زمین کی اوپری سطح کمزور ہوتی ہے وہاں سے باہر نکل آتا ہے۔ اس کی وجہ سے زمین ہلتی ہے جسے ہم زلزلے کا نام دیتے ہیں۔ آج ہم جتنے بڑے پہاڑی سلسلوں سے واقف ہیں وہ سب آتش فشاؤں کے پھٹنے سے ہی وجود میں آئے۔ پہاڑ دراصل لاوا ہے جو خشک ہوگئے ہیں، قدیم زمانے میں لوگوں کا خیال تھا کہ زمین ایک بہت بڑے بیل کے سینگوں پر رکھی ہے اور ایک وقت میں بیل زمین کا سارا بوجھ ایک سینگ پر اٹھاتا ہے اور جب تھک جاتا ہے تو زمین کو دوسرے سینگ پر منتقل کردیتا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے زلزلہ آتا ہے۔ تاہم اب سائنس نے واضح کردیا ہے کہ زلزلے آنے کی اصل وجہ لاوا اور گیس ہی ہیں۔

مرسلہ: نورالعین۔ راولپنڈی

سخت ہیں۔''

''اوہو یہ کون سی نئی بات ہے؟ ماں باپ تو کسی کے بھی یہ نہیں کہتے کہ جا بیٹی تو عشق عشق کھیل۔ اس کے لیے خود میں ہمت پیدا کرنا پڑتی ہے۔''

''نہیں ہے مجھ میں ہمت میری ممّا سیل فون چیک کرتی ہیں اور بیلنس بھی ممّا کو ہی کرانا ہوتا ہے۔''

''بیلنس کی تم فکر نہ کرو۔ وہ تمہارے موبائل پر شاہ زیب کرادے گا اور موبائل چیک ہوتا ہے تو اس کے لیے ڈیلیٹ آپشن استعمال کرو جاؤ اب اسے کال کرو ٹیکسٹ کرو اور ہاں ''ڈیلیٹ آپشن'' یاد رکھنا۔'' شیزا نے بڑے معنی خیز انداز میں ایک آنکھ بند کرتے ہوئے کہا۔

☆......☆

اب موبائل پر لمبی لمبی باتیں ہونے لگیں، ڈیلیٹ آپشن کا بھرپور استعمال ہونے لگا، جب تشنگی اور بڑھی تو بات ملاقاتوں تک پہنچ گئی۔ کوچنگ سے ماہ رُخ جلدی چھٹی لیتی اور پھر شاہ زیب کے ساتھ شہر کی شاہراہوں پر نکل جاتی۔

''تم آج آرہی ہو نا'' موبائل ٹیکسٹ میں شاہ زیب نے پوچھا۔

''کہاں اور کب آنا ہے؟'' ماہ رُخ ٹیکسٹ میں پوچھا۔

''نیا آئس کریم پارلر ہے نا، وہاں شام میں آجاؤ۔ بہت ہی زبردست اور رومینٹک ماحول ہے۔''

''ٹھیک ہے میں آجاؤں گی۔'' جواب دیا گیا۔

''ممّا میں عرشی کے گھر جارہی ہوں۔ اُس سے نوٹس لینا ہیں۔''

''شام کے وقت مجھے اچھا تو نہیں لگ رہا اس طرح تمہارا جانا، ذرا سی بھی اونچ نیچ ہوجائے تو ہمارا معاشرہ عورت کو معاف نہیں کرتا۔ ہم عورتوں کے پاس ایک عصمت وعفّت ہی تو ہوتی ہے جو بہت قیمتی ہوتی ہے۔''

''ممّا اب یہ عفت اور عصمت تو کوئی اپنی بچیوں کے نام بھی نہیں رکھنا۔ مجھے دیر ہورہی ہے واپس آکر تفصیل سے آپ کی یہ ساری باتیں سنوں گی بھی اور نوٹ بھی کرلوں گی او کے بائے۔'' ماہ رُخ نے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور گھر سے باہر چلی گئی۔

''آج ماہ رُخ کا لہجہ بہت اجنبی تھا۔ اس سے پہلے اُس نے اس انداز اور لہجے میں بات نہیں کی۔ مجھے تو اس کے بدلے ہوئے انداز نے ڈرادیا ہے۔ کہیں کوئی بند دروازوں میں نقب تو نہیں لگا رہا...... میں بھی نا جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہوں، کیسے کیسے وہم مجھے ڈراتے ہیں۔'' اپنے ذہن میں آنے والے خیالات سے پہلو بچا کر وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئیں۔

☆......☆

"ارے تم آ گئیں! میں سوچ رہا تھا کہ تم آؤ گی یا نہیں؟"
"تم نے بلایا تھا، تو کیسے نہ آتی۔" ماہ رُخ نے شاہ زیب کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"یہ انڈر میٹرک لڑکی اتنی بہادر کیسے ہوگئی۔"
"یہ سب تمہاری محبت کا کمال ہے اور کچھ نہیں۔" شاہ زیب کے سوال پر وہ مسکرا کے بولی۔
"آئس کریم تمہیں بہت پسند ہے نا۔ آؤ اندر چلو آج میں جو آئس کریم تمہیں کھلاؤں گا، وہ تم نے کبھی نہیں کھائی ہوگی۔ اب چلو ہم اس پیار بھرے ماحول میں کھو جائیں۔" شاہ زیب نے بڑے فلمی انداز میں ماہ رُخ کا ہاتھ تھام لیا۔ نیم تاریک کمرہ، ریشمی پردوں کی سرسراہٹ اور پھر اس ماحول کی سحر انگیزی...... وہ کچھ ہوگیا جس کا تصور بھی شرمناک تھا۔
"یہ سب اچھا نہیں کیا تم نے شاہ زیب۔"
"تم بلاوجہ پریشان ہو رہی ہو، کچھ بھی تو نہیں کیا۔ بس تھوڑا رومانس ہی تو کیا ہے۔" مجھے تو اس ماحول میں یہ سب کچھ بہت اچھا لگا۔ ابھی میں آئس کریم آرڈر کرتا ہوں۔"
"نہیں کھانا مجھے آئس کریم تمہاری یہ حرکت مجھے بالکل پسند نہیں آئی۔"
"کیا حرکت؟ کون سی حرکت؟ تو تم یہاں آئی کس لیے تھیں۔ اب تم اتنی نا سمجھ بھی نہیں ہو کہ اس قسم کے پارلر میں آنے کا مقصد نہ سمجھ سکو اور تم یہاں اپنی مرضی سے آئی ہو۔ اب ایسا کیا ہوگیا۔ یہ سب کچھ عام سی تفریح اور رومانس ہے۔"
"لیکن میرے لیے یہ سب کچھ عام نہیں ہے اور نا میں ایسی لڑکی ہوں۔"
"اوہو! واقعی تم ایسی نہیں، ویسی لڑکی ہو اس لیے تو میرے ساتھ یہاں اس نیم تاریک ماحول میں بیٹھی ہو! تم کو تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ جب تمہاری یہ رومانٹک ویڈیو نیٹ کے ذریعہ بے شمار لوگوں تک پہنچے گی تو تم کتنی فیمس ہو جاؤ گی۔"
"اوہ گوڈ! کیا تم نے ویڈیو بنائی ہے اور یہ سب کچھ نیٹ پر...... نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔" ماہ رُخ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ آواز گلے میں گھٹ رہی تھی۔

"جی میں بالکل ایسا کر سکتا ہوں۔ اس کام کے تو ہمیں پیسے ملتے ہیں۔ اب تم جا سکتی ہو، ہاں اگر کچھ پیسوں ویسوں کی ضرورت ہو تو چلی آنا۔ میں نئے نئے اینگلز اور خوب صورت انداز سے کچھ اور ویڈیوز بنا کر نیٹ کے سپرد کر دوں گا اور پھر شاید تمہیں کچھ اور نئے کلائنٹ بھی مل جائیں۔ یوں یہ سلسلہ چل پڑے گا۔" اس نے بڑی مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
"تم سے زیادہ ذلیل اور بے غیرت انسان میں نے نہیں دیکھا۔ اگر شیزا تمہاری کزن کے ساتھ ایسا ہوتو کیا کرو گے۔"
"وہ میری کزن نہیں ہے بلکہ ہمارے گروپ کے لیے کام کرتی ہے، سمجھیں!"
"تم بہت شاطر اور بے ضمیر انسان ہو۔"
"او یو آر ویری ٹرو بے بی۔" اُس نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔
ماہ رُخ اس نیم تاریک ماحول سے باہر آئی تو سب کچھ بالکل معمول کے مطابق تھا۔ سڑک اُس پر چلتا ٹریفک، آتے جاتے لوگ۔
سب کچھ ترتیب کے مطابق رواں دواں تھا، اگر کچھ بے ترتیبی تھی تو ماہ رُخ کی زندگی میں تھی اور اس بے ترتیب زندگی میں شامل رسوائی کو کوئی چار دیواری نہیں چھپا سکتی تھی کیوں کہ وہ بے سائبان ہو چکی تھی۔
"مما تو ویسے ہی یہ سب سن کر مر جائیں گی نہیں میں اب گھر نہیں جاؤں گی، اب میری دنیا کوئی اور ہے۔"
اور ماہ رُخ ایک ایسے راستے کی جانب چل پڑی جہاں وہ اپنی رُسوائیوں کا انتقام اس معاشرے سے لے سکتی تھی کیوں کہ اب اس کی معصومیت اور پاکیزگی کی اس معاشرے اور اس کے بدکردار لوگوں کو ضرورت نہیں تھی تو پھر وہ کیوں نا ان نیم تاریک کمروں میں گم ہو جائے۔
آج ماہ رُخ کو یہ حقیقت معلوم ہوگئی تھی کہ چاند کی روشنی فریب ہے وہاں صرف اور صرف تاریکی ہے اور چاند میں جو داغ ہے وہی داغ عورت کے دامن پر لگ جائے تو کوئی ڈیلیٹ آپشن کام نہیں آتا۔ صرف داغ رہ جاتا ہے اور سب کچھ کھو جاتا ہے۔

☆☆......☆☆

پلیٹ فارم

اسٹیشن پر جنم لینے والی کہانیاں........
جن میں جدائی اور ملن کی وصل بھی شامل ہے

قاتل حسینہ

کاشی چوہان

اِک حسینہ کی چالاکی اور سنگ دلی سے پیوستہ ایک سفاک تحریر

وہ دسمبر ہی کی ایک سرد رات تھی، جب وہ مجھے چنیسر ہالٹ کے ریلوے اسٹیشن کے ٹکٹ گھر کے سامنے بنے ہوئے ویٹنگ روم کے ایک کونے میں کھوئے میں کھڑی، ٹھٹھرتی ہوئی چپکی کھڑی ہاتھ میں ایک چھوٹی سی صندوقچی پکڑے کھڑی تھی جس کے اوپر سیاہ رنگ کا کپڑا پڑا ہوا تھا۔ غالباً یہ صندوقچی پوش تھا یا پھر......

یہ ان دنوں کی بات ہے، جب یہ اسٹیشن اپنے پورے جوبن پر تھا اور دن بھر یہاں لوگوں کی چہل پہل رہتی تھی، لیکن رات ہوتے ہی یہ سناٹے میں ڈوب جاتا تھا اور رات کی تاریکی میں یہاں صرف اس کے قریب ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ایک بڑے رقبے پر سیوریج کا پانی پھیلا ہوتا تھا، جس میں نرسل کا جنگل اُگا ہوا تھا جو ماحول میں اور بھی وحشت پیدا کرتا تھا۔ ہوا سے لہراتے سرسراتے ان نرسل کے درختوں سے عجیب سی آوازیں پیدا ہوتی تھیں۔ رات کی تاریکی میں صرف یہی پانی چمکتا ہوا نظر آتا تھا یا پھر دور کہیں اسٹیشن پر ایک چھوٹا سا لگا بلب ٹمٹا ہوا زرد روشنی بکھیرتا نظر آتا تھا۔ یہاں دن میں چٹنی چورن بیچنے والے بنگالی بابو، مینڈک کے بچے اس پانی میں پکڑتے نظر آتے تھے یا پھر بچے جال لیے پانی میں گھومتے تھے، غالباً ان کی نظر میں یہ مچھلی کے بچے تھے اور رات میں یہاں منشیات فروشوں اور نشہ کرنے والوں کا ڈیرہ ہوتا تھا۔ یہ علاقہ آج بھی منشیات فروشوں کی گرفت میں ہے۔ ایسے میں اس ٹھٹھرتی سرد رات میں یہ نقاب پوش حسینہ سیاہ برقعے میں ملبوس، تاریک رات میں اور بھی......

''اُف خدایا! اس سردی میں یقیناً یہ کوئی بھتنی ہے یا پھر چڑیل......'' میرے دل نے ایک دم سے گواہی دی اور بڑے ہی شدّ ومد سے مجھے اپنے دل کی شہادت ملی، لیکن نہ جانے کیوں ایک دم میرے دماغ میں آیا کہ......
خوف اور وحشت دونوں میرے دل و دماغ کا حصہ تھے، لیکن اکیلی عورت کو دیکھ کر میرا دل کچھ مجھ سے کہہ رہا تھا، لیکن میری ہمت تھی کہ......

پھر ایک دم میرے اندر کی مردانگی جاگی، مگر......اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا ایک مترنم آواز میرے کانوں میں پڑی......آواز تھی کہ بس......دل میں اُترتی چلی گئی اور میں سب کچھ بھول کر اس آواز کی چاشنی میں گھو گیا۔
''ایکسیوزمی۔'' میرے خیال کی بھتنی کی آواز نے یہ تصور ختم کر دیا کہ وہ......اب پھر میرے دل نے گواہی دی۔ ''نہیں یار......یہ نہ تو کوئی بھتنی ہے اور نہ ہی چڑیل......بھلا اتنی نرم و نازک، اتنی شیریں آواز بھلا

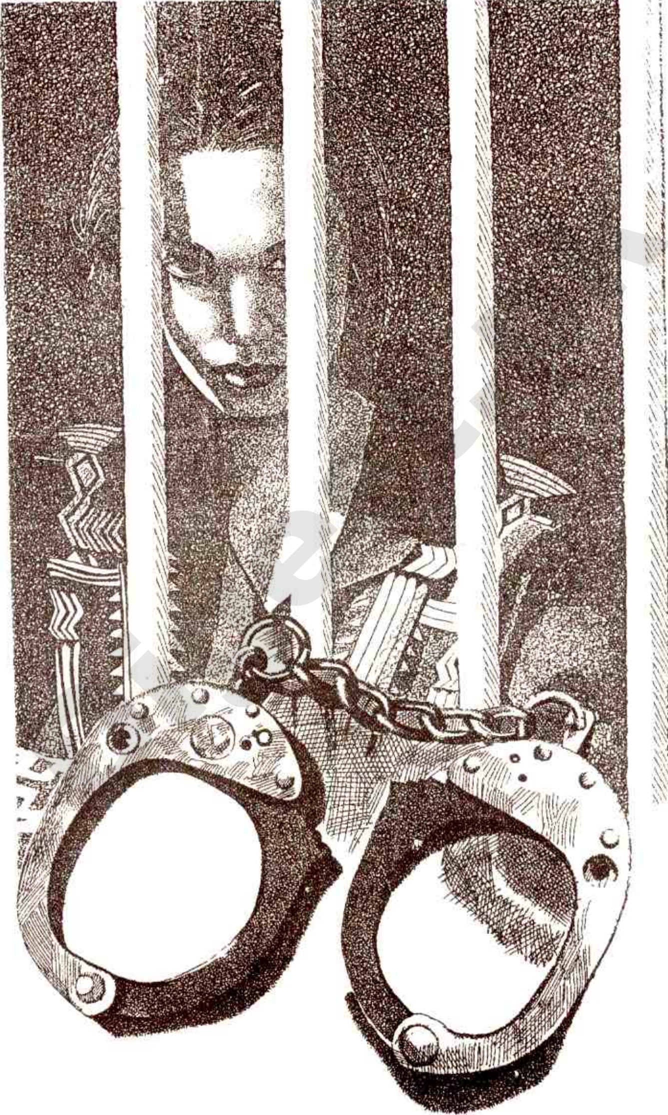
بھتنی کی کیسے ہوسکتی ہے۔'' پھر میرے قدم ازخود اس سکڑے سمٹے وجود کی جانب اٹھ کھڑے ہوئے۔

''جی فرمایئے محترمہ! آپ نے مجھ سے کچھ فرمایا۔''

میں نے اس کے قریب جاکر بڑے شگفتہ لہجے میں دریافت کیا۔

میری بات کو توجہ سے سننے کے بعد اس نازک اندام حسینہ نے بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''و......وہ...... مجھے یہاں کوئی ہوٹل وغیرہ رات



گزارنے کے لیے مل سکتا ہے۔"

"ہوٹل۔" میرے منہ سے ایک دم نکلا...... اور پھر میں نے اسے یوں دیکھا، جیسے اس کے وجود سے انکاری ہو رہا ہوں۔ اب میری نظر میں تفتیش تھی۔ پھر میں نے اس کے سراپا کا بھرپور جائزہ لیا۔ سرتاپا اس کے ایک ایک عضو کا جائزہ لیا۔ سڈول جسم، نکلتا ہوا قد، کمر پتلی مگر کولہے بھاری اور جسم گوشت سے پُر۔ برقع کی فٹنگ نے اس کے جسم کے اَنگ اَنگ کو نمایاں کر دیا تھا۔ اس قیامت کو دیکھ کر ایک مرتبہ پھر میرے دل نے گواہی دی۔ "پیشہ"، "فتنہ" کسی کا قتل کرنے نکلی ہے یا کوئی گاہک تلاش کر رہی ہے۔"

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں صرف دو سیاہ سرمگیں آنکھیں نظر آئیں، جن میں معصومیت کے ساتھ خوف کی جھلک نمایاں تھی، ساتھ ہی التجا بھی...... اس کے باوجود اس کے نرم و گلابی سراپے نے میری نیت خراب کر دی تھی اور اس سرد رات میں میرے من میں بھی گرم گرم حدّت و شدّت کے سوتے پھوٹنے لگے تھے۔

"ہوٹل، ہی کیوں؟" میں اپنے دل میں دبی ہوئی خواہش کو آہستہ سے زبان پر لایا۔

"رات میں کہاں بسر کروں گی...... میرا تو یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے سہمے ہوئے لہجے میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"آہا...... مزا آ جائے گا یار۔ اگر یہ......" ایک دم میرے دل نے شور مچانا شروع کر دیا۔

"دیکھیے محترمہ نقاب پوش! اگر آپ کا تعلق اس شہر سے نہیں ہے تو آپ کو کسی کی ضمانت پر کمرہ دیا جائے گا۔ اچھا لائیے آپ اپنا شناختی کارڈ دیجیے، میں کوشش کرتا ہوں، آپ کی قسمت اگر......"

میں نے اس کی دُکھتی رَگ پر ہاتھ رکھا۔ مجھے اچھی طرح سے علم تھا کہ وہ بھلا کیوں کر شناختی کارڈ پاس لیے گھومے گی۔ ویسے بھی اس قماش کی عورتیں ایسی کوئی نشانی جس سے ان کی اصلیت کا پتا چل سکے، ساتھ لے کر نہیں گھومتیں۔ میرا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھے گا، مجھے اس کا سو نہیں بلکہ دو سو فیصد یقین تھا۔

"جی......" وہ ہکلائی۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ شناختی کارڈ دیں گی تو......"

"وہ بات یہ ہے کہ......" وہ کچھ گربڑا سی گئی۔

"جی بتائیں! میں سن رہا ہوں۔"

"وہ کہیں گر گیا ہے...... ابھی نہیں...... میرا مطلب ہے کہ وہ چھ سات مہینے قبل کالج سے آتے ہوئے کہیں گر گیا تھا۔...... اور پھر میں نے......" وہ میری طرف معصوم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اچھا اچھا، اوکے...... اوکے...... پھر بتائیے، اب میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

"میرے پاس یہ سونے کے چار کنگن ہیں...... یہ بڑے بھاری اور خاصے موٹے موٹے ہیں۔ اچھی خاصی مالیت ہے ان کی...... یہ لیں، آپ دیکھ لیں انہیں۔" میں جواب تک اس کے جسم کا پوسٹ مارٹم اپنی نگاہوں سے کر رہا تھا، اس کی بات سن کر چونکا......

"ہاہا...... ہا...... یار یہ تو آئٹم ہی بہت ٹائٹ ہے اور پھر اسامی بھی تگڑی ہے...... واہ رے واہ......" میرا دل خوشی سے ناچنے لگا تھا، وہ ایک دم مور بن گیا تھا۔

"مگر یہ اس وقت ہیں کس کام کے؟ اس سرد رات میں سنار کی دکان کہاں؟ پھر آپ کی کوئی شناخت نہیں...... یہ موٹے موٹے کنگن آپ اپنے ہی پاس رکھیے...... اور اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو......"

"ٹھیک ہے جی مجھے منظور ہے۔" وہ میری بات پوری سنے بغیر ہی راضی ہوگئی۔ میرا تو بس ہی نہیں چل رہا تھا کہ میں اس موٹے موٹے کنگن والی نقاب پوش حسینہ کو اڑا کر اپنے دوست شہباز کے اس فلیٹ پر پہنچ جاؤں، جس کا میں چوکیدار تھا...... ارے...... ارے...... یہ آپ کیا کر رہے ہیں...... بھئی آپ چوکیدار سے مراد وہ نہ لیں جو گن کندھے پر ڈالے چوکیداری کرتا ہے، بلکہ میں تو اس کے آسٹریلیا جانے کے بعد اس کے فلیٹ "ہیون ویلی" بی 211 میں پورے استحقاق کے ساتھ اس کے محبت بھرے اصرار پر یہاں براجمان تھا، جبکہ میرا گھر بھی اس روشنیوں بھرے شہر میں ہے اور اکثر میرا ویک اینڈ اسی فلیٹ میں موج مستی کرتے گزرتا ہے۔ آج بھی

ویک اینڈ ہی تھا اور میری موج لگنے والی تھی، ایک مست مست دوشیزہ کے ساتھ...... آج ہی میری بائیک کے انجن میں مسئلہ ہوا تھا اور میں اسے دوسرے دن کے وعدے پر اپنے میکینک کے حوالے کر کے آ رہا تھا کہ اس قیامت سے ٹاکرا ہو گیا۔

☆......☆......☆

ہم فلیٹ میں پہنچ چکے تھے۔ اس وقت ٹھنڈ بھی بڑھ چکی تھی اور تاریکی بھی۔

''آپ اپنا سامان یہاں رکھ دیں۔'' میں نے اس سے کہا...... میں تو اس گلاب کو نچوڑ لینے کے لیے بے تاب تھا۔ وہ بھی کوئی شریف زادی نہیں تھی، پوری کی پوری گھنّی تھی...... مگر فی الحال اس وقت تو دلی آرام کو آہستہ آہستہ رام کرنا تھا۔

اس نے بیڈ روم سے ملحقہ اسٹور کے باہر چپلیں اتاریں اور پھر وہیں دروازے کے قریب ہی اپنی صندوقچی رکھ دی، جس پر سیاہ کپڑا ڈھکا ہوا تھا۔

''Be Relax Miss، یہاں دوسرا کوئی نہیں ہے مردوں میں۔ آپ تسلی سے اپنا سامان رکھ دیں کہیں بھی۔'' مجھے اس کی احتیاط پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''نہیں بس یہیں ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔

میں نے زیادہ پس و پیش نہ کی۔ ''جیسی آپ کی مرضی۔''

وہ اب اپنے برقع کے بٹن آہستہ آہستہ کھول رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے دستانے اتار لیے تھے۔ اس کی مخروطی انگلیاں میرے جسم پر آرے چلا رہی تھیں۔ اب میرے صبر اور قہر کا امتحان تھا۔ میری نظریں......

''آپ فریش ہو جائیں۔'' میں نے اسے واش روم کا گیٹ بتایا۔

''جی شکریہ۔'' اور وہ واش روم میں چلی گئی اور میں کچن میں...... شکر ہے چائے کے لوازمات موجود تھے۔ کافی بھی تھی اور کولڈ ڈرنک بھی...... میں نے جان گرماتے ہوئے صرف چائے بنالی اور بیڈ روم میں چلا آیا...... اندر سے مسلسل شاور سے پانی کے گرنے کی آوازیں مجھے بے قابو کیے دے رہی تھیں اور میں اس کے ساتھ گزرنے والے حسین لمحات کے تصور میں بیڈ پر بیٹھے ہی بیٹھے ٹن ہونے لگا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں دودھ ملائی کے ساتھ جنت کی سیر کر رہا ہوں اور پھر جیسے میں سکون کی آخری حدوں پر پہنچ گیا۔

☆......☆......☆

''ہاں جی مسٹر اکبر! بتاؤ تم نے اس رات اپنے اوپر والے فلیٹ میں کیا دیکھا۔'' پولیس افسر نے AN-100 فلیٹ 7 کے رہائشی اکبر علی سے سوال کیا۔

''جناب عالی! اوپر والے فلیٹ کی سیوریج لائن لیک ہے، وہ جب بھی پانی گراتے ہیں تو وہ میرے باتھ روم کی کھڑکی پر گرتا ہے۔ میں نے انہیں بارہا کہا، مگر وہ اس جانب توجہ ہی نہیں کرتے۔ اس رات بھی پانی بہت زیادہ گر رہا تھا تو میں شکایت کرنے اوپر والے فلیٹ میں گیا تھا مگر...... مگر...... جب میں اوپر پہنچا تو فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے شاور سے پانی گرنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی اور سامنے ہی بیڈ پر ایک لاش خون میں لت پت......''

''آپ نے اندر فلیٹ میں کسی کو دیکھا؟''

''جی نہیں، میں خوف کے مارے دروازے سے ہی واپس......''

''اچھا آس پڑوس۔'' اکبر علی نے پولیس افسر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''آس پڑوس کے فلیٹ میں تالے لگے ہوئے تھے۔ اس لیے میں''

''اچھا ٹھیک ہے...... جب تک قاتل کا سراغ نہیں مل جاتا آپ شامل تفتیش ہیں۔ آپ بغیر ہمیں اطلاع کیے شہر سے باہر نہیں جا سکتے۔ او کے مسٹر...... اوئے محمد رفیق...... اس کا بیان ریکارڈ کرو اور اس کی NIC کی کاپی ریکارڈ پر لگاؤ۔ اس کا انگوٹھے کا نشان بھی لو اور اس پر کڑی نظر رکھو۔''

''مم...... مم...... مگر...... میں تو جناب۔'' اکبر علی گھگھیائے۔

''کچھ نہیں جی بس میں نے کہہ دیا۔ جب تک مجرم نہیں پکڑا جاتا...... تم......'' پولیس افسر نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اکبر علی کو اپنا فیصلہ سنایا۔

☆......☆......☆

ہیون ویلی میں پراسرار قتل کے بعد کافی ہلچل مچی ہوئی تھی، پھر اخبارات نے بھی اس خاموش قتل کو شہ سرخیاں بنائی تھیں۔ فلیٹ کے لوگ ایک دوسرے سے حقیقت جاننے کے خواہاں تھے مگر یہاں تو سب کی حالت ایک جیسی تھی۔ سارا دن مردوزن کا اسی بحث میں گزرا کہ یہ قتل کس نے، کیوں اور کیسے کیا؟ رات کافی گزر چکی تھی کہ اچانک......

''سنیے! مجھے آج رات گزارنے کے لیے کوئی جگہ مل جائے گی۔''

ٹکٹ گھر کا بابو اپنی ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد ٹکٹ گھر کا دروازہ بند کر رہا تھا کہ اچانک اس کے کان میں ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ ایک دم سے چونکا...... گردن اٹھا کر جو دیکھا تو ایک تو بہ شکن دوشیزہ برقع میں ملبوس ایک صندوقچی اٹھائے اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ اتنی رات گئے اس سردی میں یہ عورت...... خوف کے مارے بابو جی کے ہاتھوں سے چابی گرتے گرتے بچی۔ پہلی نظر میں انہیں کسی چڑیل یا بھٹکتی کا شائبہ ہوا، لیکن جب اس نے کہا کہ وہ بہت مجبور ہے اور ان کی مدد کی طلب گار بھی، تو انہیں کچھ دم میں دم آیا۔

''آ...... آپ...... کون......؟'' بابو جی کی آواز گلے میں گھٹ گئی۔

''آپ مجھے آج رات کے لیے جگہ دے سکتے ہیں۔'' حسینہ ملتجی لہجے میں بولی۔

''لیکن آپ یہاں۔'' ''میں کراچی سے آئی ہوں۔ اب یہاں حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پر رات ہوگئی، مجھے آگے کنری تک جانا ہے، پلیز آپ رات گزارنے دیں، اس جگہ پر کہیں میرا انتظام کردیں۔''

''دیکھیں یہ حیدرآباد ریلوے اسٹیشن ہے اور یہاں اس وقت کسی تنہا عورت کا رہنا مناسب نہیں۔ آخری ٹرین جا چکی ہے، اب پہلی ٹرین صبح 6 بجے آئے گی۔''

''اب میں کیا کروں، کہاں جاؤں۔'' حیرت و پریشانی میں اس نے کہا۔

''آپ مجھے اپنے گھر لے چلیں۔'' وہ ایک دم بولی۔

''لیکن میں تو......'' بابو جی بات کر ہی رہے تھے کہ وہ ایک دم بول پڑی۔

''کوئی بات نہیں، بس چلیں۔'' اس نے بابو جی کو اشارہ کیا۔

''آپ میری بات تو سنیں، میں اکیلا آدمی ہوں۔ یہی اسٹیشن کے قریب ہی مجھے سرکاری کوارٹر ملا ہوا ہے۔ میرے ساتھ اکیلے آپ کا رہنا۔''

''جی کوئی بات نہیں، رات ہی تو گزارنی ہے۔'' وہ بولی۔

اب بابو جی بے بس ہو چکے تھے۔ ان کے بھی دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے کہ چلو ہینگ لگی نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے گا۔ اب جو انہوں نے اس نظر سے اس کا سراپا جانچا تو سرور میں ڈول گئے۔ ایسا ستھرا مال تو وہ خواب میں نہ دیکھ سکتے تھے جو جاگتی آنکھوں ان کے ہاتھ آ گیا تھا۔

بابو جی اسے اسٹیشن کے پیچھے جھاڑیوں کے اندر سے پگڈنڈی نما راستے سے چھپا کر اپنے کوارٹر تک لے گئے اور جلدی سے تالا کھول کر کوارٹر کے پٹ کھول دیے اور اسے لے کر جلدی سے اندر داخل ہوئے، کنڈی چڑھا دی۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ اندر کمرے کا حال پوری طرح سے یہ کہہ رہا تھا کہ وہ ایک چھڑے چھانٹ کا کمرہ ہے۔ بے ترتیب بستر و برتن اِدھر اُدھر پڑے ہوئے تھے۔ بابو جی نے چائے کے لیے پانی رکھا اور اس دوشیزہ کو پلنگ پر بستر لگا دیا کہ وہ یہاں آرام کرے اور خود نہانے کے لیے واش روم چلے گئے۔ جب فریش ہوکر واپس آئے۔ ان کے کمرے میں چاند اترا ہوا تھا۔ چائے بن چکی تھی۔ اس کے بعد......

☆......☆......☆

صبح کی کرنیں پھیل ہی رہی تھیں کہ اخبار والا آ گیا۔ ابھی لوگ پلیٹ فارم پر جمع ہو رہے تھے کہ ایک آواز آئی۔ بابو جی کا قتل ہوگیا......

خبر میں کوئی تفصیل نہیں تھی کہ بابو جی کیوں اور کیسے قتل ہوئے۔

حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ بابو جی کا قتل معما بنا ہوا تھا۔ پولیس اہلکار سراغ لگانے میں ناکام ہو چکے تھے، لیکن انہوں نے ہار نہیں مانی تھی، بلکہ وہ اپنی تفتیش جاری رکھے ہوئے تھے۔

بابو جی کے قتل کو چھ روز گزر چکے تھے، لیکن قاتل کا کوئی

سراغ نہ مل سکا تھا۔ ساتویں روز ابھی صبح ہوئی تھی، سورج کی کرنیں حیدر آباد ریلوے اسٹیشن کو روشنی سے منور کر رہی تھیں کہ اخبار والا آ گیا اور اس نے ایک زوردار آواز لگائی۔

''نقاب پوش حسینہ گرفتار، صندوق سے 3 سر برآمد۔''

پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے لوگ اس کی طرف لپکے اور اخبار لینے کے لیے پیسے اس کی طرف بڑھا دیے۔

خبر کی تفصیل کچھ اس طرح تھی کہ......

''میر پور ریلوے اسٹیشن پولیس نے رات کی تاریکی میں پلیٹ فارم پر تیزی سے بھاگتی ہوئی ایک نقاب پوش حسینہ کو گرفتار کر لیا، جس کے پاس سے ایک صندوقچی برآمد ہوئی ہے، جس میں سے تین سر برآمد ہوئے ہیں۔ اخبار نے حسینہ کی تصویر بھی شائع کی تھی۔ جو نقاب کے ساتھ اور بغیر نقاب کے بھی تھی۔ عورت نہایت حسین اور 24 سال کی ظالم حسینہ تھی۔

اس نے بتایا تھا کہ وہ ساہیوال کے ایک کالج میں بی۔ اے کی طالبہ تھی کہ ایک مرتبہ محلے کے چند اوباشوں نے اس کی عزت کو تار تار کر دیا، اس کے بعد سے اسے مردوں سے نفرت سی ہوگئی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب مردوں کو اپنے دام کا رسیا بنا کر ان سے اپنی بے عزتی کا انتقام لیا کرے گی اور بطور عبرت ان کا سر دھڑ سے جدا کر کے بطور فخر اپنے پاس رکھا کرے گی۔ اپنے اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نہ صرف تعلیم کو خیر باد کہہ دیا، بلکہ اپنے تمام گھر والوں سے بھی قطع تعلق کر لیا، کیوں کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہ کی، بلکہ الٹا اسی پر الزام لگا کر اس اوباش لڑکے سے شادی کی بات طے کر دی۔ ایک روز اس نے موقع پا کر اس لڑکے کو قتل کر دیا اور اس کا سر کاٹ کر اسے دھو کر خوب صاف کر کے اس کے خون کا قطرہ قطرہ ڈھل گیا تو اس کے سر میں کنگھا کر کے، بال سنوار کر اور ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا کر، اس کے چہرے پر میک اپ کر کے چھوٹے سے مضبوط صندوق میں رکھ کر کراچی آ گئی، پھر اسے چنیسر ہالٹ پر ایک نوجوان ملا اور وہ اپنے ساتھ اسے ایک فلیٹ پر لے گیا۔ وہاں اس سے پہلے کہ وہ شخص اس کی عزت سے کھیلتا ،اسے چائے میں بے ہوشی کی دوا پلا کر اس نے اسے بھی قتل کر کے اس کا سر اسی طرح دھو کر، صاف کر کے عورت کا میک اپ کر کے بطور یادگار اپنے پاس صندوقچی میں رکھ لیا۔ اس کے بعد اس نے حیدر آباد ریلوے اسٹیشن پر بابو جی کی نیت خراب ہونے پر ان کا حال بھی پچھلے دونوں لوگوں جیسا کر دیا اور سر کاٹ کر رکھ لیا۔ اسے بھی سجا سنوار کر دولہا بنا لیا۔ اب وہ میر پور خاص ریلوے اسٹیشن پر ایک شکار پھانس رہی تھی کہ کسی نے رات کی تاریکی میں خوف کے مارے چڑیل چڑیل کا شور مچا دیا۔ اتفاق سے وہاں سے کچھ پولیس اہلکار کندھے پر بندوقیں لٹکائے گزر رہے تھے، وہ اس کی آواز سن کر اس طرف متوجہ ہوئے تو انہیں دیکھ کر نقاب پوش حسینہ صندوقچی اٹھا کر بھاگ نکلی، لیکن پولیس اہلکاروں نے اسے جا لیا اور پھر......

اب وہ جیل میں ہے اور اپنے کیے کی سزا بھگت رہی ہے۔

☆☆......☆☆

سچی کہانیاں کا وہ خاص سلسلہ
جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

کالا ناگ



عادل حسین

کراچی سے ایک نوجوان کا بے راہ روی کے شکار معاشرے کے منہ پر طمانچہ

بات شروع کروں تو کہاں سے کروں؟ ماضی کی باتوں میں کھوتا ہوں تو دماغ کی نسیں پھٹنے لگتی ہیں۔ کاش میں سچ مچ ہی پاگل ہو جاتا ہوں۔ مجھے کچھ یاد ہی نہ رہتا۔ یا کاش میں اپنے تکلیف دہ ماضی کی کتاب سے جس کے ورق ورق پر دُکھ بکھرے ہیں سے وہ الفاظ مٹا سکتا جو روز مجھے اذیت میں مبتلا کرتے ہیں۔

ابو کی مالی مشکلات کے سبب مجھے 18 سال کی عمر میں ہی نوکری کرنی پڑی۔ چھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہونے کے سبب گھر کی ذمہ داریوں کا احساس مجھے ہی کرنا تھا اور یوں میں میٹرک سے آگے تعلیم کو مزید جاری نہ رکھ سکا۔ اس وقت تین ہزار کی رقم بھی بڑی بھاری لگتی تھی جو پورا مہینہ کام کرنے کے بعد میرے ہاتھ میں آتی تھی۔ زندگی میں تھوڑا سدھار پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ تین سالوں میں ہی ایک بہن کی شادی کر دی۔ رہائش شروع سے ہی دادا کے گھر میں تھی۔ دادا، دادی، پھوپی اور چچا کی کفالت بھی ابو کی ذمہ داری تھی۔ لیکن چچا تایا کی طرف سے جائیداد میں حصہ مانگنے پر دادا کا گھر چھوڑ کر کرائے پر گھر لینا پڑا۔ اب مجھ سے چھوٹے بھائی نے بھی نوکری شروع کر دی تھی۔ زندگی کے پانچ سال پلک جھپکتے بیت گئے۔ میرا مزاج تھوڑا سا عاشقانہ تھا۔ محلے کی ایک لڑکی سے افیئر چلا جو کہ منگنی تک پہنچ گیا۔ منگنی کرنا میری مجبوری تھی چوں کہ لڑکی کا نام میری وجہ سے زمانے کی زبانوں پر تھا۔ اور مجھے یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ کوئی میری وجہ سے بدنامی کی کالک اپنے منہ پر مَل لے۔ جانور بھی گھر میں پالا جائے تو محبت ہو ہی جاتی ہے، وہ تو پھر انسان تھی۔ رفتہ رفتہ دِل اُس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ چھ سال بعد بغیر کوئی وجہ بتائے اُن کی طرف سے رشتہ ختم کر دیا گیا۔ بھری جوانی میں دِل پر روگ لگ گیا۔ راتیں جاگ کر کٹنے لگیں اور دِن پریشانی میں گزرنے لگے۔

اس دوران چھوٹے بھائی کا رشتہ بھی طے ہو چکا تھا۔

بھائی کی سسرال سے شادی کے لیے زور دیا جانے لگا تو گھر والوں نے مجھ سے کہا کہ شادی کرو۔ مگر میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اب شادی نہیں کرنی، کیوں کہ مجھے اب ہر لڑکی بے وفا لگنے لگی تھی۔ سانپ ڈستا تو شاید زہر نکل جاتا مگر محبت نے ڈسا تھا، زہر رگوں میں پھیلا ہوا تھا۔ شادی اس زہر کو کیسے میرے وجود سے الگ کر سکتی تھی۔ دُور اندیش ہونے کے سبب سو طرح سے سوچا کہ آنے والی زندگی میں کیا کیا مسائل مجھے درپیش آ سکتے ہیں؟ عقل نے کہا کہ کل اگر بہن بھائی تمہارے نہ ہوئے تو کیا



کرو گے؟ دِل نے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اور اگر ہوا تو میں اس قابل ہوں کہ خود گزر بسر کر سکتا ہوں۔

دراصل فیصلے ہم سے وقت کروا رہا ہوتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ فیصلے کرنے والے ہم ہیں اور وہ وقت ہی ایسا تھا جب خود پر یقین زیادہ تھا تو اپنے فیصلے پر قائم رہا کہ شادی نہیں کروں گا۔ مجبوراً گھر والوں کو چھوٹے بھائی کی شادی کرنا پڑی۔ زندگی کی 29 بہاریں دیکھ چکا تھا اور دِل پر چوٹ کھانے کے بعد 29 دن بھی دِل جینے کو نہیں چاہا۔ لیکن جن رشتوں نے میرے پیروں میں ذمہ داریوں کی زنجیریں ڈال رکھی تھیں۔ انہی رشتوں کے چہرے مجھے جینے کی سزا دے رہے تھے۔

☆......☆

مجھے بچپن سے کتابیں پڑھنے کا شوق اور ادب سے لگاؤ تھا۔ نوکری جو ملی تھی تو وہ بھی ایک ادبی رسالے میں۔ ہاتھوں نے قلم پکڑنا سیکھ لیا۔ اپنے لگاؤ کے سبب جلد ہی فسانے لکھنے لگا۔ میں زندگی میں اپنے قلم کے ذریعے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ادبی رسالے میں نوکری کرتے ہوئے بھی ادبی رسالے کا حوالہ دیے بغیر اپنے افسانے چھپنے بھیجتا۔ کبھی بھی رسالے کو سیڑھی کے طور پر استعمال نہیں کیا، افسانے چھپنا شروع ہوگئے۔ میں بے وفائی کے درد کو افسانوں میں ڈھالنے لگا تھا۔

☆......☆

بھائی کے پہلا بیٹا ہوا تو گھر میں رونق لگ گئی۔ مہنگائی بڑھتی جارہی تھی تو رسالے کی نوکری کو خیر باد کہہ کر ایک پرائیویٹ کمپنی میں نوکری کرلی۔ تنخواہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ آمدنی بڑھی تو اخراجات بھی بڑھ گئے۔ ایک ایک کر کے سب آسائشیں میسر آنے لگیں۔ گھر میں خوشحالی آ گئی۔ ایسے میں میری زندگی نے ایک اور موڑ لیا۔

ملنے والوں میں سے ایک لڑکی مجھ پر عاشق ہوگئی۔ بات شروع تو دوستی سے ہوئی تھی۔ وہ میرے دردناک ماضی سے پوری طرح واقف تھی۔ کہتی تھی کہ میں تمہاری زندگی میں بہاریں بھرنا چاہتی ہوں۔ میں جو بے وفائی کا زخم دِل پر کھائے بیٹھا تھا اب پھر سے کسی کی محبت کے وعدے سچ کیسے مان لیتا؟ لیکن جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ لڑکی سچی ہے۔ وقت پھر اپنی مرضی کا فیصلہ مجھ سے لینے کے لیے بے تاب ہوا جارہا تھا اور میں عقل اور دِل کی جنگ میں لگا تھا۔

عقل نے دلیلیں دینا شروع کردی تھیں۔ کہتا تھا بھائی کے دو بچے ہو چکے ہیں اور تم شادی نہیں کرتے۔ ماں بوڑھی ہوتی جارہی ہے۔ چھوٹی بہن کی شادی کردو گے تو کیا بھاوج پر بوجھ بنو گے؟ دل نے بھی عقل کی تائید کی اور دِل تو ویسے بھی نئی لڑکی کی محبت بھری باتوں کو سچ ماننے کے لیے تُلا بیٹھا تھا۔ کمبخت نے عقل کا ساتھ دے کر وقت کی مرضی کا فیصلہ کروا دیا۔

☆......☆

روپ مایا نام تھا اُس کا۔ نام سے زیادہ پیاری وہ خود تھی! لمبی گھنی زلفیں۔ خوب صورت نین نقش۔ بڑی بڑی آنکھیں جن میں محبت کی ہزاروں داستانیں پوشیدہ تھیں۔ گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹ، گوری رنگت اُس پر اُلٹے گال پر چھوٹا سا تل۔ سنگِ مرمر سے تراشا ہوا بدن، گلابی گلابی سے خوب صورت پیر! وہ سَر سے پیر تک قدرت کا شاہکار تھی۔

مجھے شاید تعریف کرنا نہیں آتی۔ وہ ہزاروں میں ایک تھی۔ نہیں لاکھوں میں ایک۔ یا شاید!! خیر وہ بہار کے خوش گوار جھونکے کی طرح میری زندگی میں آ گئی۔ مجھے جینا اچھا لگنے لگا۔ زندگی زندگی نظر آنے لگی۔

چھوٹی بہن ایم اے کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ کرنے لگی۔ چھوٹے بھائی بھی نوکریاں کرنے لگے۔ روپ مایا سے میرا رشتہ پکا کردیا گیا۔ شادی کے لیے ایک سال کا وقت لیا گیا۔

اس ایک سال میں گھر کے ماحول میں بہت تبدیلی آ چکی تھی۔ میری کمپنی خسارے میں جارہی تھی تو تنخواہ مہینہ مہینہ بھر لیٹ ہونے لگی۔ گھر کا بجٹ بہن کے ہاتھ میں تھا۔ وہ تقاضے کرتی تو اُدھار لے کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ امی بیمار رہنے لگی تھیں۔ بھاوج نے گھر کے کاموں کو کبھی اپنی ذمہ داری نہیں سمجھا۔ بہن اسکول سے آنے کے بعد سارے گھر کے کام بھی ڈیوٹی کی طرح انجام دینے لگی۔ چڑچڑاہٹ اُس کے مزاج میں بھی آ گئی۔ شادی کی عمر میں پہنچ کر اچھے رشتے کا انتظار اور ساتھ میں نوکرانی کی طرح گھر کا پورا

کام اکیلے کرنا۔ میں اپنا کوئی افسانہ لکھ کر بہن سے رائے لینے کی کوشش کرتا تو وہ جھٹک دیتی کہ سارا دن کی تھکی ہاری اب رات میں جا کر لیٹی ہوں تو افسانہ پڑھنے بیٹھ جاؤں۔ اُس کے اِس طرح جواب دینے پر مجھے تکلیف ہونے لگی۔ میرے گھر میں میرا لکھنا کسی کے لیے بھی کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

کبھی کسی نے میرا افسانہ پڑھنے کی کوشش کی نہ ہی کسی سے کبھی میرے افسانے لکھنے کے موضوع پر کوئی گفتگو ہوئی۔ مجھے ایسا لگنے لگا کہ لکھنا کوئی جرم ہے۔ یا میرے لکھنے سے میرے گھر والوں کی عزت کم ہو جاتی ہے۔ میں سوچ سوچ کر کڑھنے لگا۔ میں حساس طبیعت کا مالک تھا۔ ویسے بھی لکھنے والے حساس ہی ہوتے ہیں۔ میں چھوٹی چھوٹی باتوں میں خوشیاں ڈھونڈنے والا انسان ہوں تو چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے تکلیف دینے لگیں۔ چھوٹے بھائی آتے جاتے کہنے لگے کہ بھائی آپ کے پیپرز اور کتابیں چاروں طرف پھیلے پڑے رہتے ہیں۔"

مجھے اس جملے میں بھی طنز لگتا۔ مجھے آگے بڑھنے کے لیے سپورٹ کی ضرورت تھی اور میرے اپنے گھر والے میرے لکھنے کو معیوب تصور کرتے تھے یا اُن کو احساس ہی نہیں تھا کہ وہ میری سوچ کو خراب کر رہے ہیں۔

☆......☆

روپ مایا سے بات کرنا میرے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ روپ مایا خود بھی مشرقیت کی جیتی جاگتی تصویر تھی اور اُس کے گھر والے بھی اُس کے مجھ سے بات کرنے کو اچھا نہیں مانتے تھے۔ تو دِن بھر بات کرنے پر کرفیو رہتا۔ جس میں ایک پَل کی بھی نرمی نہیں ہوتی، راتوں کو جاگ کر بات کرنے کی کوششیں کرنے لگا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ روپ مایا رات کو بھی جلدی سو جاتی تھی۔ تو مجھے اُس سے بات کرنے کے لیے رات جاگنا پڑتا۔ اگر بات کرنی ہو تو رات کے دو بجے روپ مایا کو خود جاگ کر جگانا پڑتا۔ میری اکثر راتوں کی نیند خراب ہونے لگی۔ صحت متاثر ہونا بھی لازمی بات تھی، تو صحت بھی میرا ساتھ چھوڑنے لگی۔

روپ مایا کی ایک بہن افسانے پڑھنے کی شوقین تھی۔ میری اُس سے بہت اچھی دوستی ہو گئی۔ اکثر اُس سے بات کر کے اپنے دِل کی بھڑاس نکال لیتا۔ رشتے بھروسے کی بنیاد پر بنتے ہیں۔ میری طرح اُس کو بھی مجھ پر بھروسا ہو گیا تھا۔

دِل کی صاف، عزت اور محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ وہ رشتوں کو نبھانا جانتی تھی اور میری طرح ہی دھوکہ کھائے بیٹھی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت سی باتیں شیئر کر لیتے تھے یوں ہم دونوں کی خوب جمنے لگی۔

پچھلی محبت کی جدائی مجھے سگریٹ کا عادی بنا گئی تھی۔ مگر روپ مایا نے میری اس عادت کو بھی چھڑوا دیا تھا۔ میں اپنے آپ کو اُس کی سوچ کے مطابق ڈھالنے لگا۔ محبت کا تقاضہ بھی یہی تھا، میں دِل و جان سے روپ مایا کو چاہنے لگا تھا۔ اُس کی ہر خوشی کا خیال رکھنے کی پوری کوشش کرتا۔ لیکن اُس کی مشرقیت بسا اوقات میرے لیے مسائل پیدا کرنے لگی۔

☆......☆

سال سے دو سال ہو گئے مگر شادی کے اسباب پیدا نہ ہو سکے۔ روپ مایا کے گھر والے مالی مسائل کا شکار تھے۔ میں اُس کی فیملی کو بھی دِل و جان سے اپنا بنا بیٹھا تھا تو ایسے میں داماد نہیں بیٹا بن کے صبر کرتا رہا۔ لیکن عمر کے جس حصے میں آ چکا تھا اُس حصے میں جیون ساتھی کی ضرورت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ مجھے بھی روپ مایا کی کمی کا احساس دِن بدن ستانے لگا۔ شاید دُوری کے کرب میں روپ مایا بھی چڑچڑاہٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ رات کے پچھلے پہر آدھے گھنٹے کی بات میں لڑائیاں ہونے لگیں۔ روپ مایا کی بے وجہ کی لڑائیوں سے تنگ آتا تو ہاتھ شیونگ کٹ سے بلیڈ نکال لیتے۔ گردن پر بلیڈ پھیرنے کی کوشش کرتا تو کمبخت عقل روپ مایا کا نام لے کر روک لیتی۔ مگر جذباتیت اور طبیعت میں پیدا ہو جانے والا غصّہ سینے یا پیٹ پر بلیڈ پھیر دیتا۔ خون کے پھوارے چھوٹ پڑتے تو گھر والوں کے سوئے ہوئے ہونے کی وجہ سے کسی کو بھنک تک نہ پڑتی۔ خود ہی خون صاف کر کے کچھ لگا لیتا۔ پھر اگلے دن وہی رات کا انتظار۔

دن جیسے تیسے دَبے قدموں سے گزر جاتا اور رات پھر قیامت کی رات ہوتی۔

☆......☆

روپ مایا کی بہن بھی اکثر اوقات مجھے نظر انداز کرنے لگی تھی۔ میرے کئی کئی بار فون کرنے پر بھی وہ میرا فون نہیں اُٹھاتی۔ ہفتوں گزر جانے کے باوجود اُس کو یہ خیال نہیں آتا کہ مجھے فون کر کے پوچھ لے کہ آپ کی کال کیوں آرہی تھی؟ کیا کام تھا۔ مگر وہ ایسا نہ کرتی۔ میری ماں کی سخت بیماری پر بھی کوئی دیکھنے نہ آتا۔ کبھی بھولے بھٹکے فون پر خیریت لے لیتے۔ مجھے لگا جیسے میرے ساتھ سوتیلی ماں والا سلوک ہونے لگا ہے۔ میں سوچنے لگتا کہ کیا ایسے نبھائے جاتے ہیں رشتے؟ میری کڑھن مزید بڑھنے لگی۔

اسی اذیت بھری زندگی کو گزارتے مزید دو سال گزر گئے۔ کمپنی کے معاملات پہلے سے زیادہ خراب ہو چکے تھے۔ ایسے میں بہن جب تنخواہ کا تقاضہ کرتی تو سمجھ نہیں آتا کیا کروں؟ وہ اپنی جگہ ٹھیک تھی کہ گھر کا بجٹ چلانا مشکل ہو جاتا تھا۔ مگر غلط میں بھی نہیں تھا جو اِس بُرے وقت میں بہن بھائیوں سے یہ امید کرتا تھا کہ وہ میرا حوصلہ بڑھائیں گے۔ وہ مجھے کہیں گے کہ بھائی اچھے بُرے دن آتے جاتے رہتے ہیں۔ آپ فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا مگر حوصلہ تو نہ بڑھا تقاضے بڑھتے گئے۔ الجھنوں سے نجات کے لیے پھر سگریٹ میں پناہ تلاش کرنا پڑی۔

☆......☆

میری شادی تو شاید میرے گھر والے بھی بھول چکے تھے۔ یا شاید ایک پنتھ دو کاج کے چکر میں انتظار کر رہے تھے۔ سچ پوچھیں تو چاہتا میں بھی یہی تھا، لیکن میری اور بہن کی عمر میں بہت فرق تھا۔ میں خود بھی یہی کوشش کرنے لگا کہ دونوں کی شادی ساتھ ہو جائے۔ لیکن شاید ابھی کچھ دیر اور باقی تھی بہن کا نصیب کھلنے میں۔

امی کی بیماری حد سے بڑھی تو گھر کے ہر کام سے روک دیا گیا۔ بہن کی ٹیچنگ جاری تھی۔ شاید اس کے پیچھے بھی پیسے کی مشکلات تھیں اور بہن سمجھدار ہونے کے سبب بھائیوں کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ میرے لیے یہاں نئی پریشانی نے جنم لے لیا۔ مجھے روزانہ ناشتا خود نکالنا پڑتا اپنے لیے۔ کام تو بہت چھوٹا سا تھا کہ چائے گرم کرو اور Bread کے تین پیس کھا کر کام پر چلے جاؤ۔ مگر میرے لیے یہ رائی کا پہاڑ بنا ہوا تھا۔ زندگی میں کبھی اس طرح کے کاموں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا تو مشکل لگنے لگا۔ بھاوج اس بات سے لاتعلق ہی رہی کہ جیٹھ کو بھی ناشتا کرنا ہوتا ہے اور سچ کہوں تو میں نے ایسا کبھی چاہا بھی نہیں کہ وہ میرے لیے اپنی نیند خراب کرے اور مجھے ناشتا بنا کر دے۔ مشکل حالات میں دوپہر سو روپے خرچ کر کے کھانا کھانا میرے لیے بہت مشکل عمل تھا۔ تو دوپہر بھوکا رہ کر گزار دیتا۔ اب مجھے روپ مایا کی کمی شدت سے ستانے لگی کہ کاش وہ ہوتی تو میرے لیے ناشتا بنا ہوتا۔ دوپہر کا کھانا بہت محبت سے مجھے ساتھ دیا کرتی۔ آج جو میں ہفتے ہفتے بھر کپڑے تبدیل صرف اس لیے نہیں کرتا کہ میری بہن پر مزید بوجھ بڑھ جائے گا۔ روپ مایا کے ہونے سے میرے کپڑوں کی پریشانی بھی مٹ جاتی۔ میں راتوں کو تنہائیوں میں رونے لگا۔ مگر میرے آنسو دیکھنے والا تھا ہی کون؟

☆......☆

دسمبر آیا تو قیامت ساتھ لے کر آیا۔ برف جیسی ٹھنڈی راتوں میں اکیلے پَن کا ناگ میرے سینے پر آکر بیٹھ جاتا۔ اُن برف راتوں میں پہلی بار بدن میں عجب سی خواہشیں جاگنے لگیں۔ میں مرد تھا اور عمر کے اُس مقام پر جہاں نفس کے بے لگام گھوڑے کو لگام دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے اب سمجھ آیا کہ یہ خواہشیں ہیں کیا۔ جسم جوان تھا اور خون گرم، جسم کو لحاف سے زیادہ بانہوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ہونٹ ضد کرنے لگے کہ سگریٹ سے کام نہیں چلے گا۔ بدن میں آگ رہنے لگی۔ آگ بھی وہ جو صرف مجھے جلا رہی تھی۔ دھواں تک کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ حالات سے لڑنا تو مشکل ہے ہی مگر اُس سے کہیں زیادہ مشکل نفس سے لڑنا ہے۔ حالات سے تو برسوں سے لڑ رہا تھا لیکن بشری تقاضے میرے لیے عذاب بن گئے تھے۔ اکیلے پن کا ناگ میرے سینے پر مستقل بیٹھ گیا اور کچھ دنوں سے تو اس نے زبان بھی باہر نکال لی تھی۔

اِس تمام صورت حال میں، میں نفسیاتی مریض بن کر رہ گیا۔ گھر والوں سے بات بات پر اُلجھنے لگا۔ کام کی طرف سے بھی دِل اُچاٹ ہوگیا۔ لہجے میں تلخی آ گئی اور دماغ صرف منفی باتیں سوچنے لگا۔ میرے، بہن بھائیوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ میں نفسیاتی مریض ہوگیا ہوں۔

روپ مایا سے معلوم ہوا کہ گھر والے جہیز جمع کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں لیکن کوئی صورت بنتی نظر نہیں آتی۔ ابھی شاید ایک ڈیڑھ سال مزید انتظار کرنا پڑے گا۔ جہاں ہم نے اک دوجے کا تین سال انتظار کیا ہے وہاں یہ تھوڑا سا عرصہ بھی ہم ملن کے انتظار میں گزار لیں گے۔

کہتی تو وہ ٹھیک تھی۔ اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ مگر میں اس کالے ناگ کا کیا کروں؟ یہ جواب تو میں اُس سے بھی نہ لے سکا۔

روپ مایا کی بہن سے شادی کے متعلق بات کر کے میں نے اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مجھے جہیز نہیں چاہیے۔ میں اپنے بازوؤں پر یقین رکھتا ہوں۔ روپ مایا کے لیے سب کچھ خود سے بنالوں گا۔"

لیکن اُس کا بھی وہی جواب تھا کہ آپ کی سوچ قابل تعریف ہے مگر لوگوں کی زبانوں کا کیا علاج کیا جائے؟ ہم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ ہم زمانے بھر کو جواب دیتے پھریں کہ بیٹی کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا۔"

میں نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ دیکھو بہن میری عمر 34 سال ہوگئی ہے۔ دو سال مزید شادی میں لگاؤ گے تو 36 پھر سال دو سال بعد اللہ اولاد جیسی نعمت سے سرفراز کرے گا (انشاءاللہ) تو میں 38 کا ہوگیا ہوں گا۔ جب جوانی 55 سالہ بوڑھے کے روپ میں بدل جائے گی تو موت قریب نظر آنے لگے گی۔ نہ اولاد کی خوشیاں دیکھ سکوں گا اور نہ اُن کے لیے کچھ کر سکوں گا اور میں روپ مایا کے لیے بھی تو بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میں اُس کو بھی تو کچھ نہ دے سکوں گا۔"

مگر میری باتیں اُس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ نہ سمجھنا تھا نہ سمجھی۔ یا سمجھ تو گئی تھی لیکن بے چاری مجبور تھی۔

☆......☆

ہر رات وہ اکیلے پن کا کالا ناگ میرے سینے پر آ کر بیٹھ جاتا۔ ایسے موڑ پر عموماً لوگ ناگ کو کچلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بشریٰ تقاضے پورے کرنے کے لیے حرام کاری پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مجھے قرآن پاک کی اُس آیت کا مفہوم اب سمجھ آیا جس میں کہا گیا ہے کہ لڑکا لڑکی بالغ ہوں تو فوراً نکاح کر دو۔ قرآن بینک بیلنس اور اچھی نوکری کی تو بات ہی نہیں کرتا۔ ہمارے معاشرے میں لوگوں نے نکاح کو جب سے مشکل بنایا ہے زنا آسان ہوگیا ہے۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتا کہ اتنے سادہ سے کام کو مشکل بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

میرے گھر والوں نے میری نفسیاتی کیفیت کے سبب مجھے علاج کی غرض سے اسپتال میں داخل کروادیا ہے۔ ناگ میرے سینے پر روزانہ آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہی لمبی سی زبان نکالے، چاہتا تو میں بھی اپنے اکیلے پن کے کالے ناگ کو کچلنے کے لیے تھوڑے سے پیسوں میں اپنے بشریٰ تقاضے پورے کر لیتا۔ چاہے جز وقتی ہی سہی، مگر روپ مایا سے سچی محبت کرتا ہوں نا۔ تو موت کو تو گلے لگا سکتا ہوں لیکن اُس کے اعتماد کو توڑ نہیں سکتا۔ میں اپنی زندگی کی بازی ہار بھی جاؤں مگر نفس کی جنگ جیت جاؤں گا انشاءاللہ۔

کالا ناگ ابھی بھی میرے سینے پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہی خطرناک سی زبان نکالے۔ اکیلے پن کا یہ کالا ناگ میری جان لے سکتا ہے۔ مگر میں پھر بھی اپنی محبت کا انتظار کروں گا۔ جانتے ہیں یہ سب میں آپ کو کیوں بتا رہا ہوں؟ اس لیے کہ آپ دیکھ لیں کہ کہیں آپ کی اولاد کے سینے پر بھی تو ایسا ہی اکیلے پن کا کالا ناگ تو نہیں بیٹھا ہوا؟ کیوں کہ ہر کوئی میری طرح اس اکیلے پن کے کالے ناگ سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لوگ ہار جاتے ہیں۔ پھر وہی ہوتا ہے، ماں باپ اولاد کے بگڑنے کا شکوہ کرتے نظر آتے ہیں۔ بے راہ روی کی دہائیاں دیتے ہیں۔ معاشرے اور میڈیا کو کوستے ہیں۔ مگر جو کالا ناگ وہ اپنے بچوں کے سینوں پر خود لا کر بٹھا رہے ہیں وہ نظر ہی نہیں آتا۔

☆☆......☆☆

دوسری مرد کہانی

نیا انتقام



شعبان کھوسہ

کوئٹہ سے، جنگ جیتنے کے لیے ایک نوجوان کا انوکھا فیصلہ، جس نے انتقام کا مفہوم ہی بدل ڈالا





میں پچیس سال بعد اپنے بچوں کے ہمراہ گاؤں لوٹ کر آ رہا تھا تو مجھے گاؤں چھوڑ کر جانے کا کوئی پچھتاوا نہ تھا۔ میں سُرخرو اور مطمئن ہو کر لوٹا تھا۔ پچیس سال قبل جب میں نے گاؤں والی زمینیں فروخت کر کے گاؤں چھوڑا تھا تو مجھے بزدل ہونے کے طعنے سننے پڑتے تھے۔ آج میں ان طعنوں کا جواب دینے کے لیے گاؤں لوٹا تھا۔ جی ٹی روڈ سے جب گاڑی گاؤں جانے والی سڑک پر مڑی تو مجھے ماضی یاد آ گیا کہ میں نے کن حالات میں گاؤں چھوڑا تھا۔

☆......☆

میرے دادا جان پاکستان کے معرض وجود میں آنے پر ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ سرگودھا کے نزدیک ایک گاؤں میں انہوں نے رہائش اختیار کر لی کیوں کہ انہیں زمینیں بھی وہاں ہی الاٹ ہوئی تھیں۔ دادا جان بہت ہی محنتی انسان تھے۔ انہوں نے زمینوں پر اتنی محنت کی کہ وہ سونا اُگلنے لگیں نہ صرف ان کی آمدنی بلکہ زمینوں کے رقبے میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ کام کرنے والے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ خود محنت کرتے تھے۔ دادا جان کی زمینوں کے ساتھ جن لوگوں کی زمینیں لگتی تھیں وہ بھی اس حلقے میں اپنا اثر و رسوخ رکھتے تھے اور ان کی زمینیں بھی بہت زیادہ تھیں مگر ان کی آمدن دادا جان کی زمینوں سے کم ہوتی تھیں اس کی ایک وجہ یہ ہی ہو سکتی تھی کہ دادا جان نماز روزے کے سختی سے پابند تھے اور زمینوں میں فصل بیجنے کے بعد زمینوں پر جا کر اونچی آواز میں سورۃ رحمٰن کی تلاوت کیا کرتے تھے اور یہ اللہ کے پاک کلام کا اثر تھا کہ فصل نہایت ہی شاندار اور وافر مقدار میں ہوتی تھی......

ساتھ والی زمینوں کے مالک جو ٹوانے کہلاتے تھے۔ فصل کم ہونے کی وجہ سے دادا جان سے جلتے اور حسد کرتے تھے اور ان سے چھیڑ خانی کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ مگر دادا جان ان کی ان اوچھی حرکتوں کی پروا ہی نہ کرتے تھے۔ ہاں یہ تھا کہ ٹوانوں نے کبھی کھل کر دادا جان کی مخالفت نہیں کی تھی۔

چوں کہ زمینیں نہری پانی سے سیراب ہوتی تھیں۔ اتفاق سے نہر بھی قریب ہی تھی اس لیے انہیں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ٹوانے اپنی زمینوں کو سیراب کرنے کے لیے کبھی کبھار پانی کا راستہ روک لیتے تھے اور اپنی باری سے ہٹ کر بھی پانی لگا لیتے تھے۔ مگر دادا جان ان کی ان حرکتوں کو نظر انداز کر دیتے تھے کیوں کہ انہیں اپنے رب پر بھروسہ تھا کہ وہ ان کی فصل میں برکت ڈالے گا اور ایسا ہی ہوتا تھا کہ ان کی فصل سب

سے زیادہ ہوتی تھی۔

دادا جان کے صبر اور صلح جوئی کے باوجود ایک دن ٹوانوں نے پانی کی تقسیم پر دادا جان سے جھگڑا کر دیا اور نوبت گالی گلوچ تک جا پہنچی، دادا جان مصالحت کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ لوگ ہاتھا پائی پر اُتر آئے۔ اس لڑائی کے دوران ٹوانوں کے ایک کارندے نے فصل کاٹنے والی درانتی سے دادا جان پر حملہ کر دیا۔ وہ حملہ جان لیوا ثابت ہوا اور دادا جان نے سب کے سامنے وہاں ہی جان دے دی۔

☆......☆

یہ افسوس ناک واقعہ ہمارے دونوں خاندانوں کے درمیان دشمنی کی بنیاد بن گیا۔ دادا جان کے تین بیٹے تھے۔ وہ تینوں ہی باپ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ اب یہ انا کا مسئلہ بن گیا تھا۔ اگر وہ اب ٹوانوں کے کسی آدمی کو قتل نہ کرتے تو لوگ کہتے کہ بیٹے بزدل ہیں کہ باپ کے خون کا بدلہ نہیں لے سکے۔ آخر ایک دن انہوں نے ٹوانوں کے ایک بندہ قتل کر کے بدلہ لے لیا۔ مگر ابھی وہ اس جیت کے نشے سے باہر ہی نہ نکل پائے تھے کہ ٹوانوں نے میرے ایک چچا کو قتل کر دیا۔ اس قتل کے لیے اب کسی بہانے اور جواز کی ضرورت ہی نہ



رہی تھی کیوں کہ دشمنی کا آغاز جو ہو چکا تھا۔ اور لوگوں کو معلوم تھا کہ اب یہ آگ جلتی رہے گی اور کسی نہ کسی کا خون بہتا ہی رہے گا۔

ہمارے اس علاقے میں پڑھنے لکھنے کا رواج بھی کم تھا، زمینداروں کو بھی اولاد کو تعلیم دلانے کا احساس ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ تعلیم کو بے کار چیز سمجھتے تھے۔

☆......☆

ایک دن کتوں کی لڑائی پر جھگڑا ہو گیا اور میرے باپ کو انہوں نے گولیوں کا نشانہ بنا ڈالا۔ ہمارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ گھر کا ہر فرد سہا ہوا تھا۔ ابا جان کو دادی اور امی نے بہت سمجھایا تھا کہ وہ دشمنی کی آگ سے دور رہیں۔ مگر انہوں نے عورتوں کی بات سننا ہی گوارہ نہ کی اور کہا کہ تم گھر کا کام کاج سنبھالو، تمہیں باہر کے کاموں سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔"

ابا جان کے قتل پر میرے چچا کو غصہ آ گیا۔ وہ بندوق لے کر گھر سے نکلنے لگے تو میں ان کے راستے میں آ گیا اور ان کو بڑی مشکل سے روکا اور ان کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ مگر اب دشمنی کی یہ جنگ عزت اور بے عزتی کا مسئلہ بن چکی تھی۔ اسی لیے گاؤں والے ہم گھر والوں پر طنز کے تیر برسانے لگے کہ ابھی تک ہم نے بدلہ نہیں لیا۔ دشمن بھی اپنی محفلوں میں ہم پر آوازیں کستے۔

☆......☆

چند سال تو خیریت سے گزر گئے۔ میں نے شہر کے کالج سے ایف ایس سی کا امتحان پاس کرلیا تھا۔ میری شادی بھی ہوگئی تھی۔ میں اولاد والا بھی ہو گیا۔ میں دادا جان کی طرح صلح جو انسان تھا۔ مجھے شروع ہی سے ان لڑائی جھگڑوں سے نفرت ہی رہی۔ میں امن اور سکون کی زندگی گزارنے کا خواہش مند تھا۔ اس لیے میں نے چچا جان کو روک رکھا تھا کہ اس دشمنی اور بدلے کے چکر میں نہ پڑیں۔ ایک دن میں شہر گیا ہوا تھا۔ اس روز چچا جان پر دشمنوں کے کارندوں نے آوازیں کسیں تو ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ گھر آئے اور اسلحہ لے کر ٹوانوں پر حملہ کر دیا بہت سارا خون پھر بہہ گیا۔ چچا اور ٹوانوں کے کئی لوگ مارے گئے۔

میں واپس گاؤں لوٹا تو دل تھام کر رہ گیا۔ چچا کی موت کا مجھے بہت زیادہ دُکھ ہوا۔ میرے دادا باپ اور سب چچا ابدی نیند سو گئے تھے۔ اب میں اپنے خاندان میں تنہا رہ گیا۔ ٹوانوں کا خیال تھا کہ میں چچا کا بدلہ لینے کے لیے میدان میں اُتروں گا۔ مگر میں نے انتقام نہ لینے کا عہد کرلیا تھا۔

☆......☆

یوں ہی کافی عرصہ بیت گیا۔ میری خاموشی دیکھ کر لوگ میرا مذاق اُڑانے لگے۔ مجھے بزدل کہنے لگے۔ میں یہ سب کچھ سنتا اور برداشت کرنے لگا۔ میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی، مجھے ان کی زندگی اور ان کا مستقبل عزیز تھا۔ میں انہیں پڑھانا چاہتا تھا۔ اب وہ اسکول جانے لگے تھے، ادھر لوگ مجھے بزدلی کے طعنے دے رہے تھے۔ اس عالم میں، میں نے انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا جو انوکھا فیصلہ تھا۔

میں نے اپنی آدھی زمین بیچ ڈالی اور شہر میں ایک گھر خرید لیا اور پھر اپنی ساری فیملی کو ساتھ لے کر شہر چلا آیا۔ اس رقم سے میں نے کاروبار شروع کردیا۔ آدھی زمین میں نے کارندوں کے حوالے کر دی۔ بچوں کی تعلیم پر میں نے خصوصی توجہ دی۔ انہیں اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اچھے کالج میں پڑھایا۔ میں کبھی کبھار کارندوں سے زمینوں کی آمدن کا حساب لینے گاؤں جاتا رہتا تھا۔ مگر میری بیوی بچوں کو گاؤں جانے کی اجازت ہی نہ تھی۔ میں گاؤں جاتا تو لوگوں کی چہ میگوئیاں شروع ہو جاتیں۔ دبی دبی آواز میں طعنے بھی دیے جاتے۔ مگر میں وہ سب باتیں اور طعنے ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا۔ مجھے اب انتقام سے کوئی غرض نہ تھی ادھر ٹوانے بھی منتظر تھے کہ میں کب پیش قدمی کروں اور وہ اپنی بندوقیں نکالیں۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔

☆......☆

پچیس برس بیت گئے تھے۔ میری فتح کا دن قریب آ گیا تھا۔ میرے دونوں بیٹوں میں سے ایک فوج میں چلا گیا اب وہ کیپٹن تھا۔ چھوٹا بیٹا مقابلے کا امتحان پاس کر کے اے سی بن گیا جبکہ بیٹی نے ایم بی بی ایس کرلیا اور ضلع کے ہیڈ کوارٹر اسپتال میں ڈپٹی ایم ایس بن گئی۔ جس دن ان تینوں کو ملازمت مل گئی وہ دن میری فتح کا دن تھا۔ کامیابی اور کامرانی کا دن تھا۔ اب میں بوڑھا ہو گیا تھا۔ لہٰذا اب میں گاؤں جا کر زندگی سکون سے

گزارنا چاہتا تھا۔

پھر ایک دن میں بیٹوں اور بیٹی کے ہمراہ گاؤں روانہ ہوا۔ تو ماضی یاد آ گیا تھا۔

اس دن میرے دونوں بیٹے اور بیٹی سرکاری گاڑیوں میں براجمان تھے۔ جن کو سرکاری ڈرائیور چلا رہے تھے۔

گاؤں کے لوگوں نے میری اولاد کی شان و شوکت دیکھی تو وہ خوف زدہ سے ہو گئے۔ بڑا بیٹا فوجی وردی میں تھا۔ جب میں نے ان لوگوں کو اپنی اولاد کے عہدوں کا بتایا تو وہ لوگ جو مجھ پر طنز کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی گردنیں جھکالیں۔ سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی، ہمارے گھر میں لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ نہ رہی ہر کوئی مجھے مبارک باد اور بچوں کو دعائیں دے رہا تھا۔ وہ لوگ جنھوں نے دشمنی کا آغاز کیا تھا ان کے بچے اَن پڑھ گنوار تھے۔ جبکہ میرے بچوں کو ایک باعزت مقام حاصل ہو گیا تھا۔ ٹوانوں نے بھی حقیقت تسلیم کر لی اور جھک جھک کر سلام کرنے لگے۔ میری اولاد کا رعب اور دبدبہ دیکھ کر ان کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ وہ سب ہماری خاطر مدارت کرنے لگے تو میرا سر فخر سے بلند ہو گیا اور پھر وہی سر خدا کے حضور میں جھک گیا کہ وہی ہے جو عزت اور ذلت دیتا ہے۔

میں نے خون کی ندیاں بہائے بغیر دشمنوں سے انتقام لے لیا تھا اور اس فتح کا سہرا تعلیم کے سر بندھتا ہے کہ اگر میں اپنے بچوں کو تعلیم نہ دلواتا اور شہر نہ آتا تو اب تک سارا خاندان ختم ہو چکا ہوتا۔ یہ تعلیم کا ہی کرشمہ تھا کہ جو لوگ مجھے طعنے دیتے تھے، آج وہی میری تعریفیں کر رہے تھے۔ تعلیم ہی وہ زیور ہے جو انسان کو عقل اور شعور سے نوازتا ہے۔ میں نے اپنی اولاد کو یہ زیور دے کر نفرت کی آگ سے بچا لیا تھا۔

میں اب بھی اپنے گاؤں میں ہی رہ رہا ہوں اور زندگی کو سکون سے گزار رہا ہوں میرے بچے ہر ہفتہ دو ہفتہ بعد مجھ سے ملنے آ جاتے ہیں۔ لوگ ان کو جھک کر سلام کرتے ہیں۔ گاؤں میں اب اَمن اور سکون ہے۔ دشمنی کا اب ادھر سے گزرنا ممکن بنا دیا گیا ہے۔

☆......☆

تیسری مرد کہانی

میں خود غرض نکلا



فیصل ندیم بھٹی

سرگودھا سے، بھلوال کے ایک نوجوان کی خود غرضی کی داستان

25 مارچ 2013 کو میں اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنی خالہ کے گھر گیا۔ میری خالہ سرگودھا شہر کے ساتھ واقع ایک گاؤں میں رہتی ہیں۔ بہار کا موسم اپنے اندر خوشبوؤں کو سموئے پورے ماحول کو اپنے سحر میں جکڑے ہوئے تھا۔ لیکن جونہی ہم خالہ کے گھر میں داخل ہوئے تو سارا ماحول جیسے اُداس ہوگیا اور اس کی وجہ میرا وہ کزن تھا جو گھر کے ایک کونے میں چارپائی پر پڑا تھا۔ جس کا نام راشد ہے، کسی زمانے میں وہ بھی اس خوب صورت ماحول میں زندگی کے مزے لوٹ رہا تھا مگر آج وہ فالج کے مرض میں مبتلا ہے۔ گزشتہ سال جب میری اس سے ملاقات ہوئی تھی تب اس کی زبان اس کا ساتھ دے رہی تھی اور اپنی کہانی اس نے مجھے سنائی مگر اب وہ بالکل چپ چاپ تھا، نہ بول سکتا ہے اور نہ ہی حرکت کرسکتا ہے، وہ کہانی جو راشد نے مجھے سنائی وہ ساری کہانی راشد کی زبانی سنتے ہیں۔

میرا نام راشد ہے اور میری پیدائش ایک متوسط طبقے میں ہوئی۔ مجھے ایک سرکاری اسکول میں داخل کرایا گیا۔ وقت گزرتا گیا اور میں نے مڈل کا امتحان پاس کرلیا۔ میرے والد صاحب جو کہ منڈی میں محنت مزدوری کیا کرتے تھے، مشکل سے گھر کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔

والد صاحب کی خواہش تھی کہ میں میٹرک کرکے فوج میں شمولیت اختیار کروں لیکن میرا ذہن ہائی اسکول میں جا کر آوارہ گردی کی طرف مائل ہوگیا۔ آئے دن اسکول میں ہم جماعتوں کے ساتھ شہر میں گھومتا رہتا۔ آہستہ آہستہ پڑھائی سے میرا دل اُچاٹ ہوتا گیا اور یوں مجھ سے میٹرک کا امتحان پاس نہ ہوسکا۔ مجھے اب پڑھائی میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ اب میرا دل گھر کے ماحول سے بھی اُکتا گیا تھا کیوں کہ صبح وشام والدین کی باتیں سنتے ہی گزر جاتی تھیں۔

ایک دن میں گھر میں اکیلا ہی بیٹھا تھا کہ میرے ایک دوست امجد نے آ کر مجھے بتایا کہ ہمارا مشترکہ دوست سعید کراچی سے آیا ہوا ہے۔ سعید کراچی میں گزشتہ تین سال سے کام کر رہا تھا۔ وہ رنگ ساز کا کام کرتا تھا۔ ہم دونوں دوست سعید سے ملنے کے لیے اس کے گھر گئے۔ سعید کے گھر والوں نے خوب خاطر تواضع کی، سعید نے بتایا کہ وہ عیدالاضحیٰ کے بعد واپس کراچی جائے گا۔ سعید نے مجھے کراچی آنے کو کہا تو میں نے بھی پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی جانے کی نیت کرلی۔ گھر میں والدین سے بات کی تو پہلے تو انہوں نے منع کیا، پھر میری ضد کے آگے ہار مان لی۔

یہ 1990ء کی بات ہے جب ایک شام میں اپنے دوست سعید کے ساتھ کراچی جانے کے لیے تیار ہوا۔ گھر والوں سے جب ملا تو سارے گھر والے رو رہے تھے۔ لیکن امی نے مجھے دعاؤں کے ساتھ گھر سے رخصت کیا۔ شام چھ بجے سرگودھا ریلوے اسٹیشن سے سپر

ایکسپریس کراچی کے لیے جاتی تھی۔ ہم پانچ بجے سرگودھا ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے تھے۔ میرے والد صاحب اور میرے دو دوست مجھے ریل گاڑی پر بٹھانے کے لیے آئے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پر خوب گہما گہمی تھی۔ ہر طرف مسافروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے جوق در جوق ریلوے اسٹیشن پر مسافروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر گاڑی آئی تو میں اور میرا دوست اپنے والد اور دوستوں کی دعاؤں کے ساتھ سرگودھا ریلوے اسٹیشن سے کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔

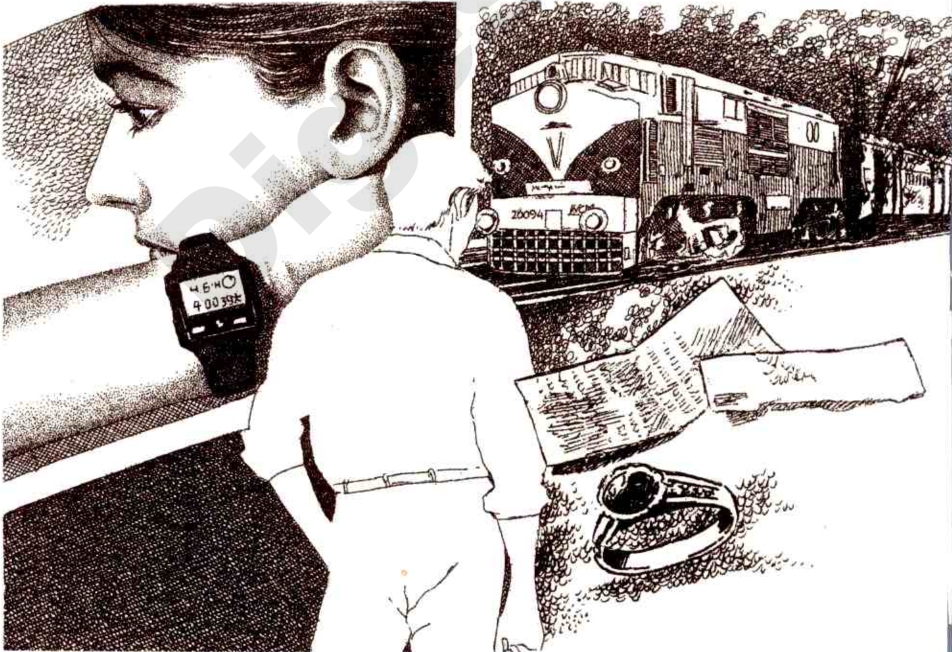
میں زندگی میں پہلی بار ریل گاڑی کا سفر کر رہا تھا اور وہ بھی اتنا لمبا سفر۔ جب سرگودھا ریلوے اسٹیشن آنکھ سے اوجھل ہوا تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ اک انجانی سی اُداسی میرے دل و دماغ پر چھا رہی تھی۔ جیسے جیسے رات کی تاریکی گہری ہوتی گئی میرے اندر بھی اک اُداسی کی بستی وسیع تر ہوتی گئی۔

رات کو گاڑی ایک ریلوے اسٹیشن پر رُکی ہم نے اُتر کر اس ماحول کا نظارہ کیا۔ رات کا اندھیرا بہت گہرا ہو چکا تھا۔ ہم جو گھر سے کھانا بنوا کر لے گئے تھے وہ ہم نے کھایا۔ صبح سورج طلوع ہوتے ہی ہم کراچی کی سرزمین پر پہنچ گئے۔ کچھ دن تو ہم نے کراچی کی مشہور جگہوں اور ساحل سمندر کی سیر کی۔ قائداعظم بانی پاکستان کے مزار پر حاضری دی۔

پھر کچھ یوں ہوا کہ پہلے میں نے ایک فیکٹری میں بطور سیکورٹی گارڈ ملازمت اختیار کی، لیکن مجھے اس میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ یہ دیکھ کر میرے دوست نے مجھے اپنے ساتھ ہی رنگ والے کام پر لگوالیا۔ میں کچھ دنوں رنگ والا کام کرتا رہا اور کچھ عرصہ کے بعد میں سارا کام سیکھ گیا۔ اب میں ایک مکمل رنگ ساز بن گیا تھا۔ وقت یونہی چلتا رہا۔ میں اپنے ہی بل بوتے پر کوٹھیوں پر رنگ کرنے کے ٹھیکے لیا کرتا تھا۔

وقت کی رفتار کبھی رُکتی نہیں، ہمارے پڑوس میں گجرات سے تعلق رکھنے والے اخلاق بھائی ساتھ ہی رہتے تھے ان سے کافی دوستی ہو گئی تھی۔ میرا ان کے گھر آنا جانا اکثر لگا ہی رہتا تھا۔

ایک دن جب شام کو میں گھر آیا تو محلے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لوگ زاروقطار رو رہے تھے پتا چلا کہ اخلاق بھائی ایک حادثے میں اس فانی دنیا سے ہمیشہ کے لیے کوچ کر گئے ہیں۔ میری آنکھیں بھی آنسوؤں سے نم تھیں، خیر



اگلی صبح اخلاق کو سسکتی آہوں کے ساتھ دفن کر کے واپس لوٹ آئے۔ مجھے اخلاق کی بیوی فرحانہ جو کہ اب بیوہ ہو چکی تھی اور اس کے معصوم بچوں کو دیکھ کر دُکھ اور افسوس ہو رہا تھا۔ فرحانہ ابھی جوان تھی اور اخلاق کی موت کے بعد اب فرحانہ کے والد فرحانہ کے ساتھ ہی مستقل رہنے لگے تھے۔ فرحانہ کے والد سے بھی میری سلام دعا زیادہ ہو گئی تھی۔ اکثر فارغ اوقات میں ان کے پاس جا کر بیٹھتا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھے پاس بٹھاتے ہوئے کہا کہ بیٹا آپ سے ایک بات کرنی ہے۔'' پھر انہوں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا کہ جوان بیٹی کی بیوگی ان سے دیکھی نہیں جاتی اور وہ کب تک فرحانہ کے ساتھ رہیں گے، لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ میں فرحانہ سے نکاح کرلوں۔'' ان کی بے چارگی مجھ سے دیکھی نہ گئی اور آخر کار میرا فرحانہ سے نکاح ہو گیا۔

فرحانہ کے دو بیٹے قائم اور عقیل تھے، فرحانہ بہت ہی اچھی عورت تھی۔ وقت گزرتا گیا، فرحانہ سے میرا ایک بیٹا عثمان پیدا ہوا دوسرا عرفان۔ لیکن میں خود غرض بنتا گیا اب میری خواہش ہوتی کہ وہ میرے بچوں کا زیادہ خیال رکھا کرے یہ سوچے بغیر کہ وہ تو ان چاروں کی ماں ہے۔ میں گھر میں اکثر فرحانہ کے ساتھ لڑائی جھگڑا کیا کرتا تھا۔ فرحانہ یہ بات سمجھانے کی بہت کوشش کرتی کہ آپ کے اس رویے سے بچوں میں بھی سگے سوتیلے کی سوچ پیدا ہو گی اور آپ کے لاڈ پیار سے یہ بچے بگڑ جائیں گے لیکن لیکن میں اس کی ایک بات بھی نہیں سمجھتا تھا۔ میں فرحانہ کو اکثر مارتا تھا اور مجھے اس پر کوئی ترس نہیں آتا تھا۔ اسی دوران میرے ماموں جو فوج میں ملازم تھے ان کا کراچی میں تبادلہ ہو گیا۔ ماموں اکثر ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ میری بیوی ماموں کی بہت زیادہ عزت کرتی تھی۔ میرے بارے میں وہ ماموں کو بتاتی تھی اور ماموں بھی مجھے سمجھاتے تھے لیکن ان کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ میں انتہائی خود غرض انسان بن چکا تھا۔ کسی کا بھی احساس مجھ میں ختم ہو گیا تھا۔ فرحانہ کے دونوں بڑے بیٹے جیسے تیسے تعلیم مکمل کر کے اب دبئی چلے گئے تھے جبکہ میری خواہش تھی اب کہ وہ تعلیم بھی حاصل نہ کریں لیکن فرحانہ میرے پر تشدد رویے کے باوجود نہیں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ دونوں اپنی تنخواہ ماں کو بھیجا کرتے تھے تو گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ میرے بیٹے عثمان اور عرفان بھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے تھے۔

میرے رویے سے اندر ہی اندر گھل گھل کر آخر کار فرحانہ ٹی بی کی مریضہ بن گئی اور اس کے ساتھ ساتھ نفسیاتی مریضہ بھی بن گئی۔ اب تو مجھے فرحانہ سے ایک عجیب سی الجھن ہوتی تھی۔ فرحانہ کے بیٹوں نے اس کا بہت علاج کروایا لیکن وہ دن بدن کمزور ہوتی گئی۔ میں نے فرحانہ کی قدر نہ کی۔ ایک دن فرحانہ کی طبیعت اچانک بہت زیادہ خراب ہو گئی لیکن میری ہی سستی اور غفلت کی وجہ سے بروقت اسپتال نہ پہنچ سکی اور راستے میں میری بے اعتنائی کا درد لیے اس دنیا سے چلی گئی۔

یہاں سے میرے زوال کا وقت شروع ہو گیا جو مکان اور دکان فرحانہ کے نام تھا وہ میرے بیٹوں نے اپنے نام کروالیا تھا۔ میں فرحانہ کی وفات کے بعد ایک سال تک وہاں رہا اس کے بعد مجھے میرے ہی گھر سے میرے اپنے بیٹوں نے بے دخل کر دیا۔ مجھے میرے گھر سے نکالنا میرے لیے دردناک واقعہ تھا میں 1985ء میں کراچی گیا تھا اور آج 2011ء میں واپس گھر خالی ہاتھ لوٹ رہا تھا۔

میں واپس اپنے گھر بھلوال آ گیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد مجھے فالج کا اٹیک ہو گیا، اور میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔

آج مجھے احساس ہوا ہے کہ جو میں عذاب کی زندگی گزار رہا ہوں یہ میرے اپنے ہی گناہوں کی سزا ہے۔ فرحانہ کے ساتھ جو میں نے ظلم وستم کیے قدرت ان کا انتقام لے رہی ہے۔ اب تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ! میری فرحانہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور اے اللہ مجھے میرے گناہوں کی بخشش فرما کیوں کہ اے رب جلیل! اب تو تیرے سوا میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میرے مالک تُو مجھے معاف فرما دے۔

مجھے معلوم ہے وہ ذات پاک جو بڑی غفور الرحیم ہے۔ وہ تو مجھے معاف کر دے گا۔ لیکن فرحانہ جب تک مجھے معاف نہیں کرے گی مجھے سکون نہیں ملے گا۔ بس اب تو میں قیامت کا انتظار کر رہا ہوں کیوں کہ روز محشر فرحانہ بھی وہاں موجود ہو گی اور میں روزِ محشر فرحانہ کے قدموں میں گر کر اس سے اپنے کیے ہوئے مظالم کی معافی طلب کروں گا۔ پتا نہیں وہ اس روز بھی مجھے معاف کرے گی یا نہیں۔

☆☆......☆☆







اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے، جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ "ناگن"۔ آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا، نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کر دے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا، زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں، آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر :10

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پردادا کو اس کے گرو نے مرتے سمے شیش ناگ کا جوڑا دان کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سنہری روشنی۔ آنکھوں کی سنہری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں۔ اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آ جائیں گے، بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں چھپے خزانے ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے غلام ہوں گے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر ساون میں اماوس کی رات ناگ دیوتا کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے پرکھوں نے ان ناگوں کو ناز و نعم سے پالا تھا اور نگہبانی کا یہ عمل اب جوگی مہاراج کے حصے میں آ چکا تھا۔

وہ رات بھی اماوس کی رات تھی اور ان ناگوں کی عمر کے سو سال مکمل ہونے جا رہے تھے۔ جوگی مہاراج نے یہ کہانی بیس سال سے ساتھ رہنے والے چیلے صابو کو سنائی تو اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا۔ گرو مہاراج ہاتھ میں خنجر تھامے ناگ منتر کا جاپ کر رہے تھے اور صابو انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ کر زیرلب مسکرا رہا تھا۔ جاپ مکمل کر کے جوگی مہاراج نے بلی کا عمل مکمل کیا۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشنان کر رہے تھے اور سرخ زبانیں نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر غور سے دیکھ رہے تھے، یہ ہی وہ لمحہ تھا جس کا صابو کو انتظار تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں خنجر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج پتھرائی آنکھوں سے اپنے چیلے کو دیکھتے رہ گئے۔ صابو لاش ٹھکانے لگا کر جب کمرے میں آتا ہے تو پٹاری والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی موجود تھے۔ صابو انہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شکنتلا تجویز کرتا ہے۔ تب ارجن اور شکنتلا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صابو ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلا ہے۔ تب صابو کے خون سے شیش ناگ کا یہ جوڑا اپنی پیاس بجھا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔

لوگ اسے دیکھ لیتے ہیں اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شکنتلا غصے میں آ جاتی ہے اور کہتی ہے۔ "ارجن کے قاتلوں! تم نے میرے ناگ کی ہتھیا کر کے بڑا انیائے کیا، تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں، شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی، تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے گی۔ ایک ایک کو تڑپا تڑپا کر ماروں گی میں پھر آؤں گی اور تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔"



شکنتلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگتی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تابانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک جا پہنچتی ہے۔ مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اسے اپنی کنیز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

مہارانی ماریہ مہاراجہ رام ناتھ کو بتاتی ہے کہ شکنتلا ناگن ہے اور انسانی روپ میں انہیں بے وقوف بنا رہی ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی پنڈت گرونرائن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ مہاراج اس سے کہتے ہیں کہ اگر شکنتلا ناگن ہوئی تو اس کو آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو ماریہ کو اسی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک ہجوم شکنتلا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے۔ مہارانی ماریہ اپنے لباس میں چھپا کر لایا جانے والا آئینہ اچانک شکنتلا کے سامنے کر دیتی ہے جس میں ایک بڑی سی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ سپہ سالار بلگرام شکنتلا کے بجائے راجہ رام ناتھ کو گرفتار کر لیتا ہے۔

سامری شکنتلا، بلگرام اور پریہ تابانہ کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ظلم کا راج تھا۔ شکنتلا جاپ کے ذریعے کالی ماتا کی مہان شکتی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شکنتلا اب صرف ناگن نہ تھی بلکہ جادوگرنی بن چکی تھی۔

شکنتلا سبز آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والے نوجوان کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتی ہے۔ وہ شکنتلا کو بتاتا ہے کہ وہ جنات کے بادشاہ خسکران کا بیٹا شکران ہے اور تمہارا کوئی جادو مجھ پر کارگر نہیں ہوگا۔

شکنتلا خسکران کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ وہ بھی اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سامری گرونرائن کو منڈل جاپ سے باز رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گرو شداد کی روح سے مدد طلب کرتا ہے۔ سامری جادوگر کی ملاقات خسکران سے ہوتی ہے۔ شکنتلا، شکران اور سامری تینوں گرونرائن کے منڈل کے پاس جا پہنچتے ہیں لیکن گرونرائن اپنا جاپ مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

شکنتلا کی ساری شکتیاں معطل ہو گئی تھیں اب وہ بالکل ایک عام سی کمزور بے بس لڑکی تھی۔ گرونرائن شکنتلا سے کہتا ہے کہ چھنکار سے بولو کہ آئندہ تمہیں مالکن نہ کہے بلکہ براہ راست میرا حکم مانے۔

ادھر پریہ حیران تھی کہ کئی دن گزر گئے نہ شکنتلا واپس آئی اور نہ سامری یا خسکران۔ پریہ کو پتا تھا گرونرائن شکنتلا کو غلام بنانا چاہ رہا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ شکنتلا کا غلام بن جانا اس کے حق میں بہتر ہے تاکہ وہ حکومت پر قبضہ کر کے ملکہ بن جائے تب اچانک خسکران آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ گرونرائن تیرتھ جاپ میں کامیاب ہو کر شکنتلا کے جسم و جان اور اس کی تمام شکتیوں پر قابض ہو گیا ہے اور سامری بھی اس کے پاس قید ہو گیا ہے، یہ سن کر وہ خوش ہو جاتی ہے۔ سامری کو ہوش آتا ہے تو سامنے گرونرائن اور لکشم ناتھ موجود تھے۔ تب وہ اپنے دیوتا کارتیکا کو اپنی سہائتا کے لیے پکارتا ہے، گرونرائن منتر پڑھتا ہے اور نیلی آگ کے شعلے سامری اور شکنتلا کو گھیر لیتے ہیں۔ شکنتلا گرونرائن کو بھی اس آگ میں کھینچ لیتی ہے اور ان کے جسم جلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب شکنتلا کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ ایک ویران اور بنجر جگہ پر موجود تھی۔ اس کا جسم بری طرح جلا ہوا تھا اور زخموں میں پیپ پڑ چکی تھی، اسی حالت میں شکنتلا تڑپتی سسکتی آبادی تک پہنچتی ہے جہاں اس پر کتے حملہ کر دیتے ہیں اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب اس کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک گھر میں موجود ہوتی ہے ایک نوجوان لڑکا، لڑکی اور ادھیڑ عمر عورت اور مرد موجود تھے۔ علاج اچھی خوراک اور مکمل آرام سے اس کے زخم بھرنے شروع ہو چکے تھے۔ لڑکی سندری شکنتلا کی دوست بن گئی ہے۔ شکنتلا دیکھتی ہے کہ سندری کا بھائی گگن رات گئے چپکے سے روز باہر نکل جاتا ہے۔ شکنتلا کو خود میں خون کی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ چھنکار کو یاد کرتی ہے۔ وہ اس وقت حیرت زدہ رہ جاتی ہے جب چھنکار کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتی ہے، وہ سوچتی ہے کہ اس کو کھوئی ہوئی شکتیاں واپس مل گئی ہیں۔

شکنتلا کھوئی ہوئی شکتیاں پا کر کھلکھلا اٹھتی ہے۔ گاؤں کے کھیتوں سے نوجوان کی لاش ملتی ہے جس کی شہ رگ کاٹ کر اس کا خون پی لیا گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس بات سے بہت خوف زدہ ہوتے ہیں۔ دلاور نامی شخص جس کو سادھو کوٹھاری نے اپنے بس میں کیا ہوا تھا۔ کوٹھاری دلاور سے کہتا ہے کہ تمہارے ذریعے ایک جن میرے قبضے میں آئے گا جو میرے تمام کام پل بھر میں کر دے گا۔ پھر تو بھی کوٹھاری کا چیلا بن کر عیش کرنا۔ پریہ خسکران اور دونوں کی مدد سے حکومت کر رہی تھی اور دونوں کو خوش رکھتی تھی۔ تب ایک روز خسکران شکنتلا کی تلاش میں نکلتا ہے اور پھر واپس نہیں آتا اور پھر ایک روز وہ بلگرام کو بھی قید خانے میں ڈال دیتی ہے جہاں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ کر بلگرام بھی بے بسی کی موت مارا جاتا ہے۔

شکنتلا کو چھنکار بتاتا ہے کہ سندری کے بھائی گگن کو ایک چڑیل خوب صورت لڑکی بن کر اپنے جال میں قید کر چکی ہے اور روزانہ تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا خون پیتی ہے۔ چھنکار شکنتلا کو اس جگہ لے جاتا ہے جہاں گگن مدہوشی کی حالت میں تھا اور وہ لڑکی اس کا خون

پینے کو اس پر جھکی ہوئی تھی۔ تب وہاں اچانک شکنتلا نمودار ہوتی ہے اور کالی دیوی کا جاپ پڑھ کر اس چڑیل کو آگ لگا کر ہلاک کر دیتی ہے۔ گگن کو ہوش آتا ہے تو وہ اسے سب بتا کر گھر واپس جانے کا کہتی ہے۔

سپیرا کرونڈیا اور اس کے چیلا شیش ناگ کو اپنے بس میں کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ بڑی تپسیا میں مصروف تھے۔ کوٹھاری دلاور کو ساتھ لے کر قبرستان پہنچتا ہے اور کدال سے ایک قبر کی مٹی ہٹاتا ہے۔ قبر سے جواں سالہ عورت کی لاش نکلتی ہے۔ دلاور اس کے بال کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے۔ وہاں سے کوٹھاری اسے ایک مکان کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے اور دلاور سے کہتا ہے کہ اس مکان میں میاں بیوی اور ان کی ایک جواں سال بیٹی ہے، بوڑھے کو باہر بلا کر میں ابھی قتل کرتا ہوں، جبکہ لڑکی کو تو ہی لائے گا میرا ہاتھ لگانا منع ہے۔ اس کے بعد دلاور دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اندر سے ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکلتا ہے، کوٹھاری اس پر حملہ کر دیتا ہے اور اسے گردن سے دبوچ لیتا ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر دلاور مکان میں گھس جاتا ہے۔ جہاں ایک کمرے میں نوجوان دوشیزہ موجود تھی اور دروازے کی آواز سے نیند سے بیدار ہوئی لگتی تھی۔ وہ دلاور کو دیکھ کر خوف زدہ ہو کر چلانے لگتی ہے۔

دلاور اس لڑکی کو بے ہوش کر کے باہر کوٹھاری کے پاس لے آتا ہے، کوٹھاری اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہے، اور دلاور کے ساتھ اپنی شکتی کے ذریعے ایک بنجر اور بیابان علاقے میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اس دوشیزہ کو ایک چتا پر لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتا ہے۔ لڑکی ہوش میں آ کر رونے گڑگڑانے لگتی ہے۔ دلاور کو اس پر ترس آ جاتا ہے اور وہ کوٹھاری پر حملہ کر دیتا ہے۔ کوٹھاری غصے میں آ کر اسے ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت سے محروم کر دیتا ہے اور پھر اپنے جنتر منتر میں مشغول ہو جاتا ہے، تب ایک نیلا شعلہ آسمان سے زمین کی طرف آتا ہے جس کے ساتھ دھواں سا تھا، وہ دھواں جو کہ حکمران جن تھا، آہستہ آہستہ بوتل میں داخل ہو جاتا ہے۔ کوٹھاری ڈھکن لگا کر بوتل کا منہ بند کر دیتا ہے اور خوشی میں ناچنا شروع کر دیتا ہے اور دلاور سے کہتا ہے کہ کوٹھاری آج بہت بڑی شکتی بن گیا ہے، ایک جن اس کے قابو میں آ گیا ہے جو اس کے سارے کام کرے گا۔

کوٹھاری اس سارے عمل کے بعد سامان سمیٹ کر اٹھنے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے کہ راجہ ہری داس کے سپاہی اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ راجہ ہری داس عیاش ہونے کے باوجود ایک رحم دل اور رعایا کا خیال رکھنے والا حکمران تھا۔ اس نے جادوگر اور جادوگرنیوں کے



خلاف سخت قانون بنایا ہوا تھا جس کی وجہ سے پوری راجدھانی میں جادوٹونے کرنے والا نہیں تھا۔ کوٹھاری کئی باراس جرم میں گرفتار ہوا تھا لیکن وہ ہر بار فرار ہو جاتا۔ اس بار اسے گرفتار کر کے ہری داس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور سزا کے طور پر اس کے ہونٹ سی دیے گئے تھے۔ ہری داس کو کوٹھاری کے تھیلے سے برآمد ہونے والا سامان دکھایا جارہا تھا جس میں ایک شیشے کی بوتل بھی تھی جس میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ راجہ اس بوتل کو کھولنے کا حکم دیتا ہے اور چند ہی لمحوں میں میدان میں خسکران جن موجود تھا جو بوتل میں بند تھا۔ تمام لوگ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ خسکران کوٹھاری کو آزاد کروا دیتا ہے اور وہ اسے پوری ریاست کو آگ لگا دینے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر گگن شکنتلا کے متعلق سوچتا ہے کہ شکنتلا کو کیسے اس چڑیل کا پتا چلا اور کیسے اسے ختم کر دیا۔ شکنتلا گگن سے رات کو گاؤں سے باہر بیری کے درختوں کے پاس ملنے کے لیے کہتی ہے۔ شکنتلا کو خون کی پیاس بے تاب کرتی ہے، لیکن گگن کے گھر والوں کے احسانات کی وجہ سے وہ گگن کا خون پینا مناسب نہیں سمجھتی۔ وہ رات کے وقت سانپ کے روپ میں ایک گھر میں داخل ہو جاتی ہے اور ایک عورت کے خون سے اپنی پیاس بجھاتی ہے۔ ان خونی وارداتوں سے گاؤں میں کہرام مچ جاتا ہے۔ پنچایت میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ گاؤں میں نئے آنے والوں کو علاقہ بدر کر دیا جائے اور وہ لوگ گاؤں کے مکھیا گگن کے پتا سے شکنتلا کو بھی علاقے سے باہر نکالنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے)

''شکنتلا ایک بات کہنے میں آیا ہوں۔''

''بولو...... بولو۔'' شکنتلا کے چہرے پر سے زلفیں ہٹاتے ہوئے بولی۔

''اگر تمہاری ملاقات...... باپو سے پہلے مجھ سے ہو جاتی تو بہت بہتر ہوتا۔''

''اچھا جی......'' شکنتلا اندازِ دلربائی سے آنکھیں پھیلا کر ہنسی۔ ''پھر کیا ہوتا بھلا؟''

''میں...... میں...... تم......'' پرشاد مارے شرم کے بات مکمل نہ کر سکا۔

''تم باپو کی جگہ مجھ سے پھیرے لے لیتے...... ہے نا...... یہی بات کہنا چاہ رہے تھے تم۔'' شکنتلا اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر بولی اور پھر خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پرشاد ہونق بن کر اس کا منہ تکنے لگا۔

''ایک بات سچ سچ بتاؤں پرشاد برا تو نہیں مانو گے؟'' لوہا گرم دیکھ کر شکنتلا نے پینترا بدلا۔

''جی حکم؟'' پرشاد ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''جب سے میں رانی بنی ہوں...... نام کی ہی رانی ہوں...... عملی طور پر تمہارے باپو سے کچھ نہیں ہو سکا۔''

''کک کیا مطلب...... کیا تم ابھی کنواری ہو؟''

''بالکل......'' شکنتلا نے صدی کا سب سے بڑا جھوٹ پورے اعتماد سے بول دیا۔

''پرنتو اب کیا ہو سکتا ہے؟'' پرشاد نے مایوسی کا اظہار کر دیا۔

''سب کچھ ہو سکتا ہے پرشاد...... صرف اٹل ارادے اور مضبوط دل ہونا چاہیے۔''

''یعنی......؟''

''یعنی یہ کہ تم راجہ بننا چاہتے ہو؟''

''سچ تو یہی ہے۔'' پرشاد نے فراخدلی سے کہا۔

''اور اروپ کے دل میں رانی بننے کی تمنا ہے!''

''یہ بھی حقیقت ہے!''

''اپنے باپو کا خون کر سکتے ہو؟''

''جی......؟'' پرشاد کی آنکھوں میں تذبذب اُبھر آیا۔

''اروپ کے ہاتھوں کھانے میں زہر ملوا دو۔'' شکنتلا سپاٹ لہجے میں بولی۔

''اور باپو کی ہتھیا کے بعد اروپ کو اسی جرم میں سزائے موت ہو جائے اور تم راجہ بن جاؤ۔''

''لیکن سوتیلی ماتا ہونے کے ناتے ہمارے پھیرے پر جنتا اور برہمچاری بغاوت کر دیں گے!''

''کیا کنیزوں اور پلنگ داسیوں کے ساتھ تم پھیرے کرتے ہو۔'' شکنتلا کھڑی ہو کر بولی۔

''نہیں......لیکن وہ بات ہماری شاہانہ روایات کا ایک حصہ ہیں۔''

''تو پھر جناب پرشاد صاحب شکنتلا نے اس کی پشت پر آ کر باہیں اس کے گلے میں ڈال کر کہا۔ میں ابھی اسی محل میں سارا جیون......آپ کی پلنگ داسی بن کر جیوں گی......اس پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے گا۔'' شکنتلا نے تجویز پیش کی۔

''تم تو خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ مکمل طور پر عقلمند بھی ہو شکنتلا۔'' پرشاد خوشی سے کھڑا ہو گیا اور کھینچ کر شکنتلا کو اپنے سامنے کر کے اسے باہوں میں لے لیا۔

''کنیز حاضر ہو سکتی ہے۔ رانی ماتا۔'' باہر سے آواز آئی تو دونوں سنبھل کر اپنی نشستوں پر جم گئے۔

''آ جاؤ......'' شکنتلا سنجیدگی سے بولی اور ایک کنیز لکڑی کے پہیوں والی چھوٹی سی میز دھکیلتی ہوئی اندر لے آئی جس پر چائے دانی اور ہرن کے گرما گرم کباب رکھے تھے۔

☆......☆

شکنتلا اور راجہ جے کشن کھانے کی میز پر دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے!

چند ہی نوالے کھانے کے بعد جے کشن نے ہاتھ روک لیا اور دائیں ہاتھ سے اپنا سینہ آہستہ آہستہ ملنے لگا۔

''کیا ہوا......مہاراج؟'' شکنتلا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں شکنتلا۔ بلکہ یوں لگتا ہے کھانے کے اندر کوئی زہریلی شے ملی ہوئی ہے۔''

شکنتلا فوراً اُٹھ کر جے کشن کی طرف آئی۔ لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی دو کنیزوں نے راجہ کو تھام لیا اور بستر کی طرف لے کر چلیں۔

بستر پر لیٹتے ہی راجہ تڑپنا شروع ہو گیا کنیزوں غلاموں کے رنگ فق ہو گئے جاؤ......راجکمار کو بلا کر لاؤ۔ شکنتلا تیزی سے بولی۔ تو ایک کنیز تیزی سے باہر کو دوڑی۔ ''تم شاہی طبیب سے رابطہ کرو۔'' شکنتلا نے دوسری کنیز کو حکم دیا اور خود راجہ کا سینہ ملنے لگی۔ وہ تمام صورتحال سمجھ چکی تھی لیکن خاموشی کا لبادہ اوڑھے تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں باہر دوڑتے قدموں کی آواز آئی اور چند ہی لمحوں میں راجکمار اور شاہی طبیب اندر آئے جے کشن اب بری طرح بستر پر تڑپ رہا تھا۔ اس کا رنگ نیلا پڑنا شروع ہو گیا۔ پیچھے اروپ بھی آ گئی اس کے چہرے پر اُداسی کے پیچھے چھپی مسرت کو شکنتلا نے بھانپ لیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ آخری لمحوں میں اگر پرشاد کے دل میں اروپ کی محبت دوبارہ جاگ اُٹھتی ہے اور وہ شکنتلا کو موردِ الزام ٹھہرا دے تو پھر بھی کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ یہ لوگ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

شاہی طبیب نے فوراً اپنا حکیمی تھیلا کھولا اسی اثناء میں راجہ کے منہ سے نیلی جھاگ نکلنا شروع ہو گئی طبیب نے ایک ڈبیہ نکال کر اس میں سے کچھ سفوف نکالا اور پانی کا کٹورہ طلب کیا اور بغیر وقت ضائع کیے سفوف منہ میں زبردستی ڈال کر پانی کا کٹورہ ان کے منہ سے لگا دیا۔ پرشاد اور شکنتلا نے راجہ کو مضبوطی سے تھاما اور زبردستی دوا ان کو پلا دی۔ اتنی دیر میں یہ خبر محل میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ راجہ جے کشن کو زہر دے دیا گیا۔ درجنوں غلام کنیزیں رشتہ دار اور انتظامیہ کے افراد باہر راہداری میں جمع ہو گئے تھے۔ اروپ کمرے میں ایک طرف سینے کے نیچے ہاتھ باندھے مطمئن انداز میں کھڑی تھی۔ اسے یقین تھا کہ راجہ کی موت کے بعد حکمرانی اس کے حصے میں آئے گی۔ اور زہر دینے کا الزام شکنتلا پر دھر دیا جائے گا۔ یعنی ایک تیر سے دو شکار ہوں گے۔

شاہی طبیب نے معدے سے زہر نکالنے کے لیے الٹی کی دوا دی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں دوا اثر دکھا گئی اور راجہ جے کشن زوردار الٹیاں کرنے لگے۔ لیکن دیر ہو گئی تھی۔ زہر اندر سے آنتیں کاٹ چکا تھا اور رگوں کے راستے خون شامل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جے کشن الٹیاں کرتے کرتے بستر سے نیچے گر گئے اور ساکن ہو گئے تھوڑی ہی دیر میں شاہی طبیب نے ان کی موت کا اعلان کر دیا۔

راجہ جے کشن کے مرتے ہی محل میں کھلبلی مچ گئی۔ شکنتلا راجہ کے ساتھ ہی کھانا کھا رہی تھی اور اس کو کچھ نہ ہوا تھا۔ لہٰذا ہر کوئی

اسے کچھ شک کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اروپ بھی اس الزام تراشی اور افواہ سازی میں پیش پیش تھی۔ اس نے تمام غلاموں، کنیزوں کو حکم دیا کہ یہ بات پورے شہر میں پھیلا دی جائے کہ جے کشن اور شکنتلا اکٹھے کھانا کھا رہے تھے جے کشن زہر سے مر گیا جبکہ شکنتلا کو کچھ نہ ہوا...... یعنی زہر شکنتلا نے راجہ کے کھانے میں ملایا تھا۔ شکنتلا نے وہ تمام کھانا ایک طرف سنبھال کر رکھ دیا۔

ادھر پرشاد نے اعلیٰ سطح کا اجلاس بلایا جس میں وزیر مشیر اور درباری شریک تھے۔

اجلاس کے تھوڑی ہی دیر کے بعد سپاہیوں کا دستہ شکنتلا کے کمرے میں آیا اور تمام کھانا اور باقی برتن اور پانی کی صراحی بمعہ کٹورے کے قبضہ میں لے لیا اور شکنتلا کو بھی ساتھ چلنے کا کہا۔ اروپ بھی پرشاد کے ساتھ بیٹھی تھی!

رانی ماتا...... آپ پر الزام ہے کہ زہر آپ نے دیا۔ ثبوت یہ ہے کہ وہی کھانا آپ خود بھی تناول فرما رہی تھیں لیکن آپ کو کچھ نہ ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی تھالی میں جو تر کاری تھی اس میں زہر نہ تھا۔'' شاہی طبیب کھانے کا معائنہ کرتے ہوئے بولا۔

شکنتلا کو اجلاس میں بطور ملزم کھڑا کیا گیا تھا۔ جس پر اروپ بے حد خوش تھی۔ ''نہیں۔'' شکنتلا اعتماد سے بولی۔ ''اگر اجازت ہو تو کچھ ثبوت میں بھی پیش کروں۔''

''اجازت ہے۔'' جواب دینے والا شاہی عادل تھا۔ جو مقدمات کی سماعت کرتا تھا۔ جناب عالی دو بلیاں منگوائی جائیں جن پر تجربہ کرسکوں...... شکنتلا نے کہا۔ فوراً دو بلیاں منگوالی گئیں۔

شکنتلا نے راجہ کی تھالی اور اپنی تھالی میں سے گوشت کا ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر دونوں بلیوں کے آگے ڈالا۔ بلیاں فوراً جھپٹ پڑیں اور گوشت چٹ کر گئیں! تھوڑی دیر گزر گئی لیکن کچھ نہ ہوا۔

پھر چاندی کا کٹورہ جس میں پانی پہلے سے پڑا ہوا تھا بلیوں کے آگے رکھا گیا۔ بلیاں پانی پینے لگیں اور پانی پیتے ہی تڑپنے لگیں...... اور لمحوں میں نیلی جھاگ چھوڑتے چھوڑتے مر گئیں!

یہ پانی کا وہ کٹورا تھا جو میرے آگے دھرا گیا تھا اور راجہ کشن نے کھانا شروع کرنے سے پیشتر اپنے کٹورے کا پانی پی لیا تھا۔ باقی باتیں کنیزوں سے سختی کرنے سے پوچھی جاسکتی ہیں۔ شکنتلا اپنا بیان دے کر خاموش کھڑی ہوگئی۔ اب پرشاد اپنی جگہ سے اُٹھا۔ کھانا کھلانے والی جگہ پر پامور کنیزیں گرفتار کر کے لائی جائیں۔

کنیزیں آگئیں...... تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ رنگ فق ہو چکے تھے۔

راجکمار پرشاد اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر بولا۔ ابھی تھوڑی دیر میں تم سب کو پہلے کوڑے مارے جائیں گے اور پھر ہاتھی کے پاؤں تلے تمہیں کچل دیا جائے گا۔ کیوں کہ راجہ صاحب زہریلا پانی پینے سے پرلوک سدھارے۔ اور کھانا اور پانی تم نے رکھا تھا۔

''نہیں جہاں پناہ......'' چاروں کنیزیں ایک ساتھ بول پڑیں۔

کوئی ایک بولو پرشاد کڑکا۔

اب جو کنیز معتبر نظر آتی تھی بولی سرکار کھانا ہم نے لگا دیا تھا کہ راجکماری اروپ آگئیں۔

''بکواس بند کر کتے کی بچی۔'' اروپ ایک دم اپنی جگہ کھڑی ہوگئی۔

سب لوگوں نے بے ساختہ گردنیں گھمائیں۔

''تم خاموش رہو۔'' پرشاد بولا۔ اپنا بیان جاری رکھو کنیز پرشاد نے کنیز کو حکم دیا۔

''راجکماری اروپ نے میز پر سے صراحی اٹھوا کر اپنے ساتھ آئی کنیز للیتا کو کہا کہ وہی صراحی لے آؤ...... راجکماری جی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ وہی صراحی ہے جس کے ساتھ ہم رنگ کٹورے اروپ جی کے پاس ہوں گے۔ جن کٹوروں میں پانی رکھا گیا وہ صراحی سے ہم رنگ نہیں ہیں۔

ان تمام باتوں کی تفتیش کی گئی تو تصدیق ہوگئی اور راجکمار نے اروپ کی فوری گرفتاری کا حکم جاری کردیا۔

''پرشاد'' اروپ چیخنے لگی۔ ''تم ہمارے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ نہیں کرسکتے۔ ہم تمہیں دیکھ لیں گے۔ ہمارے بھائیوں کو اس بات کا پتہ چلنے دو...... وہ شادھنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے!''

لیکن اروپ کو شاہی اہلکاروں نے گھیرے میں لے لیا۔ اروپ بے عزتی اور غصے سے اول فول بکنے لگی اور سپاہیوں کو دو ہتڑ مارنے لگی۔ لیکن اس کی ایک نہ سنی گئی۔ کنیزوں کی مدد سے اس کے دونوں ہاتھ رسی سے پشت پر لے جا کر باندھ دیئے گئے۔

اس وقت راجکمار پرشاد کی تاجپوشی کا اعلان کر دیا گیا اور راجہ جے کشن کی ارتھی تیار ہونے لگی۔ شاہی مرگھٹ میں چتا بنانے کا حکم جاری کر دیا گیا۔ شاہی پنڈت اور پروہت جمع ہونے لگے۔ جے کشن کی آخری رسومات میں شرکت کی دعوت کے لیے پیغامات لے کر ہرکارے روانہ ہو گئے۔

لیکن یہاں بھی شکنتلا نے ہوشیاری دکھائی اور فوری طور پر درزی بلوا کر خوب صورت مخمل کا نرم و ملائم سیاہ رنگ کا لباس سلوا لیا۔ سیاہ جوتے اور چست سیاہ لباس کے ساتھ بالوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ اور سیاہ گلاب کے پھولوں کے گجرے پہن کر ماتمی انداز اپنا لیا۔ بناؤ سنگھار سے بے نیاز گورا گلابی چہرہ۔ وہ جدھر سے گزرتی سب لوگ جب تک وہ نظر آتی رہتی دیکھتے رہتے...... یوں اس نے پتی کی موت میں سے حسن کی نمائش کا ذریعہ ڈھونڈ لیا۔

اگلے دن تک پرشاد جے کشن کی تعزیت کے لیے آنے والوں اور بعد از مرگ تقریبات میں مگن رہا اور چوتھے دن...... ایک ضروری ریاستی کام کے سلسلے میں اسے دوسرے شہر جانا پڑ گیا۔ پرشاد چند دن بعد آنے کا کہہ کر روانہ ہو گیا۔ پرشاد کے جاتے ہی شکنتلا نے محافظوں کے ہمراہ محل کی حدود کے اندر ہی قائم زنداں کی راہ لی۔ جہاں اروپ قید تھی۔

شکنتلا کی آمد کی اطلاع پا کر تمام عملہ مستعد ہو چکا تھا۔ شکنتلا کے پہنچتے ہی اس کا شاہی استقبال کیا گیا۔ کوتوال سے اس نے اروپ سے ملنے کا عندیہ دیا۔ تو فوراً ہی شکنتلا کو اروپ تک پہنچا دیا گیا۔ شکنتلا نے تمام محافظوں کو باہر صحن میں رہنے کا حکم دیا اور اکیلی کمرے میں داخل ہو گئی۔

وہاں جا کر شکنتلا حیران رہ گئی کہ قید خانے میں اروپ کو ایک بہت کشادہ کمرہ دیا گیا تھا۔ جو بالکل شاہی محل کے کمرہ کی طرح سجا سجایا تھا اور خدمت کے لیے نوکر چاکر بھی موجود تھے اور اروپ وہاں بھی شاہانہ پوشاک زیب تن کئے گھوم رہی تھی۔

شکنتلا کو دیکھتے ہی اروپ غصے سے کھڑی ہو گئی۔ ''کتے کی بچی تو کیا سمجھتی ہے کہ میرے پتا اور بھائی تجھے زندہ چھوڑیں گے! وہ تیری بوٹیاں کر کے چیلوں کے آگے ڈال دیں گے۔'' اروپ کے وہی ڈھنگ دیکھ کر شکنتلا پہلے ہی حیران ہو رہی تھی۔ اس کا لہجہ دیکھ کر شکنتلا نے اسے بھرپور سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ خراماں خراماں آگے بڑھی اور مسکرائی، اس کے ساتھ ہی الٹا ہاتھ پھیر کے چٹاخ کی آواز کے ساتھ ایک بھرپور چانٹا اروپ کے رخسار پر دے مارا۔

''بہت دیکھ لیا تو نے عیش و عشرت اور بہت کر لی تو نے بکواس...... آج کے بعد تیرے ساتھ وہی ہو گا جو شکنتلا چاہے گی۔''

''تیری یہ جرأت کمینی عورت۔'' اروپ بھری شیرنی کی طرح شکنتلا پر جھپٹی تو شکنتلا نے ایک اور طمانچہ اسے کھینچ مارا۔ بھلا دھان پان سی اروپ شکنتلا کی بھرپور طاقت اور جسم کے آگے کیا وقعت رکھتی اپنے گال پر ہاتھ رکھے ششدر نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''کوتوال کو بلاؤ۔'' شکنتلا نے ایک کنیز کو حکم دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں کوتوال حاضر ہو گیا!

''ابھی اور اسی وقت اروپ کی شاہی مراعات ختم کر کے اسے عام قیدیوں کی کوٹھڑی میں بند کر کے اس کی ہر سہولت واپس لے لو...... اس کی یہ پوشاک اتروا کر قیدیوں کا لباس پہنا دیا جائے۔''

''لیکن رانی جی...... یہ راج کماری ہیں راجہ پرشاد نے ان کے لیے خصوصی سہولتیں فراہم کرنے کا کہا ہے۔''

''کوتوال......'' شکنتلا نے ایک زوردار تھپڑ کوتوال کے منہ پر بھی دے مارا۔

''میں اس وقت راجہ کی قائم مقام ہوں مکمل اختیارات رکھتی ہوں۔ حکم عدولی کے جرم میں تمہیں بھی کڑی سزا دے سکتی ہوں۔ فوراً اس کو عام قیدیوں کی طرح کسی تنگ کوٹھڑی میں قید کر کے مجھے دکھاؤ۔''

''جو آپ حکم کریں۔ رانی جی!'' کوتوال نے سہم کر نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا!

اور پھر وہ شکنتلا کو بڑے ادب سے اپنے دفتر میں بٹھا کر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد سپاہیوں کے ہمراہ ہو کر کورنش بجالایا اور شکنتلا اروپ کو دیکھنے اس کے ساتھ ہولی۔

''یہ وہ کالی کوٹھڑی ہے شکنتلا رانی جہاں کا قیدی ہوا روشنی یا باہر کی کوئی آواز سننے سے محروم ہے۔''

اروپ گھٹنوں میں سر دیے ننگے فرش پر بیٹھی سسک رہی تھی۔ تم سب باہر ہی ٹھہرو۔ شکنتلا اکیلی کوٹھڑی میں داخل ہوئی۔ ''میرا باپ راجہ اور بھائی راجکمار ہے اور میں خود راجکماری اور شادھنی کی ہونے والی رانی ہوں۔ کتے کی بچی میں تیری ٹانگیں چیر دوں گی۔'' شکنتلا ہنستے ہوئے بول رہی تھی۔

''اب بھی سمے ہے شکنتلا کہ باز آجاؤ۔ ورنہ میرے بھائی آگئے تو تمہارا انجام بہت بُرا ہوگا۔'' اروپ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے کہا۔ تو شکنتلا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی اور زلفیں جھٹک کر بولی۔ اب تمہارا سہارا صرف یادیں رہ جائیں گی اروپ کل صبح تک تیری ساری اکڑفوں نکال دوں گی! یہ کہتی شکنتلا باہر آ گئی اور کوتوال سے بولی...... کل صبح تک اس کو نہ تو پانی دیا جائے اور نہ کھانا...... اور نہ کوئی اسے ملنے پائے...... بالکل تنہا چھوڑ دو اور فراش پر سونے دو اس کو۔''

''اور اگر انہیں کچھ ہو گیا تو...... رانی جی؟''

''یہ ہماری ذمہ داری ہے تم چنتا نہ کرو۔'' شکنتلا مسکرائی اور چلی گئی۔

☆......☆

شکنتلا جیسے ہی اپنے برامدوں کی طرف آئی تو ایک غلام نے آکر بتایا کہ ہمسایہ ریاست رتن گڑھ سے اروپ کے بھائی آئے ہیں۔ شکنتلا کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''کہاں ہیں؟''

''مہمان خانے میں بٹھا دیے گئے ہیں!'' غلام سر جھکا کر ادب سے بولا۔

''اور ان کے ساتھ آنے والے محافظ؟''

''ان کو ملازمتوں کی کوٹھڑیوں میں بٹھا کر ان کا سامان بھی وہیں پہنچا دیا گیا ہے اور گھوڑے اصطبل میں اور اسلحہ...... اسلحہ خانے میں جمع کروا دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' شکنتلا نے آہستگی سے کہا اور پھر بولی۔ ''مہمانوں کو میرے کمرہ میں اب سے تھوڑی دیر کے بعد عزت و تعظیم سے لے آؤ۔''

''جو حکم رانی ماتا۔''

اب شکنتلا جلدی سے اپنے کمرے میں آ گئی اور تمام خدمت گاروں کو باہر جانے کا حکم دیا اور کہا کہ جیسے ہی مہمان آئیں ان کو اندر بھیج دو اور خبردار کوئی ساتھ اندر نہ آئے۔

تنہائی ہوتے ہی شکنتلا زور سے پھنکاری اور ناگن بن کر ادھر اُدھر گھومنے لگی۔ اور پھر دوسری پھنکار کے ساتھ انسان بن گئی لیکن اب وہ پہلے جیسی ماتمی لباس والی رانی نہ تھی بلکہ انتہائی ہیجان خیز لباس میں ملبوس تھی۔ اس کا چہرہ گلابی ہورہا تھا۔

آہٹ ہوئی...... پردہ ہٹا...... اور دو لمبے تڑنگے گھنی نوکدار مونچھوں والے کرخت آدمی اندر آ گئے۔ دونوں سانولے رنگ کے اور شاہی لباس میں ملبوس تھے۔ ان کے آتے ہی پیچھے سے دروازہ بند ہو گیا۔ دونوں کی نظر جیسے ہی شکنتلا پر پڑی۔ ٹھٹھک کر رہ گئے۔

شکنتلا فوراً سواگت کو بڑھی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

''پدھاریئے معزز مہمانان گرامی......'' اس نے ہاتھ سے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

دونوں خاموشی سے بیٹھ گئے...... اور اس شعلہ جوالہ کو دیکھنے لگے جو حسن کا مجسمہ تھی۔

''جی فرمایئے؟'' شکنتلا صوفے پر بیٹھ کر دونوں پاؤں جوتوں سمیت میز پر رکھ کر بولی۔

''ہم اروپ کے بھائی ہیں۔ پرشاد کہاں ہے؟''

''پرشاد تو دوسرے شہر گئے ہیں۔ شکنتلا بولی۔ جو بات ہے مجھے بتایئے۔''

''اروپ کہاں ہے؟'' جگدیش ادھر اُدھر دیکھ کر بولا۔
''اروپ تو زنداں میں بھوکی پیاسی ایڑیاں رگڑ رہی ہوگی۔'' شکنتلا ہنس کر بولی۔
''ادائیں دکھا کر ہمیں رجھانے کی ضرورت نہیں لڑکی۔ ہم لوگ ذرا غلط سلط ہیں۔''
''ہم بھی غلط سلط ہیں۔ شکنتلا بدستور اسی لہجے میں بولی۔ اور سنو۔ اروپ کی رہائی بہت مشکل ہے۔ اس نے راجہ جے کشن کو زہر دے کر ہلاک کر دیا ہے۔ اب اسے سزائے موت ہوگی۔''
''ہمارے جیتے جی کون ہے جو اسے موت کی سزا سنا سکے۔''
''میں شکنتلا...... یعنی رانی ماں...... میں اس کو موت کی سزا دوں گی اور تمہاری مرضی سے!''
''تمہاری یہ جرأت کمینی عورت......'' راجیش اور جگدیش دونوں ایک ساتھ شکنتلا پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ شکنتلا تک پہنچتے ایک خوف ناک پھنکار کے ساتھ شکنتلا ناگن کا روپ اختیار کر گئی۔
جادوگری کا انہونا تماشا دیکھ کر دونوں بھائی خوف سے ساکت ہوگئے۔ جبکہ شیش ناگن تیزی سے ان کے گرد گھومنے اور پھنکارنے لگی۔ جگدیش اور راجیش اب پیچھے ہٹنے لگے تو شکنتلا پھر پہلے والے انداز میں اپنی ٹانگیں میز پر رکھے بیٹھی خوب صورت زلفوں میں انگلیاں پھیرتی اور مسکراتی دکھائی دینے لگی۔
''اپنی جگہ پر آ کر بیٹھو۔'' شکنتلا مسکرا کر تحکمانہ انداز میں بولی۔ تو دونوں مزید پیچھے ہٹنے لگے اور دروازے سے جا لگے۔
''دروازہ بند ہے میری جان...... فرار کا خیال ذہن سے نکال دو۔ ابھی میں تمہیں اور بھی بہت کچھ دکھاؤں گی۔'' اور اس کی بات سن کر دونوں بھائی آرام سے اپنی جگہ پر آ گئے۔ سنو میرا نام شکنتلا ہے میں درحقیقت سانپ ہوں اور اس کے علاوہ میں جادوگرنی بھی ہوں۔ یہ دیکھو شکنتلا کے ہونٹ ہلنے لگے۔ اور پھر اس نے جگدیش کی طرف پھونک ماری تو وہ کرسی سمیت فضا میں بلند ہو کر ہوا میں معلق ہوگیا۔ جگدیش کی مارے ڈر کے آواز بلند ہوگئی۔ لیکن اس کا چہرہ اس کی دلی کیفیات کا پتہ دے رہا تھا۔ اب اسے ہوا میں معلق چھوڑ کر شکنتلا نے راجیش کی طرف پھونکا تو یکایک جیسے راجیش کی ٹانگیں جیسے کسی نے کھینچی ہوں اور اچانک وہ الٹا ہوگیا اس کے پیر چھت کو لگنے لگے اور سر زمین کی طرف تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ زور لگا کر چیخ رہا تھا لیکن اس کی آواز بند ہو چکی تھی۔ اب جگدیش جو کرسی سمیت بلند تھا اس کی طرف مسکرا کر شکنتلا نے پھونک ماری تو اسے بیٹھے بٹھائے کھجلی شروع ہوگئی اور وہ بری طرح خارش کرنے لگا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ راجیش الٹا لٹکا ہوا تھا اور جگدیش بری طرح خارش کرنے میں مصروف تھا اور شکنتلا اپنی جگہ مطمئن بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ دونوں بری طرح تھک چکے ہیں تو ان کو نیچے اتار کر اپنے سامنے بٹھالیا۔ اب دونوں بھائی بید مجنوں کی مانند کانپ رہے تھے۔ شکنتلا کا جادو سر چڑھ کر بولا تھا۔
''سنو۔'' شکنتلا آگے جھکر کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ میں آدم خور بھی ہوں۔ انسانی خون پینا اور گوشت کھانا میرے لیے روزانہ کی بات ہے۔ اب تم فیصلہ کرو کہ دونوں میں سے کس کا خون پیئوں۔ دوسرے کو چھوڑ دوں گی۔''
اب تو دونوں کی حالت غیر ہوگئی۔ دونوں دوڑ کر اپنی جگہ سے اُٹھے اور شکنتلا کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ ہمیں معاف کر دو شکنتلا جی ہم سے بڑا انیائے ہوا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنی پوتر اور مہان ہیں۔ دونوں آہ گریہ میں مصروف ہوگئے۔ درحقیقت ان کے کمور دل دہل چکے تھے۔
''ایک شرط پر میں تمہیں معاف کر سکتی ہوں۔''
''ہمیں منظور ہے رانی جی......'' دونوں لمبے تڑنگے جوان جو شکل سے ہی خوفناک معلوم ہوتے تھے بیچارگی سے ہاتھ ماتھے سے لگا کر شکنتلا کے قدموں میں بیٹھ گئے۔
''سنو'' یا تو اپنی بہن اروپ کی جان بچالو یا پھر اپنی...... میں بہت بڑی جادوگرنی ہوں اور ہر روپ اپنا سکتی ہوں۔ میری مہان شکتی کے قہر سے بچاؤ چاہتے ہو تو ایک ہزار گھوڑے، سو ہاتھی، ایک ہزار تلواریں بمعہ زرہ بکتر اور دس من سونا اور پانچ سو اونٹ جن پر غلہ، اجناس لدی ہوں لے کر شادھنی آؤ گے اور اس کے بعد اروپ کو بھول جاؤ گے۔ سمجھو کہ تمہاری

بہن ہی نہیں...... ورنہ میں رتن گڑھ آ کر تمہارے بیوی بچوں اور والدین کو تمہارے سمیت کتے کی موت مار کر شاہی محل کو آگ لگا دوں گی...... بولو میرا حکم مانو گے یا نہیں؟"

"مانیں گے۔رانی جی۔" دونوں گھگھیائے۔

"اور اگلے ایک ہفتہ میں یہ تمام چیزیں یہاں نہ پہنچیں تو میں خود آ جاؤں گی اور پھر سامان نہیں لوں گی تمہاری جانیں لوں گی۔ بولو اپنی اور پورے خاندان کی دردناک موت چاہو گے یا۔ اروپ کو رہا کروا کر ساتھ لے جانا چاہتے ہو! اگر اروپ کی رہائی چاہتے ہو تو میں اس کو تو چھوڑ دوں گی۔ مگر تمہیں تمہارے پورے گھرانے اور تمہاری راجدھانی کو تہس نہس کر کے اس کو زندہ رہنے دوں گی۔"

"نہیں رانی جی...... راجیش نے اس کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ ہم ایک بہن کے بدلے اپنے خاندان کا نام ونشان نہیں مٹانا چاہتے۔"

"یہی سمجھیں گے...... جگدیش روتے ہوئے بولا کہ ہماری کوئی بہن تھی ہی نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" شکنتلا نے دونوں کے منہ پر زور سے پاؤں مارتے ہوئے کہا۔ تم میرے حکم کے مطابق تاوان لے کر آؤ گے۔ اور اب میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جاؤ...... ٹھیک آج کے دن میں تمہارا انتظار کروں گی۔ ورنہ سورج غروب ہوتے ہی تمہاری شہ رگ پر میرا ہاتھ ہوگا۔

☆......☆

ٹھیک چھٹے دن پرشاد ریاستی دورے سے واپس آ گیا۔

اس کے ہمراہ چند خوب صورت کنیزیں بھی تھیں جو اس نے انسانوں کی منڈی سے پسند آنے پر خرید لی تھیں انہی میں سے ایک کنیز کو دیکھ کر شکنتلا چونک پڑی۔

"ارے سندری تو......؟ یہاں کیسے......؟"

سندری نے مایوسی اور آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اُٹھائیں اور شکنتلا کو سامنے پا کر حیران رہ گئی۔ شکنتلا نے گو سیاہ لباس پہن رکھا تھا مگر انداز واطوار اور اردگرد کے مؤدب محافظوں کے نرغے میں صاف نظر آ رہا تھا کہ یہاں کی رانی ہے!

شکنتلا سندری کو باقی کنیزوں سے الگ کر کے اپنے ساتھ لے گئی۔ سندری نے اسے بتایا کہ دیدی تمہارے جانے کے بعد ایک دن ڈاکوؤں نے رات کو بستی پر حملہ کر دیا۔ مال اسباب لوٹنے کے بعد بستی کو آگ لگا دی اور نوجوان مردوں اور عورتوں کو غلام بنا لیا۔ بچوں اور بوڑھوں کو قتل کر دیا گیا۔ پھر دوسرے لوگوں کے ساتھ مجھے بھی منڈی میں فروخت کر دیا۔ مجھے آپ کے راجہ نے خرید لیا اور یہاں لے آئے۔

شکنتلا اس کی رام کہانی سن کر اُٹھی اور سندری کو سینے سے لگا لیا اور کنیزوں کو حکم دیا کہ سندری سے معزز مہمانوں کا سا سلوک کریں اور اس کا احترام کریں یہ میری بہن ہے! فوراً ہی اس کی آؤ بھگت شروع ہو گئی۔ پرشاد بھی بڑا حیران ہوا لیکن شکنتلا نے بس اتنا کہہ کر اس کا منہ بند کر دیا کہ اس کے مجھ پر احسانات ہیں۔

تنہائی میسر آتے ہی سندری شکنتلا سے پوچھنے لگی...... "دیدی آپ...... آپ ناگن ہیں۔ تو شکنتلا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔"

"ہاں سندری...... میں انسان نہیں ہوں۔ پرنتو تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ جب میں تمہارے گاؤں میں زخموں سے چور پہنچی تو اگر تم لوگ میری سہائتا نہ کرتے تو میں شاید مر جاتی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سانپ رحم نہیں کرتے۔ میں بھی کسی پر رحم نہیں کرتی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں تو مجھے اچھی لگی ہے۔ تم لوگوں نے میری بے لوث خدمت کی۔ اس میں کوئی لالچ یا حرص شامل نہ تھا۔ جبکہ میں ہر کام میں اپنا مفاد دیکھتی ہوں یہ میری مجبوری ہے۔ کیوں کہ میری فطرت میں یہ بات شامل ہے اور شاید یہی حیوان اور انسان میں بنیادی فرق ہے۔ شاید انسانیت اسی کو کہتے ہیں۔ میں نے آج تک کسی پر لحاظ اور کسی کے اوپر رحم نہیں کیا اور شاید آئندہ بھی نہ کروں لیکن تم لوگوں نے میرے ساتھ جو بے غرض محبت کی تھی اس کا جواب بھرپور انداز میں دے کر میں بھی انسانوں میں کچھ کچھ شامل ہونا چاہتی ہوں۔ سندری میں تمہارے ساتھ وہ کر جاؤں گی کہ

بس تم دیکھتی رہو!''

اس ملاقات کے بعد شکنتلا نے سندری کو کنیزوں کے حوالے کر کے اس کی خصوصی خدمت کا حکم دیا۔

اسی رات پرشاد اور شکنتلا کو پہلی بار تنہائی میسر آئی۔ پرشاد کے خیال کے مطابق شکنتلا سیاہ ماتمی لباس میں ہونی چاہیے تھی۔ لیکن...... جب پرشاد خواب گاہ کے اندر آیا تو شکنتلا جدید تراش خراش کا پہناوا اور تر و تازہ چہرہ اسے خوشگواریت کا احساس دے گیا۔ کالی گھٹاؤں جیسے خوب صورت بال اور تمتماتے عارض...... پرشاد کو باپو کے غم بھلانے لگے...... دونوں دنیا بھول کر ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔

شکنتلا کو پا کر پرشاد کھلا جا رہا تھا۔ اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔

لیکن شکنتلا کی شوخی اچانک سنجیدگی میں بدل گئی۔

''پرشاد......'' شکنتلا سنجیدگی سے بولی۔

''ہوں......''

''آج کی ملاقات کو پہلی اور آخری ملاقات سمجھ کر بھول جاؤ۔''

''کیا مطلب......؟'' پرشاد سیدھا ہو کر بیٹھ گیا!

''میں جا رہی ہوں......''

''کہاں......؟''

''تمہارے لیے سندری کو چھوڑے جاؤں گی۔ تم اس سے بیاہ کر کے اس کو رانی بنا لو...... میں اب یہاں سے بہت دُور چلی جاؤں گی۔''

''کیا بجھارتیں ڈال رہی ہو۔ سیدھی بات کرو۔'' پرشاد جھلا گیا۔

''سننا چاہتے ہو تو سنو پرشاد...... میری بات غور سے سننا۔ اور ہر لفظ کو سچ جان کر اپنے اندر اتارو۔''

''میں انسان نہیں ہوں۔'' شکنتلا پراسرار انداز میں بولنا شروع ہوئی۔

''کیا......'' پرشاد کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

''ہاں پرشاد'' شکنتلا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''میری بات سن کر ڈرنا نہیں میں تمہاری دوست ہوں...... میں انسان نہیں ہوں۔''

''کک...... کیا...... چڑیل ہو۔'' پرشاد کی آنکھوں میں خوف نمایاں ہو گیا۔

''نہیں۔'' شکنتلا مسکرائی۔ ''چڑیل بھی نہیں ہوں اور نہ جن ہوں بلکہ میں ایک سانپ ہوں۔''

''نن نہیں......'' پرشاد بستر سے اُترنے لگا۔

''میں نے کہا تھا پرشاد کہ ڈرنا نہیں۔'' شکنتلا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور پھر اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولی۔ اسی لئے میں کہہ رہی ہوں کہ ڈر خوف اور حیرانگی ذہن سے نکال کر میری بات سنو ہو سکتا ہے کہ ہماری یہ آخری ملاقات ہو اب میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔

کل صبح سندری کو تمہاری دلہن بناؤں گی اور تم اسے شادھنی کی رانی بناؤ گے۔'' شکنتلا نے پیار بھرے فیصلہ کن تحکمانہ انداز میں کہا۔

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک معمولی باندی کو رانی بنا لیا جائے۔''

''دنیا کی تاریخ ایسے واقعات سے لبریز ہے کہ کنیزیں باندیاں، ملکائیں اور ملکائیں کنیزیں بن گئیں۔ اور پھر شکنتلا چاہے گی تو یہ بات ممکن ہو جائے گی۔''

''لیکن میں تمہیں پیار کرتا ہوں...... تمہیں رانی بنانا چاہتا ہوں، شکنتلا......'' پرشاد گلوگیر آواز میں بولا۔

''پیار انسانوں سے کیا جاتا ہے۔ سانپوں سے نہیں۔'' سانپ کسی بھی وقت ڈس سکتا ہے کیوں کہ وہ انسان نہیں حیوان ہے۔''

''لیکن......مگر؟''

''اگر مگر والی باتیں چھوڑو پرشاد کل کا سورج غروب ہونے سے پہلے تم سندری کو رانی بناؤ گے اور سورج غروب ہونے کے بعد میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ پرنتو تم سے یہ وچن لے کر کہ سندری کو ہمیشہ خوش رکھو گے۔''

''اور یہ یاد رکھو پرشاد کہ میں ناگن ہونے کے ساتھ جادوگرنی بھی ہوں۔''

''کیا......؟'' پرشاد کا منہ کھلا رہ گیا!

''ہاں......اور سندری کا جہیز تمہیں میں دوں گی۔''

''وہ کیا؟''

''وہ بھی کل شام کو ہی پتہ چل جائے گا۔''

''دیکھو تم مرد ہو ذرا دل کو بڑا کر کے میری طرف دیکھو۔ خوف کو جھٹک دو۔ میں تمہاری دوست بھی ہوں اور ہمراز بھی۔'' یہ کہتے ہی شکنتلا ایڑھی پر زور سے گھومی اور پھر پرشاد کی چیخ نکل گئی......اب شکنتلا کی جگہ ایک سانپ فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا، اور پھر فوراً ہی پھنکار کر سانپ بن گئی۔

پرشاد سہما ہوا اور ہکا بکا تھا اور پھر شکنتلا نے کچھ پڑھ کر پھونکا تو پرشاد جس مسہری پر بیٹھا تھا وہ یکدم غائب ہوگئی اور پرشاد فرش پر گر پڑا......لیکن اگلے ہی لمحے مسہری پھر موجود تھی۔

اب جو شکنتلا نے اشارہ کیا تو تمام شمعیں بجھ گئیں۔ پل بھر میں قبر کا اندھیرا چھا گیا لیکن فوراً ہی شمعیں روشن ہوگئیں۔ لیکن اب وہ تعداد میں بہت زیادہ اور ترتیب بھی ان کی بدلی ہوئی تھی۔

آؤ میرے پاس بیٹھو شکنتلا نے پرشاد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بالکل خوف نہ کھاؤ۔ دوستوں کی دوست اور دشمنوں کی موت ہوں۔ یہ کہہ کر شکنتلا نے کھینچ کر پرشاد کو گلے لگا لیا۔

☆......☆

دوسری صبح پورے شہر میں منادی کرادی گئی کہ آج راجہ پرشاد نئی شادی کریں گے اور اروپ کو بڑے راجہ جے کشن کو زہر دینے کے الزام میں سزائے موت ہوگی۔ شام تک محل کے بہت بڑے باغ میں قناتیں لگ گئیں۔ انتظامات مکمل ہوگئے۔ سندری نیند سے جاگی تو شکنتلا نے بلا بھیجا۔

''سندری میری جان......آج تیرا وداع ہے۔''

''میرا......مگر کیسے......کس کے ساتھ؟''

''راجہ پرشاد کی رانی بن جائے گی تو آج......بس زیادہ سوال نہ کرنا۔ میں نے سارے انتظامات کر لئے ہیں۔''

''مگر رانی تو آپ ہیں۔''

''نہیں میں رانی تھی......پرشاد کے پتا، راجہ جے کشن کی۔ ان کو پرشاد کی پہلی بیوی اروپ نے زہر دے کر مار ڈالا ہے۔'' آج تیری شادی ہوگی اور اروپ کو سزائے موت اور پھر میرا اگلا سفر شروع ہو جائے گا۔

اگلا سفر......؟ سندری حیران ہو رہی تھی۔ ان باتوں کی اسے کوئی سمجھ نہ آ رہی تھی۔

ہاں سندری اب تمہاری اور میری شاید کبھی ملاقات نہ ہو۔ میرا تو مقدر نگر نگر گھومنا ہے ابھی تو مجھے خسکران اور چھتکار کو تلاش کرنا ہے۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ سندری معصومیت سے بولی تو شکنتلا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کا ماتھا چوم کر بولی۔ تو کچھ مت سوچ......سوائے اس کے کہ آج سے تو عام لڑکی نہیں۔ رانی ہے شادھنی کی۔ کل سے تو بھرے دربار میں راجہ کے ساتھ زرق برق لباس میں تخت پر بیٹھے گی......جب تیری پالکی سڑکوں سے گزرا کرے گی تو احتراماً لوگ راستہ چھوڑ دیا کریں گے......لیکن افسوس کہ میں یہ قابل دید منظر نہ دیکھ پاؤں گی۔'' شکنتلا افسردہ بھی تھی۔

تو نے میری خدمت کی ہے نا......میں اپنا احسان اتار رہی ہوں۔ بس اب تو صرف یہ سوچ کہ رات کو پرشاد جب پھولوں بھرے بستر پر تجھے دبوچے گا تو تو کیا کرے گی۔''

''ہوں...... ہونہہ'' سندری شرما کو چھوئی موئی ہوگئی۔

بعد دوپہر جب سندری اور پرشاد کے پھیرے ہو رہے تھے تو جاسوسوں نے آ کر اطلاع دی کہ شمال کی طرف سے سینکڑوں اونٹوں، ہاتھیوں اور گوڑھوں پر مشتمل فوج شادھنی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اطلاع دینے والوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ یہ فوج اروپ کے میکے رتن گڑھ کی ہے! اس اطلاع کے آتے ہی کھلبلی مچ گئی۔ پرشاد سمیت تمام وزیر مشیر اور درباری پریشان ہو گئے تو شکنتلا اپنی جگہ پر کھڑی ہوگئی۔ سب گردنیں موڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

''اب کیا ہوگا شکنتلا۔'' پرشاد پریشان تھا۔

''کچھ نہیں ہوگا'' شکنتلا نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور پھر بازو بلند کر کے سب کو بیٹھنے اور خاموش رہنے کا اشارہ کر کے بولی۔ یہ فوج حملہ آور نہیں بلکہ رتن گڑھ سے نئی رانی سندری کا جہیز آ رہا ہے! سندری کا تعلق بھی اروپ کی طرح رتن گڑھ سے ہے اور پھر شکنتلا کے حکم پر اروپ کو پابہ زنجیر سب کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اروپ کی کیفیت دیدنی تھی کہ کل تک جو لوگ اس کے سامنے نظریں جھکا کر بات کرتے تھے آج اسے طنزیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے اور اس کی آنکھوں کے سامنے زرخرید لونڈی سندری سے اس کا پتی پھیرے لے رہا تھا۔

سب لوگ چہ مگوئیاں کرنے لگے۔

لیکن تھوڑی دیر میں شکنتلا کی بات سچ ہوگئی جب جگدیش اور راجیش محافظوں کے جلو میں آئے اور شکنتلا کے آگے آتے ہی جھک گئے اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔

''دیوی جی...... ہم تاوان لے آئے ہیں اور اروپ نے زہر دے کر جو قبیح فعل کیا ہے اس پر ہمارے ماتا پتا اور پورا رتن گڑھ آپ سے معافی مانگتا ہے سرکار اور آپ کو پوری اجازت ہے کہ اروپ سے قتل کا بدلہ لے لیا جائے۔ اب ہمارا اروپ سے کوئی تعلق نہیں۔''

''نہیں۔'' اروپ چیخ پڑی۔

''تم میرے بھائی ہو۔ مجھے ساتھ لے کر جاؤ۔ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔'' اروپ چلانے لگی۔ ''اب تم لوگ جا سکتے ہو اور اب جیون بھر رتن گڑھ کا کوئی آدمی شادھنی کا رُخ نہ کرے۔'' شکنتلا نے بے نیازی سے کہا۔ دونوں بھائیوں نے حسرت بھری نگاہ اروپ پر ڈالی اور آہستگی سے آخری ملاقات کے لئے آگے بڑھے۔ لیکن شکنتلا اور کبھی بھائیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسی اثناء میں نوکر چاکر سونے کا ڈھیر میدان میں لگا گئے۔ پرشاد نے جب باہر جا کر معائنہ کیا تو تاوان کے بے شمار گھوڑے، ہاتھی، اونٹ اور غلہ دیکھ کر خوش گوار حیرت میں مبتلا ہو گیا اور سپاہیوں کو فوراً تمام چیزیں سنبھالنے اور ان کا حساب بنانے کا حکم دے کر پلٹا تاکہ شکنتلا کی مہان شکتی کا شکریہ ادا کر سکے۔ لیکن...... شکنتلا تو اس ہڑبونگ میں گم ہوگئی اور پھر کسی کو نہ ملی۔ اس کی تلاش کی گئی لیکن بے سود۔ اس کو نہ ملنا تھا نہ ملی اور اس کے ساتھ اروپ بھی غائب تھی۔ سب حیران تھے کہ انہیں آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔''

☆......☆

اروپ شکنتلا کے سامنے بیٹھی خوف سے لرز رہی تھی اور شکنتلا اس کے سامنے گھاس پر لیٹی مسکرا رہی تھی۔ اچھا تو میں کتے کی بچی ہوں۔ اور تو میری ٹانگیں چیر دے گی! شکنتلا اُٹھ کر اس کے قریب ہوگئی اور اروپ نہیں کے انداز میں گردن دائیں بائیں ہلانا شروع ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں شکنتلا کے ساتھ کیسے پہنچ گئی۔ اس ویرانے میں۔

اروپ کی گردن میں ایک مضبوط رسی بندھی تھی۔ جس کا دوسرا سرا ایک درخت کے ساتھ بندھا تھا...... ''مم...... مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟'' اروپ کی زبان کی لرزش نمایاں تھی۔

''یہ خنجر دیکھ رہی ہو۔'' شکنتلا نے لباس میں چھپے ہوئے خنجر کو نکال کر سیدھے ہاتھ میں تھام لیا۔

''کک کیا مطلب......؟'' اروپ پر لرزہ طاری ہو گیا۔

''اس سے تیری آنکھیں نکالوں گی!'' نہیں اروپ چلا کر بولی......

''تم ایسا نہیں کرسکتیں۔''

''کون روک سکتا ہے مجھے......اور سنو...... آنکھیں تو بعد میں نکالوں گی۔ پہلے میں تیرا خون پیوں گی۔''

''مجھے معاف کردو۔ شکنتلا دیدی۔'' اروپ کو وشواس ہو چلا تھا کہ اس ویرانے میں وہ مکمل طور پر شکنتلا کے رحم وکرم پر ہے!

''میں مرنا نہیں چاہتی۔''

''تو کیا تم جن کو ہاتھی کے پاؤں تلے کچل کر مرواتی تھیں وہ سب مرنا چاہتے تھے! بہر حال میں تمہیں ماروں گی نہیں۔ صرف جی بھر کر خون پی کر۔ تیری آنکھیں نکال کر تمہیں زندہ چھوڑ دوں گی۔'' یہ کہہ کر شکنتلا اُٹھی اور ننے تلے قدموں سے مسکراتے ہوئے اروپ کی طرف بڑھی اور خنجر ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا۔ اروپ ادھر اُدھر بھاگنے لگی لیکن وہ رسی کی مدد سے رخت کے ساتھ بندھی تھی۔ جلد ہی شکنتلا نے اس کو قابو کر کے زمین پر گرا لیا اور خنجر اس کی دونوں کلائیوں پر باری باری چلایا۔ گرم گرم خون دیکھ کر شکنتلا پاگل ہوگئی۔ اروپ پر موت کا خوف چھا گیا۔ وہ تڑپنے لگی۔ شکنتلا خون پینے لگی اروپ کی کریہہ چیخیں سن کر پرندے بھی درختوں سے اُڑ کر فضا میں گردش کرنے لگے......لیکن شکنتلا ہر چیز سے بے نیاز تھی ایک کلائی سے کبھی دوسری کلائی سے منہ لگائے خون پیتی رہی۔ شکم سیری کے بعد اُٹھی اروپ نڈھال ہو چکی تھی! اب شکنتلا نے خنجر پھر اُٹھایا۔ اس وقت خون سے لتھڑے منہ کے ساتھ وہ خون آشام نظر آ رہی تھی۔ شکنتلا کی معصومیت اور حسن اڑنچھو تھا۔ آنکھیں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ اس وقت بہادر سے بہادر انسان بھی اسے دیکھ لیتا تو اس کی حرکت قلب بند ہو سکتی تھی۔ اروپ جان کنی کے عالم میں مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہی تھی۔

خنجر اُٹھا کر شکنتلا نے ایک ہی جھٹکے سے اس کی آنکھ میں گھسیڑ دیا۔ اروپ کی دلدوز چیخیں دل دہلا دینے کے لیے کافی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے خنجر اس کی دوسری آنکھ میں پیوست ہو چکا تھا۔

''ہاہاہا......'' شکنتلا پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگی۔ مجھے رعب دیتی تھی تو اپنے باپ، بھائیوں اور راجکماری ہونے کا۔ اب تو اس ویرانے میں بھوک پیاس سے تڑپے گی تو تجھے شکنتلا کی شکتی کا احساس ہوگا۔ اب شکنتلا نے کوئی منتر پڑھ کر پھونکا تو فوراً ہی اروپ کا خون بہنا بند ہو گیا۔ لیکن زخم بدستور تھے۔ پھر شکنتلا نے زور سے پھنکار ماری اور ناگن بن گئی۔ اس کے بعد جب انسان بنی تو صاف ستھرے لباس میں تھی۔ اروپ کے گلے کی رسی کھول کر اس کے منہ پر زور دار ٹھوکر ماری اور ایک طرف چل پڑی۔''



اب شکنتلا نے ایک باز کی شکل اختیار کی اور بلندی حاصل کرنا شروع کر دی۔ گھنے جنگل سے خاصی بلندی پر آ کر مشرق کی طرف اُڑنا شروع کر دیا۔ اس کی ظالمانہ نفسیات کے پیچھے ایک بزدلی بھی چھپی تھی۔ شکنتلا موت سے بہت ڈرتی تھی۔ اس لیے ہمیشہ طاقتور شکل دھارتی تھی۔ چڑیا کوا وغیرہ بننے سے اس کو ڈر لگتا تھا کہ کہیں کسی حادثے کا شکار نہ ہو جاؤں جبکہ باز ہوا میں اُڑنے والے تمام پرندوں سے طاقتور اور پھرتیلا ہوتا ہے۔ یوں شکنتلا کو کسی ہوائی مخلوق کے شکنجے میں آنے کا ڈر نہیں رہتا۔ شکنتلا اس وقت جنگل سے آگے نکل آئی تھی۔ اُڑتے اُڑتے رات کا پتہ نہیں کون سا پہر آ گیا تھا۔ آسمان پر تاروں کی بارات تھی۔ اوپر چاند روشن تھا۔ نیچے جانے کون سا علاقہ تھا جبکہ شکنتلا کسی انجانی منزل کی تلاش میں اڑی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ حسکران کو کہاں تلاش کروں۔ چمتکار بھی بتائے بغیر غائب تھا۔ سامری جی کا پھر کوئی سراغ نہیں لا۔ کیسی خانہ بدوشوں والی زندگی شروع ہو گئی تھی۔ شادھنی میں اب اس کی کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ جبکہ نئی منزلیں، نئے علاقے، نئے لوگوں سے ملنے کا شوق بھی شکنتلا کو تھا۔ زیادہ عرصہ کسی جگہ قیام کرنے سے اس کا بھانڈہ پھوٹ سکتا تھا۔ چند لوگوں سے تو وہ نمٹ سکتی ہے پوری دنیا سے ٹکر لینا کسی کے بس میں نہیں۔ اوپر صاف آسمان اور نیچے چھوٹی بڑی پہاڑیوں پر مشتمل کوئی طویل سلسلہ تھا۔ جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ تاحد نگاہ، اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہ دے رہا تھا۔ شکنتلا نے بطور عقاب اپنی پرواز اور تیز کر دی۔ خاصی دیر گزر گئی لیکن کوئی ایسے آثار دکھائی نہ دیئے جن سے معلوم پڑتا کہ کوئی آبادی نزدیک ہے۔ شکنتلا پہلے حیران تھی اب کچھ کچھ پریشان ہونا شروع ہو گئی۔ کہ اسے اب

کچھ تھکاوٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ قیام کے لیے کوئی چھوٹی بڑی آبادی نظر آ جائے۔ اسی نظریے کے تحت اس نے اپنی بلندی کم کرنی شروع کر دی۔ اب وہ انتہائی کم بلندی پر آ گئی تھی۔ ہر طرف قبر کا اندھیرا چھایا تھا۔ ٹنڈ منڈ پہاڑ تھے۔ مایوس ہو کر شکنتلا نے پھر اونچی اور تیز اُڑان کا فیصلہ کیا اور اوپر کو اٹھنے لگی۔ ابھی زیادہ اوپر نہ اٹھی تھی کہ اسے کچھ روشنیاں دکھائی دیں! شکنتلا چونک پڑی۔

''اس کا مطلب ہے کہ یہاں کوئی رہتا ہے۔ ایک لمحے میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ رہنے والا کوئی بھی ہو یہاں کچھ آرام اور پیٹ پوجا کر کے آگے بڑھوں گی۔ پہلے سانپ بن کر دیکھتی ہوں۔ حالات کا جائزہ لوں گی۔ پھر جو روپ مناسب ہوگا اختیار کر لوں گی۔'' فیصلہ کرتے ہی وہ نیچے اُترنا شروع ہوگئی۔ وہ زور میں آگے نکل گئی تھی۔ پلٹی اور پلٹ کر جہاں کچھ روشنیاں دکھائی دی تھیں۔ ان کے قریب آ گئی۔ یہ کوئی بوسیدہ مکان تھا۔ جس کے اردگرد خاصی تیز روشنی ہو رہی تھی۔ اس ویرانے میں رہائش کیوں رکھی ہے ان لوگوں نے یہ سوچتے سوچتے وہ پھڑ پھڑاتے ہوئے آہستہ آہستہ زمین پر اُتر گئی اور پھر ہلکی سی پھنکار کے ساتھ ناگن بن کر رینگنے لگی۔ یہ گھر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گھوم پھر کر سارا گھر دیکھ لے اور حالات کا جائزہ لے! تین کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ گھر کیا تھا ایک مندر تھا۔ ہر کمرے میں چھوٹی چھوٹی مختلف دیوتاؤں کی عجیب الشکل مورتیاں جا بجا رکھی تھیں! حیرت کی بات یہ تھی کہ ہر کمرے کے چاروں کونوں میں چراغ جل رہے تھے۔ اسی طرح کچے صحن میں بھی قطار در قطار چراغ جل رہے تھے۔ صحن کے باہر بھی اسی ترتیب سے بے شمار چراغ روشن تھے۔ ساری جگہیں گھومنے کے بعد بھی جب شکنتلا کو کوئی شخص نہ ملا تو اس کے دل میں ایک انجانے خوف نے سر اُٹھایا۔ جانے یہ کیسا پراسرار گھر تھا۔ جو پوری طرح روشن لیکن سنسان تھا۔ اب شکنتلا ناگن کے روپ میں گھر سے باہر آ کر ٹیلے کے گرد چکر کاٹنے لگی۔

اچانک اس کی نظر پانی کی ایک چھوٹی سی جھیل پر پڑی۔ جو اس ٹیلے سے کچھ ہی دور تھی۔ اس جھیل کی سطح پر کائی جمی ہوئی تھی اور اس کائی کے اوپر کوئی آدمی دوزانو بیٹھا تھا۔ شاید یہ کوئی سادھو سنت ہے۔ جو تارک الدنیا ہو کر اس ویرانے کو اپنا مسکن بنائے ہوئے ہے۔ چلو دیکھتے ہیں۔ شکنتلا یہ سوچ کر جھیل کی طرف رینگنے لگی۔

قریب جا کر دیکھا تو یہ ایک کمزور لیکن لمبا سا کالا بھجنگ آدمی تھا۔ جس کی داڑھی اور مونچھیں بے تحاشا جھاڑ جھنکار کی طرح نکلی ہوئی تھیں۔ اس کا منہ ٹیلے کی طرف ہی تھا۔ آنکھیں اس کی بند لیکن ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ فقط ایک کالا جانگیہ پہنے ہوئے تھا اور بڑی حیران کن بات تھی کہ وہ پانی پر جمی ہوئی کائی کے اوپر جھیل کے بیچوں بیچ بیٹھا ہوا تھا اور پانی قطعاً ساکت تھا اس میں کوئی ارتعاش نہ تھا۔

''آؤ...... شکنتلا مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔''

''آواز سن کر شکنتلا بری طرح چونک پڑی۔ آواز بالکل صاف تھی اور یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے پیچھے سے آئی ہو۔ شکنتلا ناگن کے روپ میں سرعت کے ساتھ پلٹی لیکن اردگرد کوئی شخص موجود نہ تھا۔ یقیناً یہ کوئی مہان سادھو ہے۔ جس کو میری حقیقت اور آمد کا پتہ چل گیا ہے۔ کہیں میرے لیے مسئلہ نہ بن جائے۔ کیا میں بھاگ جاؤں۔ عقاب بن کر اُڑ جاؤں۔''

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے سادھو کے چہرے کو غور سے دیکھا تو وہ بدستور آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ شکنتلا نے خطرے کی بو پا کر پھنکار ماری اور عقاب بننے کا سوچا۔ لیکن وہ عقاب تو نہ بنی لیکن انسانی شکل میں شکنتلا کا روپ دھار گئی۔ یہ کیا ہوا۔ اس نے سوچا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ میں نے کوئی روپ سوچا ہو اور اس کی شکل میں نہ آ گئی ہوں۔''

اس وقت تو شری راج کی نگری میں ہے۔ تیری سب شکتیاں یہاں بے بس ہوں گی۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی شکنتلا کو کالا بھجنگ آدمی اپنی جگہ سے اُٹھتا ہوا محسوس ہوا اور پھر پانی پر جمی ہوئی کائی پر سے وہ شخص جس نے اپنا نام شری راج بتایا تھا۔ بڑے سکون سے چلتا ہوا کنارے کی طرف آنے لگا اب شکنتلا نے دیکھا کہ یہ کالا سیاہ جسم رکھنے والا شخص خاصا لمبا ہے۔ شکنتلا سے کوئی دو بالشت بلند تھا۔ شکنتلا اس وقت سرخ ساڑھی میں ملبوس تھی۔ بال اس کے حسب معمول کھلے ہوئے تھے۔ شری راج آتے آتے بالکل قریب آ گیا اور پھر اس نے دونوں ہاتھ شکنتلا کے شانوں پر رکھ دیے۔ ہاتھ برف جیسے

ٹھنڈے اور لوہے جیسے بھاری تھے۔ شکنتلا اس اچانک افتاد سے گھبرا گئی اور کسمسانے لگی اور شری راج انتہائی بھاری آواز میں ہنسنے لگا۔ گھبرا گئی...... شری راج بھدے اور دہشت ناک انداز میں مسکرایا۔

''مطلب کی بات کرو شری راج'' شکنتلا اب ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو رہی تھی۔

''شری راج تمہارا زیادہ سے ضائع نہیں کرے گا۔ خوب صورت قیامت، شری راج نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک طرف چلنے لگا۔ شکنتلا کو تقریباً کھینچ رہا تھا اور شکنتلا بھی حالات کو جاننے کے لیے اس کے ساتھ ہولی۔ ٹیلے پر چڑھ کر شری راج جو شکل سے کوئی پتلا لمبا بدصورت آدمی معلوم ہوتا تھا اس کا ہاتھ پکڑے اسی مکان کے ایک سیل زدہ کوٹھڑی میں لے آیا اور فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور شکنتلا کو بھی کھینچ کر سامنے بٹھالیا۔ شکنتلا بھی ساڑھی سنبھال کر مٹی کے فرش پر ہی بیٹھ گئی۔

''اب سے ایک پہر پہلے میں نے اپنی شکتی کے زور سے پتا چلا لیا کہ تو یہاں سے کچھ پرے ہو کر اُڑتی ہوئی گزرے گی تو میں نے تیرا رستہ تھوڑا سا بدل کر تجھے یہاں لے آیا اور تیری رہنمائی کے لیے سب چراغ روشن کر دیے۔''

''میرا نام شری راج ہے میں گزشتہ کئی سالوں سے یہاں تپسیا کر رہا ہوں اور ابھی کئی ورش اور یہاں گزاروں گا۔ پرنتو مجھے ایک مشکل آ پڑی ہے کہ مجھے ایک وش کنیا کی ضرورت ہے جس پر میں نے کچھ عمل کرنا ہے۔''

''وش کنیا کا حصول زیادہ دور بھی نہیں اور میرے لیے ناممکن بھی نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ میں یہاں سے ہٹا تو ساری تپسیا بھرشٹ ہو جائے گی اور میں یہاں پر گزارے ہوئے کئی سال ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ تجھے میرا یہ کام کرنا ہوگا۔''

''اور اگر میں نہ کروں۔ تو'' شکنتلا اُڑ گئی۔

''تو...... تُو یہاں سے ہزاروں سال تک نہ جاسکے گی اور اگر تو جھوٹا وعدہ کر کے نکل بھی جاتی ہے تو بھی ایک شکتی تو میں تمہاری سلب کر ہی چکا ہوں کہ تم اب صرف سانپ، انسان یا چڑیل کی شکل میں آسکتی ہو چوتھا کوئی روپ تو اب میری مرضی کے بغیر اختیار نہیں کرسکتی۔ پرنتو...... اگر میری بات مان لوگی...... تمہارا بہت بڑا میں فائدہ کرسکتا ہوں۔''

''وہ کیا......'' شکنتلا نے اسے گھورا۔

خسکران کا باپ لشکران تجھ پر بہت تپا ہوا ہے! اس کے خیال میں خسکران کی گمشدگی تمہاری وجہ سے ہے اور وہ تمہاری ایک شکتی اپنے قبضہ میں لے چکا ہے۔

''کون سی شکتی......؟'' شکنتلا حیران ہوئی۔

''چمتکار......'' وہ اس کے قبضے میں ہے۔

''اچھا......'' شکنتلا اب شری راج سے مرعوب ہونے لگی تھی۔

''اور اگر تو کچھ عرصہ تک خسکران تلاش کر کے اس کو اس کی بستی نہیں بھجواتی تو لشکران تجھے ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔''

شکنتلا سوچ میں پڑ گئی۔ چمتکار لشکران کے قبضے میں ہے روپ بدلنے والی طاقت پر شری راج نے جزوی پابندی لگادی ہے۔ کہیں کوئی بڑی مصیبت بن جائے۔ ''لیکن تم میری سہائتا کیسے کرو گے؟ شری راج۔''

''میرا کام کردو گی تو میں نہ صرف تمہیں خسکران کا پتہ بتادوں گا بلکہ سامری کے بارے میں بھی تمہاری مدد کروں گا۔''

کیا تم مجھے جادو سکھا سکتے ہو؟ شکنتلا اپنی چھپی خواہش کو دبا نہ سکی۔

کچھ کچھ تم جانتی بھی ہو! شری راج اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ وہ تو کچھ بھی نہیں۔ شکنتلا نے منہ بسورا۔

''میرا کام کرو۔ تمہارے سارے کام آسان کردوں گا۔''

''یہاں سے سو کوس دور ایک گاؤں ناگ بھون ہے! وہاں پر ناگ مندر کے تہہ خانے میں ان اغوا شدہ لڑکیوں کو رکھا جاتا ہے جو پہلے دو سال داسیاں بن کر وہاں رہتی ہیں پھر انہیں ناگ دیوتا پر قربان کر دیا جاتا ہے! ہاں زیادہ خوب صورت ناریاں وہاں کے پروہت اپنے لیے الگ کر لیتے ہیں۔ جو بوقت ضرورت شہر کے امراء کو مہنگے داموں پر فروخت بھی کی جاتی ہیں۔ مندر کی سب سے خوب صورت داسی بڑی پروہت کی ملکیت ہوتی ہے! ان داسیوں پر زہر اثر نہیں کرتا بلکہ ایک

خاص عمل سے گزار کران کا شریرایسا بنا دیا جاتا ہے جو سانپ انہیں ڈستا ہے وہ جم جاتا ہے ایسی لڑکیوں کو وش کنیا کہتے ہیں اور مندر کے پنڈت پجاری اس سانپ کو حنوط کر لیتے ہیں یہ حنوط شدہ سانپ مندر کا خاص تحفہ سمجھ کر یاتری اور سیاح مہنگے داموں خرید کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں انہی حنوط سانپوں کی فروخت سے جو رقم حاصل ہوتی ہے اس سے ناگ مندر کے اخراجات چلتے ہیں۔

اردگرد اور دور دراز علاقوں سے آ کر توہم پرست لوگ اپنی بچیوں اور بچوں کو چڑھاوے کے طور پر وہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ بچے آخر کار غلام اور لڑکیاں امراء کے حرام سرائے میں پہنچ جاتی ہیں اور بہت زیادہ خوب صورت لڑکیوں کو وش کنیاں بنا دیا جاتا ہے۔

''میرا کام یہ ہے کہ مجھے ایک وش کنیا چاہیے۔'' شری راج خاموش ہو گیا۔

''ہو جائے گا۔'' شکنتلا کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں! شکنتلا فخر سے اس کو دیکھتے ہوئے بولی تو پھر جاؤ اور ناگ بھون کے مندر سے وش کنیا لے آؤ۔ تمہیں حسکران کا پتہ بھی بتا دوں گا اور سفلی علوم کے تمہیں وہ رُخ دکھاؤں گا کہ تمہارے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے! اور وقت رخصت تمہیں وہ تحفہ دان کروں گا جو تا حیات تیرے کام آئے گا۔

''لیکن میں جاؤں گی کس طرح نہ میرے پاس چمتکار ہے اور نہ میں سانپ چڑیل کے علاوہ کچھ بن سکتی ہوں!''

رات یہیں بسر کر لو صبح ہوتے ہی میں خود تمہیں ناگ بھون کے قریب پہنچا دوں گا۔

''ایک بات تو بتاؤ شری راج۔'' شکنتلا اب بے جھجک ہونے لگی۔

''یہاں تمہارے علاوہ کون رہتا ہے۔ اور تم کھاتے کیا ہو۔''

''میں اکیلا رہتا ہوں اور کچی سبزیاں یا انسانی خون میری خوراک ہیں۔''

''اور تمہاری پتنی...... بچے؟''

''ہم تارک الدنیا لوگ ہیں دنیا سے ہمارا کیا کام۔ نہ اولاد نہ پتنی۔ بلکہ جب تک میرا عمل پورا نہیں ہو جاتا جو ابھی کئی سال کا ہے اس وقت تک کوئی عورت میرے جیون میں آئی تو میری تمام تپسیا اور کشٹ بھرشٹ ہو جائیں گے۔''

شری راج بولے جا رہا تھا اور شکنتلا اس کی یہ بات سن کر دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ شری راج تو نے مجھے ناگ بھون جانے پر مجبور تو کر ہی دیا ہے۔ پرنتو میں بھی تمہارے جیون بھر کے کشٹ کو ضائع کر دوں گی۔ میرا نام بھی شکنتلا ہے۔ ناگوں کی ملکہ اور روپ کی رانی۔ مجھے ناگ بھون سے واپس آ جانے دے۔ تیرا کریا کرم کرنے کے بعد ہی حسکران کی تلاش میں نکلوں گی۔



شکنتلا چلتی جا رہی تھی۔ چلتے چلتے شام ہو گئی اور پھر رات ہونے لگی اب سر سبز علاقہ شروع تھا۔ آس پاس کچھ آبادی کے آثار بھی تھے۔ اچانک شکنتلا کو دل دہلا دینے والی نسوانی چیخیں سنائی دیں۔ اس نے جدھر سے آواز آئی اس طرف دیکھا تو دور درختوں کے جھنڈ میں اسے چند آدمی نظر آئے جو ایک لڑکی کو پیروں سے پکڑ کر گھسیٹ رہے تھے۔

لڑکی کی اذیت آمیز چیخیں سن کر شکنتلا رہ نہ سکی حالاں کہ وہ اب جلدی جلدی ناگ بھون پہنچ جانا چاہتی تھی۔ درختوں کا جھنڈ چوں کہ کچھ دور تھا لہٰذا وہ سانپ بن کر تیزی سے جھنڈ کی طرف رینگنے لگی۔

درختوں کے قریب آئی تو اس نے دیکھا کہ بہت سے آدمی اکٹھے ہیں اور ایک طرف چتا بنائی جا چکی تھی۔ شاید کوئی خوص آدمی مر گیا تھا۔ اردگرد نظر دوڑانے سے پتہ چلا کہ یہ مرگھٹ ہے۔ ایک پری جمال جو سفید سوتی ساڑھی میں ملبوس تھی زار و قطار رو رہی تھی اور اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ تین آدمیوں نے اس کو قابو کر رکھا تھا۔ مگر اس کی مزاحمت بہت زیادہ تھی۔ وہ تین آدمی اس کی مشکیں کس رہے تھے اور آخر کار تینوں نے اس حسینہ کے ہاتھ اور پاؤں باندھ کر ایک طرف ڈال دیا اور چتے کے انتظامات میں مصروف ہو گئے۔ شکنتلا لمحوں میں سارا معاملہ سمجھ گئی کہ اس لڑکی کا شوہر مر گیا ہے اور اسے پتی کی لاش کے ساتھ چتا میں ستی کیا جا رہا ہے اور لڑکی ستی ہونا نہیں چاہتی۔ شکنتلا سانپ کے روپ سوچنے لگی کہ

اس لڑکی کی مدد کروں یا ان لوگوں کو ان کے حالات پر چھوڑ کر نکل جاؤں۔ ادھر لڑکی زار وقطار رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ ظالمو میرا کیا قصور ہے۔ اتنا انیائے نہ کرو۔ یہ میرا پتی نہیں تو مجھے کیوں ستی کر رہے ہو۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے چھوڑ دو...... لیکن لڑکی کے نوحے سننے والے کان شاید وہاں نہیں تھے۔

شکنتلا ایک درخت کی اوٹ میں سانپ کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ تقریباً بیس پچیس لوگ ہوں گے۔ ان میں سے کوئی لڑکی کی طرف متوجہ نہ تھا۔ لڑکی کو باندھ کر ایک درخت کے نیچے ڈال دیا گیا تھا۔ جو چتا سے قدرے پرے تھا۔ لڑکی رو رو کر بے حال ہو رہی تھی۔

شکنتلا نے فیصلہ کیا کہ لڑکی سے بات کر کے دیکھتی ہوں اور ساری صورت حال پوچھتی ہوں۔ وہ پھنکار کر انسان بن گئی اور کچھ پڑھ کر پھونکا تو لڑکی کے بندھن ٹوٹ گئے۔ لڑکی جو مسلسل کسمسا رہی تھی اچانک اپنے آپ کو آزاد پا کر حیران ہوگئی۔ چند لمحے حیرت زدہ رہنے کے بعد اس نے چتا کی طرف متوجہ لوگوں کی جانب دیکھا اور پھر اچانک اُٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئی لیکن چند لوگوں نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تمام لوگ غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے لپکے۔ لڑکی ذات تھی کہاں تک بھاگتی تھوڑی ہی دیر بعد شکنتلا کو ایک ہٹا کٹا شخص نظر آیا جو اس لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ کر لا رہا تھا۔ لڑکی خوف و کرب سے زار وقطار چیخ رہی تھی!! شکنتلا انسانی حالت میں درختوں کے پیچھے چھپی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے لڑکی کو بچانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ سب سمجھ گئی کہ لوگ اس کو ستی کر دینا چاہتے ہیں جبکہ وہ ستی ہونا نہیں چاہتی۔ اب چتا کو آگ دکھا دی گئی تھی۔ گاڑھا دھواں اُٹھنے لگا۔ لکڑیاں چٹخنے لگیں خوشبودار تیل کی بو پھیلنے لگی۔ دو شخص اب لڑکی کو کھینچ کھانچ کر چتا کی آگ میں دھکیلتے ہوئے لیے جانے لگے۔ شکنتلا نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کرلیا۔

اور کالی کا جاپ جپ کر من ہی من میں چڑیل بننے کا ارادہ کیا تو لمحے بھر میں اس کا قد بڑھنے لگا اور شکل بگڑنے لگی، سر درختوں سے جا لگا اب وہ خوفناک انداز میں چنگھاڑی، کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی چیخ سن کر ارتھی کے ساتھ آئے ہوئے تمام لوگوں کی نظر اس پر پڑی تو سب تھرا کر رہ گئے۔ ان کے ہوش اُڑ گئے۔ خوف سے ان کے قدم زمین پر جم کر رہ گئے۔ لڑکی کو پکڑے ہوئے اشخاص کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور لڑکی بھی خوف سے ساکت ہوگئی۔ شکنتلا نے پھر واپس انسانی شکل اختیار کر لی اور کڑک کر بولی۔ اس لڑکی کو چھوڑ دو...... جادو کے کرشمے دیکھ کر کئی لوگ بھاگ کھڑے ہوئے! جنہیں شکنتلا نے نظر انداز کر دیا۔ جبکہ ایک شخص جو کچھ دلیر نظر آتا تھا۔ آگے بڑھا اور بولا۔ ”تم جو کوئی بھی ہو ہماری بات غور سے سنو۔ یہ دھرم کا معاملہ ہے اس میں دخل نہ دو...... چمپا کو پتی کے ساتھ ستی ہونے دو۔“

”دونہیں نہیں میں اس کی پتنی نہیں۔ لڑکی دوڑ کر شکنتلا کے پہلو سے آ لگی۔ اس کو اس نے بھی اپنی آنکھوں سے چڑیل سے لڑکی بنتے دیکھا تھا لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔

”میں دھرم کو سمجھتی ہوں اگر یہ لڑکی کا پتی نہیں تو پھر اس کو کیوں جلانے کی تم نے کوشش کی۔“ شکنتلا نے شان بے نیازی سے قدم آگے بڑھائے تو چالاک بننے کی کوشش میں ایک شخص نے چتا کی آگ سے ایک جلتی لکڑی اُٹھا کر شکنتلا کے سر کا نشانہ لے کر پھینکی تو شکنتلا نے فوری طور پر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ شکنتلا کو اپنی جگہ سے ہٹتے دیکھ کر دوسرے لوگوں نے سمجھا کہ یہ بھاگ رہی ہے انہوں نے بھی پہلے شخص کی اندھی تقلید میں جلتی لکڑیاں اٹھالیں اور شکنتلا کی طرف لپکے لیکن شکنتلا اپنی جگہ سے غائب ہو چکی تھی۔ دراصل اس نے ایک چھوٹے سے سانپ کا روپ دھار کر ایک درخت کے تنے کی اوٹ میں پناہ لے لی تھی۔ اب تو سب لوگوں نے سمجھا کہ وہ بھاگ گئی ہے۔ آگ سے ڈر گئی ہے، شکنتلا آگ سے تو واقعی ڈرتی تھی۔ لیکن بھاگی نہ تھی، صرف روپوش ہوئی تھی، سب لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے آفت زدہ لڑکی بھی ایک طرف کھڑی ہونقوں کی طرح دیکھ رہی تھی کہ یہ کیا ہو گیا۔ اب کیا ہوگا، زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ چتا میں جلتی ہوئی لکڑیاں ایک ایک کر کے فضا میں بلند ہونے لگیں۔ لکڑیاں بلند ہوتی دیکھ کر سب لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور وہ ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی، جلتی لکڑیاں ان کے جسموں پر برسنے لگیں۔ سر، کمر، پشت، منہ کوئی عضو ان کی دسترس سے دور نہ تھا۔ جو لوگ بھاگ نکلے تھے لکڑیاں ان کے جسموں پر بھی بری طرح برستی ہوئیں انہیں گھیر گھار کر چتا کے قریب لے آئیں۔ اب لڑکی کو چتا میں ڈالنے

والے سب لوگ چتا کے قریب اکٹھے تھے۔ جلتی لکڑیاں ان کو گھیرے میں لے کر ان پر دھڑا دھڑ برس رہی تھیں۔ سب لوگ ہذیانی انداز میں حلق پھاڑ کر چیخ رہے تھے اور ہاتھوں سے اپنا آپ بچانے میں مصروف عمل تھے۔ لکڑیوں کا گھیرا تنگ ہوتا گیا۔ اچانک ان میں سے چند جلتی چتا کے اوپر گر گئے۔ انہوں نے گرنے سے بچنے کے لئے چند دوسرے لوگوں کو پیچھے سے پکڑ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی ان کے ساتھ ہی پیچھے جلتی آگ میں گرنے لگے۔ آہستہ آہستہ تمام افراد آگ میں گرتے چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں امن ہو گیا۔ تمام لوگ آگ کے اندر پڑے ہوئے اُچھل رہے تھے۔ ان کے لاشے اچھلنے سے آگ مزید بھڑک اُٹھی اور اچھا بھلا الاؤ بن گیا۔ چہار سو گوشت جلنے کی سڑاند پھیلنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد کھوپڑیاں او رہڈیاں چٹاخ تڑاخ کی آوازوں سے ٹوٹنے اور پھٹنے لگیں۔ اب شکنتلا پرسکون ہو کر انسانی روپ میں آئی اور ایک طرف سراسیمہ حالت میں کھڑی لڑکی کی طرف بڑھی جو حیران تھی کہ یہ کون سی نادیدہ قوت ادھر آ نکلی جس نے مجھے جلنے سے بچا کر مجھے جلانے والوں کو جلا دیا۔ اب فضا میں بلند تمام جلتی لکڑیاں اپنی اپنی جگہ پر چلی گئیں۔

''ادھر آؤ'' شکنتلا نے اسے پاس آنے کا حکم دیا۔

''لڑکی جو سانس روکے کھڑی تھی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شکنتلا کے قریب آ گئی۔ لڑکی سفید رنگ کی سوتی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اس کا خوب صورت چہرہ غالباً خوف و دہشت اور رونے سے کملایا ہوا تھا۔

لڑکی قریب آئی تو شکنتلا کی نظر اس کے ماتھے پر پڑی تو شکنتلا بری طرح چونک پڑی۔

لڑکی کے ماتھے پر مخصوص بندیا کے بجائے ایک شیش ناگن کی شبیہہ چسپاں تھی۔ اس چیز کو دیکھ کر شکنتلا چونکی تھی۔

''کون ہو تم؟ یہ لوگ کون تھے اور تمہیں کیوں مارنا چاہتے تھے؟''

''آپ نے میری سہائتا کر کے بڑی نیکی کی ہے دیدی لڑکی ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی وہ ابھی تک خوف سے کانپ رہی تھی۔ میں ناگ بھون کی وش کنیا ہوں......''

''کیا......؟ شکنتلا بھونچکاں رہ گئی۔''

اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا ناگ بھون کی وش کنیا یوں اچانک اس کے سامنے آ جائے گی۔ شری راج نے اس سے وش کنیا ہی تو طلب کی تھی۔

''یہ لوگ تمہیں کیوں جلانا اور ستی کرنا چاہتے تھے؟''

''میں نے ناگ بھون میں ہونے والے ظلم کے خلاف زبان کھولنے کی کوشش کی۔ یہی کوشش میرا جرم بن گئی۔ تم بہت مہان شکتی ہو دیدی۔'' وہ لڑکی شکنتلا کے پاؤں چھو کر بولی۔ تم چاہو تو ناگ بھون میں روح فرساء مظالم کا خاتمہ کر سکتی ہو!

''تمہارا نام کیا ہے۔'' شکنتلا بغور اس کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''والدین نے میرا نام کامنی رکھا تھا۔ پندرہ سال کی ہوئی تو مجھے اور میری بہن لکشمی کو ناگ بھون کی داسی بنا کر چڑھاوا چڑھا گئے۔ ان کا خیال تھا میں یہاں ناگ دیوتا کی داسی بن کر دھرم کی خدمت بھی کروں گی اور ستی ساوتری بھی رہوں گی...... پرنتو ان بیچاروں کو کیا پتہ کہ یہاں پروہتوں اور برہمچاریوں کے روپ میں راکشش رہتے ہیں۔ جو معصوم اور بھولے بھالے لوگوں کو الو بنا کر اپنا الو سیدھا کر رہے ہیں۔ ستی ساوتری کا خواب دیکھ کر دھرم داسی بننے والی کو رات ہی رات میں کلی سے پھول بناتے ہیں اور پھر اس پھول کا رس اس وقت تک بھنورے بن کر مل کر چوستے ہیں جب تک اس کا وجود مرجھا نہ جائے۔

''میں بھی اسی قبیح فعل کی سولی پر چڑھ کر برباد ہونے والی وہ کنیا ہوں جس کے جیون اور جوانی سے خوشی کے ایک ایک قطرے کو نچوڑ کر نکال لیا گیا۔

''او کل جب حاکم وقت نے ناگ بھون میں قدم رنجہ کیا تو میں نے اسے حقیقت سے آگاہ کرنا چاہا تو وہ تو مجھے یہ کہہ کر چلا گیا کہ تحقیقات ہوں گی اور انصاف کیا جائے گا لیکن اس کے جاتے ہی مجھے یہ لوگ کھینچ کھانچ کر یہاں لے آئے اور کسی نامعلوم مرنے والے کے ساتھ مجھے بھی ستی کر دینا چاہتے تھے۔ میرے مرنے کے بعد یہ مشہور کر دیتے کہ یہ مرنے

والے کی پتنی تھی جو اپنے پتی کے ساتھ اس کی چتا میں بیٹھ گئی تھی۔

کامنی کی بپتا سن کر شکنتلا سوچ میں پڑ گئی! کہ اس لڑکی کو لے کر شری راج کے پاس چلی جائے یا ناگ بھون کی سیر کر کے وہاں دیکھے تو سہی کہ کیا ہو رہا ہے اور اس لڑکی کی باتوں میں کتنی سچائی ہے۔

''کیا تم واقعی وش کنیا ہو......؟'' شکنتلا نے کامنی سے سوال کیا؟

''ہاں دیدی...... مجھے پورے دو سال اذیت ناک عمل سے گزرنا پڑا تو پھر میرا خون ایسا ہو گیا کہ اب کسی سانپ کا زہر مجھ پر اثر نہیں کرتا بلکہ جو سانپ مجھے ڈستا ہے اس کا دوران خون رک جاتا ہے اور وہ جم کر سنگ چور ہو جاتا ہے اسے مختلف محلول لگا کر حنوط کر لیا جاتا ہے اور اگر محلول لگانے سے پہلے میں یا کوئی بھی وش کنیا اسے ہاتھ لگا لے تو وہ اسی وقت ٹوٹ کر چور چور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سارے عمل کا وش کنیا (زہر آلود لڑکی) کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ تمام فوائد ناگ بھون کے پجاری یا پروہت لے جاتا ہے۔ تمام داسیوں اور وش کنیاؤں کو ناگ بھون کے تہہ خانوں میں رکھا جاتا ہے۔ جہاں سے فرار کر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تم مظلوم لڑکیوں کی سہائتا کرو گی نا دیدی۔ تم تو بہت بڑی شکتی مان ہو دیوتا تمہارے اس عمل سے خوش ہو کر تمہیں اور بھی گیان دان کر دیں گے!'' کامنی آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ ہاتھ جوڑے کھڑے تھی۔

''میرا نام شکنتلا ہے......اور میں شکتی ہی نہیں بلکہ ناگن دیوی ہوں۔''

''ناگن دیوی......؟'' کامنی زیر لب بڑبڑائی۔

''ہاں ناگن...... جو سو سال کی عمر پا کر روپ دھارن بن گئی۔''

''آپ روپ دھارن ناگن ہیں۔'' کامنی حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

''ہاں روپ دھارن ناگن دیوی...... یوں تم اور دوسری تمام وش کنیائیں اور ناگ بھون کے تمام سانپ اور ناگ دیوتا کے سب پنڈت پجاری اور پروہت میری رعایا میں شامل ہیں۔ میں ناگ بھون ضرور جاؤں گی اور ناگن دیوتا کا تقدس بحال کر کے رہوں گی......شوں......شوں......شوں شکنتلا کی سانسیں پھنکاریں بننے لگیں۔

''چلو میرے ساتھ......'' شکنتلا نے کامنی کا ہاتھ تھام کر کہا۔



شکنتلا کامنی کا ہاتھ تھامے اسی کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہی تھی۔ کامنی اسے ناگ بھون کی طرف لے کر چل رہی تھی۔ کامنی نے اسے بتایا کہ ناگ بھون میں اس کی چھوٹی بہن لکشمی پہلے دن کے بعد پھر اسے نہ ملی تھی۔ میں تین سال سے ناگ مندر کے تہہ خانوں میں اسے ڈھونڈتی رہی مگر وہ کہیں نہ ملی۔ کسی نے اس کے بارے میں نہ بتایا۔

باتیں کرتی ہوئی دونوں چل رہی تھیں۔ کامنی شکنتلا کو قریب پا کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہی تھی۔ دونوں انتہائی گھنے جنگل میں چل رہی تھیں۔ کامنی نے شکنتلا کو بتایا کہ وہ لوگ اسے ادھر سے ہی لے کر آئے تھے! جنگل بہت گھنا اور تاریک ہو چکا تھا۔ شاخیں شاخوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ چلنا دوبھر ہو رہا تھا، کامنی ایک جگہ کھڑی ہو گئی اور کچھ تلاش کرنے لگی۔

''کیا دیکھ رہی ہو......؟'' شکنتلا نے سوالیہ نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

''یہاں ایک چھوٹا سا غار نما دروازہ ہے جس سے گزر کر ہم یہاں آئے تھے اس کے علاوہ آگے جانا ممکن نہیں۔ دونوں مل کر دروازہ تلاش کرنے لگیں۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد گہرے سبز رنگ کا دروازہ درختوں کے درمیان نظر آ گیا۔ جو کھلا تھا۔ شاید کامنی کو لانے والوں نے اسی راستے سے واپس جانا تھا۔ یہ قدرے چھوٹے سائز کا دروازہ تھا۔ دونوں سر کو جھکا کر اندر داخل ہو گئیں۔

یہ ایک سیدھی راہداری ہے جو تقریباً تین چار سو قدم چل کر ناگ بھون کے عقب میں نکلتی ہے۔ کامنی شکنتلا کو بتا رہی تھی۔ جلد ہی دونوں وہاں پہنچ گئیں۔ جیسے ہی دروازے سے باہر نکلیں ناگ مندر سامنے تھا جس کو دیکھتے ہی انجانے وسوسوں سے کامنی کا وجود لرزنے لگا۔ شکنتلا جو کہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی اس نے اس لرزش کو واضح طور پر محسوس کر لیا۔

''کیا بات ہے کامنی۔'' شکنتلا نے اس کا ہاتھ دبا کر پوچھا؟

''مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے دیدی۔'' کامنی سسکنے لگی۔

''شکنتلا یا خوف...... دونوں میں سے کوئی ایک موجود رہ سکتا ہے کامنی۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہو گی مگر ناگ بھون کے پجاریوں اور پروہتوں کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتی دیدی...... یہ لوگ عیار مکار اور ظالم ہونے کے ساتھ کالے علم اور پراسرار شکتیوں پر دسترس بھی رکھتے ہیں۔

''کامنی......'' شکنتلا چلتے چلتے رک کر اسے گھورنے لگی۔ کامنی بھی ٹھٹھک کر رک گئی۔

''شکنتلا ایک ایسے طوفان کا نام ہے جس کے راستے میں آنے والی ہر چیز نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ تم خاموشی سے میرا ہاتھ تھامے رکھو۔''

کامنی اور شکنتلا ہاتھ تھامے ناگ مندر کے عقب سے چکر کاٹ کر سامنے کی طرف آنے لگیں۔ یہ کالے سیاہ پتھروں سے بنی انتہائی قدیم عمارت تھی جس کی لمبائی چوڑائی اور اونچائی دیکھ دیکھ کر شکنتلا حیران ہو رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں اور ناگ مندر کی اونچی سیاہ دیوار کے پہلو میں چلتی ہوئیں دونوں سامنے کی طرف آنے لگیں۔

''کیا تمہیں وہ لوگ اس راستے سے لے کر گئے تھے۔'' شکنتلا نے سوال داغا۔

''نہیں دیدی......'' وہ راستہ تو سیدھا تہہ خانے میں جاتا ہے اور وہاں کڑا پہرہ ہوتا ہے۔ پھر مجھے وہاں آدھے راستے کے بعد آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا گیا۔ البتہ مندر سے باہر جنگل شروع ہونے پر پٹی کھول دی گئی تھی۔

شکنتلا پراعتماد گفتگو سے کامنی کا ڈر کم ہونے لگا۔ وہ اسے نجات دہندہ سمجھنے لگی تھی۔ وہ کبھی ناگ مندر واپس نہ جاتی اگر اسے اپنی بہن لکشمی کی تلاش نہ ہوتی! اب کامنی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ ناگ مندر پر خاموشی طاری تھی۔ کامنی شکنتلا سے چند قدم پیچھے شکنتلا کی آڑ میں چل رہیت تھی۔ تا کہ کسی بھی متوقع حادثے سے بچ سکے۔

''کامنی کیا ناگ مندر میں سانپ یاتریوں کو کچھ نہیں کہتے۔'' شکنتلا نے پوچھا۔

لیکن کامنی نے جواب نہ دیا۔

''کیوں کامنی'' کامنی شکنتلا نے زور سے پکارا۔ لیکن کامنی وہاں ہوتی تو جواب دیتی۔ شکنتلا چونک پڑی۔ انجانے خطرے کا احساس اس کے تحت الشعور میں ابھرا اور وہ دیوانہ وار آوازیں لگاتی ہوئی دائیں بائیں آگے پیچھے کامنی کو تلاش کرنے لگی لیکن کامنی کو یا تو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا تھا۔

☆......☆

آخر کار شکنتلا کامنی سے مایوس ہو گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ ناگ مندر پر قابض پجاریوں کی شرارت ہے۔ وہ کامنی کو بے آواز یوں اُٹھا کر لے گئے ہیں کہ شکنتلا کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکی۔

اب اس نے ناگ بھون قصبہ کے ناگ مندر کا راز فاش کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ایک سپیرن کا روپ دھار کر ناگ مندر آ نکلی۔

یہ ایک دیو ہیکل مندر تھا۔ ناگ مندر کی نسبت سے اس پورے قصبہ کے ناگ مندر کا راز فاش کرنے کا فیصلہ کر لی ااور ایک سپیرن کا روپ دھار کر ناگ مندر آ نکلی۔

یہ ایک دیو ہیکل مندر تھا۔ ناگ مندر کی نسبت سے اس پورے قصبہ کو ناگ بھون کہا جاتا تھا۔ سیاہ پتھروں سے بنے ہوئے صحن تک پہنچنے کے لیے کئی درجن سیڑھیاں بنی تھیں شکنتلا جس وقت ناگ مندر کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی اس وقت دور مشرق سے پو پھٹنا شروع ہو چکی تھی۔ علی الصبح ہونے کی وجہ سے خنک ہوا چل رہی تھی۔ دور دراز سے مندر یاترا کے لیے آئے ہوئے یاتری پہنچنا شروع ہو چکے تھے۔ شکنتلا نے جوتے سیڑھیوں پر ہی اتار دیے۔

☆☆......☆☆

(حیرت کے نئے رنگوں سے آباد اس سلسلے وار ناول کی اگلی قسط ماہ نومبر میں ملاحظہ کیجیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی 300/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی

□ صبا عفان۔کراچی

○ بابا جی! میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔کھانا کھاتے ہی پیٹ میں درد ہوتا ہے اور پانی کی شکایت ہوجاتی ہے۔ جسم گرا پڑا رہتا ہے۔ کمر میں درد رہتا ہے، چھینکیں بکثرت آتی ہیں، ناک آنکھ سے پانی آتا ہے۔ دو ایک جگہ دکھایا کسی نے کہا کہ اثرات ہیں۔ میری شادی دو سال قبل ہوئی تھی۔ میرا ایک بیٹا ہے۔ بابا جی مجھے طلاق ہوگئی اور بچہ سسرال والوں نے رکھ لیا۔ میں اپنے بچے کے لیے تڑپتی رہتی ہوں۔ اب میں اپنے بھائی کے گھر رہ رہی ہوں۔ وہ میری دوسری جگہ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میرا شوہر نشہ کرتا تھا۔ میرے بھائی بچہ بھی نہیں لینا چاہتے، میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ مجھے ایسا حل بتائیں کہ نیک صالح شوہر مل جائے اور میری طبیعت بھی سنبھل جائے۔ میں نے خط میں زیادہ اپنے دکھوں کی تفصیل نہیں لکھی۔ کیونکہ یہاں ہر انسان ہی دکھی ہے اور شاید آپ بھی اتنی تفصیل پڑھنے میں بور ہوجائیں گے۔ میں بتا نہیں سکتی کہ میں کتنی مجبور ہوں۔ میرے ماں باپ زندہ ہوتے تو شاید میری شادی اس گھرانے میں نہ ہوتی اور نہ میرا بچہ مجھ سے دور ہوتا۔ میں بہت بے سکون ہوں۔ نیند بھوک سب اُڑ چکی ہے۔ جس کرب سے میں گزر رہی ہوں، میں ہی جانتی ہوں۔ میں پان تمباکو بھی کھانے لگی ہوں، یہ بھی چھوٹ جائے اور میرا بچہ بھی مل جائے۔

☆ بیٹی صبا! تمہارے دکھ کو میں بہت اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے ایسے لوگوں کو انسان کہتے ہوئے شرم آتی ہے جو ماں سے اس کی اولاد کو دور کردیتے ہیں مگر بیٹی یقین رکھو اس عمل سے وہ جہنم کے بہت قریب ہوجاتے ہیں۔ تمہارا دکھ بہت بڑا ہے۔ مگر تمہیں ہمت کرنی ہوگی۔ نماز کی پابندی کی عادت ڈالو۔ جب بہت دل دکھے تو دو نفل پڑھو۔ اللہ کے حضور بہت رویا کرو۔ انسانوں کے آگے کبھی مت گڑگڑانا ہاں اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگا کرو۔ اپنی اولاد کے لیے، اپنی اچھی زندگی کے لیے، بیٹی اللہ کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ خط لکھتے ہوئے تمہارے آنسو بھی بہے ہیں، جگہ جگہ تحریر پھیل گئی ہے۔ مگر بیٹی یقین رکھو کہ تمہیں وہ سب کچھ عطا ہوگا جو تم چاہتی ہو۔ بکثرت سورۃ فاتحہ پڑھا کرو۔ چلتے پھرتے دُرود شریف پڑھو اور مجھ سے رابطے میں رہو۔

□ عذرا۔کراچی

○ مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر دانے ہوگئے تھے میک اپ سے الرجی ہوگئی تھی۔ 9 سال ہوگئے ہیں چہرہ صاف نہیں ہوتا کچھ دن ٹھیک ہوجاتا ہے پھر دانے نکل آتے ہیں۔ دھبے رہ جاتے ہیں۔ ناک کے نتھنے پر دانے ہیں جو ختم نہیں ہوتے۔ چہرے پر پسینہ بہت آتا ہے، چکنا بھی بہت رہتا ہے۔ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میری جلد صاف اور خوبصورت ہوجائے، چہرے کی بے رونقی ختم ہوجائے۔ رات ہوتے ہی چہرے پر سوجن آجاتی ہے جو سونے کے بعد اور بڑھ جاتی ہے۔ صبح چہرہ سوجا ہوا ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ٹھیک ہوتا ہے۔ میرے مسئلہ کا حل بتائیں۔

☆ بیٹی عذرا! تمہارے چہرے کے لیے میں دوا تیار کردوں گا تم سچی کہانیاں کے دفتر سے معلومات حاصل کرسکتی ہو۔

□ عظمیٰ ظہور۔پشاور

○ بابا جی آداب! میرا مسئلہ ہے کہ ہماری بہت قیمتی جائیداد ہے۔ میرے سسر نے سب کرایہ داروں کو دوکانیں پگڑی پر دی ہیں اب نہ وہ خالی کرتے ہیں نہ کرایہ دیتے ہیں۔ ہم اپنی جائیداد کو بیچنا چاہتے ہیں لیکن کرایہ داروں کی وجہ سے کوئی بھی نہیں لیتا۔ کوئی دعا بتائیں کہ وہ خود سے خالی کردیں کوئی جھگڑا وغیرہ نہ ہو۔ کوئی دعا بتائیں ساری عمر آپ کو دعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی عظمیٰ! جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگوا کر سسر سے کہو اپنے پاس رکھیں، ہمراہ ورد بھی دوں گا۔ کام ہوجانے پر مجھے فوراً مطلع کریں۔ تعویذ حاصل کرنے کے لیے مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو۔

□ حنا۔کراچی

○ اُمید کرتی ہوں آپ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی دے۔ بابا جی میرا اور میری چھوٹی بہن کا مسئلہ رشتے کا ہے۔ بابا جی میری پہلی بھی دو منگنیاں ایک ایک سال رہ کر ٹوٹ گئی ہیں، اب بھی رشتے آتے ہیں پر کوئی بات نہیں بن پاتی ہے۔ ہم سات بہنیں ہیں جن میں سے 4 بہنوں کی شادی ہوگئی ہے۔ میرے ماں باپ بہت پریشان ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ہم دونوں بہنوں کا ایک ہی گھر میں رشتہ ہوجائے۔ بابا جی ہمارے یہاں ذات برادری کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ رشتے بہت

آتے ہیں اور ہمیں پسند بھی کر جاتے ہیں پر جب وہ ہماری برادری کے نہیں ہوتے تو میرے امی ابو منع کر دیتے ہیں۔ ہماری عمر بھی زیادہ نہیں ہے۔20 سال کی چھوٹی بہن ہے اور میں ایک سال اس سے بڑی ہوں۔ بابا جی! آپ پلیز کوئی ایسا تعویذ دیں اور وظیفہ کہ میرا اور میری چھوٹی بہن کا اچھے گھر میں رشتہ ہو جائے۔ میں نماز کی بھی پابندی کرتی ہوں پر پھر چھوٹ جاتی ہے۔

☆بیٹی حنا! تم تعویذ چاہتی ہو میں بھی تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ تعویذ منگوالو۔ اصل میں طرح طرح کے لوگ رشتے کے لیے آتے ہیں۔ جوان بچیوں پر ہر طرح کی نظریں پڑتی ہیں لہٰذا میں ہمیشہ تمام ماؤں کو یہی مشورہ دیتا ہوں کہ جب بچی اس قابل ہو جائے کہ اس کا رشتہ طے کیا جائے تب سب سے پہلے مجھ سے تعویذ منگوا کر رکھ لیا کریں تاکہ بدنظر سے حفاظت ہو۔ بہرحال اطمینان رکھو۔ جوابی لفافے کے ہمراہ خط ارسال کرو، اللہ سب خیر کرے گا۔

☐ ریحان۔کراچی

☆بیٹے ریحان! نماز فجر اور عشاء کے بعد **11'11** بار الحمد شریف پڑھو اور دعا کرو۔ معاملات میں خاموشی رکھنی ہوگی۔ بیٹا تمہارے حالات بہت تکلیف دہ ہیں۔ چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔ تمہیں صبر اور ہمت سے ان تمام حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ میں تمہارے لیے خصوصی دعا کا بھی اہتمام کروں گا۔

☐ سمیرا یاسر۔حیدرآباد

☆بیٹی سمیرا! میں مانتا ہوں کہ تمہاری شادی شدہ زندگی ایک عرصے سے اُلجھی ہوئی ہے مگر بیٹی تم سے بھی کچھ غلطیاں ہوئی ہیں۔ ایسی غلطیاں جو بہت بڑے نقصان کا سبب بن سکتی ہیں۔ جب عورت شوہر کے اعتماد کو دھچکا دے دیتی ہے تب زندگی کٹھن ہو جاتی ہے۔ میں اس لیے اپنی بیٹیوں سے صرف خط کے ذریعے رابطہ رکھتا ہوں تاکہ کوئی تیسرا شخص درمیان میں آ کر معاملات کو خراب نہ کردے۔ پھر ہمارا دین بھی نامحرم سے بلاضرورت بات کرنے کو پسند نہیں کرتا۔ تمہیں اپنی غلطی کو سدھارنے کے لیے بہت قربانیاں دینی ہوں گی۔ بکثرت استغفر اللہ ربی کا ورد کیا کرو۔ میں تمہارے لیے دعا گو ہوں۔

☐ فہمیدہ۔نوشہرو فیروز

☆بیٹی فہمیدہ! اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے جوڑ کا رشتہ بنایا ہے لیکن ہم انسان کم عقل ہونے کی وجہ سے اپنا نقصان کر لیتے ہیں۔ بیٹی تم بعد نماز فجر ایک بار سورۃ احزاب ترجمہ کے ساتھ پڑھو اور دعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔ اپنے ہاتھوں سے بعد نماز ظہر چڑیوں کو دانہ پانی ضرور ڈالا کرو۔ اللہ خیر کرے گا۔

☐ ع ب۔سرگودھا

☆بیٹی! تم بھی ان ہی فرسودہ خاندانی جھگڑوں میں اُلجھی ہوئی ہو جن کی وجہ سے نجانے کتنی زندگیاں برباد ہو گئیں۔ بہرحال تمہارا اختیار نہیں کہ ان معاملات کو سلجھا سکو مگر تم اپنے آپ کو ان سے نکال سکتی ہو اور اُس کے لیے اللہ سے مدد مانگو۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشا کے بعد سورۃ بقرۃ آیت **9** اور **10** '**111** بار پڑھو اور دعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔ انشاءاللہ ضرور کرم ہوگا۔

☐ تبسم۔میرپور خاص

☆بیٹی تبسم! تمہاری سوچ بالکل درست ہے۔ والدین کی رضامندی کے بغیر ہونے والی شادیوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ رسم و رواج کے نام پر بچیوں کو برباد کرنا بھی مناسب نہیں۔ زیادتی کرنے والے کو روز حشر اللہ کو جواب دینا ہوگا۔ بیٹی کوئی انتہائی قدم مت اٹھانا یہ میری نصیحت ہے۔ ہاں تعویذ میں تیار کردوں گا تفصیل درکار ہوگی۔ تم مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو، میں جواب دوں گا۔ انشاءاللہ سب اچھا ہوگا۔

☐ ش م۔کلر سیداں

☆بیٹی! اللہ تم پر اور تمہاری بہن پر رحم فرمائے۔ جن لوگوں کا شخص قتل ہوا ہے، ان سے تمہارے گھر والے بات چیت کر کے بذریعہ دیت معاملے کو طے کر سکتے ہیں اگر وہ دیت لینے پر تیار ہوں اور اس کے بدلے وہ قاتل کو معاف کردیں۔ اس معاملے میں زور زبردستی نہیں کی جاسکتی، بہرحال بہن سے کہو وہ "لاالہ الا انت سبحانک انی کنتُ من الظالمین" کا بہت ورد کرے۔ بیٹی تم یا مالک الملک کا ورد کرو۔ الحمد شریف ترجمہ کے ساتھ دن میں دو وقت **11-11** بار پڑھو۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور دو۔ یاد رکھو جو لوگ اللہ کی راہ میں دینے سے کتراتے ہیں وہ

مستقل مشکلات میں گھرے رہتے ہیں اور ان کا پیسہ بیماریوں یا دیگر مسائل میں ضائع ہوجاتا ہے۔ لہٰذا جب بھی اللہ کو راضی کرنا ہو، اس کی راہ میں خرچ کرو اور جائز ضرورت مندوں کو دو۔ انشاء اللہ خیر ہوگی۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرو۔

□ محمد اویس۔ نیویارک امریکہ

☆ بیٹے اویس! تم اگر اپنا پتا ارسال کرتے تو میں تمہیں براہ راست جواب دیتا۔ تمہارا مسئلہ اس نوعیت کا ہے کہ اس کا جواب کالم کے ذریعے وضاحت کے ساتھ دینا ممکن نہیں۔ تم جس مشکل میں گرفتار ہو، اس سے باہر آنا بہت ضروری ہے ورنہ روزِ حشر خالی ہاتھ ہوگے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ جلد از جلد شادی کرلو۔ تمہارا آدھا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ بیٹے تم نماز کی پابندی کی کوشش کرو۔ جب ذہن میں شیطانی خیالات آئیں لاحول ولاقوۃ ضرور پڑھا کرو۔ تم اچھے انسان ہو بھی برائی سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو اور برائی سے تمہاری جان چھوٹ بھی جائے گی۔ بس تھوڑی ہمت کرنی ہوگی۔ میں تمہیں تعویذ دوں گا مگر اس کے لیے تمہیں جوابی لفافے پر اپنا پتا لکھ کر ارسال کرنا ہوگا یا پھر سچی کہانیاں کے دفتر فون کرکے پتا نوٹ کروادو۔ میں تمہاری ضرور مدد کروں گا اس لیے کہ تم خود اپنی مدد کرنا چاہتے ہو، خوش رہو۔

□ بشریٰ۔ کراچی

☆ میرا مسئلہ بالوں اور دانوں کا ہے۔ میرے منہ پر دانے ہیں۔ بابا جی بہت علاج کروایا ہے اتنا افورڈ نہیں کرسکتی کہ مہنگی مہنگی دوائیاں استعمال کروں۔ میں چاہتی ہوں کہ چہرہ بالکل صاف ہوجائے۔ بابا جی میں اپنے بال بھی بڑھانا چاہتی ہوں۔ میرے بال پتلے ہیں اور بے جان ہیں۔ آپ مجھے ایسا تیل دے دیں بالوں کے لیے جو بالوں کو لمبا گھنا اور مضبوط کردے اور میرا چہرہ بھی صاف ہوجائے۔ میرے یہ مسئلے حل کردیں بابا جی ہمیشہ دعائیں دوں گی۔ اللہ آپ کی عمر دراز فرمائے۔ بابا جی میں سچی کہانیاں میں آپ کے مسئلے لازمی پڑھتی ہوں۔

☆ بیٹی بشریٰ! تم نے جو کچھ اپنے ساتھ کیا اس سے برا اور کچھ نہیں کرسکتیں۔ تم نے اپنے ہاتھوں اپنا خون کردیا ہے۔ تم اتنی کم عمر ہو کہ تمہیں اس سانحے کا اندازہ ہی نہیں جو تم پر گزرنے والا ہے۔ بیٹی تم نے نہیں لکھا مگر میں تمہارا پہلا مسئلہ شائع نہیں کررہا۔ صرف یہ نصیحت کروں گا کہ تم ایک لمحہ بھی ضائع کیے بنا مجھ سے تعویذ منگوالو۔ طریقہ کار سچی کہانیاں کے دفتر فون کرکے معلوم کرو۔ تمہارے پاس تو خط لکھنے کا بھی وقت نہیں ہے۔ جہاں تک بالوں اور چہرے کی دوا کا تعلق ہے تو وہ سچی کہانیاں کے دفتر سے دستیاب ہوں گی۔ طریقہ استعمال بھی دوا کے ہمراہ ہوگا۔

□ فریحہ شان۔ خوشاب۔

○ بابا جی! السلام علیکم! آج سے تقریباً آٹھ نو برس پہلے آپ نے میرے دو مسائل حل کیے تھے۔ اتنے سالوں بعد میں پھر آپ کی مدد اور دُعاؤں کی طلب گار ہوں۔ بابا جی! میرے دو مسئلے ہیں، پہلا یہ کہ میرے بھائی کی شادی کو تین سال ہوچکے ہیں۔ اُس کا ایک سال کا بیٹا بھی ہے۔ جب سے اُس کی شادی ہوئی ہے، وہ نفسیاتی مریض بن گیا ہے۔ بیوی پر بہت شک کرتا ہے۔ گھر میں آنے جانے والوں پر بھی شک کرتا ہے حتیٰ کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ بھی اُس کا یہی رویہ ہے۔ ماں باپ کی بہت نافرمانی کرتا ہے۔ بہنوں کا بالکل خیال نہیں رکھتا۔ شروع میں ہمیں سمجھ نہ آئی کہ یہ ایک بیماری ہے۔ اَب یہ بیماری بہت بڑھ چکی ہے۔ ہمیں اُس سے بے حد پیار ہے۔ ہم چاہتے ہیں، وہ پہلے کی طرح صحت مند اور ہنس مکھ ہوجائے۔ اس کی بیوی اور بچہ دس ماہ سے میکے میں ہیں۔ میرے والدین بے حد غریب ہیں پھر بھی بھائی کا علاج کروا رہے ہیں۔ بابا جی! کچھ ایسا علاج بتائیے، وہ ٹھیک ہوکر نارمل ازدواجی زندگی گزارے، پیار ومحبت سے سب کے ساتھ رہے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اور یہ بھی بتائیے کہ کسی نے اُس پر عمل وغیرہ تو نہیں کروایا؟ بابا جی! میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر کی کھلونوں کی دکان ہے مگر وہ چلتی نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو بسم اللہ تک نہیں ہوتی کیونکہ دکان کرائے کی ہے، اِس لیے ہر مہینے کرایہ چڑھ جاتا ہے۔ ہمارے دو چھوٹے بچے بھی ہیں۔ ہم لوگ اِس صورتِ حال سے بے حد پریشان ہیں۔ برائے کرم آپ ہمارے مسائل حل کردیں۔ کاروبار میں برکت ہوجائے۔ میں خود بہت سے وظائف پڑھتی ہوں مگر دُعاؤں میں اثر نہیں ہے۔ برائے مہربانی آپ ہمارے لیے کچھ کریں۔ عین نوازش ہوگی۔

☆بیٹی فریحہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بھائی پر ہر نماز کے بعد الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر تصوّر میں دَم کرو۔ علاج پابندی سے کراؤ، ضرور افاقہ ہوگا۔ بیٹی! تم اپنے مسئلے کے لیے بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ مزمل پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

☐ شہناز۔ چکوال۔

o باباجی! میں نے پہلی بار آپ کا کالم پڑھا تو دل کو بہت سکون ہوا۔ یقین ہوگیا کہ دُنیا میں ابھی اچھے لوگ باقی ہیں۔ باباجی! میرا مسئلہ بہت شدید نوعیت کا ہے۔ میں عرصہ 7 سال سے کسی کو پسند کرتی ہوں، وہ بھی مجھے بہت چاہتے ہیں مگر میرے گھر والے کسی طور نہیں مان رہے، خاص طور پر والد اور بڑے بھائی۔ اگر میرے گھر والے مان جائیں تو وہ اپنے والدین کو ہمارے گھر بھیج دیں گے۔ باباجی! میں اسکول میں جاب کرتی ہوں۔ ظہر اور عصر قضا ہوجاتی ہیں۔ گھر آتے آتے مغرب کا وقت ہوجاتا ہے۔ اَب برائے مہربانی مجھے تعویذ عنایت کیجیے اور طریقۂ استعمال بھی بتایئے۔

☆بیٹی شہناز......! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ تعویذ میں ضرور تیار کردوں گا مگر تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے والد اور بھائی اِس رشتے کے خلاف کیوں ہیں؟ بیٹی......! والدین کا تجربہ بہت ہوتا ہے، پھر وہ اپنی اولاد سے محبت بھی بہت کرتے ہیں لہٰذا برا چاہ ہی نہیں سکتے۔ تمہارا خط واضح نہیں ہے، تفصیل سے مجھے خط لکھو، اس کے بعد میں تمہیں حل بتاؤں گا مگر بیٹی......! ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ والدین کو دُکھی کر کے اولاد کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔

☐ ناصرہ خان۔ فیصل آباد۔

o باباجی! آداب! میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرا بھائی ہے، وہ اپنا مکان بیچ کر میرے ساتھ نئی کالونی میں پلاٹ لینا چاہ رہا ہے۔ آپ استخارہ کر کے بتائیں کہ اُس کا یہ مکان بیچنا بہتر ہے یا نہیں؟ کیونکہ اَب اُس کا مکان امی کے ساتھ ہے اور امی نہیں چاہتیں کہ بھائی مکان بیچے۔ مہربانی ہوگی جبکہ دوسرا مسئلہ میں نے آپ کو دو ماہ پہلے بھیجا تھا جس میں، میں اپنے دیور کے رشتے کے متعلق پوچھا تھا کہ میں اُس کا رشتہ اپنی بہن کے ساتھ کرنا چاہتی ہوں اور اُس کا میری زندگی پر کوئی منفی اَثر تو نہیں ہوگا؟ آپ نے استخارہ کر کے بتایا تھا کہ استخارہ حق میں ہے لیکن اُس میں میرا نام غلط چھپ گیا تھا لیکن خط کا متن پڑھ کر میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ خط میرا ہی ہے۔ میری امی اور بہن اِس رشتے کے لیے راضی ہیں۔ میری بہن کہتی ہے کہ میں نے خود استخارہ کیا ہے، جس میں پہلے دو دن کچھ نظر نہیں آیا اور تیسرے دن دیکھا کہ اندھیری چل رہی ہے اور ایک بچہ نظر آیا، وہ کہہ رہا تھا کہ یہ رشتہ ٹھیک نہیں ہے۔ اَب آپ اِس سلسلے میں ہماری راہنمائی کریں کہ ہم کیا کریں؟ اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین!) دُعاؤں میں یاد رکھیں۔

☆بیٹی! تمہارا فرضی نام جو مجھے سمجھ آیا، وہ لکھ رہا ہوں۔ کم از کم خط لکھتے وقت نام واضح لکھا کرو۔ بہرحال بھائی سے کہو، گھر نہ بیچے۔ تمہارے اور اُس کے درمیان بدمزگی پیدا ہوجائے گی۔ جہاں تک بہن کا تعلق ہے تو اگر وہ خود اِس رشتے کے لیے تیار نہیں تو بیٹی! تم کیوں استخارے کروا رہی ہو؟ یہ بالکل غلط ہے۔ اِسلام نے لڑکی کو پورا اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کرے لہٰذا تم یہ معاملہ اپنی بہن اور اپنی والدہ پر چھوڑ دو۔

☐ محمد امین۔ ژوب۔

o باباجی! میں اِس سے پہلے بھی آپ کو خط لکھتا رہا ہوں اور اللہ کے فضل سے میرے مسائل بھی حل ہوئے ہیں۔ آج آپ کو اپنی بہن کے مسئلے کے لیے خط لکھ رہا ہوں۔ باباجی! اس کی شادی 2010ء میں میرے سگے ماموں زاد سے ہوئی اور بدلے میں میری شادی وہاں ہوئی۔ اِس طرح ایک گھر کے دو لوگ ہمارے پاس ہیں۔ باباجی! میری بہن کے ہاں ابھی تک اولاد نہیں ہے۔ یہ بات اِس لیے محسوس زیادہ ہوتی ہے کہ میری شادی بہن کی شادی کے ایک ماہ بعد ہوئی اور میرے گھر میں ایک بیٹا بھی ہے اور دوسری اولاد کی امید ہے۔ بہن میرے بچوں کو بہت حسرت سے دیکھتی ہے۔ آپ اتنا مؤثر تعویذ دیں کہ وہ جلد از جلد ماں بن سکے۔

☆ بیٹے امین......! اللہ تمہاری بہن کو خوش اور آباد رکھے۔ تعویذ میں تیار کردوں گا مگر مجھے کچھ تفصیلات درکار

ہیں لہٰذا مناسب ہوگا کہ بہن مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھے۔ میں تفصیل سے جواب دوں گا۔ بس بچی اللہ پر بھروسا رکھے۔ بے شک وہ نہایت مہربان آقا ہے اور جو لوگ اس سے مدد مانگتے ہیں، وہ انہیں کبھی مایوس نہیں کرتا۔

□ بیگم اختر علی۔ کوٹ ڈیجی خان۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! اللہ آپ کو لمبی عمر دے اور آپ ہم جیسے پریشان لوگوں کے مسائل حل کرتے رہیں۔ بابا جی! میرے گھر میں سب لوگ بہت بیمار رہتے ہیں۔ کئی جگہ علاج کروایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ روزی کی تنگی کا بھی مسئلہ ہے۔ دو ایک عاملوں کو اپنا مسئلہ بتایا تو جواب یہ آیا ہے کہ آپ کے گھر پرانے ہیں، اس وجہ سے آپ کے گھر میں کوئی ایسی چیز ہے جو آپ کے ہر کام میں رکاوٹ ڈالتی ہے اور آپ لوگ بیمار رہتے ہیں۔ آپ کی روزی پر بھی بندش کروائی گئی ہے۔ بابا جی! برائے مہربانی کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ ہماری روزی کی بندش دور ہو جائے۔ ہم بیماری سے دور رہیں اور ہمارے گھر میں اگر کوئی ایسی ویسی چیز ہو تو وہ ہمیں نقصان پہنچائے بغیر، اللہ کے حکم سے خود غائب ہو جائے۔ بابا جی! جواب کا شدّت سے انتظار رہے گا۔

☆ بیٹی! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ روزانہ بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھو اور دُعا کرو۔ بعد نمازِ عشاء سورۃ بقرۃ کی آخری آیت 1100 بار۔ یہ وظیفہ گھر کا کوئی فرد بھی کرسکتا ہے۔ سورۃ بقرۃ کی آخری آیت پڑھ کر گھر میں استعمال ہونے والے پینے کے پانی پر دَم کرو اور گھر کے سارے افراد یہ پانی پئیں۔ انشاء اللہ سب خیر ہوگی۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ عتیقہ احمد۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ۔

○ بابا جان! میں آپ کی وہی بیٹی ہوں جس کو آپ نے شادی کے لیے تعویذ اور وِرد دیا تھا۔ بابا جان! اللہ کا بڑا کرم ہے، آپ کی دُعاؤں سے میری شادی ہوگئی اور میں اپنے گھر میں بہت سکون سے ہوں۔ بابا جان! اصل میں مسئلہ میری نند کا ہے۔ وہ اچھی شکل وصورت کی ہے، تعلیم یافتہ ہے، سلیقہ مند ہے مگر اس کا رشتہ کہیں طے نہیں ہوتا۔ لوگ آتے ہیں، پسند کر جاتے ہیں اور پھر بلا وجہ انکار ہو جاتا ہے۔ بابا جان! پہلے تو ہم نے یہ بات محسوس نہیں کی مگر اَب احساس ہونے لگا ہے۔ اس کے ساتھ کی تمام بچیوں کی یا تو شادی ہوگئی ہے یا کم از کم بات تو طے ہی ہے۔ میری ساس دل کی مریضہ ہیں اور یہ مسئلہ اُن کی تکلیف میں اضافہ کر دیتا ہے۔ برائے مہربانی کوئی حل نکالیے۔

☆ بیٹی عتیقہ! اللہ کا شکر اَدا کیا کرو اور عہد کرلو کہ اَب ہر کام میں اللہ کی رَضامندی لیا کروگی۔ جہاں تک تمہاری نند کا تعلق ہے تو بیٹی سے کہو، بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ اَحزاب پڑھے اور دُعا کرے۔ اپنی ساس سے کہو، بچی کے اوپر سے صدقہ خیرات ضرور نکالا کریں۔ بعض اَوقات بچے بدنظر کا شکار ہو جاتے ہیں اور اُن کے تمام معاملات میں پھر رکاوٹ نظر آنے لگتی ہے۔ بہر حال اللہ پر بھروسا رکھو، وہ بہتر کرنے والا ہے۔

□ پرنس عابد۔ شارجہ۔

○ بابا جی! اللہ آپ کو صحت دے۔ میں پچھلے دس سال سے شارجہ میں مقیم ہوں۔ غیر شادی شُدہ ہوں۔ چاہتا ہوں کہ پہلے بہنوں کی شادی ہو جائے۔ میری پانچ بہنیں ہیں۔ دو شادی شُدہ اور تین غیر شادی شُدہ۔ پہلے مالی تنگی کی وجہ سے رشتے نہیں آتے تھے۔ میں 17 سال کی عمر میں کسی کے توسط سے شارجہ آیا تھا۔ دن اور رات محنت کی اَب گھر بہت حد تک آسودہ حال ہے مگر اِس چکر میں بہنوں کی عمریں زیادہ ہوگئیں۔ والدہ اور والد صاحب بہت پریشان رہتے ہیں۔ آپ مجھے اِس مسئلے کا حل بتایئے۔ وظیفہ میری بہنیں خود کریں گی۔ بابا جی! بہنیں اپنے گھر کی ہو جائیں تو میں اپنے والدین کو عُمرہ کرادوں اور پھر اللہ نے چاہا تو میرے والدین کی بھی یہی خواہش ہے کہ ذمے داریاں پوری کر کے پھر اللہ کے گھر جائیں۔ بابا جی! میرے خط کا ضرور جواب دیجیے گا۔

☆ بیٹے عابد! اللہ تمہاری دُعائیں قبول فرمائے۔ تم جیسے فرماں بردار بیٹے ابھی دنیا میں موجود ہیں، تبھی یہ دنیا چل رہی ہے۔ بہر حال بچیوں سے کہو نمازِ فجر اور عشاء کے بعد سورۃ آلِ عمران آیت 9، ...... 99-99 بار

پڑھیں اور دُعا کریں اول و آخر دُرود شریف لازمی ہے۔ وظیفہ کی مدت 41 دن ہے۔

□ مجاہد خان۔ ڈیرہ اسماعیل خان۔

o بابا جی! آج بہت ہمت کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ معاشی مسائل سے تو عرصہ 6 سال سے نبرد آزما ہوں مگر اَب بیٹی کی بیماری نے بالکل توڑ کر رکھ دیا ہے۔ بابا جی! میری بیٹی کی عمر 20 سال ہے' اَب سے چھے ماہ پہلے تک وہ مکمل طور پر صحت مند تھی۔ ایک رات اچانک درد اٹھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے گئے' ٹیسٹ ہوئے جن سے پتا چلا کہ گردے صحیح کام نہیں کر رہے لہٰذا Dialysis ضروری ہے۔ ہفتے میں 3 دن بچی کے ساتھ اسپتال آتا ہوں۔ Dialysis کے لیے تو بابا جی! اس کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی' پھر اَب ڈاکٹرز Transplant کا کہہ رہے ہیں۔ اُن کے مطابق گردے آہستہ آہستہ ناکارہ ہو رہے ہیں اور اَب تک جو بھی علاج ہوا ہے' اُس سے فائدہ ہوتا نظر نہیں آ رہا لہٰذا گردے کی پیوند کاری ضروری ہے۔ بابا جی! اس بات نے ہمارے ہوش اُڑا دیے ہیں۔ مالی وسائل اپنی جگہ مگر اِس مہنگے ترین علاج کے بعد بھی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں۔ بابا جی! ہمارے خاندان کے لیے یہ بہت کڑا وقت ہے۔ میری بیوی کی حالت تو بہت خراب ہے۔ ہم چاہتے ہوئے بھی بیٹی کے سامنے اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ خدا کے لیے' کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس کی برکت سے معجزہ ہو جائے اور میری بیٹی پہلے جیسی صحت مند ہو جائے۔ بابا جی! اِس وقت بھی میری آنکھوں میں آنسو ہیں' مجھ سے اپنا آپ ہی نہیں سنبھل رہا تو اُس کی ماں کو کیسے سمجھاؤں؟ رحم کیجیے اور اِس مشکل وقت میں مدد بھی۔

☆ بیٹے مجاہد! تمہارا خط پڑھ کر بہت دُکھ ہوا مگر بیٹے! ہمت سے اِس آزمائش کا سامنا کرو۔ تمہیں اپنے اندر ہمت پیدا کرنی ہوگی ورنہ گھر کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ بیٹے! بے شک میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے مگر اِس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اِن رپورٹوں کو حرفِ آخر سمجھ لے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بہت بے نیاز ہے' وہ جب چاہے' جسے چاہے' نواز دے۔ جہاں تک ممکن ہو' بچی کا علاج کرواؤ۔ اِس کے بعد کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو۔ دُعا اور دوا دونوں بہت ضروری ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر اَسباب بھی پیدا کرے گا۔ بس اپنا یقین پختہ رکھو۔ بعد نمازِ فجر اور عشاء 41-41 بار سورۃ فاتحہ پڑھ کر پانی پر دَم کرو اور یہ پانی دو دو گھونٹ بیٹی کو پلاؤ۔ میں بھی خصوصی دُعا کا اہتمام کروا رہا ہوں' انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔ مجھے 41 دن بعد حالات سے آگاہ کرو۔

□ حجاب۔ حیدر آباد۔

o بابا جی! اللہ آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹے بڑے ہیں اور ماشاء اللہ' دونوں انجینئرز ہیں۔ تعلیمی ریکارڈ دونوں کا ہمیشہ بہت شاندار رہا مگر عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد اُن کو مسلسل ناکامیوں کا سامنا ہے۔ پڑھائی کے حساب سے نوکری نہیں ملتی۔ میں نے بچوں کو انتہائی جدوجہد سے پڑھایا ہے۔ اُن کے والد بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ میں نے یہ ذمے داریاں تنِ تنہا اٹھائی ہیں۔ اَب اپنی زندگی میں' میں اپنے بچوں کو کامیاب دیکھنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے وظیفہ عنایت فرمائیے اور مدت ضرور تحریر کریں۔

☆ بیٹی حجاب! اللہ تعالیٰ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ سب سے پہلے تو نماز کی پابندی کرو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 3-3 تسبیح سورۃ آلِ عمران' آیت 17 پڑھو اول و آخر دُرود شریف پھر حاجت بیان کرو۔ یقیناً تم نے اپنی زندگی میں بہت محنت کی ہوگی۔ انشاء اللہ' اِس کا اَجر بھی ملے گا۔ بس اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل بھروسا رکھو۔ وظیفے کی مدت 41 دن ہے۔

□ نور الصبا۔ چکلالہ۔

o بابا جی! میں نے پچھلے ماہ بھی آپ کو خط لکھا تھا مگر جواب انتظار کے باوجود نہ ملا۔ بابا جی! میں بہت پریشان ہوں' میری دو بیٹیاں ہیں' دونوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ زندگی میں جو بھی اُن کی جائز خواہشات تھیں' وہ پوری کیں۔ میں اور میرے میاں دونوں بہت مذہبی ہیں مگر بچیاں نماز بھی پابندی سے نہیں پڑھتیں۔ اُن کی بول چال' اُن کا لباس' اُن کے خیالات سب بہت مختلف ہیں۔ ہمیں

اپنے رشتے داروں اور ملنے والوں کے سامنے بہت شرمندگی ہوتی ہے۔ شروع میں یہ خیال تھا کہ لاابالی پن ہے مگر اَب یہ مسئلہ بہت شدید ہوگیا ہے۔ مجھے تو یہ خوف ہے کہ اُن کے رشتوں میں کہیں مسئلہ نہ ہو؟ اِسی خوف میں مجھے رات بھر نیند نہیں آتی کیونکہ اَب اُن کی عمریں شادی کے قابل ہیں مگر جو لوگ بھی آتے ہیں' منع کر دیتے ہیں۔ بابا جی! کوئی حل بتایئے۔

☆ بیٹی نور! تمہارا مسئلہ یقیناً پریشان کن ہے۔ بیٹی! اولاد کی پرورش بہت بڑی ذمے داری ہے اِسی لیے حکم ہے کہ دینی اُصولوں پر کرنی چاہیے تاکہ مستقبل میں پریشانیاں لاحق نہ ہوں۔ یقیناً تمہاری پرورش اور تربیت میں کہیں نہ کہیں کوئی کمی ضرور رہ گئی ہے۔ بہرحال میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ بچیوں کو بٹھا کر انہیں سمجھاؤ۔ انسان کو اپنے معاشرے اور رسم و رِواج کے مطابق ہی رہنا چاہیے پھر ہمارا معاشرہ تو غیر اسلامی طریقوں کو ناپسند کرتا ہے لہٰذا غیر اسلامی طریقوں کو اپنانے والوں کو ناپسند قرار دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو تم بچیوں پر سے صدقہ نکالو۔ ہر نماز کے بعد الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر دَم کرو۔ 21 روز تک یہ عمل کرو۔ اِس کے بعد مجھے حالات سے مطلع کرو۔ حالات قابو میں آنے میں کچھ وقت لگے گا۔ اللہ سے اچھی امید رکھو۔ انشاء اللہ' سب خیر ہوگی۔

□ روحی ناز۔ لاہور۔

o بابا سائیں! اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ بابا سائیں! میری عمر 24 سال ہے' 2 بچے ہیں۔ میاں بینک میں جاب کرتے ہیں۔ اللہ کا بڑا احسان ہے' زندگی پُرسکون ہے مگر اِس کے باوجود میں اکثر راتوں کو جاگتی رہتی ہوں۔ مختلف سوچیں ذہن منتشر رکھتی ہیں۔ جاگنے کی وجہ سے چہرے کی تازگی بالکل ختم ہوگئی ہے۔ بے شمار جھائیوں کی وجہ سے چہرہ بہت بدنما لگتا ہے۔ مہنگی ترین کریمز اور لوشن استعمال کر کے دیکھ چکی ہوں مگر کوئی فائدہ نہیں۔ آپ مشورہ دیں' کیا کروں؟

☆ بیٹی روحی ......! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھا کرو۔ پانی بہت پیو اور رات میں سوتے وقت ایک گلاس گرم دُودھ ضرور پیا کرو۔ مناسب ہوگا تم مجھ سے چہرے کی تازگی کے لیے دوا منگوا لو۔ انشاء اللہ' ضرور فائدہ ہوگا۔

□ عالم گیر۔ گھوٹکی۔

o بابا جان! میں نے دو سال قبل اپنا ماسٹرز مکمل کیا تھا' اُس وقت سے آج دن تک میں اِس کوشش میں ہوں کہ کسی طرح باہر نکل جاؤں مگر کوئی سبیل نہیں بن رہی۔ والد صاحب چاہتے ہیں کہ میں پاکستان ہی میں کوئی نوکری کرلوں مگر میرا دل نہیں مانتا۔ وہ مجھ سے ناراض رہتے ہیں جس کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب رہتا ہے۔ بابا جان! آپ مجھے کوئی ایسا تعویذ دیں جس کی برکت سے میرا مسئلہ حل ہو جائے۔ میں ڈھیروں روپیا کمانا چاہتا ہوں۔ آپ میری مدد کریں پلیز......!

☆ بیٹے عالم گیر! تم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو مگر تمہاری سوچ میں ابھی تک بچپنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمہارے والد چاہتے ہیں کہ تم پہلے اُن کی نظروں کے سامنے نوکری کرو تاکہ تمہیں تجربہ حاصل ہو سکے۔ بیٹے......! محنت سے، جائز طریقے سے روپیا کمانے میں کوئی حرج نہیں مگر جو تمہاری سوچ ہے' وہ تمہیں غلط راستوں پر دھکیل سکتی ہے۔ والدین ہمیشہ اولاد کا بھلا چاہتے ہیں۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ تم اپنے والد کا کہا مان لو۔ بیٹے......! یاد رکھو' باپ کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی ہے۔ تم کثرت سے یَارحمٰن کا وِرد کیا کرو اور کوشش کرو کہ نماز پابندی سے اَدا کرو۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔ مجھے گاہے بگاہے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ ناعمہ۔ صادق آباد

☆ بیٹی ناعمہ......! تمہارا مسئلہ شائع کرنا مناسب نہیں۔ تم مجھے براہِ راست خط لکھو۔ مجھے اِس بات کا خاص دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی میرے کالم میں شائع نہ ہو جو مناسب نہیں۔ گھروں میں خواتین یہ رِسالہ پڑھتی ہیں' کم عمر بچیاں پڑھتی ہیں لہٰذا بہت احتیاط کرنی پڑتی ہے۔

□ نغمہ شہزاد۔ کراچی۔

o بابا جان! میں آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ زندگی کے بہت سے معاملات میں مجھے رہنمائی

بھی حاصل رہی۔ آج میں اپنا مسئلہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں اِس امید کے ساتھ کہ اُسی محبت اور پیار سے جواب دیں گے جو آپ کا خاصا ہے۔ بابا جان! میری شادی کو 7 سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے گھر سے بھی بہت آسودہ ہوں اور شوہر بھی مالی طور پر بہت مستحکم ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں۔ اللہ نے دو صحت مند بچے بھی عطا کیے۔ بابا جان! جو پریشانی مجھے لاحق ہے وہ بہت عجیب ہے شاید آپ کو میرا مسئلہ شدید نوعیت کا نہ لگے مگر میرے لیے یہ حالات بہت تکلیف کا باعث ہیں۔ میرے شوہر پچھلے دو سالوں سے مجھے پیسے دینے میں بہت کنجوسی کرتے ہیں۔ ہر وقت پیسے کی بات ہر وقت نقصان کا رونا۔ گھر کا خرچہ دینے میں سو طرح کے بہانے...... وہ کوشش یہ کرتے ہیں کہ تمام خرچ میں خود پورے کروں۔ میں بھی جاب کرتی ہوں اور بے شمار خرچے میں خود ہی پورے کرتی ہوں۔ ہر وقت کی اِس چھینا جھپٹی نے مجھے بہت پریشان کر دیا ہے۔ صبح گھر سے 9 بجے نکلتے ہیں اور رات کو 12 بجے سے پہلے نہیں داخل ہوتے۔ نہ فون کرتے ہیں نہ اٹھاتے ہیں۔ کچھ کہو تو جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ بابا جان! خدا کے لیے میری مدد کریں۔ یہ صورتِ حال بہت پریشان کن ہے۔ میرے دماغ میں الٹے سیدھے خیالات آتے ہیں مگر میں انہیں جھٹک دیتی ہوں۔ آپ اِس مسئلے کا حل نکالیے۔

☆ بیٹی نغمہ! جو حالات اور صورتِ حال تم نے لکھی ہے اُس سے ایک بات واضح ہو رہی ہے کہ تمہارے شوہر مالی طور پر بہت مضبوط ہیں مگر اپنے گھر سے وہ آسودہ نہیں ہوں گے۔ یہ رویہ اُن لوگوں کا ہوتا ہے جو بہت چھوٹے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں جہاں پیسا ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ ہر شخص دوسرے کو صرف بے وقوف بنا رہا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے پاس اگر دولت آ جائے تو اُن سے سنبھالی نہیں جاتی اور وہ ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں جیسے تمہارے میاں کر رہے ہیں۔ ہر مسئلے کا حل بات چیت سے نکالا جا سکتا ہے۔ تم بھی شوہر سے بات کرو۔ اپنی پریشانی کا احساس دلاؤ۔ ہر نماز کے بعد بکثرت پڑھو "اَللّٰھُمَّ ھُدیٰ میرا شوہر" پھر دُعا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ شاہد شاہ۔ کھاریاں

o بابا جی! میں اپنے مسئلے کے لیے آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اِس سے پہلے بھی خط لکھا تھا مگر جواب نہیں ملا۔ بابا جی! میں اپنی خالہ زاد سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر میرے گھر والے تیار نہیں خاص طور سے میرے والد اور بڑی بہن۔ وجہ یہ ہے کہ میرے گھر والے چاہتے تھے کہ خالہ زاد بھائی سے بہن کی شادی ہو جائے مگر میری پسند کو دیکھتے ہوئے اُن لوگوں نے بہن کا رشتہ رَد کر دیا کہ یہ ادلہ بدلہ ہو جائے گا۔ مجھے وہ لوگ ہمیشہ سے بہت پسند کرتے ہیں بس اِس بات کو میرے گھر والوں نے اَنا کا مسئلہ بنالیا ہے۔ بابا جی! میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی جاب پر ہوں اور بہت آرام سے شادی شُدہ زندگی کی ذمے داریاں اٹھا سکتا ہوں۔ آپ مجھے ایسا تعویذ دیں جس کی بدولت یہ رُکاوٹ دور ہو جائے کیونکہ اَب اُس کی پڑھائی بھی مکمل ہو گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ایسا تعویذ دیں جس کی برکت سے ہمارا رشتہ سب کی مرضی اور رضا مندی سے طے پائے کیونکہ میں بڑوں کو ناراض کر کے کوئی کام نہیں کرنا چاہتا۔ وظیفے کے لیے معذرت چاہوں گا۔ اکثر نمازیں قضا ہو جاتی ہیں۔

☆ بیٹے شاہد...... اللہ تمہیں خوش رکھے۔ طاقت رکھنے کے باوجود تم قدم اٹھانے سے گریزاں ہو صرف اِس لیے کہ بڑوں کو دُکھ نہ پہنچے۔ اللہ تمہیں اِس کا صلہ ضرور کامیابی کی صورت میں دے گا۔ بیٹے......! تم تعویذ لینا چاہتے ہو میں تعویذ ضرور تیار کر دوں گا مگر اِس کے لیے کچھ تفصیل درکار ہے لہٰذا مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ تفصیلی خط لکھو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ شاہین نواز۔ گکھڑ منڈی۔

o محترم بابا جی! السلام علیکم! بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو دس سال ہو گئے ہیں اور میری صرف ایک بیٹی ہے۔ ڈاکٹروں سے چیک اپ کے بعد پتا چلا ہے کہ کچھ اندرونی مسائل کے باعث مزید بچے نہیں ہو رہے۔ پلیز بابا جی! مجھے کوئی وظیفہ بتائیں تاکہ میری اولاد ہو سکے اور وہ بھی اولادِ نرینہ یعنی کہ بیٹا کیونکہ میرے شوہر پہلے سے شادی شُدہ ہیں اور میرے لیے بہت سے مسئلے ہیں۔ پلیز میرے اِس خط کا جواب جلد از جلد دیں۔

☆بیٹی شاہین! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ اولاد کے لیے میں تعویذ دیتا ہوں' ہدیہ اور تفصیل جوابی لفافہ اِرسال کرو تو بتائی جائے گی۔

□ راشد علی۔ بھکر۔

o باباجی! السلامُ علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں نے پہلے بھی ایک عرض نامہ بھیجا تھا لیکن شاید وہ آپ کو موصول نہیں ہو سکا۔ باباجی! مسئلہ یہ ہے کہ میری والدۂ محترمہ جن کی عمر تقریباً 58 برس ہے (اللہ تعالیٰ اُن کی عُمر دَراز کرے!)' اُن کی دائیں ٹانگ اور دائیں بازو میں ہلکا ہلکا درد رہتا ہے۔ یہ صورتِ حال عرصہ بیس سال سے ہے اور ساتھ ہی کمر میں بھی درد رہتا ہے۔ اِس کے علاوہ کافی عرصے سے بائیں نتھنے سے نکسیر پھوٹتی رہتی ہے اور اِس کے علاوہ اکثر اَوقات دَم گھٹ سا جاتا ہے اور گہرے گہرے سانس لیتی ہیں اور سر میں بھی کھنچاؤ اور درد سا رہتا ہے۔ کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا' سب کا یہی کہنا ہے کہ یہ مجموعی طور پر جسمانی کمزوری ہے اور بس۔ باباجی! ہم غریب لوگ ہیں' جو کچھ بن پڑتا ہے' اُن کے لیے اچھی غذا وغیرہ لیتے ہیں لیکن مسئلہ حل نہیں ہو رہا، اِس لیے آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں' یقیناً اللہ کے کلام میں بہت شِفا ہے اور آپ کی دُعاؤں سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ! باباجی! میری ایک نوجوان بہن اور جوان العمر ماموں یکے بعد دیگرے وفات پا گئے ہیں۔ والدہ کو اُن کا بھی بہت صدمہ رہتا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں اور ہمیں کوئی ایسا عمل بتائیں جس سے میری والدہ صحت یاب ہو جائیں۔ ہم تاعمر آپ کو دُعائیں دیں گے۔

☆ بیٹے راشد! اللہ تمہاری والدہ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ ہر نماز کے بعد اَلحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر والدہ پر ضرور دَم کیا کرو۔ اللہ سے دُعا کرو کہ جو اُن کے حق میں بہتر ہو وہ فرمائے۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات بھی دیا کرو۔ انشاء اللہ' مکمل صحت عطا ہوگی۔

☆☆......☆☆



غزل

راہِ محبت میں کانٹوں کے سوا کچھ نہیں ملا
ملا ساتھ اُس کا تو اک پل کے لیے پھر وہ آج تک نہیں ملا
ترس گئی ہیں تیری دید کو بے قرار آنکھیں
مگر میری آنکھوں کو اشکوں کے سوا کچھ نہیں ملا
ہم تو چلے تھے راہِ محبت میں بڑے مان سے
ٹوٹا ہمارا غرور تنہائی کے سوا کچھ نہیں ملا
قسمت کا دیوتا بھی شاید مجھ سے خفا تھا
مانگتا رہا وصلِ یار کی دعا مگر آج تک مجھے کچھ نہیں ملا
تابش یہ دنیا تو ہے بس دھوکے بازوں کی
کسی مخلص کو کبھی کوئی مخلص نہیں ملا

شاعر: پرنس تابش۔ چشتیاں

غزل

رات دن اشکبار ہیں آنکھیں
کیا کوئی آبشار ہیں آنکھیں
دِل کی صورت بھی دیکھ لو ان میں
دِل کی آئینہ دار ہیں آنکھیں
اُس کے ہوتے حسین لگتی ہیں
ورنہ گرد و غبار ہیں آنکھیں
وہ ہیں آنکھوں کے سامنے پھر بھی
جانے کیوں بے قرار ہیں آنکھیں
یہ تو تھیں مائلِ ستم کل تک
آج کیوں شرمسار ہیں آنکھیں
آپ کو بھی خیال آتا ہے
آپ سے ہم کنار ہیں آنکھیں
چشمِ بینا نہیں ہے ویسے تو
ہر جگہ بے شمار ہیں آنکھیں

شاعر: سید مبارک علی شمسی۔ قائم پور

اے ارضِ فلسطین

اے ارضِ فلسطین تُو ہے نبیوں کی امامت کی امین
مقدس تھا، معتبر تھا اور اب بھی ہے!
قبلہ اوّل تیرے داماں کا مکین
ایسا ہوا ہے کیا؟ کہ بدحال ہوا ہے
جینا تیرے بچوں کا مُحال ہوا ہے
سر کھلے ہیں پاک عصمتوں کے چاک گریباں ہیں
گویا محشر ہے، عاشور ہے، شامِ غریباں ہے
خون میں ڈوبے ہوئے معصوم سے لاشے
رونے کو ہے کاندھا نہ دینے کو دلاسے
پست ہمت ہیں مسلم دنیا کے حاکم
بے بس تماشائی بنے مسلم امتہ کے حاکم
افسردہ ہے دل مسلم، خاموش نگاہیں
اے کاش کوئی قاسم، کوئی غزنوی آئے
کیا سینے میں نہیں دِل! یا دِل میں ایماں
اے غفلتوں میں پڑے جاگ، اے جاگ مسلمان
جاگا نہ ابھی تو سمجھ قیامت کی گھڑی ہے
آج ہے ارضِ فلسطین تو کل تیری گھڑی ہے

شاعرہ: مومنہ بتول۔ کراچی

تین اشعار

تجھ میں کھو کر تجھ ہی کو پایا ہم نے
یوں محبت کا انداز نبھایا ہم نے

اُس وقت کو بھی جیتا دیکھ لیا ہے اب تو
جس وقت تجھے پاس نہ پایا ہم نے
نہیں مانگتی محبتیں حساب کچھ بھی
دِل بے قرار یہ نہیں جانتا، یہ جانا ہم نے
شاعرہ: ثمینہ ناز عبدالقیوم۔ کراچی

نظم

دل کے اندر بہار رُت نے
انگڑائی لینا شروع کر دی
شگوفوں نے کھلنا اور کلیوں نے چٹکنا شروع کیا
کہ! پھولوں کی پنکھڑیوں نے مسکرا مسکرا کے
آپ کے آنے پر
خوش آمدید کہنا شروع کر دیا کہ
اس بار تم پھر نہ جانا
مہجور ہے فراق میں
ورنہ تیرے دم سے تو
یہ آباد ہے بستی خموشاں
شاعر: ساحل ابڑو، ڈیرہ اللہ یار۔ بلوچستان

دُور تارا

دور افق پر اک تارا
سب سے روشن، سب سے پیارا
اس کی ہر موجِ ضیاء میں
اک حسین احساس ہے
شمع محفل کا حسیں، اُس نے پہنا تاج ہے
اس کے اندر کہکشاؤں کی ادائیں، ہیں نمایاں
ہے چمک بھی سب سے زیادہ اور دھمک بھی
تیری مانند، میرا ساجنا! مجھ سے دور اتنا ہے
جیسے تُو قریب رہ کے!!
مجھ سے دُور جتنا ہے!
شاعر: عمران فائق، کامل پور موسیٰ، اٹک

غزل

پہلے لگا کہ دل یہاں میرا اُداس ہے
پھر یہ کھلا کہ سارا زمانہ اُداس ہے
یہ آنکھ ترے نام تھی یہ شام ترے نام
اب میں اُداس ہوں یا ستارا اُداس ہے
اُس کے بغیر لگتا نہیں تھا کہیں یہ دل
جب سے وہ مل گیا ہے زیادہ اُداس ہے
ہر شخص اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے جہاں
ہر شخص اپنے آپ میں تنہا اُداس ہے
کرنے چلی ہوں تازہ محبت کی رسم کو
کچے گھڑے کو دیکھ کر دریا اُداس ہے
پاگل ہوا نے رات چراغوں سے یہ کہا
اُس کے بغیر چاند بھی کتنا اُداس ہے
تمثیلہ کاش عید سے پہلے وہ لوٹ آئے
میری نماز اور مرا روزہ اُداس ہے
شاعرہ: تمثیلہ لطیف، جودھالہ

سہاگن

تُو نے دیکھا ہے کبھی ایک منظر صبح کے بعد
کتنی ڈری سہمی ہوئی سی لگتی ہیں بیویاں صبح کے بعد
اتنی ڈری سہمی کہ شوہر بھی رہے گا لا علم
چھوڑ کر جائیں گی کسی روز وہ گھر صبح کے بعد

میں نے ایسی بھی کئی بیویاں ہیں اُجڑتی دیکھیں
شوہر کے ڈر سے جو چھوڑ جاتی ہیں گھر صبح کے بعد
مار پیٹ لیا شوہر نے تو گنے جسم پر ہر نیل اور سوچا
کیوں نہ میں دے دوں شوہر کو زہر صبح کے بعد

تُو ابھی کنواری ہے تجھے کیاں معلوم بیوی کا دُکھ
تُو بھی کسی روز میرے گھر میں آ کر پٹ صبح کے بعد
پھر نہ آ جائے کہیں میری ساس میرے شوہر کو بھڑکانے
بند رکھتی ہوں میں اس لیے دروازہ صبح کے بعد
شاعرہ: سدرہ انور علی۔ جھنگ صدر

تیری ہی کمی ہے

زمین سے آسمان تک
چاند سے ستاروں تک
میرے اردگرد، میرے آس پاس
اِس جہان سے، اُس جہان تک
یوں تو سبھی کچھ ہے پاس میرے
مگر! میری زندگی میں
بس تیری ہی کمی ہے!

شاعرہ: یاسمین اقبال، سنگھ پورہ۔ لاہور

غزل

میں ہجر کی آگ میں تنہا کل جلتا رہا
غم تنہائی کا ناگ مجھے ہر پل ڈستا رہا
میرے جسم و جاں پہ چھائے رہے غموں کے سائے
میں شمع کی مانند آہستہ آہستہ سلگتا رہا
کل بجھے بجھے تھے آسماں کے جلتے چراغ بھی
بادلوں کی اوٹ سے چاند چھپتا نکلتا رہا
تیری یادوں کے بکھرے کانٹوں پہ اے دوست
میں ننگے پاؤں بڑی دیر تک چلتا رہا
خشک بنجر ہوگئیں جب آنکھیں میری شاہ
آنسوؤں کی جگہ پھر لہو ہی برستا رہا!!

شاعرہ: مریم شاہ بخاری۔ سرگودھا

غزل

چھوڑ دیا خوابوں میں رہنا
کچھ بھی نہیں اب تم سے کہنا
ہجر و فراق مقدر میرا
سہہ نہیں سکتی پھر بھی ہے سہنا
پہن کے اس کو لُٹ جاؤں گی
واپس لے لو پیار کا گہنا
دُکھ جو آنکھ میں ٹھہر گیا ہے
قطرہ قطرہ ہے اسے بہنا
خانم غیر سے کیوں میں کہوں گی
رب سے مجھے ہر غم ہے کہنا

شاعرہ: فریدہ خانم۔ لاہور

نظم

تمہیں گر راستہ بدلنا تھا
یونہی ذرا دیر کو ساتھ چلنا تھا
تو صدیوں جیسے عہد و پیماں باندھے تھے کس لیے؟
میرے دل میں تم جھانکے تھے کس لیے؟
کہا تھا کس نے نگاہیں چرالینا، کسی اور کو اپنا بنالینا
یوں میری ذات کو ادھورا کر کے
جھٹک کے دامن جو چل دیے تم
اک پل تو دیکھتے اندر دل کے
تھی جس میں بسی ہوئی تصویر تمہاری
دل پہ کندہ تحریر تمہاری
یہ اشکوں کا سیلابی ریلا
نہ اس کو دھو سکے گا
نہ عکس تیرا ہی کھو سکے گا
سن لے جانے والے
تیرے نقش پا سے نہ ہٹ سکیں گی
یہ آنکھیں ان سے جڑی رہیں گی

شاعرہ: فصیحہ آصف خان۔ ملتان

غزل

اس کے لبوں سے جو لفظ ادا ہوں گے
نصیب ان فقروں کے بھی کیا ہوں گے
سنا ہے گل کھلتے ہیں ان کے مسکرانے سے
سننے والے بھی ویسے ہم نوا ہوں گے
میں اُسے مانگ تو لوں جاکر رب سے
پتا نہیں فیصلے قدرت کے کیا ہوں گے
اس کی یادیں جب حد سے گزر جائیں گی
میری آنکھوں سے تب اشک رواں ہوں گے
میں کہاں جاؤں اس دل بے قرار کو لے کر

اس کی یاد کے لمحے تو ہر جگہ ہوں گے
اس کی وفاؤں کا ملن ہوگا جنہیں نصیب
وہ خوش نصیب زمانے سے جدا ہوں گے
چوٹ عشق کی کھا کے بھی جو مسکرائیں
حسن جیسے وہ صبر کی انتہا ہوں گے

شاعر: ایم حسن نظامی۔قبولہ شریف

ہائیکو

زندگی کے دامن میں
صرف سکھ نہیں ہوتے
پھر بھی جینا پڑتا ہے

شاعر: صادق شمیم چوہدری۔گوجرانوالہ

غزل

چہروں میں اک چہرہ کھوجنے کی عادت ہے
مجھ کو بھیڑ میں بیٹھ کر سوچنے کی عادت ہے
گلہ ہو بھی تو کیا اُن سے ستم گری کا کہ جنہیں
پھول شاخوں سے نوچنے کی عادت ہے
مت ڈھونڈا کیجیے مرے ہر لفظ کی تفسیر
میں تو پاگل ہوں مجھے یونہی بولنے کی عادت ہے
وقت نہیں ہے دنیا کے پاس مجھے جاننے کا
اور مجھ کو بھی کب اپنا آپ کھولنے کی عادت ہے
تم شیشہ ہو تو پھر مجھ سے دور ہی رہو
میں پتھر ہوں مجھے شیشہ توڑنے کی عادت ہے

شاعرہ: انیلا شمیم۔ڈی آئی خان

غزل

میرے دل کی بستی اُجاڑ کر جانے والے
کبھی نہ بھلا سکوں گا تجھے مجھ کو بھلانے والے
دن کو تڑپتا ہوں، راتوں کو نیند نہیں آتی
تُو بھی نہ سکوں پائے گا مجھ کو ستانے والے
ایسا جلایا دِل کہ جلتا ہی رہتا ہے
تیرا دل رہے سلامت، میرا دل جلانے والے
کبھی کھیلتا ہے کبھی توڑ دیتا ہے میرا دل
بنے تو رحمدل مجھ پر ستم ڈھانے والے
میں وفا کا پیکر ہوں وفا عمر بھر
بنے تُو وفادار مجھ کو بے وفا کہنے والے

شاعر: ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا۔ملتان

پھر سے سنور جانا

دل کے کبھی خیالوں میں
میرا خیال آتے ہی اُداسی سے نکل کر
تنہائی کے موسم سے اُکتا کے سوچنا
سارے غم دل سے بھلا کے سوچنا
انہی خیالوں میں ڈوب کر
بھیگی پلکیں یاد میں لانا، تنہا لمحے پاس بلانا
میرا خیال آتے ہی زمانہ بھول جانا تم
فقط اتنا یاد رکھنا
برستے ساون کو دیکھنا، ترستی آنکھوں کو دیکھنا
میرے خیال آتے ہی پھر سے نہ بکھر جانا
اگر ہو سکے لازم، تو
پھر سے سنور جانا

شاعر: احمد فراز۔جودھپور

میں محبت ہوں

سنو! محبت کو دیکھنا چاہو
تو مجھ کو آ کے دیکھو تم
محبت ہی محبت ہے
میری چوڑی کی کھنک میں، میری پائل کی چھنک میں
میرے ماتھے کی بندیا میں، میری آنکھوں کی نندیا میں
میری پلکوں کے جادو میں، میرے تن من کی خوشبو میں
میرے کانوں کی بالی میں، میرے ہونٹوں کی لالی میں
میرے نینوں کے کاجل میں، میرے ست رنگے آنچل میں
میری شرم و حیا میں، میری رنگین قبا میں
مجھے آ کے دیکھو تم
محبت ہی محبت
میں محبت ہوں

شاعرہ: سیدہ نور العین زاہرا۔لاہور

سلسلۂ خاص

فیضِ عشق



امجد جاوید

عشق کے متوالوں کے لیے عشق میں ڈوبی ایک خاص الخاص کہانی کا چوتھا حصہ

''امی، آپ...... کہیے کیا حال ہے......''

''بیٹا تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے، تم ٹھیک تو ہو......''

زبیدہ نے تشویش سے پوچھا تو اسے ہوش آیا۔ تب اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے جھوٹ کہہ دیا۔

''بس یونہی اماں، میرے گلے میں خراش سی آ گئی تھی۔ آپ سنائیں کیسی ہیں، آپ......''

''میں بالکل ٹھیک ہوں اور یہیں سلامت نگر میں ہوں۔ میں......'' امی کی آواز آئی۔

''آپ...... سلامت نگر میں...... کب کیسے......'' وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

''سوال ہی کرتے رہ جاؤ گے یا ہمیں بتاؤ گے بھی کہ تم تک کیسے پہنچیں۔'' امی نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کہا۔

''کون ہے آپ کے ساتھ......'' اس نے پوچھا۔

''بھائی حمید نے ڈرائیور بھجوایا ہے...... لو یہ اسے بتاؤ......''

لمحے بعد ڈرائیور کی آواز آئی تو اس نے سمجھا دیا کہ کیسے آنا ہے، پھر فون رکھ کر وہ اٹھا اور گیٹ کے پاس جانے کے لیے اٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی رہائش گاہ پر گاڑی آن رکی۔ اس کی امی گاڑی سے نکلی تو وہ یوں اس سے ملا جیسے کئی برس سے بچھڑا ہوا ہو۔ زبیدہ نے وہیں گیٹ پر کھڑے ہو کر رہائش گاہ کی طرف دیکھا اور انتہائی محبت سے بولی۔

''یہ گھر ملا ہے تجھے بیٹا......''

''جی اماں۔ آئیں نا آپ......'' اس نے کہا اور زبیدہ کو لے کر اندر کی طرف چل دیا۔ اتنے میں ڈرائیور گاڑی پورچ میں لے گیا اور گاڑی سے اتر آیا۔ وہ بھی شعیب کے ٹھاٹھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کچھ باتیں کیں اور اپنے ملازم سے اس کے آرام کے لیے کہہ دیا۔ دونوں ماں بیٹا اندر چلے گئے۔

''امی! آپ یوں اچانک...... کوئی اطلاع دیے بغیر۔'' سہولت سے بیٹھنے کے بعد اس نے پوچھا۔

''بس بیٹا۔ میرا دل کیا اور میں آ گئی۔'' زبیدہ نے مختصر سا جواب دیا تو وہ خاموش ہو گیا، پھر چند لحوں بعد اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آپ آرام کریں، میں آپ کے لیے۔''

''تو بیٹھ میرے پاس بیٹا، ہو جائے گا سب کچھ۔'' وہ بولی تو شعیب بیٹھ گیا، پھر یونہی ان کے درمیان باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دیر بعد شعیب نے محسوس کیا کہ وہ دباؤ جو حویلی سے آنے کے بعد اس پر چھا گیا تھا، وہ بالکل ہی نہیں تھا۔ وہ پرسکون تھا۔ یہی تو مامتا ہے۔ جس کے اثر میں



آتے ہی انسان سارے دکھ، درد اور غم بھول جاتا ہے۔ باتوں کے دوران پتا ہی نہیں چلا کب دوپہر ڈھل گئی۔ تب اس کے ملازم نے کچھ لوگوں کے آنے کے بارے میں بتایا۔

''امی، آپ آرام کریں کچھ دیر، پھر باتیں کرتے ہیں۔ میں بھی ذرا ان سے مل لوں۔''

''ہاں! تم ایسے کرو، ڈرائیور کو بھجوا دو۔ میں کچھ دن تمہارے پاس رہوں گی۔''

''جی ٹھیک ہے آپ آرام کریں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور سیدھا ڈرائیور کے پاس گیا۔ اسے کافی ساری رقم دی اور اسے واپس بھجوا دیا۔ وہ خوش خوش واپسی کے لیے چل دیا اور وہ لان میں بیٹھے ہوئے چوہدری ثناءاللہ کے پاس چلا گیا۔

''جی چوہدری صاحب۔! معاملہ تو پھر نہ بنا۔ وہ جو آپ چاہتے تھے۔'' اس نے خوش دلی سے کہا، حالانکہ وہ اندر سے افسردہ تھا۔

''یہی تو! یہی تو المیہ ہے ان لوگوں کا...... یہی طاقت ہے ان کی...... تشدد بھی کرتے ہیں اور پھر ان لوگوں کو چیخنے بھی نہیں دیتے۔ اب ظاہر ہے تاجاں مائی کو انہوں نے کسی بھی طرح بلیک میل کیا ہوگا۔ تبھی تو وہ نہیں بولی، اپنے بیٹے تک کو جھوٹا بنا دیا۔ لازمی بات ہے کسی کمزوری کے باعث ہی ہوگا۔'' وہ بے تکان بولتا چلا گیا۔ ظاہر ہے وہ اپنا غصہ نکال رہا تھا۔

''چوہدری صاحب! مان لیں کہ اس نے یہ معاملہ بھی جیت لیا ہے، چاہے اس نے کچھ بھی کیا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... یہ تو ماننا پڑے گا۔'' وہ فوراً ہی اپنی ہار قبول کر گیا۔

''اصل بات یہ ہوتی ہے چوہدری صاحب! کسی کمزور بندے، یا غیر کی بنیاد پر لڑائی نہیں جیتی جا سکتی۔ پرائی لڑائی میں بندہ ہار ہی جاتا ہے۔ جب اپنی لڑائی ہو تب ہی جیت کے امکان ہوتے ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں خیر! میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ آپ نے میرے کہنے پر اتنی دلچسپی لی، آئندہ کے لیے شاید آپ کو زحمت نہ دوں۔'' اس نے ممنونیت بھرے لہجے میں یاسیت سے کہا۔

''آپ تو مایوس ہو گئے چوہدری صاحب! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ وہ ظالم ہے تو پھر اس کے ظلم کو روکنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''تب میں آپ کی بات پر عمل کروں گا...... اگر اللہ نے چاہا تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ اب مجھے اجازت دیں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، آپ ایک چھوٹا سا کام کیجیے گا۔ وہ تاجاں مائی کا بیٹا ہے نا، اسے تو میرے پاس بھجوا دیں۔'' اس نے عام سے انداز میں کہا۔

''کب؟'' چوہدری سے پوچھا۔

''ابھی بھجوا دیں یا جب بھی۔'' اس نے پھر عام سے انداز ہی میں کہا۔

''جی ضرور...... میں ابھی بھجوا دیتا ہوں۔ اجازت دیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ہاتھ ملایا اور چل دیا۔ شعیب وہیں لان میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ نادیہ کے بارے میں جو اشارہ ملا ہے، وہیں سے ہی آگے معلوم ہوگا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ایک اور خیال اس کے ذہن میں ابھرنے لگا۔ یہ جو سب کچھ سلامت نگر ہی میں گھوم کر رہ گیا ہے۔ کہیں یہ کوئی سازش تو نہیں ہے، یہ جو میرے اردگرد سب لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ ان کا تعلق نادیہ سے ملتا ہے یا یہ کہیں اور ہی راستہ نکلتا ہے جو مجھے کہیں اندھیرے ہی میں نہ لے کر پھینک دے۔ اس کا ذہن دلیلیں دیتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن دل تھا کہ ذہن کی کسی دلیل کو بھی قبول نہیں کر رہا تھا۔ وہ ایک دم ہی سے الجھ گیا تو اس نے نادیہ کے خیال کو ایک لمحے کے لیے جھٹک دینا چاہا، مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ کچھ ایسا تھا کہ وہ نادیہ کے خیال کو خود سے الگ نہ کر سکا۔

''پھر میں کیا کروں...... اسے تلاش کرنے کے لیے کس راہ پر چلوں۔'' وہ خود ہی بڑبڑانے لگا۔ یوں خود کلامی کرتے ہوئے وہ چونک گیا۔ کیا نادیہ اس کے اعصاب پر اس قدر حاوی ہو چکی ہے؟ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ تب اس نے محسوس کیا کہ شام کے سائے ڈھل رہے ہیں۔ اسے اب اٹھ کر اندر چلے جانا چاہیے۔ وہ اٹھا اور آہستہ قدموں سے اندر کی جانب چلا گیا۔

☆……☆

رات دھیرے دھیرے اتر آئی تھی۔ نادیہ کھڑکی سے لگی باہر دیکھ رہی تھی۔ وہی دور دور تک پھیلی ہوئی اندھیرے کی سیاہ چادر، جس میں کہیں کہیں برقی قمقموں کی روشنی بے ڈھنگے ستاروں کی طرح لگ رہی تھی۔ بے ترتیب اور الجھے ہوئے، ہانپتے ہوئے روشنی دیتے، جیسے وہ بھی کسی کی غلامی میں روشنی دینے پر مجبور ہوں، یہ سیاہ رات جن پر مسلط ہو چکی ہو۔ جیسے روشنی دینے کے لیے خود کو جلانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ وہ بھی جل رہے تھے اور یہاں اس کھڑکی میں موجود وہ بھی جل رہی تھی، مگر وہ خود کو بدقسمت تصور کر رہی تھی۔ جس کے مقدر میں جلنا تو ہے لیکن اس کی روشنی نہیں، شاید اس میں جلنے کی بھی صلاحیت نہیں، وہ محض سلگ سکتی ہے اور سلگنا ہی شاید اس کا مقدر ٹھہرا ہے۔

کچھ عرصہ پیش تر بھی وہ یوں کھڑکی میں کھڑی اپنی ہی ذات کے حساب کتاب میں الجھی ہوئی تھی۔ تب اس کی سوچوں میں بغاوت بھری ہوئی تھی۔ وہ حویلی سے باہر کی دنیا نہیں دیکھنا چاہتی تھی بلکہ وہ آزادی چاہتی تھی، ان روایات سے نفرت تھی جو اس پر لاگو کی ہوئی تھیں۔ مذہب کے نام پر اپنی پسند و ناپسند کو مسلط کیا گیا ہوا تھا۔ وہ باہر کی دنیا کا تجزیہ نہیں کر پائی تھی، کیوں کہ اس نے باہر کی دنیا دیکھی ہی نہیں تھی۔ اسے تو وہ گھٹن ستایا کرتی تھی جو اس حویلی کے در و دیوار میں کسی آسیب کی مانند چھائی ہوئی تھی، لیکن اب اس کی سوچوں کا محور کچھ اور ہی تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ باہر کی دنیا میں جاتے ہی اسے راحت کی بجائے زخم مل جائیں گے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ وہ بغاوت کر کے بھی، کچھ نہیں کر پائی تھی۔ زبیدہ پھوپھو سے ملاقات ہوتے ہی وہ سمجھ گئی کہ روایات کے تسلط میں وہ یونہی حصار میں نہیں تھی۔ یہ حصار دراصل حویلی والوں کا خوف تھا اور اس خوف نے زندگیوں کو ششدر کر رکھا تھا۔ لاہور سے سلامت نگر آنے سے پہلے پھوپھو زبیدہ نے اسے پوری طرح بتا دیا تھا کہ وہ کن حالات میں حویلی سے نکلی اور کاشف کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہی ہے۔ حویلی سے ایک بار ناتا توڑ لیا سو پھر اس جانب منہ نہیں کیا۔ اب اگر وہ چاہتی ہے تو دوبارہ حویلی نہیں جائے، لیکن وہ خود کچھ اور ہی سوچ چکی تھی۔ نجانے کیوں وہ قدرت کے اشاروں کو سمجھ کر آگے بڑھنا چاہتی اور اپنے سارے ہی فیصلے اسی کے مطابق کرنا چاہتی تھی، کیونکہ اس کے اندر سے یہ پختہ یقین اٹھ رہا تھا کہ یہ اشارے ہیں، جو اسے مستقبل کی راہ دکھا رہے ہیں، ورنہ ایک تسلسل کے ساتھ اتفاقات کا ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ محض اتفاق نہیں ہیں۔ وہ ایک ایک اشارے کو پھر سے اپنے ذہن میں دہرانے لگی۔

وہ بڑی آسانی کے ساتھ حویلی سے نکل کر ٹرین میں جا بیٹھی اور بغیر کسی پریشانی کے لاہور پہنچ گئی۔ وہ جس اختر رومانوی کے لیے گئی تھی، وہ اس کا کزن نکلا اور ماں، اس کی اپنی پھوپھو، لیکن جس کے لیے وہ گئی، وہی نہیں ملا، بلکہ حویلی کے لوگ اس تک آن پہنچے۔ جو اپنی تمام تر طاقت کے باوجود پسپا ہو گئے۔ وہ اسے واپس نہ لے جا سکے۔ وہیں اسے اپنی پھوپھو کے بارے میں معلوم ہوا۔ جو اس سے پہلے ہی بغاوت کر چکی تھی۔ اس نے ان اشاروں پر وہیں شعیب کے گھر میں بیٹھ کر بہت سوچا تھا۔ تب بہت سارے ''کیوں'' اس کے سامنے آن کرتن گئے۔ مثلاً وہ اختر رومانوی ہی کو کیوں پسند کرنے لگی تھی۔ اس کی شاعری سے لے کر لہجے تک کو ہی کیوں پسند کیا؟ وہ پھوپھو کے گھر ہی کیوں پہنچ گئی؟ شعیب اس کا کزن کیوں نکلا۔ اس کے ساتھ سفر میں کوئی انجانا حادثہ کیوں نہیں ہوا؟ دلاور شاہ اس تک کیوں پہنچ گیا؟ پھوپھو کا راز اس کے سامنے کیوں آ گیا؟ یوں ایک سلسلہ تھا کہ دراز ہوتا چلا گیا۔ تبھی اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ واپس حویلی میں جائے گی اور اس حادثے کو کریدے گی، جیسے سب نے ''قدرت کو یہی منظور تھا'' کہہ کر ماضی کے سرد خانے میں ڈال دیا تھا۔ وہ حادثہ اس کے والدین کا تھا۔ حویلی سے نکلنے سے پہلے وہ بھی سبھی کی طرح یہی سمجھتی تھی لیکن پھوپھو کی بغاوت کے بارے میں سن کر اسے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کے والدین کو بہرحال حادثہ پیش نہیں آیا تھا، کیا ہوا تھا؟ یہی اس نے جاننا تھا۔ اگرچہ وہ چاہتی تھی کہ پھوپھو کا راز، راز ہی رہ جائے، وہ افشا نہ ہو اور اس معاملے میں اس کے اندر پوری طرح قربانی دینے کا جذبہ بھی موجود تھا، لیکن ان سارے واقعات و حالات

میں اسے جو اپنے والدین کے بارے میں شک ہو گیا تھا۔اب وہ چاہتی تھی کہ اس سے وقت کی پڑی دھول کو صاف کر دے۔یہ کیسے ہو گا۔ابھی اسے کچھ معلوم نہیں تھا،مگراس کے اندر جو اعتماد آ گیا تھا،اس سے نادیہ کو پورا یقین تھا کہ وہ ایسا کر گذرے گی۔

وہ اختر رومانوی کی ذات میں پوری طرح ڈوب گئی تھی۔اس کے خیال میں بھی نہیں تھا کہ اختر رومانوی کے لبادے میں شعیب موجود ہے اور وہ اس کا اپنا ہی خون ہے۔اگر زبیدہ پھوپھو کا راز رہتا ہے تو وہ بھی راز ہی رہے گی۔شعیب اسے کبھی نہیں پا سکے گا۔اور وہ خود اختر رومانوی سے رابطہ نہیں چاہتی تھی۔وہ اس کے لیے صفحہ ہستی سے مٹ گیا تھا۔اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ شعیب حویلی میں آیا ہے،مگر دل کے کونے میں کہیں بھی خواہش نہیں اٹھی کہ دیکھوں تو سہی وہ حقیقت میں کیسا ہے؟ایک لمحہ کی دوری اور چند قدم کے فاصلہ پر تھا وہ۔اسے محض کھڑکی تک جانا تھا اور اسے دیکھ لینا تھا،لیکن اس نے شعیب کو ایک نظر بھی نہیں دیکھا۔وہ آیا اور چلا گیا۔اس نے ایک نگاہ بھی نہ ڈالی۔یہ غصہ تھا،بے بسی تھی یا پھر وہ بے نیاز ہو گئی تھی۔یہی سب سوچتے ہوئے اسے ایک لمحے کو خیال آیا کہ کیا اس کی محبت اتنی سی ہی تھی کہ چند دن وہ محبت کی پنہائیوں میں رہی اور پھر سدا کے لیے اس سے یہ جذبے اور احساس چھین لیے گئے۔یہاں سے پھر ''کیوں'' اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔جیسے وہ مہارانی ہو اور اس کے دربار میں یہ سوال کسی سوالی کی طرح اس کی نظر کرم کے منتظر ہوں۔اب اس کے پاس تھا بھی کیا،یہی سوال تھے اور انہی سوالوں کی بنیاد پر ابھرتے ڈوبتے سوچوں کے پندار،اس کے علاوہ اب اس کے پاس تھا بھی کیا۔وہ خود اپنے اندر سے جاگ اٹھی تھی۔اسے خود اپنے فیصلے کرنا تھا۔جن کے سہارے اس نے اپنی زندگی کے باقی ایام گذارنے تھے۔اس کا سیل فون نجانے کہاں تھا اور کتابیں میگزین ڈبوں میں بند کر کے کسی کونے کھدرے میں ڈال دیئے گئے تھے۔وہ ان کے بارے میں اب سوچنا بھی نہیں چاہ رہی تھی۔اس کا تمام تر محور اب اس کی اپنی ذات تھی،جہاں سے اب سوچوں کے نئے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

رات لمحہ بہ لمحہ گذرتی چلی جا رہی تھی اور سوچوں کا ایک طوفان تھا جو امنڈتا چلا آ رہا تھا۔اس نے خود کو حالات کے سپرد کر دیا تھا۔وہ چاہتی تھی کہ اب اپنے اعتماد کے بل بوتے پر ان حالات کا مقابلہ کرے،اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ایک مجبور،بے بس اور تنہا لڑکی ہے۔وہ ان حالات کا کیسے مقابلہ کر پائے گی۔پھوپھو کا ایک سہارا بنا تھا،وہ بھی ختم ہو گیا۔وہ اس کی اگر بات مان کر اس کے ساتھ چلی جاتی تو شاید اسے اپنی تنہائی کا اتنا احساس نہ ہوتا۔اسے شعیب کی محبت چاہے نہ ملتی لیکن اس کا سہارا تو مل جاتا اور اگر نفرت مل جاتی۔؟اس خیال کے ساتھ ہی جب یہ سوچ ابھرتی تو وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔زندگی اچانک ہی بے رنگ دکھائی دینے لگی۔اسے یوں لگتا جیسے زندگی کے صحرا میں وہ یک تنہا کھڑی ہے،آسمان سے کڑی دھوپ اس پر ہے اور وہ آبلہ پائی میں کھڑی اسی حیرت میں ہے کہ کوئی تو راستہ ہو؟لیکن راستہ تو کیا ملنا تھا۔اسے کوئی سراب بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔وہ مایوسی کی انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔باہر موجود اندھیرے کی طرح اس کا مقدر بھی سیاہی میں ڈوبا ہوا تھا۔اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔اچانک ہی اسے یہ احساس ہوا کہ اس کے آنسو بہہ رہے ہیں۔کھڑکی پر دھرے ہاتھ کی پشت پر جب گرم گرم نمی محسوس ہوئی تو وہ اپنے آپ میں آ گئی۔اس نے بے بسی کی سی کیفیت میں اپنے آنسو صاف کیے اور باتھ روم میں چلی گئی۔وہ منہ پر کافی دیر تک پانی کے چھپاکے مارتی رہی۔ذرا سکون محسوس ہوا تو اس نے وضو کرنا شروع کر دیا۔وہ باتھ روم سے وضو کر کے نکلی تو ایک گوناں سکون اس کے دل میں اتر آیا تھا۔وہ جائے نماز بچھا کر رب تعالیٰ کے حضور کھڑی ہو گئی اور پھر انتہائی جذب کے عالم میں نماز پڑھنے لگی۔نجانے اتنا سرور نماز میں کہاں سے آ گیا تھا۔بے بسی کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے جب انسان اپنے خالق حقیقی کی طرف رجوع کرتا ہے،اس کی مدد کا طلب گار ہوتا ہے تو اسے اپنے رب کی طرف سے یقین مل جاتا ہے کہ وہ اس کی مدد کرتا ہے۔منفی سوچیں نہ جانے کہاں تحلیل ہو جاتی ہیں اور اس کی جگہ ایمان و یقین آ جاتا ہے۔جس سے دل کو تسلی ملتی ہے کہ بندے اور رب

کا تعلق جب بن جاتا ہے تو پھر اس میں دوئی نہیں آتی، تعلق گہرا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

حویلی کی اوپری منزل کے اس کمرے میں دھیمی روشنی تھی۔ نادیہ پورے خشوع وخضوع کے ساتھ رب تعالیٰ کے حضور جھکی ہوئی تھی۔ اس کی دعاؤں میں نجانے کیسی رقت آ گئی تھی کہ بہتے آنسوؤں کا اسے خیال ہی نہیں تھا، بلکہ ایک گوناں سرور اس کے دل میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ اسے لگا جیسے تپتے ہوئے صحرا میں چمکتے ہوئے سورج کے آگے بادل آ گئے ہیں اور موسم خوشگوار ہونے کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب سراب نہیں، حقیقی نخلستان اسے نہ صرف ملیں گے، بلکہ وہ انہی راستوں پہ چلتی ہوئی اپنی منزل تک ضرور پہنچے گی۔ ایک ایک چہرہ اس کی نگاہ میں تھا۔ وہ انہیں دیکھتی جاتی تھی اور غور کرتی چلی جا رہی تھی۔ زندگی اسے با مقصد دکھائی دینے لگی تھی۔



شعیب اگرچہ اپنے آفس میں مصروف تھا لیکن وہ ذہنی طور پر الجھا ہوا تھا۔ حویلی سے آنے کے بعد اسے نجانے اپنی ہزیمت کا احساس کیوں ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ پیر سائیں نے اسے اسی کے سامنے ہرا دیا ہے۔ وہ جو بہت کچھ کرنے کے بلند و بانگ دعوے لیے ہوئے تھا، کچھ بھی نہیں کر سکا۔ وہ یوں خالی ہاتھ واپس لوٹا تھا کہ جیسے اس کا ہاتھ جھٹک دیا گیا ہو۔ وہ لاشعوری طور پر محمد الیاس کا انتظار کر رہا تھا جو ہنوز اس تک نہیں پہنچا تھا، جبکہ نادیہ تک پہنچنے کی ایک راہ اسی کی ذات سے ہو کر جا رہی تھی۔ وہ خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا کہ جیسے اچانک سب کچھ ہی اس سے چھین لیا گیا ہو۔ وہ جتنا اپنا دھیان اپنے کام کی طرف لگاتا، اتنا ہی الجھ جاتا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اٹھے اور کسی ویرانے میں چلا جائے۔ وہاں بس وہ ہو، اس کی تنہائی ہو اور نادیہ کی یادیں ہوں۔ اسی کشمکش میں دوپہر گذر گئی۔ دفتر کا وقت ختم ہوا تو وہ سرکاری گاڑی میں واپس رہائش گاہ آ گیا۔ اس کا دل تھا کہ ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ شاید اس کے اندر کا عکس اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس لیے جیسے ہی وہ گھر آیا۔ زبیدہ نے ایک ہی نگاہ میں دیکھ لیا کہ شعیب نارمل نہیں۔ ضرور کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔

''کھانا لگواؤ بیٹا۔؟'' زبیدہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی۔!'' اس نے ہنکارہ بھرا اور ایزی ہونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ماں نے کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ وہ اس کے بغیر کھاتی ہی نہیں تھی۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کھانے کی میز پر آ گیا۔ یوں ماں کا ساتھ دینے کی غرض سے وہ کھاتا رہا۔ دونوں نے ہی بہت کم کھایا اور پھر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ملازم جب برتن سمیٹ کر چلا گیا اور اس نے چائے لا کر ان دونوں کے سامنے رکھ دی تو اس وقت زبیدہ اپنے طور پر فیصلہ کر چکی تھی۔

''کیا بات ہے بیٹا۔! تم مجھے خاصے پریشان دکھائی دے رہے ہو؟''

''امی۔! میں پریشان تو ہوں، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ میں چاہوں بھی تو اپنا آپ چھپا نہیں پاؤں گا، لیکن جو میری پریشانی ہے، اس کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ایسا کچھ ہے کہ کسی نقصان کا اندیشہ ہو۔'' اس نے الجھتے ہوئے صاف گوئی سے کہا تو وہ بولیں۔

''تیرا تعلق تو مجھ سے ہے نا۔ بتاؤ ممکن ہے تمہارے مسئلے کا کوئی حل میرے پاس ہو۔''

''امی! بس ایسے ہی...... بس چھوڑیں آپ۔'' اس نے نظر انداز کرنے والے لہجے میں کہا۔

''بیٹا! آج سارا دن میں ایک بات سوچتی رہی ہوں۔ بعض اوقات ہم جو باتیں کہہ نہیں پاتے، بعد میں وہ بڑا نقصان دیتی ہیں۔ کوئی بھی راز رکھنے کا ایک وقت ہوتا ہے اور پھر اسے افشا کر دینا چاہیے۔ ورنہ بہت زیادہ نقصان ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔'' زبیدہ نے نجانے کس جذبے کے تحت کھوئے ہوئے انداز میں کہا، تو شعیب چونک گیا۔

''امی! آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟''

''دیکھو بیٹا! میں نے تم سے ایک بہت بڑا راز چھپائے رکھا۔ وہ راز ایسا تھا کہ اگر میں وہ تمہیں وقت سے پہلے بتاتی تو شاید تمہاری یہ شخصیت نہ بن پاتی اور پھر اس میں میری اپنی غرض بھی شامل تھی۔ میں خود غرض ہو گئی

تھی، لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ وہ سب میں تمہیں بتا دوں۔ اب اس کے بعد تم جو چاہو سمجھو، میری ذمے داری تو پوری ہو چکی ہے۔'' زبیدہ نے یوں اعتماد سے کہا جیسے اب اسے اپنا آپ چھپانے سے کوئی خوف نہ ہو۔

''آپ ساری دنیا میں ایک ایسی ہستی ہیں کہ جسے میں اہمیت دیتا ہوں۔ میں آپ سے ہوں۔ چاہوں بھی تو آپ سے خود کو الگ نہیں کر سکتا۔ میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں، میں زمانے کی مار کھا چکا ہوں۔ سمجھتا ہوں کہ حقیقت کبھی کبھی کتنی تلخ ہوتی ہے اور میں کسی بھی تلخ حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتا ہوں امی۔ آپ بتائیں۔''

''ہاں! شاید یہ حقیقت اتنی ہی تلخ ہو کہ تمہیں اپنی ماں کا وجود بھی اچھا نہ لگے۔'' زبیدہ نے روہانسی ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ آپ کہہ دیں جو آپ کے دل میں ہے۔''

''تو سنو بیٹا! یہ میری زندگی کی کہانی ہے۔'' زبیدہ نے کہا اور جس قدر ممکن ہو سکا آہستہ آہستہ اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتاتی چلی گئی۔ شعیب ہمہ تن گوش پورے تحمل سے سب کچھ سنتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ سہ پہر کا وقت ہو گیا۔ ''حقیقت یہ ہے شعیب کہ میں یہاں تمہارے لیے نہیں نادیہ کے لیے آئی تھی۔ اور شاید نادیہ تم سے بہت دور چلی جائے گی۔ اس نے صرف میری خاطر، میرے راز کی خاطر۔ تم سے اپنا آپ چھپا لیا۔''

شعیب یہ سب سن کر پہلے تو کافی دیر تک خاموش رہا۔ شاید وہ اس حقیقت کی تلخی کو نگل رہا تھا یا پھر زندگی کے اس نئے منظر میں خود کو دیکھ رہا تھا، پھر جب بولا تو اس کے لہجے میں اعتماد چھلک رہا تھا۔

''امی! مجھے اس سے غرض نہیں کہ آپ نے جو کچھ کیا وہ غلط تھا یا صحیح، بس وہ درست تھا، جو بھی تھا۔ آپ نے میرے لیے اتنے دکھ سہے۔ تنہائی کی زندگی سے لڑتی رہیں۔ ایمان سے امی...... آپ میرے لیے زیادہ مقدس ہو گئی ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ حویلی والوں کے خلاف ڈٹ جائیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے نادیہ چاہیے، بلکہ اس لیے کہ انہوں نے آپ کو وہ مان نہیں دیا، جو آپ کا ہونا چاہیے تھا، بلکہ دلاور شاہ نے آپ کے ساتھ دھوکا کیا۔ وہ جو کوئی بھی ہے، اسے میری ماں کے سامنے جھک کر معافی مانگنا ہو گی۔'' شعیب نے کافی حد تک جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ مجھ سے معافی مانگے یا نہ مانگے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے، بلکہ نادیہ تمہاری ہونی چاہیے۔ مجھے اس سے نہیں اس لڑکی کو زندہ درگور ہوتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتی۔'' زبیدہ نے کہا اور ساتھ ہی اس کے آنسو نکل گئے۔

''ایسا ہی ہو گا۔ تیاری کریں، ہم ابھی حویلی جائیں گے۔'' شعیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ زبیدہ ایک لمحے کو خوف زدہ ہو گئی، جبکہ شعیب کے ذہن سے ساری الجھنیں ختم ہوئیں تو ہر منظر واضح ہو گیا تھا۔ اس نے گاڑی نکالی تو زبیدہ اس کے ساتھ والی پسنجر سیٹ پر آن بیٹھی۔

جس وقت وہ رہائش گاہ سے چلے عصر اور مغرب کا درمیانی وقت ہو رہا تھا۔

حویلی پہنچتے انہیں زیادہ وقت نہیں لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ وہاں پہنچ گئے جہاں انہیں صدر دروازے پر ہی روک لیا گیا۔

''کس سے ملنا ہے صاحب؟'' وہاں موجود ایک شخص نے اس کے ساتھ بیٹھی خاتون کو دیکھ کر تذبذب سے کہا، جو کچھ دیر پہلے ہی یہاں سے گئی تھی۔ اس نے شعیب کو بھی دیکھا تھا اور یہی گاڑی پہلے بھی یہاں آئی تھی۔ شعیب نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ سیل فون نکال کر دلاور شاہ کے نمبر پش کر دیے۔ دوسری ہی بیل پر فون ریسو کر لیا گیا۔

''نمبر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں کون بات کر رہا ہوں۔'' اس نے اپنے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

''کہیے آفیسر۔! اب کیا بات ہے۔'' دوسری طرف سے اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں آپ کا بھانجا بات کر رہا ہوں اور حویلی کے دروازے پر ہوں، کہیے اندر آنے کی اجازت دیں گے یا اپنی ماں کو حویلی کے اندر بھیج دوں؟''

''کیا مطلب کیا کہنا چاہتے ہو تم؟'' دلاور شاہ نے انتہائی الجھے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

''ظاہر ہے، ہم یہاں کھڑے رہیں گے، جب تک

آپ ہمیں اندر آنے کی اجازت نہیں دیں گے۔'' وہ پھر غصے میں چھلکتے ہوئے لہجے پر قابو پا کر بولا۔

''کس نیت سے آئے ہو؟'' پیر سائیں نے پوچھا

''اس کا جواب میں آمنے سامنے بیٹھ کر دوں گا اور اس شرط پر کہ آئندہ مجھے حویلی کے دروازے پر کوئی نہیں روکے گا۔'' شعیب کا غصہ بے قابو ہونے لگا تھا۔ کبھی چند لمحے دوسری طرف خاموشی رہی۔ پھر نجانے کی سوچ کر پیر سائیں بولا۔

''ٹھہرو۔! میں ملازم بھیجتا ہوں ورنہ یہ تجھے اندر نہیں آنے دیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ چند منٹ وہ ویسے ہی کھڑے رہے، تبھی اندر سے ایک ملازمہ نے آ کر سکیورٹی والوں سے کہا اور انہیں اندر جانے کا اشارہ کر دیا۔ شعیب نے گاڑی پورچ میں لے جا کر روک دی اور پھر اتر کر اندر چل پڑے۔ ڈرائینگ روم میں سامنے ہی پیر سائیں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر گہرے اطمینان کی پرچھائیاں تھیں۔ اس نے زبیدہ پر ایک نگاہ ڈالی اور دونوں کو ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے تو پیر سائیں ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔

''تو پھر تمہاری ماں نے ساری روداد تمہیں سنا دی ہو گی، یہ بھی بتا دیا کہ میں رشتے میں تمہارا ماموں لگتا ہوں۔ ہو گئی رشتے داری، اب بتاؤ یہاں کیا کرنے آئے ہو؟''

''دلاور! اس لہجے میں بات کرو گے تو پہلے مجھ سے بات کرو۔ بتاؤں میں تمہیں یہ یہاں کیا کرنے آیا ہے۔ یہ نادیہ کو لینے کے لیے آیا ہے جسے تم ان در و دیوار میں زندہ درگور کرنے جا رہے ہو۔''

''آپا! زبان بند رکھو۔'' پیر سائیں نے کہنا چاہا مگر زبیدہ نے ہتھے سے اکھڑتے ہوئے کہا۔

''خبردار اگر مجھے ٹوکا دلاور۔! تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ پوچھ رہے ہو یہ یہاں کیا کرنے آیا ہے۔ یہ بھی اس حویلی کا اتنا ہی مالک ہے جتنے تم ہو۔ جب چاہے یہاں آ سکتا ہے۔ تم اسے روکنا بھی چاہو تو نہیں روک سکتے دلاور۔'' زبیدہ ایک دم سے پھٹ پڑی تھی۔ شاید دلاور کو امید نہیں تھی کہ وہ اتنا اونچا بولے گی۔

''اچھا تو تم اپنا یہ حق جتانے آئی ہو، مگر تم اپنا یہ حق بہت پہلے بڑے پیر سائیں کے دور میں کھو چکی ہو اور......'' اس نے کہنا چاہا تو شعیب بولا۔ اس کے لہجے میں تحمل کے ساتھ ساتھ برداشت کا بھی عنصر تھا۔

''پیر سائیں! آپ اس طرح میری ماں کو بلیک میل نہیں کر سکتے۔ اگر آپ کو اپنے مریدین کا زعم ہے تو یہ آپ کا خوف بھی ہے۔ یہ نہ ہو کہ آج آپ اجازت دینے والے ہیں تو کل ہم آپ کو اجازت دینے والے بن جائیں۔ اس سے پہلے کہ میں ادب کا دامن چھوڑ دوں۔ آپ اپنا لہجہ ٹھیک کر لیں۔''

''کیا کرو گے تم۔؟'' پیر سائیں نے سرسراتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو کچھ نہیں کرنا، جو کرنا ہے وہ آپ ہی نے کرنا ہے۔'' وہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا تو پیر سائیں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر آہستگی سے بولا۔

''بتاؤ۔ تم ماں بیٹا کیسے آئے ہو؟''

''میں نادیہ کو لینے کے لیے آئی، جسے تم نے دھوکے سے یہاں قید کر لیا ہے۔'' زبیدہ نے غصے میں کہا۔

''میں نے تو اسے قید نہیں کیا۔ وہ اپنی مرضی سے یہاں موجود ہے اور زبیدہ آپا! کیا اس نے آپ کو بتایا نہیں۔'' وہ کافی حد تک طنزیہ انداز میں بولا۔ اس سے پہلے کہ زبیدہ کوئی جواب دیتی اماں بی دروازے میں آ کھڑی ہوئیں۔ اسے دیکھتے ہی زبیدہ اٹھ گئی اور پھر ان کی طرف دیکھتے ہی رونے لگ گئیں۔ وہ کچھ دیر یونہی کھڑی تکتی رہی۔ پھر بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔

''آ جاؤ! آؤ'' پھر شعیب کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''میں تمہاری نانی ہوں پتر۔! آؤ میرے گلے لگ جاؤ'' وہ اٹھا اور اپنی نانی کے گلے لگ گیا۔ دلاور شاہ انہیں دیکھتا رہا، پھر انہیں اماں بی کے ساتھ جاتا دیکھ کر اٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر سے غضب چھلک رہا تھا۔

اماں بی انہیں اپنے کمرے کے سامنے بڑے گول کمرے میں لے گئیں جو ڈرائینگ روم کے طور پر سجا ہوا تھا اور خاندان کے لیے مخصوص تھا۔ بہت عرصے بعد اس کمرے کو استعمال کرنے کی نوبت آئی تھی۔ اطمینان سے بیٹھنے کے بعد زبیدہ نے اپنی ماں سے کہا۔

''دلاور شاہ اس قدر غیریت برتے گا میرے

ساتھ۔۔میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔۔اب مجھے اس حویلی میں آنے کے لیے اجازت لینا پڑے گی۔اگر میں اپنی ضد پر اتر آئی تو اس کی ساری شان وشوکت چھین لوں گی۔"

"تم تو چلی گئی تھی۔۔واپس کیوں آئی۔۔"

"میں نادیہ کو لینے آئی ہوں۔۔صرف میرا راز نہ کھولنے کی غرض سے اس نے یہاں حویلی میں گھٹ کر مرنا قبول کرلیا ہے۔اب تو وہ شرط بھی نہیں رہی۔" زبیدہ نے تیزی سے کہا۔

"مطلب۔؟" اماں چونکی۔

"مطلب یہ کہ میں نے اپنے بیٹے کو سب بتا دیا۔کچھ نہیں چھپایا۔۔" اس نے کہا تو دلاور شاہ اور اس کی بیوی اسی لمحے کمرے میں داخل ہوئے اور بڑے اطمینان سے آکر سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"زبیدہ آپا۔!میں تم سے زیادہ بحث نہیں کروں گا۔دوٹوک بتاتا ہوں کہ تم نادیہ کو یہاں سے نہیں لے جا سکتی ہو۔ہاں،اس حویلی میں حصے داری کا دعویٰ میں مان لیتا ہوں۔اپنے حصے کی جو قیمت لگاؤ۔میں ابھی دینے کو تیار رہوں۔ورنہ اگر تم لوگوں کے ذہن میں یہ ہے کہ عدالت میں لوگے،تو وہ تم لوگوں کی بھول ہے۔"

"مجھے نہ حویلی سے کوئی غرض ہے اور نہ میں نے کبھی ایسا سوچا۔میں نے فقط تیرے رویے کے جواب میں تجھے احساس دلایا ہے۔تم نادیہ کو مجھے دو۔میں دوبارہ یہاں قدم بھی نہیں رکھوں گی۔چاہئے یہ کاغذ پر لکھوالو۔" زبیدہ نے واضح کہا۔

"نادیہ کی منگنی میرے بیٹے ظہیر شاہ سے ہو چکی ہے۔اورابھی تھوڑی دیر بعد اس کا نکاح ہے۔ظہیر کے ساتھ۔اس لیے تمہیں یہاں سے مایوس لوٹنا پڑے گا۔" پیر سائیں سکون سے بولا۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے دلاور شاہ۔!میں نادیہ کے جذبات جانتی ہوں۔تم اس پر ظلم نہیں کر سکتے۔" زبیدہ بولی۔

"زبیدہ آپا۔!اگر نادیہ ہی یہاں سے نہ جانا چاہئے تو......؟" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

"ایسا نہیں ہوسکتا۔۔" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

"ضرور تم نے اسے خوف زدہ کردیا ہوگا۔"

"قطعاً خوف زدہ نہیں کیا۔چاہو تو اس سے پوچھ لو۔آپ کا کہنا بھی یہی تھا نا کہ جو نادیہ چاہے گی،ویسا ہی ہو گا۔اب نادیہ کی سن لو۔وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔" اس نے کہا تو اماں بی بولی۔

"بیٹا شعیب۔!کیا یہ درست ہے کہ ہم نادیہ کے کہنے پر اپنا فیصلہ دے دیں۔؟"

"ضرور اس میں کوئی چال ہے۔ورنہ اتنی آسانی سے......" زبیدہ نے کہنا چاہا کہ باہر سے نادیہ کی آواز آئی۔

"نہیں پھوپھو۔!اس میں کسی کی کوئی چال نہیں ہے۔میں نے فیصلہ دے دیا تھا کہ میں حویلی میں رہوں گی۔وہ فیصلہ میں نے جس بنیاد پر بھی کیا،ہو گیا۔کسی کا مجھ پر کوئی جبر نہیں ہے۔یہ میرا اپنا ذاتی فیصلہ ہے۔" شعیب نے اس آواز کو سنا تو اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔وہی آواز،وہی لہجہ،وہی انداز۔ہاں بس اس آواز میں حزن ملا ہوا تھا۔جو نادیہ کی آواز کو انفرادیت بخشتا تھا۔

"تم سامنے آکر کہو......ضرور......"

"نہیں پھوپھو۔!میں سامنے نہیں آؤں گی۔شعیب کا شکریہ کہ اس نے مجھے مان دیا۔میرے لیے یہاں تک چل کر آیا۔وہ مجھے اپنانا چاہتا ہے۔اس عزت افزائی کا بھی شکریہ۔یقیناً میں نے پھوپھو کے راز کو افشا نہ ہونے کے ڈر ہی سے یہاں حویلی میں رہنے کا فیصلہ دیا تھا،لیکن اب میرا یہی فیصلہ ہے۔" نادیہ نے پورے اعتماد سے کہا تھا۔

"کیا تمہارے اس فیصلے میں دلاور شاہ......"

"ہاں۔!میں نے ان کے ساتھ،اماں بی کے ساتھ اور زہرہ بی کے ساتھ مل کر یہ فیصلہ کیا ہے۔مجھے اپنی اور اس حویلی کی عزت اور روایات کی پاسداری کرنا ہے۔" نادیہ نے واضح طور پر کہہ دیا۔

"تم وہ نادیہ بات نہیں کر رہی ہو جو میرے پاس گئی تھی۔انہوں نے تمہارے دماغ کو نجانے کیا کر دیا ہے۔میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" زبیدہ نے روتے ہوئے کہا۔

"نہیں پھوپھو۔!میں نے پیر سائیں کی یہ بات مان لی ہے اور مجھے یقین ہے کہ پیر سائیں بھی میری بات مانیں گے۔کیوں پیر سائیں؟" نادیہ نے کہا تو سبھی اس دروازے کی طرف دیکھنے لگے جہاں سے اس کی آواز آ

رہی تھی۔شاید دلاور شاہ سے اس کی کوئی بات طے ہو چکی تھی۔اس لیے دلاور شاہ نے کہا۔

''ہاں۔!میں مانوں گا۔بولو۔؟''

''شعیب۔!معذرت خواہ ہوں کہ مجھے بڑوں کے سامنے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی ،لیکن یہ ضروری ہے،کیا آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟''

''اس کے یوں سوال کرنے پر ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔شعیب کو یوں لگا جیسے انجانی آواز اس کے پورے بدن سے آ کر لپٹ گئی ہو اور اس کا دامن تھام کر اس سے سوال کر رہی ہو۔سو اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں نادیہ۔!مجھے اگر تم سے محبت نہ ہوتی تو میں اس حویلی کی جانب ایک قدم بھی نہ بڑھاتا۔مجھے تم سے محبت ہے۔''

''تو پھر اسی محبت کا واسطہ،آپ میری لاج رکھیں گے۔میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آپ میری کزن دلاور شاہ کی بیٹی فرح سے شادی کر لیں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟'' دلاور شاہ ایک دم سے چیخا۔بھی چونک گئے جیسے اس نے کوئی انہونی کہہ دی ہو۔

''آپ نے میری بات ماننا تھی پیر سائیں۔جیسے میں نے آپ کی بات مانی۔اگر آپ کو میری بات منظور نہیں تو پھر میں بھی آپ کی پابند نہیں۔فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔بولیں جواب دیں۔''

''نادیہ۔!یہ تم بہت غلط کر رہی ہو۔میں تمہاری اس......''

''یہ غلط ہے یا صحیح۔سوچ لیں۔مغرب تک کا وقت ہے آپ کے پاس۔مغرب کے بعد جہاں میرا نکاح ہو گا،وہاں فرح کا بھی ہو گا۔میں جا رہی ہوں اپنے کمرے میں۔نانی اماں،شعیب میرا مہمان ہے،خاطر مدارت کی جائے۔''

اس کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی۔زبیدہ کا چہرہ ایک دم سے کھل گیا۔جبکہ دلاور شاہ کا چہرہ غصے میں سرخ ہو چکا تھا۔وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔اس کے پیچھے ہی زہرہ بی بھی چلی گئیں۔کمرے میں وہ تینوں رہ گئے۔

☆......☆

پیر سائیں اپنے کمرہ خاص میں بیٹھا ہوا تھا۔اور دیوان ہاتھ باندھے سامنے کھڑا تھا۔دونوں کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔انہیں نادیہ کی شرط نے حیران و پریشان ہی نہیں گنگ کر کے رکھ دیا تھا۔پیر سائیں بہت غصے میں حویلی سے اٹھ کر مردانے میں اپنے کمرہ خاص تک آیا تھا تا کہ وہ اس پر پوری طرح سوچ کر کوئی فیصلہ دے سکے۔

''تمہارا ذہن کیا کہتا ہے۔'' پیر سائیں نے دیوان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا تو مشورہ یہی ہے کہ نادیہ بی بی کی بات مان لی جائے۔'' اس نے کہا تو پیر سائیں نے چونک کر دیکھا،چند لمحے سوچتا رہا،پھر بولا۔

''کیوں۔؟کیوں مان لیں اس کی بات؟''

''نادیہ بی بی نے شرط ہی اس لیے رکھی ہے کہ آپ یہ بات نہ مانیں اور پھر وہ اپنی مرضی کرنے میں آزاد ہو گی۔دیکھیں پیر سائیں ماحول اور حالات وہ نہیں رہے جس میں آپ اپنی بات زور دے کر یا حکم دے کر منوا سکتے ہیں۔نادیہ بی بی کی بغاوت ہی اس لیے ہوئی کہ شعیب کا وجود سامنے آ گیا۔اگر شعیب نہ ہوتا تو پھر شاید یہ حالات پیدا ہی نہ ہوتے ،ماحول ہی کچھ دوسرا ہوتا۔''

''ہم ان حالات کو اپنے حق میں کیسے کر سکتے ہیں۔'' پیر سائیں نے پوچھا۔

''شاید نہ کر سکیں۔یہ گمان بھی نہیں تھا کہ شعیب آپ کے خاندان کا خون بھی ہو سکتا ہے۔قدرت کے اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ایسے حالات سامنے آ رہے ہیں کہ جن کے بارے میں گمان بھی نہیں تھا۔اگر لاہور میں نادیہ بی بی آپ کو نہ ملتی؟ تب سے لے کر اب تک حالات جس طرح پل پل بدلے ہیں۔یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتے۔یہ قدرت کے اشارے ہیں،انہیں مان لیں۔میں وثوق سے کہتا ہوں کہ بازی پھر آپ کے ہاتھ میں رہے گی۔''

''کیسے؟'' پیر سائیں نے تیزی سے پوچھا۔

''گستاخی معاف پیر سائیں۔!آپ کے خاندان میں کوئی ایسا لڑکا نہیں ہے،جس سے آپ اپنی صاحبزادی کی شادی کر سکیں؟ نادیہ بی بی کی شادی اگر ظہیر شاہ سے ہو جاتی ہے تو وہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا جو آپ نے سوچا ہے،دوسرا شعیب نے اپنے حصے کا مطالبہ کرنا ہی کرنا ہے۔وہ آج کرے یا کل۔چاہے صلح ہو یا نہ ہو۔اگر آپ کی صاحبزادی کا نکاح شعیب سے نہ ہو سکا تو پھر

ساری زندگی۔ وہ حویلی ہی میں پڑی رہے گی۔ اس کی زندگی کا بھی تو سوچیں۔ بجائے شعیب کو دور کرنے کے، آپ سے قریب کریں۔ اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے۔''

''ہاں۔! اس کا اشارہ تو اماں بی بھی مجھے دے چکی ہیں۔'' پیر سائیں نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو بس پھر اللہ کا نام لے کر آپ ہاں کر دیجئے۔ نادیہ بی بی تو بچی ہے۔ اس نے تو سوچا ہے کہ آپ کا انکار ہوگا اور وہ شعیب سے شادی کرے گی۔ اس طرح آپ فائدے میں نہیں نقصان میں رہیں گے۔ جائیداد کے حصے دار الگ ہو جائیں گے تو پھر آپ کے پاس کیا رہ جائے گا۔ فائدہ ہاں کرنے ہی میں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ مغرب کے بعد میں بیٹی کا نکاح دے دیتا ہوں۔'' پیر سائیں نے بمشکل کہا اور اٹھ گیا۔ اسے یہ اچھی طرح ادراک ہو گیا تھا کہ وہ شرط جس سے اس کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی درحقیقت وہ اس کے لیے فائدہ مند تھی۔ جائیداد کے معاملات کو اگر سامنے رکھا جائے اور ان پر ذرا سا بھی سوچا جائے تو بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ اسے اب شعیب پر ایسی بھرپور نوازشات کرنی تھیں کہ وہ نہال ہو جاتا۔ یہاں تک کہ وہ نادیہ کی محبت کو بھول کر فقط اس کا دم بھرتا۔ ایسا آفیسر اس کے لیے بہت سارے فائدوں کا باعث بن جاتا اور پھر سب سے بڑی بات۔ اس کی بیٹی، جس کے بارے میں وہ پریشان ہو جایا کرتا تھا، بیٹھے بٹھائے اس کی خوشگوار زندگی کے امکان پیدا ہو گئے تھے۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ اس نے سوچ لیا کہ مغرب کے بعد اس نے کیا کرنا ہے۔

☆......☆

حویلی کی دوسری منزل پر اگرچہ سب موجود تھے لیکن ان کے درمیان وہی سناٹا تھا جو اس حویلی کی پہچان بن چکا تھا۔ پیر سائیں نے سب کو وہیں جمع ہونے کے لیے کہا تھا اور پھر مغرب کے بعد وہ سب وہیں تھے۔ ان میں صرف دو وجود نہیں تھے، ایک نادیہ اور دوسری فرح، اماں بی، زبیدہ، زہرہ بی، ظہیر شاہ اور شعیب وہاں موجود تھے۔ پیر سائیں ان میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ سبھی اس کے فیصلے کے منتظر اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اماں بی سے پوچھا۔

''کیا نادیہ ہماری بات سن رہی ہے؟''

''جی پیر سائیں! میں یہیں اس کمرے میں ہوں اور آپ کا فیصلہ سننے کی منتظر ہوں۔'' دوسرے کمرے میں سے نادیہ کی آواز ابھری۔ تو پیر سائیں پرسکون ہو گیا جبکہ شعیب نے اضطراب سے پہلو بدلا۔

''نادیہ بیٹی! تم نے تو اپنا فیصلہ سنا دیا جو شرط ہی ہے۔ کیا زبیدہ آپا کی بھی اس میں خواہش ہے، کیا تم نے ان سے پوچھ لیا ہے۔ اگر وہی انکار کر دیں تو'' پیر سائیں نے پوچھا۔

''پھوپھو آپ کے سامنے تشریف رکھتی ہیں۔ آپ چاہیں تو ان سے پوچھ لیں۔ ان کے انکار یا اقرار کے بعد صورت حال جو ہوگی، پھر اس پر بات کر لیں گے۔'' نادیہ نے اوٹ ہی سے جواب دیا۔

''جی، زبیدہ آپا۔! تو پھر کیا کہتی ہیں آپ؟ آپ نادیہ کی بات سے اتفاق کرتی ہیں یا انکار۔؟'' پیر سائیں نے پوچھا اور زبیدہ کی طرف دیکھنے لگا جو پہلے ہی شعیب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، نادیہ بولی۔

''مجھے یقین ہے کہ شعیب میرا مان رکھیں گے۔''

''تو پھر فیصلہ ہو چکا۔ جو تم چاہو گی، وہی ہوگا۔'' شعیب نے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا تو زبیدہ دھیرے سے بولی۔

''مجھے منظور ہے۔ اب تم کہو، کیا کہتے ہو۔''

''مجھے نادیہ کی شرط منظور ہے۔'' پیر سائیں نے کہا تو ماحول پر چھایا ہوا تناؤ ایک دم سے ختم ہو کر رہ گیا۔ بہت حد تک سب کے ذہن میں یہی تھا کہ وہ بات نہیں مانے گا، لیکن وہ مان گیا تو ایک اضطرابی کیفیت بھی ساتھ میں در آئی تھی۔ ظہیر شاہ اس سارے دورانیے میں بالکل خاموش رہا تھا۔ اس نے ہنکارا بھی نہیں بھرا تھا۔ تبھی زبیدہ نے کہا۔

''تو پھر مجھے بھی منظور ہے دلاور شاہ۔''

اس کے یوں قبول کرنے پر چند لمحے ان کے درمیان خاموشی رہی، پھر پیر سائیں نے شعیب کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے درمیان تعارف سے لے کر اب تک کوئی اتنا اچھا تعلق پیدا نہیں ہو سکا۔ اس کی

چراغ تلے اندھیرا

☆ وزیرِ صحت نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔ تمباکو نوشی صحت کے لیے مضر اور دل کی بیماریوں کا باعث ہے۔

☆ گالیاں دینے کی وجہ سے دو طالب علموں کو لڑتے دیکھ کر ہیڈ ماسٹر صاحب گرج بولے۔ ''الو کے پٹھو، حرام زادو، نالائقو، تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ گالی دینا بری عادت ہے۔''

☆ ایک نوجوان نے اپنے والدین کی نصیحتوں سے دلبرداشتہ ہو کر انہیں گولیوں سے بھون ڈالا اور اسلحہ سمیت تھانے میں پہنچ کر کہا۔ ''جنابِ عالی، مجھ پر رحم کیا جائے کیونکہ میں یتیم ہوں۔''

☆ اردو زبان کی اہمیت کے بارے میں منعقدہ سیمینار میں اردو زبان کی اہمیت یوں بیان کی گئی۔

''اردو از آ ر نیشنل لینگویج، میری دلی خواہش ہے کہ کنٹری میں آل گورنمنٹ دفاتر فیوچر میں اپنی ساری کارسپانڈس اسی نیشنل لینگویج میں کریں تاکہ اس لینگویج کی امپارٹنس بحال ہو سکے۔''

مرسلہ۔ آسیہ نزاکت۔ ڈسکہ۔

بنیاد ہی میں کچھ ایسا ہو گا کہ جس میں کوئی اچھے جذبے پروان نہیں چڑھے بلکہ اس کے برعکس ہی ہوا۔ اب جبکہ تم ہمارے گھر کے فرد بننے جا رہے ہو۔ بلاشبہ وہ ساری باتیں بھلا دو گے جو انجانے میں ہمارے درمیان ہوئیں کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارا اور میرا تعلق اور رشتہ کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اب تم اپنے دل میں کچھ نہیں رکھو گے۔''

''جی نہیں، میرے دل میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔'' شعیب نے آہستگی سے کہا اور خاموش ہو گیا۔ تو پیر سائیں نے اماں بی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، نیچے دیوان نکاح خواں کو لے آیا ہو گا میں، ظہیر شاہ اور شعیب جا رہے ہیں۔ آپ نادیہ اور فرح کو تیار کر دیں۔ اس نے کہا اور اٹھ کر چل دیا۔ اس کے ساتھ ظہیر شاہ اٹھا تو شعیب کو بھی اٹھنا پڑا۔

حویلی کی نچلی منزل پر نکاح خواں کے ساتھ شہر کے دو معززین بھی موجود تھے۔ تبھی شعیب کو خیال آیا کہ یہاں دو گواہوں کی بھی ضرورت ہو گی۔ وہ اگر لاہور میں ہوتا تو ان میں سے ایک بھائی حمید ضرور ہوتا۔ لیکن یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ اچانک اسے ثناء اللہ کا خیال آیا۔ اس نے فون پر نمبر پش کیے تو لمحوں میں اس سے رابطہ ہو گیا۔ تب اس نے پوچھا۔

''اس وقت کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں آپ۔؟'' اس نے پوچھا۔

''میں گھر میں ہوں اور کچھ نہیں کر رہا۔'' اس نے جواب دیا۔

''پیر سائیں کی حویلی تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا۔'' اس نے پوچھا۔

''بس ذرا سا وقت، خیریت تو ہے نا'' اس نے تشویش زدہ لہجے میں جواب دیا۔

''تو بس پھر فوراً پہنچیں۔ ساتھ میں کوئی ایسا بااعتماد شخص بھی لیتے آئیں جو ہمارا گواہ ہو۔'' شعیب نے کہا۔

''جی، ابھی آیا۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

نکاح خواں تیار تھا۔ سامنے پڑا رجسٹر کے پرت پُر کر لیے گئے تھے۔ صرف ثناء اللہ کا انتظار تھا دیئے گئے مخصوص وقت سے چند منٹ کی دیر سے وہ پہنچ گیا۔ ملنے ملانے کے بعد انہوں نے احوال جانا تو ثناء اللہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے مگر اس نے کوئی سوال نہ کیا۔ اس نے اور اس کے ساتھ آئے شخص نے دستخط کر دیئے۔ دیوان کے ساتھ ثناء اللہ کو اندر بھجوا دیا گیا۔ وہاں سے تصدیق کے بعد ایجاب و قبول ہوا اور مختصر خطبے کے بعد دعا مانگ لی گئی۔

''شعیب اپنے دوستوں کو روکنا، یہ کھانا کھا کر

جائیں۔'' پیر سائیں نے کہا اور اٹھ گیا۔ تبھی شعیب نے ظہیر شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا رقیب تھا۔ اگر اس کے دل میں بہت سارے خیال آرہے تھے تو بلاشبہ وہ بھی اس کے بارے میں بہت سوچ رہا ہوگا۔ اس کے دل پر کیا گذر رہی ہوگی۔ اسے یہ تو معلوم ہی ہے کہ نادیہ فقط میرے لیے حویلی چھوڑ کر لاہور چلی گئی تھی۔ اگر دلاور شاہ اسے اپنی انا کا سوال نہ بناتا تو شاید اس کا نکاح ظہیر شاہ سے نہ ہو پاتا۔ اور اس پر انہیں ایسی قیمت دینا پڑی ہے کہ فرح کا نکاح اس کے ساتھ کرنا پڑا۔ وہ سوچوں کی وادی میں کھویا ہوا تھا۔ لیکن دل میں کچھ کھو جانے کا احساس اس کے لیے چبھن بن رہا تھا۔ اک اضطراب تھا کہ بڑھتا چلا جارہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ماضی کے ان حوالوں کو یاد کرے جس میں نادیہ نے اپنی محبت کا وہ احساس دیا تھا جو نشہ بن کر اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گیا تھا۔ جبکہ اس کا ذہن موجودہ صورت حال کو قبول ہی نہیں کر رہا تھا۔ وہ یہاں کیا کرنے آیا تھا اور کیا ہو گیا ،کہاں حویلی میں داخلے پر اجازت طلب کرنا پڑی تھی اور اب وہ اسی حویلی ہی کا حصہ تھا۔ یہ انہونی تھی اور اس کی وجہ نادیہ ہی کی درخواست تھی۔

نادیہ کے کھو جانے کا احساس جہاں حسرت بن کر اسے مایوس کر رہا تھا، وہاں اسے یہ بھی دکھ ہو رہا تھا جس کے لیے دل میں محبت بھرے جذبات ابھرے ہیں، نہ اسے دیکھ سکا اور نہ ہی اسے پا سکا، ورنہ اس کی زندگی میں نجانے کتنے لوگ آئے اور گئے۔ کسی کے لیے بھی اس کے من میں محبت بھرے جذبات نہیں اٹھے تھے۔ یہ کیسی محبت تھی کہ جسے دیکھا بھی نہیں صرف چاہا ہی چاہا ہے، وہی اسے نہ مل سکا، یہاں تک کہ اس کی اپنی ہی محبت نے اسے انجان راہوں پر پھینک دیا۔ جس کے بارے کوئی خبر نہیں تھی کہ کون سا راستہ کدھر جاتا ہے۔ چند گھڑیاں پہلے جس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا، وہی اس کے ذات کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کے لیے وہ کسی کو بھی مورد الزام نہیں ٹھہرانا چاہتا تھا بلکہ یہ سراسر اس کا اپنا ذاتی فیصلہ تھا۔ ایک ہی لمحے میں جو اس نے فیصلہ کیا تھا تو اس کے سامنے جہاں نادیہ کی ذات تھی، وہاں اسے اپنی ماں بھی دکھائی دے رہی تھی۔ نادیہ کی شرط مان کر ہی اپنی ماں کو اس حویلی میں دوبارہ مقام دلا سکتا تھا۔ وہ جو اسے دیکھنے کے روادار نہیں تھے، جس کے بارے میں بات کرنا تو کجا، اس کے وجود ہی سے انکاری تھے۔ اپنے تئیں انہوں نے زبیدہ کو مار دیا تھا، زندگی سے نکال دیا تھا، اب اسے ہی قبول کرنے کو تیار تھے۔ وقت ان کے ہاتھ میں تھا اور وہ ان لمحات کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اب اس کی ماں جب بھی حویلی میں آیا کرے گی تو ایک حیثیت اور مقام کے ساتھ، پہلے کی طرح صدر دروازے پر اجازت کی طلب گار نہیں ہوا کرے گی۔ پیر سائیں جو اس کی جان کا دشمن تھا، اب اسے داماد کے طور پر قبول کر چکا تھا۔ کیا یہ اعجاز محبت تھا یا وقت و حالات کی مہربانی، جو کچھ بھی تھا، اسے اپنی محبت قربان کر کے، اپنی ماں کے لیے بہت کچھ مل گیا تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ اسے اندر سے بلاوا آ گیا۔ اس نے سب کی طرف دیکھا اور اٹھ کر اندر چلا گیا۔ حویلی کے در و دیوار اس کے لیے اب اجنبی نہیں رہے تھے۔ حویلی کی انہی دیواروں کے درمیان کہیں نادیہ موجود تھی جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اس کی محبت کو کبھی دل سے نہیں نکال پائے گی۔

☆......☆

حجلۂ عروسی میں سمٹی ہوئی نادیہ کے دل میں نہ کوئی ترنگ تھی اور نہ ہی کوئی امنگ، مستقبل کے سپنوں کی جگہ ماضی کی یادیں اسے کچو کے بھر رہی تھیں۔ اس کی آنکھ میں کوئی اک ذرا آنسو نہیں تھا اور نہ ہی لبوں پر کوئی مسکان مچل رہی تھی۔ خالی الذہن سی، ویران دل کے ساتھ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک کا سفر نہ تو کوئی خوشگواریت لایا تھا اور نہ ہی کوئی تلخی اسے محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا وجود یوں ہو گیا تھا کہ جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو اور اس کے اندر سے سارے جذبات و احساسات کھینچ لیے ہوں۔ وجود تھا کہ مٹی کا ایک ڈھیر بیڈ پر تھا جیسے عروسی جوڑا پہنا دیا گیا ہو۔ سرخ جوڑے میں ملبوس نادیہ زیوارت سے لدی پھندی خاموشی سے ایک ٹک اپنے پیروں کو تکے جا رہی تھی۔ اس نے بہت پڑھا تھا کہ شادی ہونے سے جو رسومات ہوتی ہیں۔ ان میں کتنا ہلا گلا ہوتا ہے۔ سکھیاں کس طرح چھیڑتی ہیں۔ ایک گھر سے دوسرے گھر تک کے سفر میں

اگر آئیں، سسکیاں اور آنسو ہوتے ہیں تو ان میں امنگ بھری خوشیاں، ترنگ بھرے جذبے اور رنگ بھرے احساسات بھی ہوتے ہیں۔ زندگی ہمک رہی ہوتی ہے کہ جس سے مستقبل سے تار و پود ترتیب پاتے ہیں۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا، خلا کی سی کیفیت تھی، جس میں کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ اگرچہ دادی اماں نے خود سامنے بیٹھ کر ملازماؤں کو اسے سجانے سنوارنے کے لیے کہا تھا۔ اتنی توجہ اس نے فرح پر نہیں دی تھی۔ جتنی اس پر دی تھی۔ ملازماؤں نے بھی اسے بڑے شوق سے تیار کیا تھا۔ وہ بھی کہ بے جان بت کی مانند بجتی سنورتی رہی۔ اسے، اس کے کمرے سے اٹھایا اور ظہیر شاہ کے سجے ہوئے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں وہ بے نیاز بیٹھی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ سوچوں تک میں سناٹا تھا۔ اختر رومانوی کا لہجہ بھی یاد کرنے کی کوشش تو بھی اسے یاد نہ آیا۔ تبھی دھیرے سے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا، ظہیر شاہ تھا۔ پتا نہیں اسے لگا، یا حقیقت میں ہی ایسا تھا، اسے ظہیر شاہ کے چہرے پر بھی کوئی خوشگواریت دکھائی نہیں دی تھی۔ اس نے نگاہیں پھیرلیں اور دوبارہ سے اپنے پیروں کو دیکھنے لگی۔ جس پر سونے کی پائل خوب بج رہی تھی۔ ظہیر شاہ اس کے قریب بیڈ پر آ بیٹھا اور بڑی آہستگی سے سلام کیا۔ اس نے بھی زیرلب جواب دے دیا۔ چند لمحے یونہی خاموشی کی نذر ہو گئے۔ یوں جیسے دونوں بے جان بت ایک دوسرے کے سامنے موجود ہوں۔ پھر ظہیر شاہ نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سنہری ڈبیہ نکالی، اسے کھولا اور نادیہ کے سامنے کر دیا۔ اس میں ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

''یہ میری طرف سے تحفہ ہے تمہارے لیے۔''

چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اس کا ہاتھ تھام کر، بڑے پیار اور نزاکت سے اسے پہناتا، لیکن وہ یونہی اس کے سامنے کیے رہا۔ کتنے ہی لمحے یونہی گذر گئے۔ اس نے بھی اپنا ہاتھ آگے نہیں کیا کہ وہ سمجھ جاتا۔ تبھی ظہیر شاہ نے اس ڈبیہ کو ایک طرف رکھتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔

''کیا تم اب بھی اس شادی پر ناخوش ہو۔؟''

''بہت سارے فیصلے انسان اپنی مرضی سے نہیں کر پاتا۔ حالات و واقعات اسے مجبور کر دیتے ہیں۔ اب ان پر خوش ہوا جائے یا ناخوش۔ یہ بھی حالات و واقعات کی مرضی کے تحت ہوتا ہے نا۔''

''تو دوسرے لفظوں میں تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تیری اور میری شادی حالات و واقعات کی مجبوری کے تحت ہوئی ہے۔'' وہ خاصے تحمل سے بولا۔

''میں دوسرے تیسرے لفظوں میں بات نہیں کر رہی ہوں ظہیر شاہ، میں نے صاف لفظوں میں بات کی ہے۔ بلکہ آپ کی بات کا جواب دیا ہے۔ کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں ان سارے حالات و واقعات کو جس کے تحت یہ شادی ہوئی۔'' وہ بھی عام سے انداز میں بولی۔

''خیر۔! وہ ہوا سو ہوا۔ لیکن میں یہاں یہ الجھن دور کر لینا چاہتا ہوں کہ حویلی سے بھاگ جانے کی وجہ کیا تھی۔ میری ذات سے نفرت، اختر رومانوی یا شعیب سے محبت یا کوئی بات؟''

''آپ کے والد پیر سائیں کا لالچ، اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں ان فرسودہ اور جھوٹی روایات کو توڑ دوں اور میں نے توڑیں۔ آپ کی ذات سے نفرت ہوتی نا تو جو چاہے ہو جاتا میں آپ سے شادی نہ کرتی اور نہ ہی مجھے کوئی مجبور کر سکتا تھا۔ شعیب سے محبت، تو میرے پاس ہر طرح سے آپشن تھا۔ آپ نے بھی تو میرے ساتھ شادی اپنے لالچ کے لیے کی ہے۔ میں آپ سے یہ سوال کروں کہ کیا آپ کو میرے ساتھ محبت ہے؟ تو آپ کیا جواب دیں گے، بولیں۔'' نادیہ نے بڑے تحمل کے ساتھ صاف گوئی سے کہہ دیا۔

''میں نے بابا سائیں کا حکم مانا ہے۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''تو سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے ہو آپ کہ آپ بھی اپنے بابا سائیں کے لالچ میں پوری طرح شریک ہیں۔ آپ کی اور میری شادی نہیں ہوئی، مگر میری جائیداد اپنے نام کروانے کے لیے فائل بہت پہلے ہی پہنچا دی گئی۔ میں اسے کیا سمجھوں؟ یا پھر آپ انکار کریں کہ آپ اپنے بابا سائیں کے منصوبے سے آگاہ نہیں ہیں۔'' اس بار وہ کافی حد تک تھے سے اکھڑ گئی تھی تو ظہیر شاہ نے تحمل سے کہا۔

''خیر! ہم یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس وقت

شادی کے بندھن میں بندھ گئے ہیں۔اور ایک چھت کے نیچے ہیں۔میرے خیال میں ہمیں اپنی آئندہ کی زندگی کے لیے یہ طے کر لینا چاہیے کہ ہم نے اپنی زندگی کیسے گذارنی ہے۔''

''زندگی تو ویسے ہی گذرتی ہے جیسے ہم چاہیں گے۔یہ تو ہم دونوں کے رویئے پر ہے نا۔ہم ایک دوسرے کے لیے اعتماد بنیں گے تو ہی اچھا رہے گا، ورنہ ہم میں بدگمانی اور تلخیاں ہی پیدا ہوتی رہیں گی۔'' نادیہ نے سکون سے کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہو گا۔کہ ہم ایک دوسرے پر اعتماد کریں اور ہم ایک اچھی زندگی گذار سکیں؟'' اس نے سمجھوتہ کر لینے والے انداز میں پوچھا تو وہ بولی۔

''یہی کہ ہم ایک دوسرے پر اعتماد کریں اور کیا۔ حالات وواقعات کی بجائے عزت اور مان دیں۔''

''کیسے؟ کیسے ہو گا یہ؟'' اس نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں۔جس طرح زندگی کی سانسوں بارے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔اس طرح کسی دوسرے کی نیت بارے کیا کہا جا سکتا ہے۔یہ تو زندگی کی راہوں پر چلنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہم سفر کیسا ہے۔'' اس نے بڑے محتاط انداز میں کہا۔

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ابھی تک الجھن میں ہو ہمارے اس رشتے کے بارے میں۔الجھن ہے تمہیں ،یقین نہیں۔'' ظہیر شاہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''دیکھو ظہیر شاہ! میری زندگی میں جو محرومیاں ہیں۔اس کے بارے میں آپ پوری طرح آگاہ ہو۔جانتے ہو کہ اس حویلی میں ہم عورتیں کیسے رہتی ہیں۔ہمیں تو اپنی مرضی سے سوچنے تک کا اختیار نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو آج یہ مجبوریاں نہ ہوتیں۔وہ مجبوریاں جو محرومیوں میں لپٹی ہوئی ہیں۔''

''یہ ہماری روایات ہیں انہیں قبول تو کرنا پڑے گا۔میں بھی انہی روایات کا پابند ہوں اور رہوں گا۔تمہارے ساتھ شادی کرنے کے بعد ایسا نہیں ہے کہ میں ان روایات سے انحراف کر لوں گا۔جہاں تک جائیداد کا معاملہ ہے ،وہ تم رکھو اپنے پاس ،مجھے اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔کبھی بھی یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہارے ساتھ جائیداد کے لالچ میں شادی کی ہے۔میری اور تمہاری شادی فقط حویلی کی روایات کے لیے ہے۔'' ظہیر شاہ نے اس واضح کرنے کی کوشش کی۔

''میں آپ کی بات کو جھٹلاتی نہیں ،اگرچہ میرے پاس بہت سارے دلائل ہیں کہ پیر سائیں نے کیا کچھ کیا۔تاہم میں آپ سے یہ سوال کرتی ہوں کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔'' اس نے بحث کو سمیٹ دینا چاہا۔

''میں فقط یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں ماضی کو نظر انداز کر سکتا ہوں ،اگر تم آئندہ حویلی کی روایات کی پاسداری کرو۔اور یہ کبھی بھی جتانے کی کوشش نہ کرنا کہ میرے ساتھ شادی کر کے تم نے مجھ پر یا میرے والدین پر احسان کیا ہے۔کیونکہ یہ شادی تم نے شرط سے کی ہے۔تمہاری شرط پوری ہوئی اور اب تمہیں اپنی زندگی میرے مطابق گذارنا ہو گی۔'' ظہیر شاہ نے کافی حد تک سخت لہجے میں کہا تو وہ بہت زیادہ تحمل سے بولی۔

''اب میں آپ کے نکاح میں آ گئی ہوں۔آپ میرے شوہر ہیں اور آپ کا ہر حکم ماننا میرا فرض ہے،لیکن آپ کا لہجہ اور انداز مجھے یہ جتا رہا ہے کہ میں اب آپ کی زرخرید لونڈی بن کر رہوں تو زندگی گذارنے کا حق رکھتی ہوں ورنہ نجانے میرے ساتھ کیا ہو جائے گا۔میرے سارے حق سلب ہو جائیں گے اور میں انہی در و دیوار میں گھٹ کر رہ جاؤں گی؟''

''ہاں، تمہیں ایسا ہی کرنا ہو گا۔جیسے پرکھوں سے ہماری یہ روایات چلی آ رہی ہیں۔اور اس پر میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرو گی۔میں تمہیں یہی باور کرا رہا ہوں۔'' وہ قدرے کھردرے لہجے میں بولا۔

''تو ٹھیک ہے۔ میں آپ کی بات مان لیتی ہوں۔لیکن آپ کو میرا حق مجھے دینا ہو گا۔جس سے آپ فرار نہیں لے سکتے۔'' وہ پھر اسی تحمل سے بولی۔

''کیسا حق؟ میں نے تمہیں اپنے عقد میں لے لیا ہے تو حقوق بھی پورے کروں گا۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''تو پھر سنیں! یا تو آپ مجھے اپنے ساتھ لندن لے جائیں یا پھر آپ کو یہاں رہنا ہو گا میرے ساتھ۔یہ میرا حق ہے کہ جہاں آپ رہیں گے، میں نے بھی وہیں رہنا

ہے۔ کیونکہ آپ میرے ذمے دار ہیں۔ دوسرا اور کوئی نہیں۔'' وہ پرسکون انداز میں بولی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ ایسا ناممکن ہے۔ مجھے اپنی تعلیم مکمل کر کے ہی یہاں آنا ہے۔ جو میرے باپ کا خواب ہے۔ اور ویسے بھی میں ابھی اپنے ساتھ تمہیں لے جا نہیں سکتا۔'' اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ جانیں، آپ فیصلہ کر کے مجھے بتا دیں۔ تب ہم زندگی کی شروعات کر لیں گے۔'' اس نے ظہیر شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بھنا کر بولا۔

''یہ تم خواہ مخواہ کی ضد کر رہی ہو۔ یہ اقرار کر لو کہ تم نے مجھے اپنے دل سے شوہر تسلیم ہی نہیں کیا۔''

''اور کیا آپ نے دل سے مجھے بیوی تسلیم کر لیا؟'' وہ تنک کر بولی تو کافی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

''دیکھو نادیہ! میں تمہیں بار بار یہ بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اگر ہم زندگی کی راہ پر سمجھوتے کے ساتھ چلتے تو زندگی سہل ہو بھی سکتی ہے، لیکن مجھے لگتا ہے تم کچھ اور ہی سوچ رہی ہو۔ ٹھیک ہے، اب میں تمہیں اپنے فیصلے ہی سے آگاہ کروں گا۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر باہر کی جانب چل دیا۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ اس کے دل میں قطعاً احساس نہیں تھا کہ وہ اس کی سہاگ رات ہے اور اس کا دولہا اس سے روٹھ کر حجلہ عروسی سے جا رہا ہے۔ وہ کمرے میں تنہا ہو گئی تو نجانے کیوں اسے یوں لگا کہ وہ اب تک گھٹن کی شکار تھی اب کھل کر سانس لے سکتی ہے۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور اپنے زیور اتارنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ اپنا عروسی جوڑا اتار کر سکون سے سو جائے گی۔

☆......☆

شعیب اپنے آپ ہی میں خود کو اجنبی محسوس کر رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے حالات و واقعات کے ساتھ ہوائیں بھی بدل جاتی ہیں۔ ایک ہی دن میں اتنا کچھ بدل جائے گا یہ تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ تو اپنی امی سے پوری بات سن کر نادیہ کو لے آنے کے لیے اس گھر سے نکلا تھا۔ لیکن ہوا کیا؟ فرح اس کے نکاح میں دے دی گئی جسے وہ اپنے ساتھ لے آیا اور اب وہ حجلۂ عروسی میں اس کی منتظر تھی۔ زندگی اپنے رنگ کیسے بدلتی ہے، یہ اس دن اس کی سمجھ میں آیا۔ مقدر کس قدر طاقت ور ہوتا ہے یہ اس دن اسے پتا چلا۔ انسان اپنے ذہن میں نجانے کیسے منصوبے بناتا ہے۔ کس قدر ارادے باندھتا ہے لیکن ہوتا کیا ہے؟ یہاں تک کہ کچھ بھی اس کی دسترس میں نہیں رہتا۔ گھر میں موجود تین فرد، وہ، فرح اور اس کی امی کے ساتھ فقط دو ملازمین۔ خاموشی انتہائی گہری تھی۔ سب ہی اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔ رات تھی کہ گذرتی چلی جا رہی تھی۔ اور وہ لان میں بیٹھا ان لمحات کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا جو نادی سے بات کرتے ہوئے گذرتے تھے۔ کہیں بھی کچھ ایسا نہیں تھا۔ جس سے ان کے درمیان کوئی کسی قسم کا وعدہ ہوا ہو۔ وہ دونوں اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ زندگی کا ایسا کون سا موضوع تھا جو ان کے زیر بحث نہیں آیا تھا لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی اظہار ہو، جس سے دونوں کی محبت عیاں ہوتی ہو۔ وہ ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ بہت قریب آ گئے لیکن جب ان دونوں ہی کے ملنے کا وقت آیا۔ تب نادیہ نے عجیب رویہ دکھا دیا۔ کیا اسے مجھ سے محبت کبھی تھی ہی نہیں؟ اگر ایسی بات ہے تو پھر حویلی سے اختر رومانوی تک جانا کس زمرے میں جاتا ہے؟ ظہیر شاہ سے اگر اس نے شادی کرنا تھی تو پھر حویلی سے جانے کا کیا مطلب۔ اگر وہ حویلی سے نہ جاتی تو کیا اس کے بارے میں علم ہوتا۔؟ ایسے ہی نجانے کتنے سوال اس کے ذہن میں ایک کے بعد ایک آتے چلے جا رہے تھے۔ اسے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ فرح اس کے انتظار میں ہے۔ یہ عجیب بات تھی کہ جو اس کی ہمسفر بن چکی تھی، اس کے بارے میں اندر سے ذرا سا جذبہ بھی نہیں اٹھا تھا اور وہ جو اس سے بچھڑ گئی تھی وہ اسے ہی یاد کرتا چلا جا رہا تھا۔

''ایسا کیا سوچ رہے ہو بیٹا۔'' اس کے کانوں میں اس کی امی کی آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی دائیں کاندھے پر دباؤ کا احساس ہوا تو وہ چونک گیا۔

''نہیں۔ کچھ نہیں امی!'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا تو اس کی امی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میں جانتی ہوں بیٹا۔ !تم نے اگر کبھی نادیہ کے

لیے اظہار نہیں بھی کیا تو ان دنوں تمہاری اس کے لیے تڑپ دیکھ کر میں اندازہ لگا چکی ہوں کہ تم اسے کتنا چاہتے ہو لیکن فرح بھی تو اس کا دیا ہوا تحفہ ہے۔ نجانے کس مصلحت کے تحت اس نے فرح کو اپنا مقام دے دیا ہے اور خود حویلی کی چار دیواری میں دفن ہوگئی۔“

”ہاں امی! پہلے مجھے اتنا احساس نہیں تھا، لیکن اس کے کھو جانے کے بعد وہ مجھے بہت یاد آ رہی ہے۔“ اس نے واضح طور اعتراف کرلیا۔

”میں سمجھتی ہوں بیٹا! لیکن اب وہ ماضی کا حصہ بن گئی ہے۔ اس میں نہ حالات کا کوئی دوش ہے اور نہ ہماری کوئی کوتاہی، یہ فیصلہ اس نے خود کیا۔ اب اس پر ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ اس کی امی نے پیار سے کہا۔

”ہاں امی۔! شاید اس لیے میں نے فرح کو قبول کر لیا۔ ورنہ شاید......“ اس نے کہنا چاہا لیکن مصلحت کے تحت خاموش ہوگیا۔

”اب جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ ماضی کو بھول جاؤ اور آنے والے وقت کو اچھا اور خوشگوار بنانے کی کوشش کرو۔ جس طرح بھی سوچا جائے، اس میں فرح بے چاری کا تو کوئی بھی قصور نہیں ہے۔ اس بے چاری کو تم ایک بیوی کا مان دینا کہ وہ خوشگوار زندگی کا سکھ پائے۔“ امی نے سمجھایا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے امی! جیسا آپ چاہیں۔“

”تو چلو اٹھو، وہ بے چاری تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ اسے کبھی دکھ مت دینا۔“ امی نے اسے سمجھایا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور پھر دونوں ماں بیٹا رہائش گاہ کے اندر چل دیئے۔

شعیب جس وقت اپنے کمرے میں داخل ہوا تو فرح ایک گٹھڑی کی مانند بیڈ کے ایک کونے پر ٹکی ہوئی تھی۔ زیورات سے لدی پھندی وہ سر نیہوڑے یوں بیٹھی ہوئی تھی کہ جیسے خود میں ہی کہیں گم ہونے جا رہی ہے۔ وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی حالت کا اندازہ کرتا رہا۔ پھر وہ آہستگی سے آگے بڑھا اور بیڈ کے دوسرے کنارے پر جا بیٹھا۔ اس نے محسوس کیا کہ فرح ہلکے ہلکے کانپ رہی ہے۔ نجانے کیوں اسے فرح پر ایک دم سے ترس آ گیا۔ وہ اگر نادیہ کا تصور ذہن میں لیے ہوئے ہے تو ممکن ہے فرح کے ذہن میں بھی کوئی تصور ہو۔ اس نے ہولے سے اسے سلام کہا تو عجیب مردنی سی آواز میں فرح نے جواب دیا۔ تب شعیب کو احساس ہوا کہ اسے باتوں ہی باتوں میں حوصلہ دینا ضروری ہے۔ ورنہ شاید وہ بات ہی نہ کر پائے۔ اس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔ اس لیے وہ بڑے نرم لہجے میں بولا۔

”فرح! میں مانتا ہوں کہ ہماری شادی ایسے حالات میں ہوئی ہے جس کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ آج کیا، دوپہر تک تمہارے ذہن میں نہیں ہوگا کہ آج رات تمہاری سہاگ رات ہوگی۔ قسمت کے اس کھیل میں ہمارے لیے کیا ہے، نہ تم جانتی ہو اور نہ میں جانتا ہوں۔ تم جو کہنا چاہو اور جیسی زندگی چاہو، میں اس طرح کی زندگی تمہیں دینے کی کوشش کروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر اسے اپنی جانب لا کر ایک کنگن اس کی کلائی میں پہنا دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ فرح کا بدن مزید لرزنے لگا ہے۔ کافی لمحات کی خاموشی کے بعد وہ اس ہلکی سی آواز میں بولی۔

”شکریہ۔“

”کیا تم کچھ نہیں کہو گی؟“ شعیب نے اسے بات کرنے پر ابھارا تو اس نے حوصلہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے کیا کہنا ہے۔ کیونکہ مجھے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ زندگی نے جو دیا اور جیسا دیا مجھے قبول ہے۔ آئندہ بھی میں کوئی گلہ نہیں کروں گی۔ حویلی کی روایت میں ہے کہ عورتیں اپنے فیصلے نہیں کر سکتیں تو میں بھی اپنا آپ اور اپنی زندگی کے سارے فیصلے آپ کے سپرد کرتی ہوں۔“

”کیا تم نے کبھی سوچا تھا کہ ایسی انہونی ہو سکتی ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔! یہ انہونی ہی ہے۔ آپ کو شاید نہیں معلوم کہ خاندان کے باہر شادی نہ کرنا بھی حویلی کی روایت میں ہے۔ خاندان میں کوئی ایسا لڑکا نہیں تھا کہ جس سے میری شادی ہو سکتی۔ میں نے تو سوچ لیا تھا کہ میں نے ساری زندگی یونہی گذار دینا ہے۔ اب یہ قسمت“ فرح نے کہا تو شعیب نے پوچھا۔

''میرے خیال میں قسمت سے زیادہ یہ نادیہ کا فیصلہ ہے۔تم سوچ سکتی ہو کہ ایسا اس نے کیوں کیا؟''

''میں نہیں جانتی ۔وہ آج سے نہیں بہت پہلے سے ،کئی مہینوں سے ڈسٹرب ہے۔کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ تنہائی کا شکار ہو کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے۔اس لیے ایسی حرکتیں کرتی ہے جن کے بارے میں اسے خود معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے۔'' وہ کافی حد تک حوصلہ سے بات کرنے لگی تھی۔

''اتنی تنہائی ہے حویلی میں؟'' اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تنہائی تو ہے اور یہ سب حویلی کی روایات کی وجہ سے اور پھر ہم تین ہی تو تھیں حویلی میں،امی وہ تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔نہ کسی معاملے میں دلچسپی اور نہ ہی کوئی اپنی مرضی۔بس بابا سائیں کے حکم کی پابند ہیں۔'' اس نے اعتماد سے کہا تو وہ بڑے نرم لہجے میں بولا۔

''خیر! تمہارا یہ فیصلہ اچھا ہے کہ اپنے سارے فیصلے میرے سپرد کر دیے ہیں۔لیکن میں تم پر کوئی جبر یا ظلم نہیں کروں گا بلکہ میں تمہیں اپنی مرضی سے جینے کا پورا پورا حق دیتا ہوں۔تم جس طرح خوش رہنا چاہو، ویسے ہی رہو۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے۔''

''کہیں آپ مجھ پر ترس کھا کر تو ایسا نہیں کہہ رہے ہیں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''کیوں تمہیں ایسا کیوں لگا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ حقیقت ہے کہ میں آپ کے لیے کوئی مانگی ہوئی دعا تو نہیں ہوں نا۔آپ پر مسلط کی گئی ایک شرط ہوں۔ شرط تو مجبوری ہی میں پوری کی جاتی ہے نا۔آپ کی بات سے تو مجھے یوں لگا جیسے آپ کو مجھ سے کوئی رغبت نہ ہو اور آپ بس مجھے نبھائیں گے۔'' اس کے لہجے میں نجانے اتنا درد کہاں سے سمٹ آیا تھا۔

''ابھی تم میری مزاج آشنا نہیں ہو۔اس لیے ایسا کہہ رہی ہو۔زندگی میں جب تم میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلو گی نا، تب تجھے محسوس ہوگا کہ میں ٹھیک کہہ رہا تھا۔ابھی تو ویسے بھی میری باتوں کی سمجھ نہیں آئے گی۔اگر میں نے مجبوری میں بھی تجھے نبھایا نا تو اس میں بھی میں تجھے مان دوں گا۔جس طرح حویلی میں روایات کے نام پر جبر ہے۔انسانی رویے کی تضحیک کی جاتی ہے۔ ویسا میں کر ہی نہیں سکتا۔تم نے اتنی زندگی حویلی کی چار دیواری میں گزاری ہے۔اس لیے تمہیں احساس نہیں ہے کہ باہر کی دنیا کتنی کھلی ہے۔اس میں کتنی روشنی ہے۔جبر ہے نہیں، خلوص سے دل جیتے جاتے ہیں۔'' اس نے کافی حد تک جذباتی لہجے میں کہا۔

''لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے نا۔آپ نادیہ کو چاہتے تھے اور میں......''

''یہ ٹھیک ہے کہ میرے دل میں اس کے لیے محبت ہے ،احترام ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنی زندگی اس لیے تج دوں کہ وہ مجھے نہیں ملی۔زندگی کی حقیقتیں کچھ اور بھی ہیں۔ان سے بھی نبرد آزما ہونا ضروری ہے۔ایک کونہ پا کر سارے رشتوں سے ناتا توڑ لیا جائے، یہ تو پاگل پن ہی ہوا نا! اور پھر فرح یہ جان لو ہم میں لاکھ گہرا تعلق رہا ہو دوستی کی حدیں جتنی مرضی وسعت رکھتی ہوں مگر! ہمارے درمیان کوئی وعدہ نہیں ہوا یہاں تک کہ کوئی اظہار تک نہیں، اس لیے ہم دونوں میں کوئی شرمندگی نہیں اور نہ ہی ہم ایک دوسرے کو بے وفا کہہ سکتے ہیں۔ہر رشتے اور تعلق کا مان الگ ہوتا ہے اسے اس کے مقام پر رکھا جائے تو ہی زندگی سہل ہوتی ہے۔ورنہ الجھنیں اس قدر بڑھتی ہیں کہ سوچیں ہی انسان کی قاتل بن جاتی ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔میرے خیال میں نادیہ کے اندر آپ کی محبت سے زیادہ حویلی کی روایات سے نفرت کا عنصر زیادہ ہے۔اس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتی رہتی ہے۔شاید آپ کے پاس جانے میں اس کی بغاوت نے اسے اکسایا ہو۔'' فرح نے آہستگی سے کہا تو وہ بولا۔

''تمہارے ساتھ نکاح ہونے تک میں سمجھتا رہا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہے، لیکن جب اس نے شرط عائد کی تو مجھے گماں ہوا یہ محبت نہیں، بغاوت ہی ہے۔ورنہ اسے اپنی محبت پا لینے کا پورا پورا اختیار تھا۔وہ جو چاہتی سو کرتی۔''

''خیر! میں جو بھی ہوں۔جیسی بھی ہوں آپ کی زندگی میں آ گئی ہوں۔ مجھے زندگی کو برتنے کا ابھی اتنا سلیقہ نہیں ہے۔میرے لیے باہر کی دنیا کی معمولی سی چیز بھی بہت غیر معمولی ہوگی۔اب میں نے آپ ہی کی نگاہ سے دنیا کو دیکھنا ہے۔پلیز! مجھے نہ صرف مان دیجیے گا۔

بلکہ وہ اٹوٹ سہارا بھی جس سے میں کہیں اس حیرت کدے میں گم ہو کر نہ رہ جاؤں۔" فرح نے بڑے نپے تلے لفظوں میں اپنا مدعا کہہ دیا۔شعیب کو اس کا یہ انداز اچھا لگا۔اس لیے خوش دلی سے بولا۔

"تم بات بڑے سلیقے سے کر لیتی ہو۔اس کی کیا وجہ ہے؟"

"یہ شاید نادیہ ہی کی وجہ سے۔اس نے بہت پڑھا ہے اور میں نے بھی۔اس کے اندر بغاوت اترتی چلی گئی اور میں اپنے آپ میں کھو کر رہ گئی۔میرے سپنے کچھ اور ہی طرح کے تھے۔میں نے اپنی دنیا تخلیق کر لی تھی اور اس میں خوش تھی کیونکہ میں جانتی تھی کہ اب میں نے تنہا زندگی گزارنی ہے اور اپنی بنائی ہوئی دنیا میں زندہ رہنا ہے۔یہ اپنے آپ کو سہارا دینے کی کوشش تھی،آپ اسے خود فریبی کہہ سکتے ہیں۔"

"زندگی میں ہر انسان نے اپنی دنیا بنائی ہوئی ہے فرح! جہاں وہ اپنی مرضی سے زندگی گذارنے پر مجبور ہے یہ دنیا جس قدر خوبصورت ہے نا، یہ اتنی بدصورت اور کریہہ بھی ہے کہ خوف آنے لگتا ہے۔یہاں انسان کا اپنے آپ میں سمٹنا بھی بہت ضروری ہے ورنہ باہر کے حالات اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیں۔تم فکر نہیں کرو فرح! تمہیں نہ صرف عزت ملے گی بلکہ وہ مان بھی جو تم چاہتی ہو۔بس ایک بات یاد رکھنا اعتماد ہی سارے رشتے ناتے اور تعلق کو مضبوط اور گہرا بناتا ہے۔یقین جیسی دولت انسان کے پاس ہونا تو پھر کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

"میں آپ سے یہی چاہتی ہوں۔جہاں کہیں قدم ڈگمگا جائیں تو آپ ہی میرا سہارا ہوں۔" اس نے جذب سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ماتھے سے لگا لیا۔شعیب نے اس کا ہاتھ پکڑا اور تھپتھپا کر دھیرے سے چھوڑ دیا۔ان کے درمیان یقین نے تعلق کو گہرے رنگ دے دیئے تھے۔شعیب اٹھا اور ایزی ہونے کے لیے لباس تبدیل کرنے لگا۔فرح اٹھی اس نے اپنے زیور اتارے،عروسی جوڑا اتارنے کے لیے باتھ روم میں چلی گئی۔وہ جب ایزی ہو کر آئی تو ہلکی پھلکی سے گڑیا دکھائی دے رہی تھی۔وہ شرماتے ہوئے دوبارہ بیڈ پر آ بیٹھی جہاں شعیب اپنی ہی کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔وہ اس کی طرف دیکھنے لگی کہ کب وہ اپنی سوچوں میں سے باہر آتا ہے۔تبھی وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔اس کمرے سے باہر رات گہری تھی جہاں فقط رنگینیاں ہی اپنا آپ منوانے کے لیئے بے تاب تھیں۔

☆......☆

مشرقی افق سے سورج بلند ہو گیا تھا۔نارنجی رنگ دھیرے دھیرے پیلاہٹ میں بدل گیا۔روشنی پھیلی اور ہر طرف اجالا ہو گیا۔پرسکون زندگی میں ہلچل ہو گئی۔ایسے میں مردان خانے میں پیر سائیں اپنے کمرے خاص میں بیٹھا ہوا،زندگی کی اس حقیقت بارے سوچ رہا تھا کہ بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی بندے کے اختیار میں بہت کچھ آ جاتا ہے۔اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شدید خواہش کے باوجود ہاتھ میں کچھ نہیں آتا۔انسانی خواہشات چاہے جتنی وسعت رکھتی ہوں ان کی ایک حد ہوتی ہے،پھر اس سے آگے کوئی ایسی طاقت ہے۔جس کی اپنی ویٹو پاور شروع ہو جاتی ہے۔اس نے اپنے تئیں جو کچھ بھی سوچا تھا،لیکن ہوا وہی جو قدرت کی مرضی تھی۔انسانی نظام کے ساتھ ساتھ قدرت کا بھی ایک نظام ہے جو اپنی دسترس رکھتا ہے۔وقت کو قابو کرنے کی خواہش میں انسان اپنی عظمت اور وقعت کھو دیتا ہے۔وہ تنہا بیٹھا ہوا یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔وہ مخصوص دستک تھی جیسے وہ پہچان گیا تھا۔دستک دینے کے چند لمحوں بعد دیوان اندر آ گیا اور دونوں ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔پیر سائیں نے اس کے چہرے پر دیکھا اور تشویش سے پوچھا۔

"کیا بات دیوان،تھوڑا پریشان لگ رہے ہو؟"

"سرکار بات پریشانی والی ہی ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"تو پھر بولو نا بات کیا ہے؟" اس بار پیر سائیں نے قدرے اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"اپنے ظہیر شاہ صاحب واپس برطانیہ چلے گئے ہیں۔" دیوان نے اپنے لہجے کو کافی حد تک نرم رکھتے ہوئے کہا تو پیر سائیں نے حیرت سے کہا۔

"ظہیر شاہ لندن چلا گیا۔یہ کیا بات ہوئی،کسی کو بتایا،نہ پوچھا۔ابھی کل شام ہی تو اس کی شادی ہوئی ہے ،یہ کیا ہے،کون کہتا ہے۔"

''سرکار، زنان خانے سے یہ پیغام بڑی بی بی جی نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ ظہیر شاہ جی وہاں کوئی خط چھوڑ گئے ہیں۔ وہ رات ہی کسی وقت ڈرائیور کو لے کر نکل گئے تھے۔'' دیوان نے وضاحت کی۔

''خط چھوڑ گیا ہے؟ اور رات ہی کسی وقت نکل گیا ہے۔ یہ کیا ماجرا ہوا؟ خیر، میں دیکھتا ہوں۔ تم کسی نہ کسی طرح اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو۔ میرے خیال میں وہ ابھی تک ائیر پورٹ بھی نہیں پہنچا ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔

''جی سرکار! میں نے رابطہ کیا ہے، لیکن ان کا فون ادھر حویلی میں ہے۔ وہ ساتھ لے کر نہیں گئے۔ ڈرائیور کا فون بھی بند ہے۔'' دیوان نے اپنی کارگزاری سنادی۔

''ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں۔'' پیر سائیں نے کہا اور اپنے خاص کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ اگرچہ وہ اپنی معمول کے مطابق دھیمی چال ہی چل رہا تھا مگر اس میں تیزی واضح طور پر دیکھی جاسکتی تھی۔

حویلی کی دوسری منزل پر کاریڈور کے پاس کھلی جگہ میں بڑی بی بی جی کے پاس زہرہ بی دونوں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کے چہرے افسردہ تھے۔ یوں جیسے کہ بہت بڑا نقصان ہو گیا ہو۔ پیر سائیں ان کے پاس آیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کب گیا وہ؟'' اس نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو بڑی اماں نے بتایا۔

''پتا نہیں، صبح اس کا انتظار کیا لیکن وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں آیا۔ تو پتا کروایا۔ دروازہ بند تھا اور دروازے کے باہر یہ کاغذ ٹنگا ہوا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے کاغذ کا ایک پرزہ پیر سائیں کی طرف بڑھا دیا۔ جسے اس نے پکڑ لیا اور پڑھنے لگا۔ اس میں انتہائی مختصر انداز میں یہی لکھا ہوا تھا کہ وہ برطانیہ واپس جارہا ہے، وہاں جا کر فون کر کے تفصیل سے بتائے گا کہ وہ کیوں فوراً واپس چلا گیا ہے۔ لہٰذا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پیر سائیں نے پڑھا اور پھر دونوں سے پوچھا۔

''اس نے تو کوئی وجہ نہیں لکھی؟ کیا اس کے کمرے میں نادیہ نہیں ہے؟ اس سے نہیں پوچھا؟''

''نادیہ نے تو یہی بتایا ہے کہ رات کے پہلے پہر وہ اس کمرے میں گیا تھا، کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ کافی دیر انتظار کر کے وہ تو سو گئی لیکن یہ کمرے میں نہیں پلٹا۔'' زہرہ بی نے دھیمے سے لہجے میں بتایا تو وہ تیزی سے بولا۔

''صاف ظاہر ہے، ان دونوں میں کوئی بات ہوئی ہوگی۔ اور بات بھی کوئی بہت اہم، ورنہ وہ اتنا بڑا فیصلہ نہ کرتا۔ آپ نے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''میں نے نادیہ سے پوچھا تھا۔ وہ تو کہہ رہی ہے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جھگڑے والی، وہ کچھ دیر آیا، باتیں کیں اور اٹھ کر چلا گیا۔'' زہرہ بی نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔

''وہ باتیں کیا تھیں۔ اصل میں انہی باتوں میں۔'' پیر سائیں کہتے کہتے رک گئے، پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد اپنی والدہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''آپ! اماں بی آپ نادیہ سے پوچھیں۔ اس نے کوئی ایسی بات کی ہوگی۔ جیسے ظہیر شاہ نے اپنی توہین سمجھا ہوگا۔ پتا کریں آپ۔''

''مان لیا دلاور شاہ کہ نادیہ نے کوئی توہین آمیز رویہ رکھا ہوگا، مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ ظہیر شاہ حویلی چھوڑ کر لندن کو سدھار جائے۔ اسے اگر حویلی کے کسی فرد پر اعتبار ہوتا تو وہ ضرور کوئی بات کرتا۔ ایسے بنا بتائے چلے جانا کوئی دانش مندی تو نہیں ہے۔'' لاشعوری طور پر اماں بی نے نادیہ کی وکالت کر ڈالی۔

''وجہ تنازعہ تو پھر بھی یہیں کہیں ہے نا۔'' پیر سائیں نے اپنے بیٹے کے طرز عمل کو یکسر نظر انداز کر دیا تو اماں بی چند لمحے خاموش رہی۔ پھر دھیمے سے لہجے میں بولیں۔

''چلیں! میں پوچھتی ہوں نادیہ سے کہ اصل معاملہ کیا ہوا ہے۔ لیکن مجھے نہیں یقین کہ وہ کچھ ایسا بتائے گی۔ جواب تک اس نے بتایا ہے اس سے زیادہ ہو۔ یہ تو ظہیر کے فون آنے پر ہی معلوم ہوگا کہ وہ کیا کہتا ہے۔'' اماں بی نے واضح لفظوں میں پیر سائیں کو باور کرا دیا کہ وہ مزید کوئی توقع نہ رکھے۔

''خیر! میں کوشش کرتا ہوں کہ ابھی وہ ملک سے باہر نہ جاسکے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگا تو اماں بی نے کہا۔

''بیٹے کی پریشانی تو ہوگئی لیکن کیا بیٹی فرح کا بھی خیال ہے کہ نہیں۔ اب اس کی طرف کون جائے گا؟ آپ جائیں گے یا ہم سے کوئی؟''

اماں بی نے جب توجہ اس طرف مبذول کرائی تو پیر سائیں چونک گیا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ بیٹی کو بھی لینے جانا ہے۔ بیٹی کو لانے کی بات اپنے اندر بہت سارے سوال چھپائے ہوئے تھا۔ یہ پیر سائیں کی شان کے خلاف تھا کہ وہ کسی کے گھر میں جاتا، چاہے وہ کسی کا بھی ہو اور پھر بیٹی کے گھر میں، اس شعیب کے گھر میں جس سے اس کی مخالفت رہی ہو۔ نجانے وہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کرے۔ پتا نہیں فرح کے ساتھ اس نے کیا سلوک کیا ہوگا۔ شرط کے ساتھ جو مجبوری بندھی ہوئی ہوتی ہے کیا اس کے اثرات فرح پر نہ پڑے ہوں گے۔؟ اس نے تو اپنی بات منوا کر نادیہ کو ظہیر شاہ سے بیاہ دیا تھا ،لیکن کیا اب فرح کی زندگی میں اپنی مرضی سے خوشیاں دے پائے گا۔ اگر شعیب نے اپنا رنج ودکھ فرح کی ذات میں سے نکالنا چاہا تو وہ انہیں روک پائے گا۔ کیا شعیب کے ساتھ فرح کو بیاہ کر اس نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟ کیا یہ کوئی نادیہ ہی کی چال تھی کہ اس طرح وہ پیر سائیں کو نیچا دکھا سکے گی۔ کیا اس کی پلاننگ میں زبیدہ پوری طرح ساتھ دے رہی ہے؟ کیا اسے گھیرنے کا پورا پورا منصوبہ بنا لیا گیا ہے؟ یہ سوچتے ہی وہ ایک دم سے پسینے میں نہا گیا۔ اپنی ضد اور انا کی خاطر اس نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا اور ایک بہت بڑا نقصان کر لیا۔

''پیر سائیں! کیا ہو گیا آپ کو طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟'' زہرہ نے اس کی حالت دیکھ کر تیزی سے پوچھا تو وہ آہستگی سے بولا۔

''نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔''

''تو پھر یہ؟'' اس نے پھر آہستگی ہی سے پوچھا تھا لیکن اس کے لہجے میں فکر مندی در آئی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''ابھی ظہیر شاہ کا معاملہ ختم ہو جائے تو پھر سوچتے ہیں کہ فرح کی طرف کون جاتا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ کاروڈیر میں نیچے جانے کے لیے چل پڑا۔ فرح کا خیال آتے ہی ظہیر شاہ والا معاملہ بالکل ہی معمولی لگ رہا تھا۔ وہ عجیب کشمکش میں آ گیا تھا۔ وہ خود اگر جاتا ہے تو نجانے شعیب کا رویہ کیا ہو اور اگر حویلی کی خواتین کو اس کے گھر بھجواتا ہے تو پرکھوں کی روایات ٹوٹ جاتیں۔ اگرچہ انہوں نے اپنے ہی رشتے داروں کے ہاں جانا تھا۔ پہلے کبھی ایسا ہوا ہی نہیں تھا کہ حویلی سے باہر جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیا شعیب اور زبیدہ کو حویلی میں لانا ہوگا؟ کیا وہ مان جائیں گے؟ اگر وہ مان گئے اور حویلی میں آ گئے تو کیا وہ پھر بھی حویلی کی روایات کو برقرار رکھ پائے گا؟ شعیب اگر اپنی بیوی کو کہیں لے جانا چاہے تو کیا وہ اسے روک پائے گا؟ کیا اس طرح اس کی اپنے داماد کے ساتھ براہ راست مخالفت نہ شروع ہو جائے گی۔ یا پھر اسے اپنا آپ بچ کر شعیب کے سامنے سرنگوں ہونا پڑے گا۔ کیسی غلطی کر گیا وہ؟ اگر وہ حویلی میں آنے کے بارے میں نہ مانا تو پھر؟ فرح اب اس کی بیٹی ہی نہیں شعیب کی بیوی بھی ہے۔ وہ دسترس جو کل دوپہر سے پہلے اسے حاصل تھی اب نہیں ہے۔ اسے زبیدہ اور شعیب کے سامنے ہر حال میں سرنگوں ہونا پڑے گا۔ اگر نہیں ہوتا تو پھر معاملات زیادہ خراب ہونے کا قوی امکان تھا، لیکن یہ ظہیر شاہ نے بھی تو حویلی سے جا کر اچھا نہیں کیا۔ یہ تو سیدھے سیدھے فرار کا راستہ ہے۔ اس کی ضد اور انا ہار گئی اور نادیہ کا صبر جیت گیا۔ پہلے تو وہ فقط اس کی بھتیجی ہی تھی اور اسے اپنی گرفت میں رکھنے کے لیے ظہیر شاہ سے شادی کے بندھن میں باندھنا چاہتا تھا۔ اب جبکہ وہ شادی کے بندھن میں بندھ گئی تھی تو اسے حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ خالی ہاتھ رہ گیا۔ نادیہ زیادہ مضبوط ہو گئی بظاہر اس کا سب کچھ کھو گیا تھا لیکن اس کا ذرا نقصان نہیں ہوا اور وہ زیادہ مضبوط ہو گئی۔ پیر سائیں اپنی سوچوں میں گھیرا ہوا مردان خانے میں اپنے مخصوص کمرہ خاص میں جا پہنچا۔ صحن میں مریدین کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ دیوان پوری طرح جانتا تھا کہ پیر سائیں کس حال میں ہیں۔ وہ اس کے پاس جا پہنچا۔

''سرکار! ہنوز وہی حال ہے۔ ڈرائیور کا فون بند ہے اور وہ پتا نہیں کہاں پر ہیں؟''

''اب کیا ہو سکتا ہے۔؟'' پیر سائیں نے کہا تو اس کے لہجے میں شکستہ پن نمایاں تھا۔ دیوان چونک گیا اور بولا۔

''سرکار! لاہور ائیر پورٹ سے لندن جانے والی فلائٹ کو روکا جا سکتا ہے۔ ظہیر شاہ کو ملک سے باہر جانے سے بھی روکا جا سکتا ہے۔ اتنے تعلقات تو ہیں کہ......''

(جاری ہے)